بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
فروری 2015
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

بانی و مدیرِ اعلیٰ — محمود ریاض

مدیرہ — رضیہ جمیل

مدیر منتظم — آذر ریاض

مدیرۂ اعزازی — امت الصبور

فلم ٹیلی وژن — شاہین رشید

اشتہارات — خالدہ جیلانی

MEMBER
APNS
CPNE

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار، کراچی

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	700	روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	5000	روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا		روپے

فروری 2015
جلد 29 شمارہ 6
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: 2/ بی 6 پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رضیہ جمیل

شعاع کا فروری کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اہلِ مغرب جو مسلمانوں پر انتہا پسندی، بنیاد پرستی اور عدم برداشت جیسے سنگین الزامات عائد کرتے رہے ہیں، فرانس میں پیش آنے والے حالیہ واقعہ نے انہیں ایک بار پھر موقع فراہم کر دیا ہے مسلمانوں کی کردار کشی کے لیے وہ سرگرم اور متحد ہو گئے ہیں۔ مغربی میڈیا اس مہم میں پیش پیش ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا پیغام پندرہ سو سال سے دہر میں اجالا کر رہا ہے۔ آپ کی تعلیمات قیامت تک انسانیت کی راہوں کو روشن کرتی رہیں گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ایمان کا حصہ ہے۔ اہلِ مغرب جانتے ہیں کہ ایک عام سا بے عمل مسلمان بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کیا جذبات و احساسات رکھتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کا شر انگیز اظہار رائے کس سنگین اظہار عمل کو جنم دے سکتا ہے۔

یورپ کے اہلِ علم اور دانش وروں کو سوچنا چاہیے کہ آزادیٔ اظہار کے نام پر شر انگیزی کر کے وہ دنیا کو کس طرف لے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں پر تنگ نظری اور بنیاد پرستی کا الزام لگانے والے کس انتہا پسندی اور تعصب کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

چالیس ملکوں کے سربراہان ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلے اور لاکھوں افراد نے ان کے ساتھ یک جہتی کا مظاہرہ کیا۔ آزادیٔ اظہار کے ان نام و نہاد علم برداروں کے لیے خود ان کے روحانی پیشوا پوپ فرانسس کا یہ تبصرہ بہترین جواب ہے۔

"آزادیٔ اظہار کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اگر کوئی میری ماں کے لیے نازیبا الفاظ استعمال کرے تو اسے میرا گھونسا کھانے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

آزادیٔ اظہار کی حدود نہ صرف مغربی میڈیا بلکہ ہمارے میڈیا کو بھی مقرر کرنا ہوں گی۔

اس شمارے میں،

- فرح بخاری کا مکمل ناول۔ شامِ خزاں طویل سہی،
- سمیرا حمید کا مکمل ناول۔ "یارم" تکمیل کے مراحل میں،
- لبنیٰ جدون، راشدہ رفعت اور سحر ساجد کے ناولٹ،
- سیما بنت عاصم، نظیر فاطمہ، فریدہ فرید اور کنیز نور علی کے افسانے،
- ٹی وی فنکارہ۔ یمنیٰ زیدی سے ملاقات،
- بیٹا کر سیر دو جہاں کرنا۔ آمنہ زریں کا تبصرہ،
- معروف فنکاروں سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- پیارے نبی کی پیاری باتیں۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

فروری کا شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے۔

خدایا تو رحیم و مہرباں ہے
تیرا لطف و کرم سب پر عیاں ہے

تو ہے موجود ہر ذرے میں لیکن
تیرا پیکر نگاہوں سے نہاں ہے

تیرا مشکور ہے ایک ایک ذرہ
تیرا ممنون یاں ہر انس و جاں ہے

کھلے ہیں پھول تیرے اذن ہی سے
تیرے ہی حکم سے دریا رواں ہے

تو ہی مالک ہے ہر اک شے کا مولا
زمیں تیری، تیرا ہی آسماں ہے

جسے بخشی ہے تو نے اپنی رحمت
غموں کے درمیاں وہ شادماں ہے

نہیں ہے فکر پھر اس کو کسی کی
تیرا کلمہ اگر وردِ زباں ہے

شمیم فاطمہ

دل کی دنیا میں ہے روشنی آپؐ سے
ہم نے پائی نئی زندگی آپؐ سے

کیوں نہ نازاں ہوں اپنے مقدر پہ ہم
ہم کو ایماں کی دولت ملی آپؐ سے

کل بھی معمور تھا آپؐ کے نور سے
ہے منور جہاں آج بھی آپؐ سے

دشمنوں پر بھی در رحمتوں کا کھلا
راہ و رسمِ محبت چلی آپؐ سے

دل کا غنچہ چٹکتا ہے صلِ علیٰ
اپنے گلشن میں ہے تازگی آپؐ سے

ختم ہے آپؐ پر شانِ پیغمبری
یہ روایت مکمل ہوئی آپؐ سے

ناصر کاظمی

ادارہ

عشاء کے بعد بات چیت کی کراہت

اس سے مراد وہ بات چیت ہے جو اس وقت کے علاوہ دیگر اوقات میں جائز ہے اور اس کا کرنا اور چھوڑنا دونوں برابر ہیں۔ لیکن وہ بات جو اس وقت کے علاوہ دیگر اوقات میں حرام ہو تو وہ اس وقت (عشاء کے بعد) زیادہ حرام اور زیادہ مکروہ ہو گی۔ لیکن بھلائی کی بات' جیسے علمی مذاکرہ' نیک لوگوں کی حکایت' عمدہ اخلاق کا تذکرہ' مہمان کے ساتھ اور کسی ضرورت مند وغیرہ کے ساتھ گفتگو کرنا' تو اس میں کوئی کراہت نہیں بلکہ یہ مستحب (پسندیدہ) ہے۔ اسی طرح کسی عذر یا سبب کی وجہ سے بات کرنے میں بھی کوئی کراہت نہیں ہے۔ یہ تمام باتیں جن کا میں نے ذکر کیا' ان پر صحیح حدیثیں دلالت کرتی ہیں۔ (یہ احادیث ملاحظہ ہوں)

حضرت ابو برزہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشائ سے پہلے سونے کو اور عشائ کے بعد بات چیت کرنے کو ناپسند فرماتے تھے۔

(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : (1) عشائ سے قبل سونے کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح عشا کی نماز فوت ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے اور عشائ کے بعد جائز بات چیت اس لیے ناپسندیدہ ہے کہ اس سے سونے میں تاخیر ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے انسان کے لیے تہجد یا فجر کے وقت اٹھنا مشکل ہو جاتا ہے' اس صورت میں گویا نماز فجر کے فوت ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ علاوہ ازیں انسان' عشا کی نماز کے فوراً بعد سو جائے تو اس لحاظ سے بھی بہتر ہے کہ اس کی دن کی سرگرمیوں کا اختتام نماز پر ہو گا جو افضل ترین عمل ہے۔

(2) یہ بھی یاد رہے کہ جب عشائ کے بعد بات چیت نا پسندیدہ ہے تو دوسرے کام بھی' جن میں کوئی دینی فائدہ اور شرعی غرض نہیں ہے' مکروہ ہوں گے' جیسے کھیل کود' تاش بازی' شطرنج وغیرہ اور آج کل کی عالمی لعنت ٹیلی ویژن اور ویڈیو وغیرہ دیکھنا۔ یہ ساری چیزیں تو ویسے بھی حرام ہیں۔ عشائ کے بعد ان لغویات میں مصروف رہنا اور بھی زیادہ حرام ہو گا۔ اسی طرح امام نووی رحمتہ اللہ نے علمی مذاکرے وغیرہ کو جو جائز بلکہ مستحب قرار دیا ہے تو یہ بھی مشروط ہے بروقت نماز فجر کی ادائیگی کے ساتھ۔

پیش گوئی

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں عشا کی نماز پڑھائی۔ پس جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا تو فرمایا۔

"بھلا بتلاؤ تو سہی' یہ رات کون سی ہے؟ بے شک جو شخص آج روئے زمین پر زندہ ہے' صدی کے پورے ہونے تک وہ باقی نہیں رہے گا۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : (1) یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی فرمائی تھی کہ آج کی رات کے بعد جو زندہ ہیں' وہ صدی کے راس (پورے ہونے یا سرے) پر باقی نہیں رہیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پہلی صدی ہجری کے اختتام تک وفات پا گئے۔ سب سے آخر میں وفات پانے والے صحابی

ابوالطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ ہیں جن کا انتقال ایک سو دس ہجری میں ہوا یعنی آپ کے فرمان کے پورے سو سال بعد۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔
(2) اس میں عشاء کے بعد ضروری باتیں اور علم سے متعلق گفتگو کا جواز ہے۔

عشاء کی نماز تاخیر سے پڑھنا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن صحابہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کرتے رہے۔ چنانچہ آپ ان کے پاس تقریباً" آدھی رات کو آئے اور ان کو عشاء کی نماز پڑھائی ' (حضرت انس فرماتے ہیں) پھر ہمیں خطبہ دیا جس میں فرمایا۔
"سنو! بے شک بعض لوگ نماز پڑھ کر سو گئے اور تم جتنی دیر انتظار کرتے رہے ' برابر نماز ہی میں رہے۔" (بخاری)

فائدہ : اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ عشاء کی نماز نصف رات تک مؤخر کی جاسکتی ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اس کے لیے جاگنا بھی جائز ہے تاکہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھی جاسکے۔ تیسری بات یہ کہ انتظار کی ساری مدت نماز میں شمار ہوگی اور اس حساب سے زیادہ اجر و ثواب ملے گا۔

شوہر کی اجازت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ' بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ خاوند کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر روزہ رکھے اور نہ یہ جائز ہے کہ وہ اس کے گھر میں اس کی اجازت کے بغیر کسی کو داخل ہونے کی اجازت دے۔" (بخاری و مسلم)
فوائد و مسائل : (1) روزے سے مراد نفلی روزہ ہے۔ علاوہ ازیں اسی طرح دیگر نفلی عبادات ہیں ' مثلاً" نفلی نماز اور تلاوت وغیرہ ' یہ سب کام خاوند کی موجودگی میں خاوند کی اجازت کے بغیر کرنے جائز نہیں۔

(2) اسی طرح خاوند کی رضامندی کے بغیر عورت کو گھر میں اپنے محرم کو بھی داخل ہونے کی اجازت نہیں دینی چاہیے چہ جائیکہ غیر محرم مردوں اور رشتے داروں کو۔ البتہ جن محرموں کے لیے اس نے صراحتاً" اجازت دے رکھی ہو یا اس پر وہ خاموش رہتا ہو تو ان کو عورت گھر کے اندر آنے کی اجازت دے سکتی ہے۔

امام سے پہلے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"کیا تمہارا ایک آدمی ' جب اپنا سر امام سے پہلے اٹھاتا ہے ' اس بات سے نہیں ڈرتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے سر کو گدھے کا سر بنا دے یا اللہ اس کی صورت کو گدھے کی صورت میں بدل دے۔" (بخاری و مسلم)
فائدہ : اس میں امام سے پہل کرنے کی وعید بیان کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے، کسی کے سر یا شکل و صورت کو گدھے کے سر یا صورت میں بدل دینا کوئی مشکل کام نہیں۔ اس لیے مقتدی کو ہر کام امام کے بعد کرنا چاہیے۔ امام سے پہلے رکوع یا سجدے میں جانا یا پہلے سر اٹھانا یا کوئی اور کام پہلے کرنا سخت گناہ اور نہایت خطرناک ہے۔

نماز میں کوکھ پر ہاتھ رکھنے کی کراہت کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نماز میں کوکھ پر ہاتھ رکھنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ (بخاری و مسلم)
فائدہ : انسان کے دائیں بائیں دو پہلو ہیں انہیں کوکھ کہا جاتا ہے۔ نماز کی حالت میں ان پہلوؤں (کوکھوں) پر ہاتھ رکھنا تکبر کی علامت ہے جب کہ نماز تو سراسر بارگاہ الٰہی میں عجز و نیاز مندی کے اظہار کا نام ہے۔ تاہم پہلو میں درد ہو اور اس کی وجہ سے کوکھ پر ہاتھ رکھنے کی ضرورت پیش آجائے تو بات اور ہے۔ اس وقت ایسا کرنا جائز ہوگا۔

نماز سے پہلے

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

”کھانے کی موجودگی میں نماز نہیں اور نہ اس وقت جب کہ پیشاب ' پاخانے کی شدید حاجت ہو۔“ (مسلم)

فائدہ : یہاں نفی بمعنی نہی ہے' یعنی کھانے یا پیشاب پاخانے کی حاجت کے وقت کوئی شخص نماز نہ پڑھے۔ لیکن یہ حکم ایسے شخص کے لیے ہے جس کو شدید بھوک لگی ہو اور کھانا بھی سامنے تیار ہو۔ کیونکہ اس صورت میں وہ کھانے سے پہلے نماز پڑھے گا تو سکون اور خشوع و خضوع سے نماز نہیں پڑھ سکے گا۔ اسی طرح پیشاب پاخانے کی ضرورت بھی شدید ہو تو پہلے قضائے حاجت کا اہتمام کرے اور پھر نماز پڑھے۔

نماز میں آسمان کی طرف دیکھنا

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”لوگوں کا کیا حال ہے کہ وہ اپنی نماز میں اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں۔“ چنانچہ اس کی بابت آپ کا لہجہ سخت ہو گیا' یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”لوگ اس سے باز آجائیں ورنہ ان کی نگاہیں اچک لی جائیں گی۔“ (بخاری)

فائدہ : نماز میں آسمان کی طرف نگاہ اٹھانا خشوع و خضوع کے منافی ہے' اس لیے اس پر سخت وعید فرمائی گئی ہے۔ تاہم نماز کے علاوہ 'مثلاً' دعا کے وقت یا غور و فکر کے وقت آسمان کی طرف نگاہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

بغیر عذر کے نماز میں ادھر اُدھر دیکھنے کی کراہت کا بیان

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز میں ادھر اُدھر دیکھنے کی بابت پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”یہ ایک جھپٹ ہے جس کے ذریعے سے شیطان بندے کی نماز کا کچھ حصہ اچک لیتا ہے۔“ (بخاری)

فائدہ : جھپٹ یا اچک' لینے کا مطلب ہوتا ہے' کسی کی غفلت اور بے خبری میں نہایت تیزی سے اس کی چیز لے لینا۔ جب انسان نماز میں خشوع و خضوع کے بجائے ادھر ادھر دیکھتا ہے تو یہ گویا انسان کی غفلت اور بے خبری ہے۔ جس سے شیطان فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کی نماز کو بے اثر کر دیتا ہے۔

قبروں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی ممانعت کا بیان

حضرت ابو مرثد کناز بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

”قبروں کی طرف رخ کر کے نماز مت پڑھو اور نہ ان کے اوپر بیٹھو۔“ (مسلم)

فوائد و مسائل : (1) قبروں کی طرح رخ کر کے نماز پڑھنے کی ممانعت کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس طرح مشرکین کے ساتھ مشابہت ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں غیر اللہ کی تعظیم کا پہلو بھی اس سے نکلتا ہے جو انسان کو شرک کی طرف لے جاتا ہے۔

(2) قبروں پر بیٹھنے سے انسان کی تذلیل ہوتی ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو توقیر و تکریم سے نوازا ہے۔ اس لیے ان دونوں کاموں سے بچنا چاہیے۔

نمازی کے آگے سے گزرنے کی حرمت کا بیان

حضرت ابو جہیم عبداللہ بن حارث بن صمہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اگر نمازی کے آگے سے گزرنے والے شخص کو یہ علم ہو جائے کہ اس کا کتنا گناہ ہے تو وہ گزرنے کے

بجائے چالیس تک کھڑے رہنے کو اپنے لیے بہتر سمجھے گا۔"

حدیث کے راوی بیان کرتے ہیں' مجھے یاد نہیں کہ آپ نے چالیس دن' چالیس مہینے یا چالیس سال فرمایا تھا۔(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : (1) اس سے معلوم ہوا کہ نمازی کے آگے سے گزرنا نہایت سخت گناہ ہے۔ نمازیوں کو بھی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ سترے یا ستون کے بغیر عام گزر گاہ پر کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھیں' اس سے یا تو گزرنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے یا مسئلے سے ناواقف لوگ آگے سے گزرتے رہتے ہیں۔

(2) اگر سترہ وغیرہ نہ ہو تو کتنے فاصلے سے نمازی کے آگے سے گزرنا جائز ہے' اس کا اندازہ تین میٹر یا تین صف کیا گیا ہے۔ مزید احتیاط کے طور پر چار پانچ صف کا اندازہ کرلیا جائے تو بہتر ہے۔ واللہ عالم۔

جمعے کے دن کو روزے کے لیے اور جمعے کی رات کو نماز پڑھنے کے لیے مخصوص کرنے کی کراہت کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم جمعے کی رات کو دوسری راتوں کے درمیان سے قیام (نفلی نماز وغیرہ) کے لیے خاص نہ کرو اور جمعے کے دن کو دوسرے دنوں کے درمیان سے روزے کے لیے خاص نہ کرو مگر یہ کہ جمعہ اس مدت میں آجائے جس میں تمہارا ایک آدمی روزے رکھتا ہو۔" (مسلم)

فائدہ : جیسے ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھنا کسی شخص کا معمول ہو' اس میں جمعے کا دن آجائے۔ یا عاشورے یا عرفے کا روزہ رکھتا ہو' اس میں جمعہ کا دن آجائے' یا ایام بیض کے روزوں میں جمعہ آجائے' یا اس نے نذر کے روزے شروع کر رکھے ہوں' ان میں جمعہ آجائے۔ ان تمام صورتوں میں جمعے کے دن روزہ رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ صرف بطور خاص جمعے کے دن کا روزہ رکھنا مکروہ ہے۔

جمعہ کے دن کا روزہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"تم میں سے کوئی شخص جمعے کے دن روزہ نہ رکھے۔ ہاں' اس کے ساتھ ایک دن پہلے یا ایک دن بعد کا روزہ ملالے (تو پھر کوئی حرج نہیں۔)" (بخاری و مسلم)

فائدہ : اس میں جمعے کے دن روزہ رکھنے کی ایک اور صورت کا بیان ہے کہ جمعرات یا ہفتے کے دن کا روزہ ساتھ ملالیا جائے تو ٹھیک ہے۔

ممانعت

حضرت محمد بن عباد بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے پوچھا۔

"کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعے کے دن کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے؟"

انہوں نے فرمایا "ہاں۔" (بخاری و مسلم)

جمعہ کا روزہ

ام المومنین حضرت جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہ بیان فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم (ایک مرتبہ) جمعے والے دن ان کے پاس تشریف لائے جب کہ وہ روزے سے تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا۔

"کیا تم نے کل روزہ رکھا تھا؟"

انہوں نے عرض کیا "نہیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "کیا تمہارا ارادہ کل کا روزہ رکھنے کا ہے؟"

انہوں نے عرض کیا "نہیں۔"

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "روزہ افطار کرلو۔" (بخاری)

فائدہ : اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی نے صرف جمعے کا روزہ رکھا ہو تو اسے توڑ دینا ضروری ہے۔

بغیر کھائے پیے دو دن یا زیادہ دن مسلسل روزہ رکھنا

حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری و مسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا۔ صحابہ نے عرض کیا

"آپ خود تو وصال کرتے ہیں (بغیر کھائے پیے مسلسل روزہ رکھتے ہیں؟"

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "میں تم جیسا نہیں ہوں' مجھے تو (اللہ کی طرف سے) کھلایا پلایا جاتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : (1) بعض شرعی معاملات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خصوصی احکام تھے جن کی رو سے بعض چیزیں آپ پر واجب تھیں' امت پر وہ واجب نہیں' آپ کے حق میں وہ جائز تھیں' امت کے لیے ان کا جواز نہیں ہے۔ ایسی چیزیں آپ کی خصوصیات کہلاتی ہیں جن میں امت کے لیے آپ کی اقتدا کرنا جائز نہیں ہے بلکہ گناہ ہے۔ ان ہی خصوصیات میں سے ایک صوم وصال ہے جس کا مطلب ہے بغیر کھائے پیے مسلسل کئی کئی دن کا روزہ رکھنا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو صبر و تحمل کی جو خصوصی قوت عطا فرمائی تھی' اس کی وجہ سے آپ روزوں میں وصال فرمایا کرتے تھے۔ لیکن افراد امت میں وہ قوت نہیں کہ وہ اس کا تحمل کر سکیں' اس لیے ان کے لیے وہ جائز نہیں۔

(2) میں تم جیسا نہیں کا مطلب بھی یہی ہے کہ اللہ نے مجھے جو خاص قوت عطا کی ہے' اس سے تم محروم ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تم جیسا انسان ہی نہیں۔ کیونکہ یہ مطلب انما انا بشر مثلکم نص قرآنی کے خلاف ہے۔

(3) کھلائے پلائے جانے سے مراد بھی روحانی قوت ہی ہے نہ کہ روزے کی حالت میں کسی خصوصی غذا کا اہتمام کیونکہ کھانا پینا تو روزے ہی کے منافی ہے۔

قبر پر بیٹھنے کی حرمت کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم میں سے کسی شخص کا انگارے پر بیٹھنا' جو اس کے کپڑوں کو جلا دے اور اس آگ کا اثر اس کی جلد تک پہنچ جائے' کسی قبر پر بیٹھنے سے بہتر ہے۔" (مسلم)

فائدہ : قبر پر بیٹھنے میں مردے کی اہانت کا پہلو ہے' اس لیے اس کو بھی سخت گناہ قرار دیا ہے۔ اس سے اجتناب ضروری ہے۔

قبر کو پختہ کرنے اور اس پر عمارت (قبہ وغیرہ) بنانے کی ممانعت

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ قبر کو پختہ کیا جائے' اس پر بیٹھا جائے اور اس پر کوئی عمارت بنائی جائے۔ (مسلم)

فائدہ : قبروں کو پختہ کرنا ایک تو فضول خرچی ہے' کیونکہ اس سے کوئی فائدہ مردے کو نہیں ہوتا۔ دوسرے' اس میں فوت شدگان کی ایسی تعظیم ہے جو انسان کو شرک کی طرف لے جاتی ہے۔ قبروں پر قبہ اور گنبد وغیرہ بنانے کا بھی یہی معاملہ ہے اور قبروں پر بیٹھنا تکریم انسانیت کے منافی ہے۔ اس لیے ان تینوں کاموں سے روک دیا گیا ہے۔

مجموعہ محمد خالد اختر (سفرنامے)

مصنف: محمد خالد اختر
تبصرہ: آمنہ زرین

دنیا کیا ہے؟
خانہ بدوشی!

ہر اگلا مرحلہ۔ پچھلے مرحلے سے جدائی کا تقاضا کرتا ہے۔ بچپن، جوانی، رشتے، صحت، عروج۔ سب کچھ چھوڑتے چھوڑتے۔ ہنسی خوشی۔ دنیا چھوڑ دینے کی صلاحیت موجود ہو تو یہ مظہر ہے اس عنصر کا، کہ طمع و حرص سے محفوظ ایک دل ہے جو درویش کا ہے!

کیونکہ بس درویشی ہی وہ ہنر ہے جو آبلہ پائی کے ان تمام مرحلوں سے گزرنے کا آسان نسخہ ہے!

احساس، خیال کو پنہائیاں عطا کرنے والا عنصر ہے۔ اور اس کا منبع۔ سمندر کی وسعت اور گہرائی سے مماثل۔ دل کا مقام ہے۔ ایک شفاف دل کا عطا ہونا۔ حصول لطف کا بے مثل ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ ہر لمحہ نیرنگئی خیال۔ بھی ایسی مہمیز ثابت ہوتی ہے کہ چار دن کی اس دنیا میں، کہ جس کو بے ثبات کہا جاتا ہے۔ کچھ لوگ سرشاری کے عالم میں۔ ایسی بھرپور زندگی گزار جاتے ہیں، جو نادر و کامیاب تو ہوتی ہے۔ قابل رشک و تقلید بھی ٹھہرتی ہے!

زیر نظر کتاب، صاحب کتاب کے ان اوصاف کو آپ سے متعارف کرواتی ہے اور کیا مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ یہ ایک مشکل مرحلہ ہے کہ صاحب کتاب کو پیش کیا جائے یا کتاب کو، کس طرح دونوں کو مربوط کیا جائے؟

خیر۔ چلتے ہیں دلچسپ سفرناموں کے مجموعے کی جانب۔ جہاں آپ کے لطف اور خیال کو بھی پنکھ عطا ہوتے ہیں!

"اب ہم پہاڑیوں سے باہر ایک میدان میں نکل آئے۔ یہ پہاڑیاں اب ایک سرخ خواب کی طرح ہمارے بائیں کو ڈھلتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ کھوہروں کی مملکت ختم ہو چکی تھی۔ ہم کپاس کے ایک کھیت کے پاس سے گزرے، جس کے حاشیے پر شان دار درخت ایک زمردیں قطار کی طرح صف باندھے کھڑے تھے۔ ڈوڈوں میں کپاس کے پھول سفید ہیروں کی طرح دمک رہے تھے۔ مجھے اس سے پہلے کبھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ کپاس کا کھیت بھی اتنا خوب صورت ہو سکتا ہے۔ مگر کپاس کا یہ کھیت تقریباً "پہلا منظر تھا، جس نے پہاڑوں کے منظر کی یکسانیت اور یک رنگی کو توڑا تھا۔ یہ میری آنکھوں کے سامنے اچانک باغ ارم کی طرح مہک اٹھا۔ اس کے تصور سے اب بھی میرا دل اچھلنے لگتا ہے۔"

"اگر آپ ابدیت کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو میں آپ کو ڈیہلو سے نوں کوٹ تک اونٹ پر سوار ہو کر رات کے وقت سفر کرنے کا مشورہ دوں گا۔ سورج غروب ہوتے ہی اس سفر میں ابدیت رچنے لگتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ سفر کہیں ختم نہیں ہو گا۔ ریت کے ٹیلے ایک دوسرے کے بعد، موت کی سی اٹل ناگزیریت کے ساتھ آتے ہیں۔ اور مسافر یوں محسوس کرتا ہے جیسے بقا کی اس بے پایانی میں اسے ان ٹیلوں سے قطعی کوئی مفر نہیں۔"

"اگر کوئی حیوان مشین سے کسی طرح مناسبت رکھ سکتا ہے تو وہ صرف اونٹ ہے۔ اس سے زیادہ مطمئن، بے اعتنا اور آسودہ خاطر اور کوئی جانور نہیں۔ اسے غور سے دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ اپنی خوراک میں بھی دلچسپی نہیں لے رہا۔ تاہم یہ ایک ناقابل تصور مقدار نگل جاتا ہے۔ ایک جگہ پر بلا دیر بیٹھے رہنا اس

کے جذبات پر (اگر اس کے کوئی جذبات ہوتے ہیں۔) ظاہری طور پر اتنا ہی کم اثر انداز ہوتا ہے جتنا سارا دن مسلسل چلتے رہنا۔ میرے خیال میں کسی اور حیوان میں اتنی قوت، برداشت اور لاابالی پن نہیں جتنا اونٹ میں' اور اگر اسے بزرگوں نے صحرا کے جہاز کا لقب دیا ہے تو وہ بالکل راستی پر تھے۔ بزرگ بھی کبھی کبھی سچی باتیں کہہ جاتے تھے میرے دوستو!"

یہ ذکر ہے، 1945ء میں تھر کے گاؤں ڈیپلو سے نوں کوٹ تک کے اس سفر کا جو اونٹ پر بیٹھ کر طے کیا گیا۔ صحرا کی چاندنی' رات کا حسن' ساربان کے نغمے' درختوں کے مہیب سائے میں ڈھلتی ہوئی تخیل کی وارداتیں۔ اور پھر صبح کے ظہور کا دل آویز بیان۔ صبح جس کے لیے "عناصر کی کروٹوں میں سے ایک ہی کروٹ مجھے، سب سے زیادہ اور خوب صورت" کی ترکیب استعمال ہوئی ہے۔

مسافر کی عمر اس وقت 25 سال تھی!

دوسرا سفر جو انہوں نے ایک ایسے شخص سے ملاقات کی خاطر کیا جو دور افتادہ علاقے میں محض اپنے محدود وسائل سے طلبا کی تعلیم کے لیے دن رات وقف کیے ہوئے تھا۔ یہ سفر' سائیکل پر طے ہوا۔ اور راستے میں چلنے والے تمام کردار' مناظر کا احوال کتنی آسانی اور روانی سے ہم تک پہنچتا ہے!

"یہ ایک وسیع رات تھی۔ محرم کی تیسری کا چاند ایک زرین درانتی کی طرح' تاریک مخملی آسمان میں معلق تھا۔ اس کی دھار کی زد میں ایک سفید چنچل ستارہ مسکرا رہا تھا۔ مولوی فقیر اللہ کا غریبانہ کوٹھا مسجد' ارد گرد طالب علموں کے حجرے' مدھم اور پر اسرار کھیتوں کی وسعت میں ایک نیلے جھٹپٹے کا لحاف اوڑھے خاموش پڑے تھے۔"

"یہ ریاستی دہقان عالم جس کا عربی فقہ اور حدیث کا مطالعہ وسیع تھا' جو مجسم طمانیت اور رضا تھا' جو فولاد کے مجسمے کی طرح ٹھوس اور دن کی طرح ایمان دار اور بے باک تھا۔ کھلی ہواؤں اور صالح خوراک کے بنے ہوئے مضبوط جثے والا یہ شخص' بردباری' تحمل' خوش اخلاقی اور مہمان نوازی کا پتلا۔ رسول عربی کا مذہب صرف ایسا ہی شخص دنیا میں پھیلا سکتا تھا۔ اس نے مذہب کی سچی روح اپنے اندر تحلیل کرلی تھی اور اس کا دمکتا ہوا چہرہ اس کی اندرونی روشنی کا پتا دیتا تھا۔ وہ ایک مذہبی جنونی نہ تھا۔ ان آدمیوں میں سے نہیں جو خدا کا چغہ پہن کر اپنے ہم نفسوں پر جج بن کر بیٹھتے ہیں اور ان کے لیے دائمی عذاب متعین کردیتے ہیں۔"

ہر سفر ایک مہم نہیں ہوسکتا۔ اس کو مہم بنانے کے عناصر' دریافت اور حصول طلب کی سچی لگن ہیں۔ سو' ہر سفر کے اختتام پر فہم وادراک کے نئے مہمان جہان ہمراہ ہوتے ہیں!

"مذہب میں جو حقیقی طور پر خوفناک اور شیطانی عنصر ہے' وہ جنون کا ہے اور میری نظر میں ایک مذہبی دیوانے سے بڑھ کر قابل نفرت اور گھناؤنا شخص اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ جنون آدمی کا سب سے ذلیل جبلی جذبہ ہے۔ یہ نفرت کی دیوی کو پیدا کرتا ہے۔ نفرت ہمیشہ تباہ کرتی ہے اور نفرت پر جو کچھ پلتا ہے' زندہ رہنے والا نہیں ہوتا۔"

یاد رہے کہ یہ نظریہ ہر مذہب کے حوالے سے مربوط ہے!

"ہمارے گائیڈ نے جو ایک نورانی وجود کے ہلکے قدموں سے چلتا جاتا تھا' ہماری ڈھارس بندھائی کہ جھیل اب زیادہ دور نہیں ہے۔ اس کے یقین دلانے کے باوجود یہ پہاڑ نہ ختم ہونے والا ثابت ہوا۔ راستہ اس کے ارد گرد ایک سانپ کی طرح سکڑتا' لپٹتا چلا گیا تھا۔ بعض جگہ یہ راستہ آدمی کے پاؤں کے سہارے سے بھی باغی ہوجاتا اور وہاں سے گزرنے کے لیے چٹانوں کی نوکوں اور کنکروں کو پکڑنا پڑتا۔ ایک خاص نم دار جگہ کا تصور کرکے مجھے اب بھی پسینہ چھوٹ جاتا ہے۔ یہاں راستہ یک لخت ختم ہوجاتا تھا اور تین چار فٹ خلا کے بعد یہ پھر شروع ہوجاتا تھا۔ خلا نیچے چٹانی کھائیوں سے کوئی پانچ سو فٹ بلندی پر ہوگا۔ پاؤں کی

ذرا سی چوک سے آدمی گر کر نیچے چٹانوں پر پاش پاش ہو سکتا تھا۔ ہم سب کے چہرے خوف سے سفید ہو گئے، مگر آخر الامر ہم ایک ایک کر کے چٹان کے سوراخوں میں پاؤں رکھتے دوسری طرف پہنچ گئے۔"

اپنے گہرے اور شفاف اور اک پر ابھرنے والے ہر عکس کو پڑھنے والے کے ذہن پر مرتسم کرنے کی صلاحیت "جزئیات نگاری" کہلاتی ہے اور ارد گرد موجود تمام عناصر کا مشاہدہ، قاری کو مربوط تسلسل سے جوڑے رکھتا ہے!

اس پیچ دار راستے پر چلتے ہوئے ہم پہاڑ کے ایک کونے پر آئے اور یہاں اچانک ہماری نظریں فطرت کے ایک بے مثال نظارے پر پڑیں اور ایک لمحے کے لیے ہمارے سانس رک گئے۔ ہم دم بخود ہو کر اس معجزے کو دیکھنے لگے۔

نیچے جنگلوں سے ڈھانپے ہوئے چٹانی نشیبوں اور بلندیوں کے درمیان ایک زریں دھند کے میدان میں سیف الملوک جھیل یاقوت ــــــ کی طرح جڑی ہوئی تھی۔ سفید برف کے تودے اس کی صاف سبز سطح پر تیر رہے تھے۔ ان میں سے چند اپنے خاص زاویے کی وجہ سے سورج کی روشنی میں خون سا چھلکا رہے تھے۔ جھیل کے مشرقی کونے سے کچھ دور ایک پُرشکوہ برف سے سفید پہاڑ اپنا مغرور سر اٹھائے کھڑا تھا۔ وہ تراشا ہوا بلور تھا۔ اور اسی لیے وہ اسے شیشہ پہاڑی کہتے ہیں۔ اس آسمانی منظر کو دیکھ کر ہماری سب تھکاوٹ گویا جادو کے اثر سے اتر گئی۔

یہ کاغانی مہم تھی جو 53ء میں سر کی گئی اور ہر مہم اپنے آغاز سے انجام تک کے ہر مرحلے، ہر پڑاؤ، ہر دریافت، ہر کردار، ہر منظر کی مجسم تصویر ہے۔ وہ سفری صعوبتیں ہوں یا سہولتوں کی عدم دستیابی، شہروں کے نام ہوں یا کھیت کھلیان۔ خانہ بدوش قافلے، سوتی اور ان کے چرواہے، چٹکی ہوئی چاندنی یا ڈوبتے ابھرتے سورج کے رنگوں کا بیان۔ ہم ان مناظر کو نئی حیرت اور خوشی کے ساتھ دیکھتے ہیں!

"کئی قسموں اور قوموں کے، مچھروں اور پسوؤں نے میرے بستر کو ایک تڑپا دینے والا دوزخ بنا دیا، لیکن وہاں کا ایک بدترین عذاب مکھیاں تھیں۔ مکھیاں وہاں ایسے اونچے مقام پر اور سرد موسم میں کیوں تھیں، یہ میں نہیں سمجھ سکتا۔ بہرحال، وہ وہاں موجود تھیں اور جھنڈوں میں بھنبھناتی ہوئی یلغار کرتی ہوئی نتھنوں اور کانوں میں گھسی پڑتی تھیں، کمبل کے نیچے آکر قمیص کے گلے یا آستین میں سے، انسانی جلد تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈتی تھیں، ایک گھنٹے تک یہ سزا بھگتنے کے بعد میں نے سونے کی خواہش کو خیرباد کہہ دیا اور پائپ سلگا کر ہوٹل سے باہر آگیا۔"

"ہم ایک سیلون میں جا گھسے۔ یہ ایک بے انتہا غلیظ اور تاریک جگہ تھی۔ حجام صورت سے ایک قاتل معلوم ہوتا تھا، مگر ایک بار اندر جا کر پلٹنا ناممکن تھا۔ میں نے ایک بالکل کند استرے سے حجامت کرائی۔"

جانیے سفر کے بارے میں ان کی رائے۔

"اگر ایک شخص میں خانہ بدوشی اور سفر کا اصل جذبہ نہیں، اگر وہ چیزوں اور اپنے ہم جنسوں کو ایک شاعر کی روح سے دیکھنے سے قاصر، تو ایسے آدمی کے لیے بہتر ہے کہ وہ سفر نہ کرے۔ ایسے آدمی کے لیے سفر میں نفع نہیں۔"

"اپنے سفر کے اختتام پر ہم نہ صرف جسمانی طور پر زیادہ صحت مند تھے۔ بلکہ ہر طریق سے پہلے سے زیادہ سیانے اور زیادہ بہتر آدمی تھے۔ سواتی مہم نے ہماری رگوں میں گردش کرتے ہوئے خون کو نیا کر دیا تھا، ہمارے دماغ پر جمے ہوئے میل کو دھو ڈالا تھا، اور اسے خوب صورت یادوں کا خزانہ دے کر بے اندازہ اسیر کر دیا تھا۔"

چلیے ریل کے سفر پر

"یہ مسافر گاڑی شاید دنیا بھر کی گاڑیوں میں سب سے آہستہ رفتار تھی۔ یہ زریں سہ پہر میں چمک چھکاتی اس کاہلی اور آلکسی سے چل رہی تھی، جیسے اسے کسی خاص منزل پر نہ جانا ہو، بلکہ بس یونہی مٹر

گشت کرنے نکلی ہو۔ مگر اسے ملکوال تک ہی تو جانا تھا' جلدی کی ضرورت ہی کیا تھی؟؟"

"ترائی ایک مستقل دلچسپیوں کی تصویروں کا البم تھی۔ ابھی تمہارے سامنے ایک اونچی گھاس اور سبزے کی چراگاہ ہوتی' دوسرے لمحے ایک سیاہ آب و گیاہ چٹیل میدان تمہارے سامنے آجاتا اور اس کی ویرانی تمہارے خون کو برف کردیتی۔"

قاری کو مخاطب کرنے والی تحریر میں انسیت کا اولین احساس دھیرے دھیرے پختہ اور گہرا ہوتا جاتا ہے اور پڑھنے والا خود کو ہر لمحے میں صاحب تحریر کے ساتھ محسوس کرنے کا لطف اٹھاتا ہے۔

"اے میرے قاری! یقیناً کسی دن تم اور میں اسی طرح اکٹھے اس سڑک پر ساتا کونڈی جائیں گے' کیونکہ ایک ایسے نام والی جگہ کو دیکھے بغیر آدمی زندہ ہی کیسے رہ سکتا ہے!"

منو۔ کتابوں سے وارفتگی کے عالم کی ایک کیفیت "مجھے کتابوں سے محبت ہے۔ پرانی' قدیم مڑے ہوئے کونوں والے ورقوں' انگوٹھوں سے میلے صفحوں والی کتابوں سے خصوصی دنیا میں کوئی خوشبو مجھے اس خوشبو سے زیادہ پسند نہیں جو بوسیدہ نسخوں' ان کی قدیم جلدوں اور زرد پائے ہوئے اوراق سے آتی ہے۔"

خالد صاحب کے ذوق مطالعہ نے ان کے تخیل پر ہمیشہ قائم رہنے والے اثرات مرتب کیے۔ انگریزی' اردو دونوں میدانوں کی شناوری نے ان کے اسلوب بیان پر ایک منفرد لہجہ عطا کیا' جو فطری روانی کے جمال اور اثر آفرینی سے بھرپور ہے۔ دوران سفر اپنے شناسا کرداروں سے تشبیہات آپ پر ان کے ذوق مطالعہ کا راز کھولتی ہیں۔

کتاب کے تعارفی الفاظ' قاری کو پیش آنے والے ذہنی ارتقاء کے مرحلے کے لیے جلا بخش رہنمائی فراہم کرتے ہیں اور اپنے ہنر کی مشاقی کے مظہر بھی۔

"زیر نظر جلد میں شامل آخری تین سفرناموں کو چھوڑ کر باقی تمام سفر اندرون ملک مقامات کے ہیں' جس سے محمد خالد اختر کے رویے کا بنیادی عنصر ظاہر ہوتا ہے جس کی رو سے اصل اہمیت اس مقام کی نہیں ہے' جس کا سفر اختیار کیا گیا ہے بلکہ سفر کے ازلی انسانی تجربے کی ہے۔"

"پڑھنے والے کو مسحور کرنے والی بات ان انسانی کرداروں کی رنگا رنگی ہے' جو اپنی مخصوص صورت حال سے دوچار انسانوں پر مشتمل زندگی کا میلہ ہی ہے جس سے محمد خالد اختر کا سفری تجربہ عبادت ہے۔"

چلیے دیکھتے ہیں اپنے کچھ شہر۔ جو ہمارے ہیں' لیکن ہمارے پاس ان کو دیکھنے کی فرصت اس طرح سے نہیں!

"ہم اب لاہور کے نزدیک تھے۔ اندھیری مخملی رات میں پیلی' نیلی اور سرخ روشنیاں بکھر رہی تھیں۔ ہمارے دلوں نے وہ لذیذ دھڑکن محسوس کی جو لاہور میں وارد ہونے والے ہر سچے مسافر کو محسوس ہوتی ہے۔ تم خواہ پہلی بار لاہور کے نزدیک آؤ' خواہ تیسویں بار' یہ عجیب روح کی اٹھان' یہ پراشتیاق دھڑکن تمہیں ضرور محسوس ہوگی۔ لاہور ایک ایسی کافر محبوبہ ہے' لاتعداد دلربائیوں اور عشوہ طرازیوں کی حامل کہ اس کے چاہنے والے اس کے لیے ہمیشہ تڑپتے رہتے ہیں۔

ہم راوی پر سے گزر کر شیخوپورہ جانے والی سڑک پر مڑے تو سورج نکل آیا۔ ہمارے گرد کی وسیع کھیتوں اور سبزے کی دنیا دمک اٹھی۔ ہمارے دل گانے لگے۔ ہوا میں بہار کا سانس تھا۔ فصلیں کٹ چکی تھیں اور کٹے ہوئے کھیت پیلے سونے کے سے تھے۔"

"خوشاب ایک چھوٹا سا خوب صورت شہر ہے۔ یہاں تم گویا ہیبت کی عنابی پہاڑیوں کے سائے میں آجاتے ہو اور اچانک ان کی موجودگی سے آگاہ ہوجاتے ہو۔ ہمارا احمد ندیم قاسمی بھی تو ان ہی پہاڑوں کا رہنے والا ہے۔ ابھی کیورس نے مجھے بتایا کہ یہ پہاڑ نمک کا پہاڑ ہے یہ نمک کا ہو سکتا ہے۔ مگر یہ تو گلاب اور عنبر

کے رنگ کا ہے۔ یہ ایک مستقل طور پر جھانکتا ہوا پہاڑ ہے اور خوشاب کے بازاروں اور کوچوں کو ایک زندہ' شفیق دوست کی مانند دیکھتا رہتا ہے۔"

دیکھیے ایک جگہ رکنے کا منظر۔

"ہم نے چائے کی ایک چھوٹی دکان میں میٹھی چائے اور مکھن لگے بری بنوں کا ناشتا کیا۔ ان چھوٹی چائے کی دکانوں میں جو ساری رات کھلی رہتی ہیں' مجھے ـــ بڑا رومانٹک ماحول نظر آتا ہے۔ ان کی کمزوری لمبی میزیں' ٹین کی کرسیاں' نیلی پام چینی کی چائے دانیاں۔ میں ان سب سے محبت کرتا ہوں اور ان لوگوں سے بھی جو وہاں آتے ہیں۔ یہاں ہمیشہ ایک رفاقت کی خوشبو ہوتی ہے اور تم وہاں زندگی کی گہما گہمی کا مزا دیکھتے ہو۔"

مسخرا اڑائے بغیر مزاح پیدا کرنا فطری خوش طبعی کی بدولت ہے اور صورت حال کے مطابق فطری ہیت کذائی سے مزاح کا عنصر ڈھونڈ لینا قدرتی رفاقت کا مظہر۔

"رش کی حالت دیکھ کر ہمارا جی بیٹھ گیا' مگر قلیوں نے ہماری ہمت بندھائی۔ انہوں نے پہلے تو جوں توں کر کے بند دروازے کی کھڑکی سے ہمارا سامان اندر پھینکا اور پھر سامان کے بعد ہماری باری آگئی اور قلیوں نے ہمیں باری باری اٹھا کر دروازے سے اندر ٹھونس دیا۔ کافی عرصے تک ہمیں پتا نہ لگ سکا کہ ہم کون سے ہیں اور ہمارا اسباب کون سا۔ آدمی آدمی پر چڑھا بیٹھا تھا۔ بعض لوگ دوسرے لوگوں کی گود میں بیٹھے تھے۔ بعض اسباب کے اوپر اٹکے ہوئے تھے اور میں نے کم از کم ایک ایسا مسافر بھی دیکھا جس کے اوپر اسباب بیٹھا ہوا تھا۔"

"ترائی کے میدانوں اور پیلی پہاڑیوں پر رات پڑ گئی تھی۔ کھیتوں دور نیلی پیلی روشنیوں کا انبوہ تھا۔ آٹھ بجے گاڑی ملکوال جنکشن میں داخل ہو گئی۔"

وادیِ سوات کا محل دیکھیے۔

"ہمارے سامنے زمردیں گھاس کے قطعے کے حاشیے پر سنگ مرمر کے چبوترے پر ایک چھوٹا سفید محل ایستادہ تھا۔ اس ننھے محل میں پھول کی ایک پتی کی سی نزاکت تھی۔ ایک غیر مرئی صفت۔ یہ پریوں کا محل تھا۔ پریاں اس وقت کہیں گئی ہوئی تھیں اور محل سونا تھا۔

آخری تین سفرنامے ترکی' یونان اور قونیہ کی مہمات کی داستانیں ہیں' جو انہوں نے 72 سال کی عمر میں اسی ولولے اور گرم جوشی سے طے کیں۔ جو صرف ایک خاص مبہم جو کا خاصا ہوتی ہیں!

"دونوں کے پیچھے یہ ستر برس کا بوڑھا' نیم جاں بوڑھا' لمبے لمبے ڈگ بھرتا' اپنے آپ کو پینتیس برس کا جوان سمجھتا۔"

تیز رفتاری سے بدلتی اردگرد کی دنیا میں' ترکی سے اب پاکستانی تھوڑا بہت مانوس ہیں۔ لیکن یہ روداد 91ء کے سفر کی ہے اور اپنے آپ میں ترکی کی دلکش داستان ہے!

ترکی کا سفرنامہ انہوں نے مکتوب غالب کے انداز میں لکھا ہے جو زبان و بیان کا خوب صورت نمونہ ہے۔

"ہاں صاحب' تمہارے استنبول کو تین مسافروں نے خوب چھانا پھٹکا' حق سیاحت ادا کیا کہ مارکوپولو بھی سنے تو خجل ہو' نادم ہو۔"

بس' ٹرین' جہاز' فیری پکڑنے اور چھوٹنے کے دلچسپ قصے' یونانی جزیروں کے خوب صورت مناظر' جہاز کے عرشے سے سمندر میں ڈوبتے سورج کے رنگ' رہائش اور سیاحت کے لطف' انگیز بیان آپ کے تخیل کو اڑتا ہوا قالین بنا دیتے ہیں۔

درویش کی ایک خوبی دینے کی صفت ہوتی ہے۔ اس کے پاس جو موجود ہو وہ اسے دینے میں ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیتا۔ اس درویش کے پاس دینے کے لیے اپنے ذہنی' قلبی و روحانی تجربات کا جوہر اور لطف تھا۔ سو اس نے کمال فیاضی سے دیا۔ ایک سچے مہم جو کی رفاقت کا لطف' اس کے لطف اٹھانے کی صلاحیت سے لطف اٹھانے کا لطف۔ اگر آپ بھی جستجو رکھتے

ڈرامہ سیریل آپ کی کنیز کی کنیز

یمنیٰ زیدی سے ملاقات

شاہین رشید

یمنیٰ زیدی ناظرین کے لیے اب نیا نام نہیں ہے کیونکہ اس نے اپنی بہترین پرفارمنس سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا ہے۔ آپ کی کنیز میں اس کا بہترین کردار ہے "ایک ڈری سہمی گاؤں کی لڑکی ایک بڑے گھر میں بیاہی جاتی ہے اور اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے" اس کی بہترین ترجمانی اس فنکارہ نے کی ہے۔ آج کل کیا آن ایر ہے" کیا کچھ آنے والا ہے اور کیا کچھ کرنا ہے یہ جاننے کے لیے یمنیٰ سے ایک گفتگو۔

"ہیلو کیسی ہو۔۔ ماشاءاللہ بہت اچھی پرفارم ہو؟"

"جی اللہ کا شکر ہے بہت شکریہ پسند کرنے کا۔"

"کیا مصروفیات ہیں۔۔۔ کیا آن ایر ہے اور کیا انڈر پروڈکشن ہے؟"

"ماشاءاللہ سے مصروفیات بہت زیادہ ہیں آپ کی دعاؤں سے۔۔ آج کل "جیو" سے "آپ کی کنیز" آن ایر ہے اور پی ٹی وی سے "کس سے کہوں" جبکہ آنے والے سیریلز میں "جگنو" فاروق رند کی ڈائریکشن ہے۔ بہت ہی ہلکا پھلکا لائٹ کامیڈی کردار ہے میرا۔ "پارس" کے نام سے جیو سے ہوگا اسے عامر یوسف نے ڈائریکٹ کیا ہے اے اینڈ بی کی پروڈکشن ہے اور جگنو کے بارے میں مزید بتاؤں کہ اسے "آمنہ مفتی" نے لکھا ہے۔"

"اپنے لیے کردار کا انتخاب کرنا مشکل ہے یا آسان ۔۔۔ اور 2014ء آپ کا کیسا گزرا؟"

"جو آپ نے پوچھا کہ انتخاب کرنا مشکل ہے یا آسان تو میں سمجھتی ہوں کہ کردار کا انتخاب کرنا بہت مشکل ہے۔ پتا نہیں چلتا کہ کون سا بہتر ہے اور کون سا نہیں ۔۔۔ اور 2014 تو بہت ہی اچھا گزرا کام کے حوالے سے بھی اور ویسے بھی اور آپ کو یہ بھی بتانا چاہوں گی کہ مجھے "انیس بزمی" جو کہ بالی ووڈ کی پروڈکشن کمپنی ہے انہوں نے ایک فیچر فلم کے لیے مجھ سے رابطہ کیا اور لیڈ رول کی پیشکش کی۔ لیکن میں نے انکار کر دیا" کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ اگر بہت ہی آؤٹ اسٹینڈنگ کام ہو تو آپ کریں ورنہ نہ کریں۔

دوسرے ملک میں جا کر عام سے کردار کرنے کی میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مگر پھر بھی انڈیا سے فلم کی آفر آنا ہی میرے لیے بہت اچھی بات تھی اور خوشی اس بات کی ہوئی کہ ہمارا کام دوسرے ملکوں میں بھی دیکھا جا رہا ہے اور پسند کیا جا رہا ہے۔"

"بالکل... آنے والے سیریلز میں کردار کس قسم کے ہیں پوزیٹو یا نیگیٹو۔ آپ کے زیادہ تر کردار تو پوزیٹو ہی ہوتے ہیں۔ اور کس قسم کے رول پسند ہیں؟"

"میں نے پوزیٹو اور نیگیٹو دونوں ہی طرح کے کردار کیے ہیں۔ رشتے کچھ ادھورے سے میں میرا تھوڑا نیگیٹو رول تھا۔ اور آنے والے سیریلز میں سب میں پوزیٹو رول ہیں یا پھر لائیٹ کامیڈی رول ہیں... میں چاہتی ہوں کہ بہت ہی اسٹرونگ قسم کے کردار کروں جن میں صداقت ہو اور لوگوں کو پتا چلے کہ ہماری پاکستانی لڑکی کتنی اسٹرونگ ہوتی ہے' مردوں کے قدم سے قدم ملا کر چلتی ہے اور اپنے گھر کے لیے کتنی قربانیاں دیتی ہے۔ بس جس میں پرفارمنس ہو وہ کرنا چاہوں گی۔"

"آپ کا کنیز' میں ایک سین میں آپ کو کتوں کے آگے ڈالا جاتا ہے۔ اور ڈرایا جاتا ہے۔ یہ کتنا حقیقی تھا؟"

"اس ڈرامے میں کتوں والا سین انتہائی خوفناک تھا۔ اور وہ سین کئی دنوں سے ملتوی ہو رہا تھا کیونکہ ڈائریکٹر کو بھیانک قسم کے کتے نہیں مل رہے تھے۔ اور جب ملے اور مجھے دکھائے گئے تو میں نے تو سین کروانے سے منع کر دیا۔ اور بہت مشکل سے ڈائریکٹر نے مجھے کنوینس کیا۔ کیونکہ ایسے خوفناک کتوں کے آگے کھڑے ہونا ہی بہت ہمت کی بات ہے اور اگر آپ چیخیں گے تو وہ تو آپ کی طرف لپکیں گے ہی نا... اور میں جب کتوں کے سامنے جاتی تو بھاگ کر واپس آجاتی' دو تین بار ایسا ہوا۔ تو مجھے خود احساس ہوا کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اور پھر ڈائریکٹر نے بھی کہا کہ آپ سیریس ہو جائیں... میں نے دیکھا کہ جو کتوں کی رسی تو پکڑ کر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے بھی ہاتھ تھک گئے تھے...

بہر حال سین کروانے سے پہلے میں سچ مچ بہت روئی' بے شک مجھے ایکٹنگ کا شوق ہے۔ مگر یہ کام تو انتہائی مشکل تھا اور یہ سوچ کر بہت خوفزدہ ہو رہی تھی کہ اگر خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو... خیر میں نے بہت سی دعائیں مانگیں اور اپنے آپ کو اس سین کے لیے تیار کیا اور بڑی بہادری سے وہ سین کروایا اور پھر ڈائریکٹر سے کہا کہ آپ دیکھ لیں کہ میں نے کیسا کیا' اگر ٹھیک نہ لگے تو میں دوبارہ کروانے کے لیے تیار ہوں' پتا نہیں اتنی ہمت مجھ میں کہاں سے آگئی تھی۔ لیکن میں سچ بتاؤں ... اس سیریل میں میں نے بہت محنت کی ہے۔ یوں سمجھیے کہ میں نے خون پسینہ ایک کر دیا۔ گاؤں کے سین' برائیڈل ڈریس میں بھاگنا کھیتوں میں رسی بندھی ہوئی... مگر جب سیریل آن ایر آتا ہے اور لوگ اندرون ملک اور بیرون ملک پسند کرتے ہیں۔ ہماری تعریف کرتے ہیں' جب کینیڈا' آسٹریلیا' پیرس' امریکہ برطانیہ سے آپ کے لیے فون آتے ہیں تو یقین کریں کہ محنت کا صلہ وصول ہو جاتا ہے اور ڈھیروں خون بڑھ جاتا ہے۔"

"واقعی... اور اس میں شک نہیں کہ آپ کی اداکاری میں دن بہ دن نکھار آتا جا رہا ہے۔ اس فیلڈ میں آنے کا خیال کیسے آیا؟"

"بس اتفاق ہے۔ ہوا یہ کہ میری بہن این سی اے میں پڑھتی تھیں۔ اور کالج میں میڈیا سے تعلق رکھنے والے لوگ اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ تو بڑی بہن کے ایک کولیگ نے بتایا کہ لاہور میں ایک ڈرامہ بن رہا ہے اور اس کے ڈائریکٹر کو نئے چہروں کی ضرورت ہے تو میں نے ایسے ہی شوق شوق میں تھوڑا کام کر لیا... تو جب انہوں نے دوبارہ اپنے نئے سیریل کا آغاز کیا تو پھر مجھ سے رابطہ قائم کیا... اور میں نے ہاں کر دی۔ وہ ڈرامہ سیریل "تھکن" تھا اور اس میں میرا کردار اچھا خاصا اسٹرانگ تھا، جسے لوگوں نے بہت پسند کیا۔ اس کردار میں میری پرفارمنس دیکھ کر کراچی کے معروف ڈائریکٹر محسن مرزا نے مجھے کال کی اور ڈرامہ سیریل "خوشی ایک روگ" کے لیے مجھے لیڈ رول آفر کیا۔ اور

آپ کو تو پتا ہی ہے کہ یہ سیریل کتنا ہٹ گیا تھا اور آپ نے بھی اس سیریل کو دیکھ کر مجھے فون کیا تھا۔"

"بالکل مجھے یاد ہے۔ اور آپ کا سیریل تھکن بھی یاد ہے جس میں آپ کا نیگیٹو رول تھا۔ اس کے بعد نیگیٹو رول کی ہی پیشکش ہوئی ہو گی؟"

"میرا لک کہ ایسا نہیں ہوا؟ جبکہ میں بھی یہی سمجھ رہی تھی کہ اب مجھے ایسے ہی رول ملیں گے مگر مجھے "خوشی ایک روگ" میں بہت ہی معصوم اور دکھی لڑکی کا رول ملا۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ اس سیریل نے بلکہ میرے اس رول نے مجھے بہت زیادہ شہرت دی اور پھر تو آفرز نہ ختم ہونے کا ایک سلسلہ چل پڑا اور الحمد للہ کہ آج میں اس فیلڈ میں کافی کامیاب جا رہی ہوں۔"

"ماشاء اللہ... تعریف نے مغرور کیا؟... اور کسی نے تنقید بھی کی؟"

"اللہ نہ کرے کہ میں کبھی مغرور ہوں، میں تو اپنے رب کا ہر دم شکر ادا کرتی رہتی ہوں... اور ایسا نہیں ہے کہ لوگ صرف تعریف ہی کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے اور یہ تو ہمارے کام کا حصہ ہے۔ ہر کوئی پرفیکٹ نہیں ہوتا اور کوئی ہمیں بتائے گا تو ہم پرفیکٹ ہوں گے۔ خود سے تو نہیں ہو سکتے نا... تنقید سے تو بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔"

"شہرت، دولت، عزت، کیسی لگتی ہے یہ دنیا؟ برائیاں زیادہ ہیں یا اچھائیاں؟"

"سچ پوچھیں تو مجھے تو اس میں زیادہ اچھائیاں ہی نظر آتی ہیں۔ مجھے اس فیلڈ میں آئے ہوئے کوئی بہت لمبا چوڑا زمانہ نہیں ہوا۔ مگر آپ دیکھیں کہ کم عرصے میں میں نے کافی اچھے سیریلز کیے ہیں اور کافی اچھے سیریلز انڈر پروڈکشن ہیں۔"

"کامیابی کا کیا گر ہے؟"

"بس یہی کہ اپنی حدود، اپنی روایات، بڑوں کا عزت و احترام کرتے رہیں۔ سب آپ کے نزدیک آئیں گے۔ اصل میں اچھی تعلیم و تربیت بھی اس فیلڈ میں بہت کاؤنٹ کرتی ہے۔ آپ کا کردار آپ کا بی ہیویر

اچھا ہونا چاہیے، برائی اور اچھائی کی طرف انسان دوسروں کو خود راغب کرتا ہے۔ اتنے مضبوط کردار کے ہو جائیے کہ کوئی آپ کو میلی آنکھ سے نہ دیکھ سکے۔ بس پھر آپ کامیاب ہیں۔"

"یمنیٰ! آپ نے کہا کہ اداکاری ایک مشکل کام ہے تو کبھی اس فیلڈ میں آکر پچھتاوا ہوا؟"

"ارے نہیں، بالکل بھی نہیں... سیدھی سادی اداکاری تو سب ہی کر لیتے ہیں، مگر مزہ تو مشکل کام میں ہے... بس مجھے "آپ کی کنیز" میں کتوں والے سین میں مشکل ہوئی تھی، مگر جب میں نے سوچا کہ کتوں کو تو پکڑا ہوا ہے اور مجھے کوئی نقصان نہیں ہو سکتا تو میں نے بآسانی اس سین کو کر لیا۔ مجھے یاد ہے کہ ڈرامہ سیریل "تھکن" میں مجھے سچ مچ مار پڑتی تھی مگر میں نہیں گھبرائی تھی۔ "خوشی ایک روگ" اور "میری ہلاری" میں رونے کے سین حقیقی ہوتے تھے۔ میں سچ مچ روتی تھی۔ میں تو ہر کردار کو اپنے اوپر طاری کر کے کرتی ہوں

تاکہ حقیقت کا رنگ آئے۔"

"اصل زندگی میں اس کا اثر ہوتا ہے؟"

"بہت ہوتا ہے۔ گھر والے ناراض بھی ہوتے ہیں۔ چڑچڑے رول کر کے مزاج بھی چڑچڑا ہو جاتا ہے۔۔۔ امی کہتی ہیں کہ ایسے رول مت لیا کرو گھر میں بھی ایسی ہی رہتی ہو۔۔۔ اب تھوڑے لائٹ کامیڈی رول کروں گی تو اس کا بھی مزاج پر اثر پڑے گا' پھر میرے خیال سے گھر والے خوش ہو جائیں گے۔"

"فیلڈ کے بارے میں تو بہت باتیں ہو گئیں۔۔۔ اب کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

"جی ضرور۔ میرا نام یمنیٰ زیدی ہے۔ جس کا مطلب لکی (Lucky) اور بلیس (Bless) ہے اور میرے نام کا اثر میری شخصیت پر بھی ہے اور واقعی میں ہر لحاظ سے لکی ہوں۔ شکر الحمد للہ۔ میں 3 جولائی 1989ء کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ والدہ ہاؤس وائف ہیں جبکہ والد زمین دار ہیں اور چونکہ وہ اپنا زیادہ وقت زمینوں پہ گزارتے تھے تو امی نے ہماری تربیت کی۔ ہمارے گاؤں کا نام "عارف والا" ہے اور پڑھائی کے لیے ہم سب لاہور میں شفٹ ہوئے۔۔۔ ہم تین بہنیں اور ایک بھائی ہے اور میرا نمبر تیسرا ہے۔"

"بہن اور بھائی بھی ہیں اس فیلڈ میں؟"

"نہیں جی۔۔۔ کسی کو شوق ہی نہیں ہے' حالانکہ میری بہنیں بہت پیاری ہیں۔ بڑی بہن کو تو آفرز بھی آ چکی ہیں مگر ان کا رجحان ہی نہیں ہے اس طرف۔ اور ہاں یہ بھی بتادوں کہ ہم اردو اسپیکنگ ہیں۔ مگر ہماری تعلیم و تربیت پنجاب میں ہوئی اس لیے لگ بھی ویسا ہی آ گیا۔"

"تعلیم مکمل ہو گئی تمہاری؟"

"جی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرا ماسٹرز مکمل ہو چکا ہے اور اس سال میری کانووکیشن ہے اور انٹیریر ڈیزائننگ میں میں نے ماسٹرز کیا ہے اور مجھے پڑھائی سے بہت لگاؤ ہے۔ میں نے اپنی مصروفیات کو اپنی پڑھائی پہ حاوی نہیں ہونے دیا۔"

"شادی نہیں کرنی کیا؟"

"بالکل کرنی ہے اور امی کی تو بس یہی خواہش ہے کہ یمنیٰ کی شادی جلدی سے ہو جائے۔ کوئی اچھا سا لڑکا یمنیٰ کو پسند آ جائے۔ جبکہ میں چاہتی ہوں کہ میری زندگی اچھی گزرتی رہی اور اللہ ہمیشہ میرے حق میں بہتر کرے۔ اور میں یہ بات بڑے فخر سے کہوں گی کہ میں نے زندگی میں جو چاہا وہ حاصل کیا۔ اللہ مجھ پر ہمیشہ سے ہی بہت مہربان ہے۔"

"مزاج کی کیسی رہیں؟"

"ملا جلا رجحان ہے۔ غصہ بھی آتا ہے اور ہنس مکھ بھی ہوں۔ غصے کا اظہار بول کر کرتی ہوں اور جہاں نہیں بول سکتی' اپنے آپ کو بے بس سمجھتی ہوں' وہاں مجھے پھر رونا آ جاتا ہے۔"

"غصہ کن باتوں پر آتا ہے؟"

"مخصوص نہیں ہے کہ یہ بات ہو گی تو غصہ آئے گا۔ یہ نیچرل عمل ہے۔ کوئی بھی بات دل کو لگ جائے۔ تو دکھ بھی ہوتا ہے اور غصہ بھی آتا ہے۔ اور ایک بات پر تو ہمیشہ غصہ آتا ہے' جب میں دیے ہوئے ٹائم پر پہنچ جاتی ہوں تو پھر کوئی دوسرا ٹائم پر کیوں نہیں

آتا۔ بس ایک خامی ہے مجھ میں کہ میں اپنے کام میں بہت زیادہ پرفیکشنسٹ ہوں۔"

"شہرت نے کبھی پریشان کیا؟"

"شہرت اور پریشانی؟... بالکل بھی نہیں... شکر ہے کہ میری پہچان ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے ہے۔ ورنہ پہچان تو برے کاموں سے بھی ہوتی ہے۔ جب لوگ ہمیں پہچان کر ہمارے پاس آتے ہیں تو آپ سوچ بھی نہیں سکتیں کہ مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے اور میں اپنے رب کا کتنا شکر ادا کرتی ہوں۔"

"فارغ وقت ملتا ہے تو کیا کرتی ہیں؟"

"اب تو فارغ وقت بہت ہی کم ملتا ہے... مگر آپ یہ سن کر یقیناً" حیران ہوں گی کہ مجھے ڈرائنگ کا بھی شوق ہے اور میں شاعری بھی کرتی ہوں۔ مگر میری شاعری میری ڈائری اور مجھ تک ہی ہوتی ہے۔ ڈرتی ہوں کہ پتا نہیں کسی کو پسند آئے گی یا نہیں۔ کہانیاں لکھنے کا بھی شوق ہے۔"

"تو اصلاح کروالیا کرو... اور اپنے سارے شوق اداکاری کی نذر نہ کردینا؟"

"اصلاح... وہ تو امی کردیتی ہیں۔ کیونکہ میری امی "شبانہ زیدی" خود بہت اچھی شاعرہ ہیں... اور ایسا نہیں ہوگا کہ سب کچھ اداکاری کی نظر ہوجائے۔"

"اور گھرداری؟"

"میں ہوم اکنامکس کالج کی تعلیم یافتہ ہوں۔ اندازہ لگائیں کہ گھرداری میں کیسی ہوں گی، مجھے بہت شوق ہے گھرداری کا... گھر کو صاف ستھرا رکھنا اچھا پکانا اچھا کھانا... سب کچھ آتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ لڑکی کو سب کچھ آنا چاہیے اور..."

"تاکہ پرائے گھر جاکر مشکل نہ ہو؟"

قہقہہ... "امی بھی یہی کہتی ہیں... اور ٹھیک کہتی ہیں وہ بھی تو ایک طرح سے جاب ہوتی ہے اور بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔"

"گھر میں سب سے زیادہ پیار کس سے ملا؟"

"سب سے... میں جب اس فیلڈ میں آئی تو مجھے ایسا لگا کہ میرے والد جو کہ غصے کے کافی تیز ہیں، ناراض ہوں گے، مگر ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے بھی مجھے بہت سپورٹ کیا۔ اور بچوں کو کسی معاملے میں سپورٹ کرنا ماں باپ کے پیار کا اظہار ہوتا ہے۔ اور میری دادی جان جن کا انتقال ہوچکا ہے۔ میرے کام کو بہت پسند کرتی تھیں اور بہت تعریف کرتی تھیں... اور ہاں مزے کی بات بتاؤں کہ صرف میری نانی اس بات کے خلاف تھیں کہ میں اس فیلڈ میں آؤں... یہ بھی ان کا پیار ہی تھا۔ خیر سچ میں مجھے اپنے گھروالوں سے بہت پیار ملا اور مل رہا ہے۔"

"اور جناب کرکٹ ورلڈ کپ شروع ہونے والا ہے فروری میں... لگاؤ ہے کرکٹ سے؟"

"بالکل ہے جی... اور جب اپنے میچ ہوں تو دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔ مگر جب ہم ہارتے ہیں تو پھر ساری امیدیں خاک میں مل جاتی ہیں اور بہت افسوس ہوتا ہے۔ تو اپنی ٹیم کو کہنا چاہوں گی کہ پلیز جم کر کھیلیے گا اور سب کی امیدوں پر پورا اتریے گا اور صرف اور صرف پاکستان کو نظر میں رکھ کر کھیلیے گا۔"

"اور کچھ کہنا چاہیں گی؟"

"جی... میں بس اپنے لیے یہ دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ مجھے توفیق دے کہ میں دوسروں کے کام آؤں اور میرے اردگرد جو لوگ ہیں ان کے دل کبھی بھی میری وجہ سے نہ ٹوٹیں اور نہ ہی وہ دکھی ہوں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے یمنیٰ زیدی سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں وقت دیا۔

شادی مبارک ہو

مہا جاوید اور شایان احمد

آسیہ رزاقی

بارے مہا کی مایوں کی رسم 19 دسمبر کو ہو گئی۔ بڑی تیاری تھی۔ ابٹن، ہنڈیاں، پیلے کپڑے۔ ایک خاص ماحول۔ مجھے تو شادی کی رسموں میں یہ رسم بہت پسند ہے۔ شادی کا آغاز۔ روٹھے ہوؤں کو منانا آسان، کہ چپکے سے ابٹن پیچھے سے آکر لگا دیا۔ ادھر سے بھی ہنستے ہوئے یہی کارروائی کی گئی۔

ساری لڑائی یا اختلاف ابٹن نے مٹا دیا۔ البتہ چہرہ بھی رنگ گیا تو کوئی بات نہیں۔ دوستی کی بنیاد مضبوط ہونی چاہیے۔ ہاں کبھی کبھی منے منائے لوگ بگڑ جاتے ہیں کہ بھئی اتنی محنت سے کیا ہوا میک اپ خراب بلکہ ستیاناس کر دیا۔

"کون ہینڈو تھا جس نے ابٹن ایجاد کیا۔ لو جی! ناک کان میں بھی ابٹن بھر گیا۔" یہ بھی ہوتا ہے۔

"ارے بدتمیزی ہے۔ لو بھلا دوسروں کے گھر میں واش روم میں جا کر منہ دھوؤ اور مجھے تو ابٹن کی مہک ہی بری لگتی ہے۔" (تو منہ نہ دھوؤ۔ ٹشو سے صاف کر لو بھئی۔)

مایوں کا چھوٹا سا فنکشن مہا کے چھوٹے چچا تنویر کے گھر پر تھا۔ انہوں نے لان میں پیلا شامیانہ لگا کر پھولوں اور لائٹوں سے سجایا تھا۔ گھر کے ہی قریبی عزیز تھے۔ یعنی مہا کے چچا، چچیاں، **پھوپھیاں**، کزنز اور ہم جیسے غریب الوطن لاہور اور ایبٹ آباد کی سردی کھا کر کراچی کے متوازن موسم کا لطف لے رہے تھے۔

مہا۔ ہماری بھانجی نمبر چار۔ اعلا تعلیم یافتہ بہترین فوٹو گرافر۔ کسی اعلا درجے کی ماڈل سے بڑھ کر سڈول اور دراز قد۔ مجھے کراچی آئے ایک مہینہ ہو گیا ہے۔ آ

کر پہلے مہا کا سوئٹر بنایا۔ دولہا کے لیے لاہور میں بلکہ ایبٹ آباد میں ہی بنا لیا تھا۔۔۔ پھر مونگ کی پینڈیاں بنائیں۔ رسم کے لیے سوجی کی پینڈیاں زیادہ تعداد میں۔

موسم بے حد خوشگوار ہے۔ بون وسٹا کی گیارھویں منزل ثمینہ کا نیا فلیٹ۔ اپنی وسعت اور کشادگی کے ساتھ مہمانوں کو باآسانی سمونے کو تیار۔

دوپہر میں عائشہ لاہور سے آئیں۔ یہ ہمارے تایا سید ہاشمی فرید آبادی (آقا جان) کی نواسی ہیں۔ امریکی شہری ہیں۔ لاہور آئی تھیں ہمارے چچا سید مطلبی فرید آبادی کے پڑپوتے کی شادی میں۔ جو اشفاق احمد قدسیہ بانو کی پوتی سے ہوئی ہے۔ ایک پنتھ دو کاج کے محاورے کو سچ بنانے۔ کراچی مہا کی شادی کے لیے آ گئیں۔

رسم ہو چکی تھی تو سلمہ (بھانجی نمبر ایک) اپنی امی اور مومانی ریحانہ (مسز انس) کے ہمراہ آئیں۔ حسب معمول جہاز لیٹ تھا۔ علی ارسلان کے گھر سے آئی تھیں تیار ہو کر۔ مسز ارسلان اور ان کے بیٹے بھی تھے۔ کھانا ہو رہا تھا تو یہ لوگ پہنچے۔ ابٹن والے دن کے لیے ایک گلوکار کی خدمات حاصل کی گئی تھیں لیکن اس سے پہلے پشاور کے المناک سانحے نے سب کو رلا دیا تھا۔ دل چیر دیے تھے۔ قومی المیہ۔

مہا کے ابا جاوید نے وہ پروگرام کینسل کر دیا۔ اتنے بڑے دردناک المیے کے بعد کس دل سے خوشیاں منائی جاتیں۔ ہر دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

مہمانوں نے تو بس رسماً مہا کے ابٹن لگایا۔ بھائیوں نے دل کھول کر اس کے منہ پر ابٹن کا پلاسٹر کر دیا۔ نہ جانے کس بات کا بدلہ لیا تھا بے چاری سے۔ موقع نہ تھا کہ لڑتی۔ (اور ضرور لڑتی)

مہندی تو بڑے پیمانے پر ڈیفنس کے ہال لان میں مشترکہ تھی۔ وہ ملتوی نہیں کی جا سکتی تھی۔ ثمینہ نے مہندی کی مناسبت سے بہت خوب صورت ڈریس مہا کا بنوایا تھا۔ کام دار اورنج کلر کی لمبی قمیص۔ سبز خوش رنگ دوپٹہ۔ پہلے دولہا دوستوں اور بھائی کے نرغے میں دوپٹے کے زیر سایہ لائے گئے۔

اسٹیج بہت اچھا سجایا ہوا تھا۔ مہا بھائیوں کے ہمراہ کام دار دوپٹے کی چھاؤں میں نمودار ہوئیں۔ کزنز ان سے آگے گولڈن روشن لالٹینیں لیے ہوئے تھیں۔ جدت ایک جدت اور۔ یعنی مہا کے زیور۔ ماتھا پٹی بھی لگائی تھی۔ واہ زبردست، اچھا انتظام تھا۔ بھرپور روشنیاں تصویریں بنتی رہیں۔

ہم نے تو اپنی جگہ سے ہلنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ بھئی کرسی بہت پیاری ہوتی ہے۔ پل میں چھن جاتی ہے۔ ناپائیدار۔ میٹھی دہی پھلکیوں اور شوارما سے تواضع ہوئی۔ پھر کھانا ہوا۔ کب رسم ہوئی۔ کیا ہوا۔ خبر نہیں۔ کرسی چھوڑنے کی ہمت نہ کی۔ بس شور شرابہ ہوتا رہا۔ خیر گاجر کا حلوہ گرم جلیبیاں آ رہی تھیں۔ اچانک یاد آیا۔

ابٹن کی رسم کے لیے سعدیہ (مہا کی بھابھی) نے جو گلاب جامنیں بنائی تھیں وہ تو ہم نے چکھی تک نہیں تھیں۔ اس لیے مہندی پر حلوہ جلیبی کو ہاتھ نہ لگایا۔

گھر جا کر سعدیہ کی گلاب جامن کھانے کے شوق میں۔ البتہ پتا چلا کہ قلفہ بھی تھا۔ جس سے ہم محروم رہے۔ وہ تو کھایا جا سکتا تھا۔

گھر آ کر گلاب جامنوں کی فرمائش کی۔ اچھا ہوا کہ وقت پر یاد آ گیا ورنہ وہ بھی نہ ملتیں۔ کیونکہ ہمارے کھاتے ہی سب ختم۔ ابٹن کے لیے مہا کی چچی نگہت میدے کی پینڈیاں بنا کر لائی تھیں۔ اور پھوپھی زیبی نے گلاب جامنیں بنائی تھیں۔ ہر سمت میٹھا پن۔ بیگم انور کا دال کا حلوہ الگ۔

دولہا کا جوڑا بھیجنا بھی ایک مرحلہ۔ بے حد نفاست کے ساتھ سجا بنا کر۔ خوب صورتی اور مہارت سے باسکٹ کی آرائش کی گئی۔ اس میں پینڈیاں مٹھائی چاکلیٹ رکھ کر ساتھ ہی شیشے کے بڑے بڑے کپ سنہری روپہلی لیس سے آراستہ کر کے اس میں ڈرائی فروٹ بھر کر سمدھیانے بھیجے گئے۔

ادھر سے بھی مہا کا شادی کا جوڑا مٹھائی اور پھولوں سے سجا کر بانٹنے والی مٹھائی بھی چھوٹی ڈھکن دار باسکٹوں میں سلیقے سے رکھ کر مہا کی ساس شاہانہ چھوٹے بیٹے کے ہمراہ لائیں۔

شادی 25 دسمبر کو کلفٹن کے پام ایمرلڈ مارکی نزد ڈولمن مال میں منعقد ہوئی۔ پھولوں کی بہار ہر سمت نظر آئی۔ رنگ برنگے موسمی پھولوں کے گلدستے بہار کی نوید دے رہے تھے۔

سسرال سے سرخ غرارہ سوٹ اور روبی کا سیٹ آیا تھا۔ خالصتاً "روایتی دلہن۔ دولہا شایان بھی شیروانی میں پھولوں کے ہار کے ساتھ مشرقی دولہا بنے ہوئے تھے۔ ارمان تو پورے کرنے تھے۔ والدین کے بھی اور اپنے بھی۔ کھانا بہت ہی زبردست اور مختلف تھا بے حد لذیذ۔ عمود بھی صبح کوئٹہ سے آگیا تھا۔ پچھلے دنوں ہی یہ صاحب شادی میں باندھے گئے ہیں۔ دلہن مریم بھی اپنے کام کے سلسلے میں کراچی آئی ہوئی تھی۔ وہ پی سی میں ٹھہری ہوئی تھی۔ عمیر بھی وہیں چلا گیا تھا۔

ان دونوں کی موجودگی سے سب کو خوشی ہوئی۔ مجھے تو ایک پرس دے کر صوفے پر بٹھا دیا گیا۔ سلا میاں بہ طور کر پرس میں رکھنے کی ذمے داری 'بلکہ پابندی کے ساتھ کہ جی اب یہاں سے ہلنا نہیں ہے۔ گفٹ بھی وہیں رکھے جا رہے تھے۔ پھر تو تمام خواتین یعنی کہ عزیز خواتین اپنے اپنے پرس اور شالیں میرے پاس رکھ رکھ کر بے فکر ہو کر چلی گئیں۔ اسٹیج بھی بہار دکھا رہا تھا۔ لگتا نہ تھا کہ یہ موسم خزاں ہے۔ تصویریں بنتی رہیں۔

نکاح پر بہت اچھی دعا ہوئی۔ اللہ دولہا دلہن کو اپنی امان میں رکھے۔ خوشیوں کے ساتھ۔ سب کی امیدیں پوری کریں آمین۔ اور اے اللہ تمام پاکستان کے لوگوں کی حفاظت کرے۔ ان کی جان اور آل اولاد کی بھی اللہ حفاظت کرے۔ آمین ثم آمین۔ دہشت گردوں سے ملک کو پاک کردے۔ آمین۔ رخصتی قریباً" ایک بجے ہوئی۔ اللہ سب کو اپنی امان میں رکھے۔ آمین۔

اگلے دن محتشم اور سعدیہ ناشتا لے کر بہن کی سسرال گئے۔ یہ آرام کا دن تھا۔ (ہمارے لیے) تہمینہ تو انتظام میں مصروف تھیں۔ بچا ہوا کھانا ماسیوں، چوکیداروں، ڈرائیور وغیرہ کو بانٹنے کا کام۔ تموز کے نا اپنے لیے فریزر میں پارو کے ہاں بھجوایا۔ کچھ پڑوسیوں کو بھی بھیجا۔ اس کے اگلے دن مہا کی چھوٹی پھپھو فاخرہ کے گھر برنچ پر بلایا گیا تھا۔ بہت اچھا کھانا ناشتا تھا۔ گھر آ کر ولیمہ کی تیاری۔ خاصی گہما گہمی رہی۔

ولیمہ پی اے ایف میوزیم کے کنونشن ہال میں تھا جو کہ بہت ہی نفاست سے سجا ہوا تھا۔ مہا کا ولیمہ کا جوڑا بھی سسرال سے آیا تھا۔ شاہانہ (ساس) نے دونوں جوڑوں میں اپنے ارمان نکالے تھے۔ بہت شاندار لباس تھے۔ ماشاء اللہ شادی تو مکمل ہو گئی۔ سب ہی مطمئن اور خوش تھے لیکن دوسرے شہروں سے آنے والوں کو واپسی ... مشکل ... پنجاب دھند میں لپٹا ہوا تھا۔

علی سفیان آفاقی کی علالت کے باعث وہ اور لبنیٰ نہیں آسکے تھے۔ ان کی بڑی بیٹی نادیہ ملتان سے لاہور اپنے پاپا کی تیمارداری کے لیے چلی گئی۔ بیٹی بیٹے کو شادی میں کراچی بھیج دیا۔ اب ان دونوں کو ملتان لے کر جانا پارو کی ذمے داری تھی، جو بچوں کی خالہ ہیں۔ نادیہ نمبر دو، ماہجی ہیں پارو نمبر تین۔

شادی میں عینی نے ہم سے پوچھا۔

"آپ نے دو بھانجیوں کا ذکر تو خوب کیا ہے۔ دو کا کم۔ انہیں سلمہ اور پارو سے ملوایا کہ دونوں کے ہی ذکر زیادہ تھے۔ اب سنئے ملتان جانے کے لیے بچوں کو لے کر ایئرپورٹ پہنچ گئیں پارو بیگم۔

ملتان میں دھند بہت تھی۔ فلائٹ کینسل۔ اگلے دن لاہور روانی فلائٹ کی بکنگ ہو گئی۔

وقت پر سفیان علی پارو کو ایئرپورٹ لے گئے۔ جہاز روانہ ہو گیا تو گھر آ گئے۔ (اتفاق کہ پارو کے والد علی سفیان آفاقی، شوہر سفیان علی۔) لاہور سے لبنیٰ نے یہاں والدہ سفیان کو فون کر کے بتایا کہ جہاز رن وے پر لینڈ نہ کرسکا۔ واپس کراچی چلا گیا۔ بھاگم بھاگ سفیان پھر ایئرپورٹ بیگم کو وصول کرنے پہنچے۔ کراچی ایئرپورٹ پر انہیں اگلے دن کی فلائٹ کی نوید سنائی گئی۔ بچے تو خوش۔ ہم لوگ اگلے دن ان کے گھر پہنچے۔ سو رہی تھیں بے فکری خاتون۔ جگا کر انہیں سمجھایا، پارو اب آج تو تم چلی ہی جانا۔ بیچارے سفیان کو مزید سزا نہ دو۔

مل ملا کر، واپس آئے۔ تہمینہ نے کچھ دیر بعد فون کیا۔ ان کا جواب آیا۔ آج کی وہ فلائٹ نہیں ملی۔ اور ہمیں مختلف لوگوں سے ملنے کو کہا گیا۔ ہم نے خوب چیخ پکار کی تو اب وہ ہمیں اسلام آباد بھیج رہے ہیں۔ (یقیناً" پارو نے سب کو زچ کر دیا ہو گا۔ اس لیے کسی طرح پیچھا چھڑانے کے لیے روانہ کر دیا۔ اب وہ اگلے دن بس سے لاہور جائیں گی۔ یوں تو سب ہی مہمانوں کی فلائٹ لیٹ ہوئی۔ مگر ہاشم بیچارہ جو تین بجے کی فلائٹ سے جانے کے لیے ایک بجے گھر سے چلا گیا۔ اسے پی آئی اے والوں نے ہر آدھے گھنٹے بعد روانگی کا جھانسہ دے کر ایئرپورٹ پر بٹھائے رکھا۔

ہم سب مہا کے چچا انور کے گھر دعوت اڑا رہے تھے، وہ بیچارہ جہاز کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر ساڑھے گیارہ بجے روانہ ہوا جہاز۔ کیا اس وقت دھند نہ تھی؟ کیا یہ بہانہ تھا۔ جہازوں کی کمی اور خرابی کا؟ پی آئی اے کے خسارے کی چھوٹی سی وجہ معلوم ہو گئی۔ حماقت۔ جی۔ جب ہر سال دھند ہوتی ہے۔ تو شام کی فلائٹ ختم کر کے صبح اور دوپہر ہی کی کیوں نہیں کر دیتے؟

نہ مسافروں کو پریشانی ہو۔ نہ اسٹاف پر مسافروں کے زبانی حملے۔ بلکہ ہاتھاپائی بھی۔ کیا صحیح فیصلہ کرنے کا ادراک نہیں یا جرات کی کمی؟

اب گھر میں سناٹا ہے۔ محتشم اور سعدیہ لاہور گئے ہیں بیٹی زل کو لے کر سعدیہ کی کزن کی شادی میں۔ زل کی رونق لاہور چلی گئی۔ ماشاء اللہ بہت دلچسپ بچی ہے۔

☼

دستک دستک دستک

شاہین رشید

آصف، ملک ریاض

"کیسے ہیں آصف ملک ریاض صاحب؟"
"الحمد للہ بالکل ٹھیک۔"
"ایک بات بتائیں کہ آپ کی پروفائل پہ آپ کا نام Acif لکھا ہے۔ تو ایسا کیوں ہے؟"
"یوں سمجھیے کہ یہ تھوڑی یونیک نیس ہے جب میں کالج میں انٹر کا طالب علم تھا تو ان دنوں ناموں کو بڑے اسٹائلش انداز میں لکھا جاتا تھا تو مجھے اس بات میں زیادہ کشش محسوس ہوئی کہ میں اپنا نام C کے ساتھ لکھا کروں۔ تو میرے ڈاکومنٹس میں تو میرا نام Asif ہی ہے۔"
"کسی نے یہ تو نہیں کہا کہ آپ کی انگریزی کمزور ہے؟"
قہقہہ "بہت سارے ایس ایم ایس آتے ہیں اور میرے سننے والے، ہیں تو ان کو میں نے وضاحت بھی کر دی ہے پھر میں نے اس پہ تھوڑی سی ریسرچ بھی کی تو مجھے پتا چلا کہ Vowel کے بعد آپ کوئی بھی لفظ استعمال کر سکتے ہیں' اور C کا استعمال بھی غلط نہیں ہو گا تو یہ انگریزی کے حساب سے غلط نہیں ہے' اور پھر میرے سننے والوں نے بھی اسے پسند کیا تو میں نے Acif ہی رہنے دیا۔"
"آپ کی آواز جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ بہت عمدہ ہے، تو کالز تو بہت آتی ہوں گی؟"
"بالکل جی... آواز کی وجہ سے بہت پسند کرتے ہیں میرے چاہنے والے اور میرا اسٹائل بھی کچھ نیا ہے کہ سب ہی پسند کرتے ہیں اور آج کل جو شوز کر رہا ہوں وہ بہت پسند کیے جا رہے ہیں۔"
"کیا شوز ہیں آج کل آپ کے؟"

"آج کل میرے ویک اینڈ کے شو ہیں۔ ویک اینڈ نائٹ شو اور سنڈے کو چل آؤٹ شوز ہوتے ہیں۔ تو بڑا مزا آتا ہے ایک ماحول بنا لیتا۔ تو ایسے پروگراموں میں آواز کا اتار چڑھاؤ لوگوں کو بہت متاثر کرتا ہے۔"
"تو اس کا مطلب ہے کہ نوجوان آپ کو زیادہ پسند کرتے ہیں؟"
"جی ہاں... لیکن میری آواز سن کر کم عمر نوجوان سمجھتے ہیں کہ شاید میں تیس سے اوپر کا نوجوان ہوں اور جب میں لوگوں کو اپنی صحیح عمر بتاتا ہوں تو وہ حیران ہو جاتے ہیں۔ کوئی مانتا ہی نہیں کہ میں پچیسویں سالگرہ منا کر چھبیسویں میں داخل ہوا ہوں۔ اور مزے کی بات یہ کہ میں تصاویر میں بھی اٹھائیس انتیس کا ہی لگتا ہوں۔"
"کچھ لوگ اپنی شخصیت کی بدولت کماتے ہیں اور

کچھ آواز کی بدولت تو آپ کے پاس دونوں چیزیں ہیں تو اسکرین پہ بھی آجائیے؟"

"مجھے اداکاری کا بھی شوق ہے اور میرا ارادہ بھی ہے کہ میں اسکرین پہ آؤں۔۔۔ تو ان شاء اللہ بہت جلد ٹرائی کروں گا ڈراموں کے لیے۔ ویسے اسکول اور کالج کے زمانے میں تو اپنا ہر شوق میں نے پورا کیا۔"

"آپ کی شکل معروف فنکار ہمایوں سعید سے بھی ملتی ہے تو آپ بہت جلد اپنی جگہ بنالیں گے۔ ماڈلنگ کا بھی شوق ہے؟"

"بے شک میری شکل ان سے ملتی ہے اور مجھے بہت لوگوں نے کہا بھی ہے، مگر میں جگہ بناؤں گا اپنی شخصیت سے، اپنے ٹیلنٹ سے اور ماڈلنگ کا شوق نہیں ہے مجھے۔ اگر ٹی وی پہ آیا بھی تو یا تو بحیثیت "ہوسٹ" کے یا پھر اداکار کے۔۔۔ اور ہوسٹ بنوں گا تو کسی رات کے پروگرام کا، کیونکہ صبح صبح اٹھنا میرے لیے بہت مشکل کام ہے۔"

"یہ نوجوانوں کے ساتھ کیا مسئلہ ہے، صبح دیر تک سوتے ہیں اور رات دیر تک جاگتے ہیں؟"

"یہ تو خیر ایک کامن سی بات ہے۔ ویسے میں اپنے شوز میں بھی لوگوں کو اور نوجوانوں کو جگاتا اور موٹیویٹ کرتا رہتا ہوں۔ لیکن خود بھی انہی میں سے ہوں۔ سنڈے کو بارہ ایک بجے شو کرنے جانا اور سنڈے کی نیند خراب کرنا اور سنڈے نائٹ شو کرکے گھر جانا مشکل کام ہے ۔۔۔ مگر شاید ہم نوجوانوں کے خون میں یہ بات سرکولیٹ کرچکی ہے کہ صبح اٹھنے کو نوجوان جرم سمجھنے لگ گئے ہیں کہ یہ کوئی ایسا کام ہے جو ہم غلط کررہے ہیں۔ ہمیں نہیں کرنا چاہیے اور میری والدہ تو اس حوالے سے بہت سخت ہیں۔ وہ صبح گھڑی کا ٹائم پیچھے کرکے مجھے جگاتی ہیں۔ کہ نو بج گئے اٹھ کر دیکھو تو آٹھ بجے ہوتے ہیں۔ تو ان کے اٹھانے کا اپنا انداز ہے۔ اور میں بھی ٹائمنگ کا بہت خیال رکھتا ہوں۔"

"کامیابی کی پہلی سیڑھی وقت کی پابندی ہے۔ کیونکہ جو وقت کو ضائع کردیتے ہیں وقت انہیں ضائع کردیتا ہے۔ کیا خیال ہے؟"

"جی آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ لیکن شکر ہے کہ میرے کام پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ہمیشہ وقت سے پہلے پہنچ جاتا ہوں۔"

"ریڈیو کی کمائی سے گھر چل سکتا ہے؟"

"ہرگز نہیں۔۔۔ ریڈیو تو بس ایک شوق ہے۔ اس لیے میں جاب بھی کرتا ہوں اور ڈراموں کی ڈبنگ بھی کرتا ہوں اور بڑا شکر ہے کہ اچھا خاصا کمالیتا ہوں۔"

"وہ کون سا ایسا ٹائم ہوتا ہے جب لوگ بہت زیادہ ریڈیو سنتے ہیں اور کون سا ایسا ٹائم ہے جب لوگ بالکل نہیں سنتے یا کم سنتے ہیں؟"

"دو باتوں کی وضاحت کردوں ایک تو یہ کہ لوگ ریڈیو سن کب رہے ہیں اور دوسری یہ کہ ریڈیو سننے کے بعد فیڈ بیک دینے کی پوزیشن میں کب ہوتے ہیں، اب جو چھ سے آٹھ بجے والے اور آٹھ سے دس والے شو ہوتے ہیں، ان میں لوگ کام کررہے ہوتے ہیں۔ یعنی ستر فیصد لوگ اپنے کام میں مصروف ہوتے ہیں یا گھر آرہے ہوتے ہیں۔ وہ لوگ سن ضرور رہے ہوتے ہیں، لیکن وہ فیڈ بیک نہیں دے پاتے فیڈ بیک ملتا ہے، رات دس بجے سے شروع ہونے والے پروگراموں کا جو رات تین سے چار بجے تک جاری رہتے ہیں۔ سنڈے کے شو میں فیڈ بیک زیادہ آتا ہے اور سنڈے سے ڈبل فیڈ بیک آتا ہے۔ تو آئیڈیا ہوجاتا ہے کہ لوگ توجہ سے سن رہے ہیں۔"

"دوران شو کن باتوں کا خیال رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے؟"

"دوران شو ان باتوں کا خیال رکھیں کہ آپ سے کوئی ٹیکنیکل غلطی نہ ہوجائے۔ مطلب یہ کہ ایک وقت میں آپ کے سامنے تین ایل سی ڈی پڑی ہیں، آپ کے سامنے پینل ہے، آپ کو کمرشل ٹائم پہ چلانے ہیں۔ آپ کو اذان ٹائم پہ چلانی ہے۔ نیوز والے کو ٹائم دینا ہے، یہ چیزیں ٹیکنیکل ہیں اور اس کے لیے آپ کے دماغ کا حاضر ہونا بہت ضروری ہے۔ چھوٹی

سی بھی غلطی آپ سے ہو گئی تو آپ کے لیے مشکل ہو جائے گی اور آپ کے لیے ہینڈل کرنا تھوڑا مشکل ہو جائے گا۔"

"پڑھائی میں کیسے تھے آپ اور پریکٹیکل لائف میں کب آئے؟"

"میٹرک تک تو اے ون گریڈ آتے تھے پھر انٹر میں گریڈ نیچے۔۔۔ آ گئے' اور گریجویشن میں بھی ایسا ہی ہوا۔۔۔ اور شاید ایسا اس لیے ہوا کہ میں نے کم عمری میں ہی جاب شروع کر دی تھی یعنی انٹر کے بعد ہی' انٹر کے رزلٹ سے پہلے ہی۔ مجھے احساس ذمہ داری تھا اس لیے میں فارغ نہیں بیٹھا۔"

"شادی۔۔۔؟"

"میری والدہ کا تو خیال تھا کہ بائیس تیئس سال کی عمر میں شادی ہو جانی چاہیے مگر اب دور بدل چکا ہے۔ اس لیے اسٹیبلش ہونے کے بعد ہی شادی کرنی چاہیے۔"

"کھانے پینے کا شوق ہے؟"

"کھانے پینے کا شوق ہے۔ مگر بچپن سے تربیت ایسی تھی کہ جو بھی ملے ہنسی خوشی کھا لو۔ اور جس حال میں جو بھی ملے کھاؤ۔۔۔ اور جو بھی ملے پہنو اس لیے نخرے نہیں کرتا۔۔۔ اور اس لحاظ سے میرے گھر والے بھی لکی ہیں کہ میں نے کبھی نخرے نہیں دکھائے۔"

"فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟"

"فارغ وقت' اب تو خیر ملتا ہی نہیں ہے۔ بس ایک لیپ ٹاپ ہوتا ہے اور میں ہوتا ہوں۔ میوزک سے اور کھیلوں کی دنیا سے لگاؤ ہے۔ کرکٹ سے بہت اچھا تعلق رہا۔ بہت میچ جیتے' فاسٹ باؤلر تھا۔ مگر اسے جاری نہیں رکھ سکا۔ اگر پریکٹس میں رہتا تو شاید بہت اچھا فاسٹ باؤلر ہوتا اور آل راؤنڈر بھی ہوتا۔ اگر کم عمری میں جاب نہ کرتا تو پھر کرکٹ میں ہوتا۔"

یاسرہ رضوی

"ہیلو جی۔ کیا حال ہے؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔ آپ کیسی ہیں۔"

"آپ کی دعا ہے۔ ملکہ عالیہ میں دیکھ رہی ہوں ماشاءاللہ بہت اچھا پرفارم کر رہی ہیں ہمیشہ کی طرح۔۔۔ کیسا رسپانس مل رہا ہے؟"

"بس جیسا ہمیشہ ملتا ہے کہ جی بہت اچھا کر رہی ہیں۔ بہت پسند آ رہا ہے آپ کا کام۔۔۔ ایسے ہی اچھے رول کرتی رہیے گا۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔"

"آپ کو خود کو کیسا لگ رہا ہے؟"

"مجھے اچھا لگ رہا ہے اور میں وہی رول کرتی ہوں جو مجھے اچھے لگتے ہیں۔ ورنہ عام سیدھے سادے رول تو بہت ملتے ہیں۔ مگر میں انکار کر دیتی ہوں کہ میں نے ڈراموں کی تعداد نہیں بڑھانی بلکہ اپنے آپ کو دوسروں سے منفرد دکھانا ہے تاکہ لوگوں کو میرا کام یاد رہے۔"

"بالکل جی۔۔۔ یہ کوالٹی تو آپ میں ہے۔۔۔ اس لیے تو آپ کا سیریل "من کے موتی" بہت پسند کیا گیا اور آپ کے سیریل "مجازی خدا" کو بھی لوگ نہیں بھولے کہ اس میں بھی پرفارمنس بہترین تھی؟"

"ہاں جی۔۔۔ دونوں سیریل ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے اور جس زمانے میں یہ سیریل ایک ساتھ چلے، میرے لیے بہت فائدے مند رہے کہ لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ یاسرہ میں کام کرنے کی کوالٹی بھی ہے۔۔۔ اگر وہ سیدھے سادھے کردار کر سکتی ہے تو ماڈرن کردار بھی کر سکتی ہے۔"

"سگریٹ بھی خوب پی آپ نے مجازی خدا میں مشکل ہوئی یا۔۔۔؟"

"یا۔۔۔ کیا؟ ایسا کچھ نہیں ہے کہ مجھے عادت ہے۔۔۔ زندگی میں ایک آدھ کش تو ہر کوئی لگا لیتا ہے۔۔۔ شروع شروع میں تھوڑی کھانسی اور گلے میں خراش ہو جاتی تھی۔ پھر ٹھیک ہو گیا۔۔۔ ویسے سگریٹ نوشی کے سین زیادہ نہیں تھے۔"

"من کے موتی" اور اب ملکہ عالیہ۔۔۔ دونوں میں انتہائی سمپل رول۔۔۔ کیوں؟"

"کیوں کی کوئی بات نہیں۔۔۔ دونوں رول میرے حساب سے اچھے تھے۔ اور مجھے اندازہ تھا کہ یہ پسند کیے جائیں گے اس لیے میں نے انہیں کرنا پسند کیا۔ بس کرداروں میں جان ہونی چاہیے۔۔۔ سیدھے اور ماڈرن سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"تو ڈرامہ سائن کرتے وقت آپ کردار کو اہمیت دیتی ہیں۔۔۔ رائٹر اور ڈائریکٹر کو نہیں؟"

"ایسا کچھ نہیں اچھا ڈائریکٹر ہمیشہ اچھی اور جان دار کہانیوں پر ہی کام کرتا ہے اس لیے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کام اچھا ہو گا۔۔۔ میں ڈائریکٹر کے علاوہ سب سے پہلے اپنا کردار دیکھتی ہوں اور پھر سائن کرتی ہوں۔"

"میں نے دیکھا ہے کہ اتنی شہرت کے باوجود آپ سپورٹنگ رول بھی کر لیتی ہیں۔۔۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

"اس لیے کر لیتی ہوں کہ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ سپورٹنگ ہے یا لیڈنگ ہے۔ بس جو کردار میرے دل کو اچھا لگتا ہے وہ میں کر لیتی ہوں۔ آپ ابھی سیدھے رول کی بات کر رہی تھیں تو میں نے ایک ٹیلی فلم میں گاؤں کی ایک لڑکی جو کھلونے بیچتی ہے کا رول بھی کیا ہے اور کوئی پہچان نہیں سکا کہ میں نے روپ دھارا ہوا ہے۔ سب اصلی والی سمجھ رہے تھے۔ مگر کیمرے وغیرہ دیکھ کر انہیں اندازہ ہوا کہ یہ گاؤں والی نہیں ہے بلکہ شہر سے آئی ہے۔"

"پھر تو خوب آؤ بھگت ہوئی ہو گی؟"

"جی جی۔۔۔ گاؤں کے لوگ بہت مخلص اور مہمان نواز ہوتے ہیں بہت اچھے دن گزرے ان کے ساتھ۔ بہت محبت دی سب نے۔"

"آپ خود بھی تو رائٹر ہیں۔ کیا لکھنا اچھا لگتا ہے۔ سوپ سیریل یا پھر ٹیلی فلم؟"

"میں ٹیلی فلم کو ہی پسند کرتی ہوں اور میں رائٹر بھی ٹیلی فلم کی ہی ہوں۔۔۔ مجھے اچھا لگتا ہے کہ کوئی ایک ہی نشست میں بیٹھ کر پورا ڈرامہ دیکھ لے۔۔۔ آج کل زندگی اتنی مصروف ہو گئی ہے کہ سیریل کے لیے بھی لوگوں کے پاس وقت نہیں ہے تو سوپ کے لیے تو بالکل بھی ٹائم نہیں ہے۔ مگر چونکہ یہ دونوں طرح کے ڈرامے تواتر کے ساتھ بن رہے ہیں تو ٹائم ہے نا لوگوں کے پاس تب ہی تو دیکھتے ہیں۔"

"آپ کا ملکہ عالیہ بھی تو دکھایا گیا۔ کافی لمبا چلا تھا وہ بھی اور من کے موتی بھی کافی لمبا گیا؟"

"وہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ لوگوں کے پاس ٹائم ہے تو لوگ دیکھتے ہیں۔ میں تو اپنی پسند کی بات کر رہی ہوں کہ مجھے فلم بنانا، لکھنا اور دیکھنا پسند ہے۔"

"مصروفیات میں گھر تو نظرانداز ہوتا ہو گا؟"

"نہیں جی۔۔۔ بچپن سے ہی گھر گرہستی کی عادت ڈال دی تھی ماں نے اس لیے مصروفیات کے باوجود گھرداری میں حصہ ضرور لے لیتی ہوں۔ بہت اچھا پکا لیتی ہوں۔۔۔ اور یہ ماں کی تربیت ہی تو تھی کہ جب امریکہ پڑھنے گئی تو وہاں اپنے گھر کے سارے کام خود کرتی تھی۔" مطلب تعلیمی قابلیت؟"

"ہیومن ریسورس کی ڈگری کے لیے امریکہ گئی اور ماس کمیونیکیشن کے لیے برطانیہ گئی تھی۔"

"پھر تو آپ کو خاصا ماڈرن ہونا چاہیے تھا؟"

"ہاں۔۔۔ تھوڑی ماڈرن ہو گئی تھی۔ مگر پھر یہ سب کچھ اپنی نیچر کے خلاف لگا۔ بس اسی لیے اپنی طبیعت پہ لوٹ آئی۔ مجھے اس طرح سادہ رہنا اچھا لگتا ہے۔"

راشدہ رفعت

ہلکا پھلکا بخار اور معمولی سا فلو... آفس سے چھٹی کرنا بنتا تو نہ تھا لیکن وہ اپنے موڈ کا کیا کرتا۔ کبھی کبھار تو بندے کو اپنے دل کی بات ماننا ہی پڑتی ہے نا۔

اور آج ایسا ہی دن تھا۔ وہ رات کی بھرپور نیند کے بعد صبح اٹھ کر ایک بھرپور ناشتا کر چکا تھا اور اب بہت اطمینان سے اخبار کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اماں پڑوس میں اپنی کسی جاننے والی کی عیادت کو گئی ہوئی تھیں۔ اسی وقت ڈور بیل بجی تھی۔

"حیرت ہے' اماں اتنی جلدی آگئیں۔" حارث اخبار میز پر رکھ کر گیٹ کھولنے گیا تھا۔ آنے والی اماں نہ تھیں۔ اماں کی گھبرائی بوکھلائی سی عزیز از جان بھانجی صاحبہ گیٹ کھلنے کے انتظار میں کھڑی ہاتھ کی انگلیاں مروڑ رہی تھیں۔ دوسری جانب اپنی خالہ جان کے بجائے ان کے سپوت کو دیکھ کر محترمہ کی گھبراہٹ میں خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا۔ حارث نے اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ حارث کو منمناتا سا سلام کر کے گھر کے اندر داخل ہوئی۔

"اماں ذرا پڑوس تک گئی ہیں۔ تم بیٹھو میں اماں کو..."

حارث نے ہانیہ کے سلام کا جواب دے کر اسے آگاہ کرنا چاہا تھا مگر وہ اس کی بات مکمل ہونے کا انتظار کیے بغیر بول پڑی تھی۔

"کیا کہا آپ نے' خالہ جان گھر پر نہیں ہیں۔" خوف زدہ سا لہجہ اور انداز ایسا جیسے کہ ابھی واپسی کے لیے دوڑ لگا دے گی۔

"اماں اپنا سیل فون ساتھ لے گئی ہیں۔ میں انہیں کال کر کے بلا لیتا ہوں' قریب ہی گئی ہیں۔ پانچ منٹ میں آجائیں گی۔"

ناولٹ

حارث نے اسے بے حد رسانیت سے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر چھایا تذبذب ابھی بھی کم نہ ہوا تھا۔ حارث نے اس کے ساتھ مزید دماغ کھپانے کے بجائے لاؤنج میں چارجنگ پر لگا اپنا موبائل فون اٹھا کر اماں کو فون کردیا۔ محترمہ کی تسلی کے لیے اسپیکر بھی آن کردیا تھا۔

"ہانیہ آئی ہے۔ اچھا اچھا۔ بٹھاؤ میری بچی کو۔ میں دو منٹ میں آئی بس۔"

خالہ کی آواز سن کر "بچی" خود ہی صوفے پر ٹک گئی تھی۔ حارث اس کی مزید تسلی کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ جانتا تھا' ہانیہ اس کی گھر میں موجودگی کی توقع نہ کر رہی ہوگی۔ ہر دس پندرہ دن بعد وہ اپنی خالہ کے پاس اپنے دکھڑے رونے آتی تھی' لیکن چھٹی والے دن آنے سے گریز ہی کرتی تھی۔ اماں کی زبانی اسے ہانیہ کی آمد کا علم ہوتا اور نہ صرف اس دن بلکہ اس سے اگلے دن بھی اماں کی زبان پر اپنی بھانجی کا ہی تذکرہ رہتا۔

"بے چاری بچی جی کا بوجھ ہلکا کرنے آجاتی ہے میرے پاس۔ آپا اور بھائی صاحب نے کیسا لاڈوں میں پالا تھا۔ تینوں بھائی بھی جان چھڑکتے تھے۔ ماں باپ' کا تو چلو اللہ کے پاس سے بلاوا آیا' چلے گئے لیکن نگوڑمارے بھائی' اپنی آنکھیں اور کان اپنی اپنی بیویوں کے پاس گروی رکھ دیے۔ کم بخت ماریوں نے جینا حرام کر رکھا ہے۔ بے چاری ہانیہ کا۔"

اماں کے پاس تو سنانے کو اور بھی کچھ ہوتا تھا لیکن حارث کو ہانیہ کے نگوڑمارے بھائیوں اور کم بخت ماری بھابھیوں کے تذکرے سے چنداں دلچسپی نہ تھی' پھر بھی اسے اماں سے اکثر ہانیہ نامہ سننا پڑتا تھا۔

ہانیہ' اماں کی مرحومہ بہن کی اکلوتی لاڈلی بیٹی تھی۔ خالہ' خالو اللہ کو پیارے ہوچکے تھے اور اب وہ اپنے بھائیوں اور بھابھیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے حالات اتنے بھی قابل رحم نہیں تھے۔ اچھا پہنتی اوڑھتی تھی۔ گھر کے کاموں کا بھی خاص بوجھ نہ تھا۔ چھوٹی' چھوٹی معمولی باتیں' جو گھروں میں ہو ہی جاتی ہیں'

ہانیہ کو بہت دل گرفتہ کردیتی تھیں۔ وہ حساس تو ہمیشہ سے تھی۔ ماں باپ کے گزرنے کے بعد ضرورت سے زیادہ زود رنج ہوگئی تھی۔ کسی بھی چھوٹی سی بات پر پہروں کڑھتی تھی اور جب ضبط کا پیمانہ بالکل لبریز ہوجاتا تو دل کا غبار ہلکا کرنے کے لیے یہاں اماں کے پاس آجاتی۔ رونے دھونے کا طویل سیشن ہوتا۔ اماں اسے چپ کرواتیں۔ ڈھیروں دلاسے دیتیں۔ کچھ نصیحتیں کرتیں۔ دوسرے الفاظ میں ہانیہ اماں سے کتھارسس کروا کر واپس اپنے گھر کی راہ لیتی۔

افشاں آپا یا عینی آپا سسرال سے میکے آئی ہوتیں تو وہ بھی اماں کے ساتھ مل کر ہانیہ کو ڈھیروں ڈھیر تسلیاں دیتیں۔ حارث کے علاوہ سب گھر والوں کو ہانیہ سے دلی ہمدردی تھی۔ خیر اس کے ساتھ کوئی ایسا خاص بیر حارث کو بھی نہ تھا لیکن جو مسئلے لے کر محترمہ یہاں آتی تھیں اور گھر والوں کو بھی جن باتوں کی وجہ سے ہانیہ بے چاری پر ترس آتا تھا۔ حارث کو ان باتوں پر سوائے ہنسی کے کچھ نہ آتا۔

مثلاً "ہانیہ کی گہری سہیلی کی شادی تھی۔ توفیق بھائی کو دو تین دن پہلے سے یاد دہانی کروا رہی تھی کہ وہ مقررہ وقت پر گاڑی سمیت گھر پر رہیں۔ مقررہ وقت پر توفیق بھائی گھر پر ہی تھے' لیکن شوہر کی شکل دیکھ کر نازو بھابھی کو یاد آگیا کہ آج تو انہوں نے اپنی بہن کی نند کا نومولود بیٹا دیکھنے جانا ہے۔ بچے کی پیدائش کو سولہ روز گزر چکے تھے۔ اگر نازو بھابھی ایک دو دن بعد مبارک باد دینے چلی جاتیں تو کیا فرق پڑجاتا۔ اس کی گہری سہیلی کی شادی کا فنکشن مس ہوتے ہوتے رہ گیا نا۔ وہ تو شمس بھیا کو اس کی بے چاری سی شکل پر ترس آگیا اور وہ اپنی پھٹیچر سی بائیک پر اسے میرج ہال چھوڑ آئے۔ واپسی کیسے ہوئی' وہ الگ المناک داستان تھی جو ہانیہ بی بی نے ہچکیوں سے روتے ہوئے سنائی اور اماں دوپٹے سے اس کی آنکھیں پونچھتی رہیں۔

شادی کے بعد یہ گہری سہیلی ہانیہ سے ملنے گھر آئی۔ ہفتے بعد اس نے میاں کے ساتھ بیرون ملک چلے جانا تھا۔ نازو بھابھی اور شہلا بھابھی گھر پر تھیں۔ دونوں

سہیلی سے ملنے تک نہ آئیں۔ ملازمہ کے ہاتھ ڈرائنگ روم میں دو گلاس کولڈ ڈرنک بھجوادی۔ گلاسوں میں اتنی برف ڈال دی تھی کہ کولڈ ڈرنک بالکل شربت ہی بن گئی (یہ ہانیہ کی ہی اصطلاح تھی) اور اسی شام نازو بھابھی کے بہن، بہنوئی گھر آئے تو طرح طرح کے لوازمات سے پوری میز سج گئی۔ بلکہ انہوں نے شامی کباب تلنے کو ہانیہ سے ہی کہا اور شامی کباب تلتے ہوئے گھی کا ایسا چھینٹا کلائی پر پڑا کہ اچھا خاصا آبلہ بن گیا اور جب ہانیہ مہمانوں سے سلام دعا کرنے گئی۔ بھابھی کی بہن نے اس کی اسٹڈیز کے متعلق ایک دو سوال پوچھے تو نازو بھابھی نے مہنگائی کا رونا شروع کردیا۔ درپردہ وہ ہانیہ کو سنانا چاہ رہی تھیں کہ اس کے تعلیمی اخراجات کی وجہ سے گھر کے خرچوں میں کیسی تنگی برداشت کرنی پڑتی ہے۔

اور چھوٹی بھابھی شاپنگ پر گئیں تو رسماً "ہانیہ سے بھی پوچھ لیا کہ اسے کچھ چاہیے تو نہیں۔ اس کا ہینڈ بیگ بہت پرانا ہوچکا تھا۔ اس کا اسٹریپ بھی بس ٹوٹنے ہی والا تھا تو اس نے بھابھی سے کہا کوئی مناسب قیمت والا ہینڈ بیگ لے آئیں، اور چھوٹی بھابھی جن کی چوائس کا ایک زمانہ گرویدہ تھا وہ اس کے لیے ایسا بدرنگا اور بدوضع بیگ اٹھالائیں کہ ہانیہ کبھی حیرت سے بھابھی کا منہ دیکھتی اور کبھی بیگ کا۔ اور رات کے کھانے کے بعد چھوٹی بھابھی کے کمرے سے چھوٹے بھیا کے اونچا اونچا بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ خاصے کنجوس تھے اور بیوی سے اس فضول خرچی کے بارے میں باز پرس کررہے تھے تو چھوٹی بھابھی خرچے کی وضاحت دیتے ہوئے بار بار ہانیہ کے ہینڈ بیگ کا ہی ذکر کرتی رہیں۔ ہانیہ اس وقت کو کوستی رہی جب اس نے ہینڈ بیگ کی فرمائش کی تھی۔ ایک دفعہ جب اسے بخار ہوا تو وہ دو دن تک بھیا کے میڈیکل باکس میں سے بخار کی ٹیبلیٹس لے کر کھاتی رہی۔ بھابھیوں اور بھائیوں میں سے کسی کو خیال تک نہ آیا کہ اسے ڈاکٹر کے پاس ہی لے جایا جائے۔ وہ تو شکر ہے کہ دو دن بعد بخار خود ہی اتر گیا۔

اسی طرح جب شہلا بھابھی کے سب سے چھوٹے فتنے مطلب بیٹے نے اس کی اہم اسائنمنٹ پھاڑ دی اور اس نے غصے میں بھتیجے کو ایک چماٹا (طمانچہ) رسید کردیا تو بظاہر تو شہلا بھابھی کچھ نہ بولیں مگر دو دن تک ان کا موڈ آف ہی رہا۔

اسی طرح کے درجنوں قصے تھے جن کو سناتے ہوئے ہانیہ بی بی پر رقت طاری ہوجاتی اور اماں لاڈلی بھا بجی کو سینے سے چمٹا کر ڈھیروں ڈھیر تسلیاں دیتیں اور پھر اگلے دو دن تک حارث کے سامنے اماں آب دیدہ ہوکر بھانجی کی باتیں دوہراتی رہتیں۔

☼ ☼ ☼

دونوں بہنوں کی شادیوں کے بعد اماں سارا دن چپ رہ رہ کر اکتا جاتی تھیں۔ جب وہ آفس سے گھر واپس آتا تو اماں اسے کھانا بعد میں دیتیں، دن بھر کی رپورٹ پہلے دیتیں۔ اسے اماں کی تنہائی کا بخوبی احساس تھا۔ دو سال پہلے ابا کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس کے بعد سے اماں بہت تنہا ہوگئی تھیں۔ دونوں بہنیں اپنے گھر بار کی تھیں۔ پندرہ بیس دن بعد میکے کا چکر لگتا۔ ماں کے سامنے سسرال والوں کی ڈھیروں ڈھیر غیبتیں کرکے واپس اپنے گھر کی راہ لیتیں، لیکن آج کل بہنوں کے ہاتھ ایک اور موضوع لگ گیا تھا۔ وہ جب بھی میکے آتیں، حارث کی شادی کا ذکر چھیڑ دیتیں اور اپنی ان نندوں، دیورانیوں، جیٹھانیوں جن سے ان کی ایک دن نہ بنی تھی، ان ہی کی بیٹیوں کا نام حارث کے لیے تجویز کرتیں۔ شکر ہے اماں اس معاملے میں حارث کی ہم نوا تھیں۔

"ساری زندگی جن عورتوں کی تیزی طراری کے قصے تم مجھے سناتی رہی ہو اب ان کی بچیوں کو حارث کے لیے منتخب کررہی ہو۔ جب مائیں اتنی تیز طرار ہیں تو بچیاں کون سی سیدھی اور معصوم ہوں گی۔ نہ بھئی مجھے اور میرے بیٹے کو بخشو تم۔"

"جیسی سیدھی اور معصوم بہو آپ چاہ رہی ہیں' وہ آج کے دور میں تو ملنے سے رہی۔ جن لڑکیوں کا ہم ذکر کرتے ہیں' وہ ہمارے سامنے پلی بڑھی ہیں۔ ان کے مزاج اور عادتوں سے ہم بخوبی آگاہ ہیں۔ تھوڑی بہت تیزی طراری تو کس میں نہیں ہوتی اماں!" افشاں آپا بہت رسانیت سے ماں کو مخاطب کرتیں۔

"ہاں تو اور کیا اماں! باجی بالکل صحیح کہہ رہی ہیں۔ الوینہ' نوشابہ لائبہ اور زرمینہ چاروں بچیاں ہماری آنکھوں کے سامنے پلی بڑھی ہیں پھر حارث ہمارا اکلوتا بھائی ہے۔ ہمارا تو میکہ ہی اس کے دم سے ہے کیا گارنٹی ہے کہ غیروں میں سے کوئی لڑکی لائیں گے تو وہ اس گھر میں ہمارا کبھی کبھار کا آنا بھی برداشت کرپائے گی۔ اپنی دیکھی بھالی لڑکی کو بھابی بنائیں گے تو ہمارا اور ہمارے بچوں کا وجود بخوشی گوارا کرے گی۔" عینی آپا نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

"تو کیا ضروری ہے کہ تمہاری سسرالی بچیوں میں سے ہی کسی کو بہو بناؤں۔ تمہیں قرب وجوار میں کوئی اور ایسی لڑکی نظر نہیں آرہی جو دیکھی بھالی بھی ہے۔ سیدھی اور معصوم بھی اور تمہارے بچوں سے بہت پیار بھی کرتی ہے۔" اماں ذرا معنی خیز انداز میں مسکرائی تھیں۔

عینی آپا اور افشاں آپا نے چونک کر اماں کو دیکھا۔ چونکا تو حارث بھی تھا۔ ابھی تک تو وہ ماں بہنوں کی بحث سے لطف لے رہا تھا لیکن اماں نے اس بار جو فقرہ بولا تھا' اس میں کس ہستی کی طرف اشارہ تھا۔ وہ چند لمحوں میں ہی اس اشارے کو پا گیا تھا لیکن ہوسکتا ہے اسے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو۔ اس نے بے یقینی سے ماں کو دیکھا تھا۔

"ہانیہ کی بات کررہی ہیں آپ؟" عینی آپا نے حیرت سے استفسار کیا۔

"ہاں' میں ہانیہ کی ہی بات کررہی ہوں۔ بولو' کوئی اعتراض ہے تو؟" اماں نے مسکرا کر بیٹیوں کو دیکھا۔

"اس سے اچھی بات اور کیا ہوسکتی ہے۔ حیرت ہے یہ بات ہمارے ذہن میں کیوں نہ آئی۔" افشاں آپا نے فوراً" سے پیشتر تائیدی ووٹ دے ڈالا۔

"تمہارے ذہنوں پر تمہاری سسرالی بچیاں چھائی ہوئی تھیں۔ بتاؤ تو سہی ان میں سے کوئی میری ہانیہ کے پاسنگ بھی ہے۔" اماں نے تفاخرانہ لہجے میں استفسار کیا۔

"فار گاڈ سیک اماں! آپ اپنی رونی صورت والی بھانجی کو میرے پلے باندھنا چاہ رہی ہیں۔" حارث کو ماں کی بات سن کر گویا کرنٹ لگا تھا۔

"بس مجھے اسی چیز کا خدشہ تھا۔ اسی لیے اتنے دن سے یہ خواہش اپنے دل میں دبا رکھی تھی۔ سمجھاؤ اپنے بھائی کو ہانیہ سے اچھی لڑکی اور کہاں ملے گی اسے۔" اماں نے بیٹے کو ناراضی سے دیکھا تھا۔

"ہاں تو اور کیا حارث! بتاؤ تو سہی۔ کیا کمی ہے ہانیہ میں شکل وصورت لاکھوں میں ایک' پڑھی لکھی سیدھی سادی بھولی بھالی اور سب سے بڑھ کر ہماری اپنی۔ آپ کا انتخاب سوفیصد درست ہے اماں! بس پہلی فرصت میں توفیق بھائی وغیرہ کے ہاں جاکر ہانیہ کا رشتہ مانگ لیتے ہیں۔" افشاں آپا تو ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے چکر میں تھیں۔

"کمال کرتی ہیں آپا آپ! میں کہہ رہا ہوں مجھے ہانیہ پسند نہیں اس امیچور لڑکی سے مجھے ہرگز شادی نہیں کرنی۔ کوئی ڈھنگ کی لڑکی ڈھونڈنی ہے تو ڈھونڈیں' ورنہ یہ کام میں خود کرلوں گا۔" حارث کو غصہ ہی آگیا۔ اس کی زندگی کا سب سے اہم معاملہ اور اس کی رائے کو کوئی اہمیت دینے کو ہی تیار نہ تھا۔

"اچھا خفا کیوں ہوتے ہو۔ بتاؤ تو سہی' کیا کمی ہے ہانیہ میں۔ تمہیں وہ کیوں اچھی نہیں لگتی۔" عینی آپا نے اسے بچکار کر پوچھا۔

"میں نے جب بھی اسے دیکھا ہے' روتے ہوئے ہی دیکھا ہے۔ میرے لیے کیا وہی رونے دھونے والی لڑکی رہ گئی ہے؟" اس نے بگڑ کر پوچھا۔

"تم اس کے معروضی حالات تو دیکھو۔ ماں باپ سر

رہیں نہیں۔ بھائی' بھابھیاں اپنی زندگیوں میں مگن۔ گھر میں کوئی ایسا فرد نہیں جس کے ساتھ وہ اپنے دل کی بات شیئر کر سکے۔ کوئی چھوٹا بہن بھائی بھی نہیں جس سے لڑ جھگڑ کر دل کی بھڑاس نکال سکے۔ یہاں اماں کے پاس آکر وہ اپنا جی ہلکا کر لیتی ہے' ورنہ ایسی بات تھوڑی ہے کہ وہ ہر وقت روتی دھوتی رہتی ہے۔" افشاں آپا نے بھی لاڈلے بھائی کو بہت پیار سے سمجھایا تھا۔

"کوئی اور بات کریں آپا! جب میں نے کہہ دیا نہیں تو بس نہیں۔" اس نے اکتا کر ان کی بات کاٹی۔

"رہنے دو افشاں! جب اس نے نہ کر دی ہے تو وہ کبھی ہاں میں نہیں بدلے گی۔ اپنے لیے اپنی پسند کی لڑکی یہ خود تلاش کر لے گا۔ تم دونوں اپنے گھر بار کی ہو اور میں نے بھی کتنے دن جی لینا ہے۔ جیسے مرضی لڑکی پسند کرے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اماں بیٹے کی ہٹ دھرمی پر آب دیدہ ہو گئی تھیں۔ حارث جی میں کچھ شرمندہ تو ہوا لیکن جانتا تھا ماں بہنیں اسے قائل کرنے کو ابھی بہت سے جذباتی اور نفسیاتی حربے استعمال کر سکتی ہیں' سو اس وقت یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔

"میں داؤد کی طرف جا رہا ہوں۔ کل وہ بائیک سے سلپ ہو گیا تھا۔ اچھی خاصی چوٹیں آئی ہیں۔ اس کا حال پوچھ آؤں۔" اس نے اپنے قریبی دوست کا نام لیا۔ ماں بہنیں ایک دوسرے کو دیکھ کر اور دل مسوس کر رہ گئیں۔ حارث' لاکھ فرماں بردار سہی مگر یہ سچ تھا کہ کوئی بھی اس کی مرضی کے خلاف اس سے کوئی کام نہ کروا سکتا تھا۔

"تم دونوں کو ہی جلدی پڑی ہوئی تھی بھائی کی شادی کی۔ نہ روز' روز ایسے ویسے رشتے لے کر آتیں تو کاہے کو میں ابھی ہانیہ کا نام لیتی۔ بڑا ٹیڑھا بیٹا ہے میرا۔ بہت طریقے' سلیقے سے قائل کرنا تھا مجھے اس کو۔ موقع محل دیکھ کر بات چھیڑتی۔ تم دونوں کی وجہ سے سب کچھ چوپٹ ہو گیا۔" اماں اب بیٹیوں پر بگڑ رہی تھیں۔ بیٹے پر آیا غصہ بلاوجہ بیٹیوں پر نکل رہا تھا اور فرماں بردار بیٹیاں چپ چاپ ماں کی ڈانٹ سنے گئیں۔

☆ ☆ ☆

حارث کو خدشہ تھا کہ اماں دوبارہ یہ موضوع ضرور چھیڑیں گی' لیکن صد شکر اس دن کے بعد اماں نے اس کے سامنے ہانیہ کا نام نہیں لیا تھا اور اب تو کافی دنوں سے محترمہ کی آمد بھی نہیں ہوئی تھی۔ حیرت انگیز طور پر اسے کبھی کبھار ہانیہ کا خیال آجاتا تھا۔ اماں اور بہنوں کی بات یاد کر کے چھم سے محترمہ کا سراپا ذہن کے پردے پر لہراتا' مگر اگلے ہی پل وہ سر جھٹک کر ہانیہ کے تصور بھی ذہن سے جھٹک ڈالتا۔

اور پھر ایک دن ہانیہ صاحبہ گھر آہی گئی تھیں۔ آج

بھی اتفاق سے حارث کے آفس کا آف تھا۔ وہ اپنے کمرے میں لیپ ٹاپ پر آفس کا کوئی کام نمٹانے میں مصروف تھا' جب دروازے کی بیل بجی۔ اماں شاید واش روم میں تھیں۔ حارث گیٹ کھولنے گیا تو گھبرائی بوکھلائی سی ہانیہ دروازے پر موجود تھی۔ کچھ فاصلے پر ایک رکشے والا رکشے سے گردن باہر نکال کر اسی جانب متوجہ تھا۔

"حارث بھائی! میں ہینڈ بیگ میں پیسوں والا پرس ڈالنا بھول گئی' پلیز اسے کرایہ دے دیں۔" بے تحاشا شرمندہ ہوتے ہوئے اس نے حارث کو مخاطب کیا۔

"عجیب بھلکڑ لڑکی ہے۔" وہ دل میں صرف سوچ ہی سکا۔ اگلے ہی پل اس کی بے چاری سی شکل دیکھ کر اسے ترس آ گیا تھا۔

"تم چلو اندر۔ میں اسے کرایہ دیتا ہوں۔" حارث نے اسے نرمی سے مخاطب کیا اور رکشے والے کو کرایہ دے کر جب وہ لاؤنج میں سے گزرا تو صوفے پر بیٹھی ہانیہ پر نگاہ پڑی۔

وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسائے' سر جھکا کر جانے کس سوچ میں گم بیٹھی تھی۔ اسے حارث کی آمد کا احساس تک نہ ہوا تھا۔ حارث اپنے کمرے کی طرف جانا چاہتا تھا مگر کچھ سوچ کر وہ اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس لڑکی کو اس کی ماں اس کا جیون ساتھی بنانا چاہتی تھیں اور حارث کے انکار پر وہ یہ خواہش دوبارہ زبان پر نہ لائی تھیں' مگر ان کی خاموش سی سے خفگی بھی حارث سے برداشت نہ ہو رہی تھی۔

"کیا اماں کی خواہش پوری کرنے کو وہ ہانیہ سے شادی پر راضی ہو سکتا ہے۔" اس نے ہانیہ پر اک نگاہ ڈالتے ہوئے خود سے پوچھا تھا۔

وہ خوب صورتی کے مروجہ پیمانے پر پوری اترتی تھی۔ دودھ ملائی سی رنگت' ستواں ناک' قدرتی گلابی ہونٹ' متناسب سراپا۔ وہ واقعی بہت خوب صورت تھی۔ حارث نے فراخ دلی سے تسلیم کیا' لیکن اس کی غیر متوازن شخصیت' بلا کی زود رنج' بھلکڑ اتنی کہ بنا

پیسوں کے گھر سے نکل پڑی' غیر حاضر دماغی کا یہ عالم کہ حارث اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھا اس کا چہرہ تک رہا تھا اور ہانیہ کو اس کی موجودگی کا احساس تک نہ تھا۔ جانے کن سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی وہ۔

"تمہاری اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں ہانیہ!" حارث نے اسے مخاطب کیا۔ وہ جیسے ایک دم چونکی تھی۔

"جی حارث بھائی! آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟"

"تمہاری پڑھائی کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ کیسی جا رہی ہیں تمہاری اسٹڈیز۔" اس نے دوبارہ اپنا سوال دوہرایا تھا۔

"پڑھائی ٹھیک جا رہی ہے حارث بھائی! خالہ کو بلا دیں گھر پر ہی ہیں نا؟" عجلت میں اس کے سوال کا جواب دے کر اماں کے بارے میں پوچھا۔ حارث سخت بدمزا ہوا۔ مانا یہ لڑکی اس گھر میں صرف اپنی خالہ سے ملنے آتی تھی لیکن خالہ کے بیٹے نے اسے مخاطب کرنے کی غلطی کر ہی لی تھی تو ایک' دو باتیں کرنے میں کوئی مضائقہ بھی نہ تھا۔

"تم بیٹھو' میں اماں کو بھیجتا ہوں۔" سنجیدگی سے کہہ کر وہ اٹھ گیا تھا۔ سامنے سے ہی اماں بھی آ رہی تھیں۔ وہ انہیں ہانیہ کی آمد کا بتا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں اماں اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ بنا کچھ کہے انہوں نے ڈریسنگ ٹیبل پر دھرا ٹشو کا ڈبا اٹھایا تھا۔

"اگلے مہینے کے سامان میں چار ڈبے فالتو منگوا لیجیے گا۔ آپ کی بھانجی گھر کے سارے ٹشو استعمال کر سکتی ہے۔" اس نے اماں کو مخاطب کیا' وہ کچھ نہ بولیں بس بیٹے پر تیکھی نگاہ ڈال کر ٹشو کا ڈبا لیے واپس پلٹ گئی تھیں۔

"جانے آج کیا ستم ٹوٹا ہے محترمہ کی ذات پر۔" اس نے استہزائیہ انداز میں سوچا تھا پھر سر جھٹک کر دوبارہ اپنے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا' لیکن آج جانے کیوں کام پر توجہ مرتکز نہ ہو رہی تھی۔ طبیعت پر بھی عجیب کسل مندی سی طاری تھی۔ اماں تو اپنی

بھانجی کے پاس سے گھنٹہ بھر سے پہلے کیا ہی اٹھتیں' اس نے خود اپنے لیے چائے بنانے کی سوچی۔ لاؤنج میں اب اماں اور ہانیہ نہ تھیں۔ اماں شاید اسے اپنے کمرے میں لے گئی تھیں۔

حارث نے اپنے لیے کیتلی میں چائے چڑھائی تو جانے کیسے اخلاقیات اور مہمان داری کا تقاضا یاد آگیا۔ اماں اور ان کی بھانجی کے لیے بھی چائے بنالی۔ خود ٹرے میں کپ سجا کر لے جانا تو اسے اچھا نہ لگا۔ اپنے مگ میں چائے ڈال کر وہ اماں کے کمرے کی طرف گیا۔

سوچا تھا انہیں کہہ دے کہ چائے بنی ہوئی ہے۔ کچن میں سے جا کر لے لیں' مگر اماں کو با آواز بلند پکارنے سے پہلے ہی وہ ٹھٹک کر رکا تھا۔ کمرے میں سے موصوفہ کی زور زور سے رونے کی آواز آرہی تھی اور اماں اسے چپ کروانے کی کوشش میں ناکام ہوئے جارہی تھیں۔

"حد ہوتی ہے۔ یہ لڑکی بھی بلاوجہ اماں کو پریشان کرتی ہے۔ کوئی معمولی سی بات ہوگی اور یوں رونا دھونا ڈال رکھا ہے۔" حارث کو ازحد کوفت ہوئی۔

"ہانیہ میری بچی! بتا تو سہی ہوا کیا ہے۔ کب سے روئے جارہی ہے۔ پہلے تو کبھی اتنا نہیں روئی۔ ہلکان کرلیا ہے خود کو' مجھے بتا تو سہی ہوا کیا ہے؟" اماں کی آواز نے حارث کو وہیں کھڑے رہنے پر مجبور کردیا۔ فطری تجسس آڑے آیا کہ محترمہ کیا جواب دیتی ہیں۔

"نازو بھابھی نے میرے لیے اپنے بھائی کا رشتہ دیا ہے خالہ!" بے تحاشا روتے ہوئے اس نے آخر بتا ہی ڈالا۔

"تو میری چندا! اس میں یوں رونے کی کیا بات ہے۔ اس عمر میں بچیوں کے رشتے آتے ہی ہیں۔"

اماں نے اسے پچکارا تھا۔ حارث کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ جو لڑکی رشتہ آنے پر ایسا واویلا مچا رہی تھی۔ اس کی ذہنی حالت کے کیا ہی کہنے۔ اور اماں ان محترمہ کو اس کے پلے باندھنا چاہ رہی تھیں۔

"آپ کو نہیں پتا خالہ! نازو بھابھی کا بھائی ایک نمبر کا لوفر اور آوارہ ہے۔ ویسے تو اس نے ایم بی اے کیا ہوا ہے۔ جاب بھی اچھی ہے' لیکن وہ بہت ہی لوز کریکٹر بندہ ہے اور نازو بھائی کو اپنے لفنگے بھائی کے لیے میں نظر آگئی۔ ان کے خاندان میں کوئی اس شخص کو لڑکی دینے کو تیار نہیں اور میرے بھائی آنکھوں دیکھی مکھی نگلنے کو تیار ہیں۔" وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

"تجھے کس نے بتایا کہ وہ ایسا لڑکا ہے۔" اماں نے تحمل اور رسانیت سے دریافت کیا۔

"مشعلا بھابھی اور چھوٹی بھابھی کی باتیں سنی تھیں۔ انہیں سب پتا ہے شہزاد سے متعلق۔ پتا تو توفیق بھائی کو بھی ہے' ظاہر ہے وہ ان کا سگا سالا ہے' لیکن ان کے منہ میں تو نازو بھابھی کی زبان ہے۔ افسوس مجھے شمس بھیا اور چھوٹے بھیا پر ہے۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ شہزاد کس ٹائپ کا لڑکا ہے اور اس کی باتیں میں نے ان کی بیویوں کی زبانی ہی سنی ہیں تو پہلے تو دونوں بھابھیاں مکر گئیں پھر چھوٹے بھیا بولے کہ شادی سے پہلے لڑکوں میں تھوڑی بہت ایسی ویسی عادتیں ہوتی ہی ہیں۔ شادی کے بعد سب سدھر جاتے ہیں۔ لڑکا پڑھا لکھا ہے۔ برسر روزگار بھی اور کیا گارنٹی ہے کہ کسی اور جگہ سے رشتہ آئے گا تو لڑکا بہت شریف اور سلجھا ہوگا۔ یہ تو نازو بھابھی کا بھائی ہے اس لیے اچھی بری عادتیں سامنے آگئیں اور شمس بھیا بولے کہ کیوں کہ نازو بھابھی ہمارے گھر کی بہو ہیں تو شہزاد کے گھر میری پوزیشن مستحکم ہوگی۔ وہ لوگ ہمارے دباؤ میں رہیں گے۔ آپ خود بتائیں خالہ کیا یہ معقول وجہ ہے میرا وہاں پر رشتہ کرنے کی اور نازو بھابھی جیسی خاتون بھی کسی کے دباؤ میں آسکتی ہیں۔ جیسی وہ ہیں ویسا ہی ان کا خاندان ہے۔ میں تو ان کے گھر میں جا کر جیتے جی مرجاؤں گی اور پھر وہ لفنگا شہزاد.... اف! میں مرجاؤں گی خالہ! مگر اس سے شادی نہیں کروں گی۔"

رو' رو کر ہانیہ کا گلا بیٹھ گیا تھا اور کمرے سے باہر کھڑے حارث کو اب اس کی باتیں اور رونا بچکانہ نہ لگ رہا تھا۔ جب کسی کی زندگی داؤ پر لگی ہو تو واویلا مچانا حق ہے۔ اس وقت اپنی کزن پر اسے ترس بھی آرہا تھا

اور دلی ہمدردی بھی محسوس ہو رہی تھی۔

"تم ایک بار توفیق سے بات تو کرو۔ وہ تمہارا بڑا بھائی ہے۔ تمہارے باپ کی جگہ پر ہے۔ تمہاری بات کیوں نہ سنے گا۔ وہ کبھی تمہاری مرضی کے بغیر تمہاری زندگی کا فیصلہ نہیں کرے گا۔" اماں بہت خوش فہم تھیں یا پھر انہیں بھابھی کی فطرت کا اندازہ ہی نہ تھا۔ ہانیہ انہیں بے بسی سے دیکھ کر رہ گئی۔

"چلو شاباش۔ یوں خود کو ہلکان مت کرو۔ یہ پانی پیو۔" اماں غالباً اسے پانی کا گلاس تھما رہی تھیں۔

"پرسوں شہزاد ہمارے گھر آیا تھا خالہ!" ہانیہ نے رندھی ہوئی آواز میں مزید کچھ بتانا چاہا۔

"اس کی بہن کا گھر ہے۔ آگیا ہوگا پھر کیا ہوا۔" اماں نے اس کی پوری بات سنی ہی نہ تھی۔

"ٹھیک ہے، خالہ! اس کی بہن کا گھر ہے اور وہ پہلی بار نہیں آیا' آتا رہتا ہے اور میں ہر بار کوشش کرتی ہوں کہ اس کا سامنا نہ کروں۔ مجھے اس کی گندی نگاہوں سے اتنی الجھن ہوتی ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ پرسوں بھی میں اس کی شکل دیکھتے ہی کچن میں گھس گئی اور پتا ہے خالہ! تھوڑی دیر بعد وہ میرے پیچھے کچن میں ہی چلا آیا۔" وہ بتاتے بتاتے پھر بری طرح رو پڑی۔

"میں اسے اتنے قریب دیکھ کر گھبرا گئی۔ میں نے اس سے کہا کہ آپ کو کچھ چاہیے تو بتائیں۔ کہنے لگا۔ تمہارا ساتھ چاہیے۔ میرا دماغ گھوم گیا خالہ! میں نے اس سے کہا کہ وہ شرافت سے باہر جاکر بیٹھے' ورنہ میں آواز دے کر بھائی کو بلا لوں گی۔ وہ زور سے ہنسا' پھر میری لٹ پکڑ کر کھینچی' کہنے لگا جانتا ہوں تم اتنی اکڑ دکھا رہی ہو' لیکن یاد رکھو جتنا مرضی انکار کر دو دلہن بن کر میرے ہی گھر آنا ہے پھر گن گن کر بدلے لوں گا' پھر وہ چلا گیا خالہ! مجھے لگا کہ میرے ماں باپ آج ہی مرے ہیں۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں اپنے گھر میں نہیں بلکہ کسی گلی یا بازار میں کھڑی ہوں۔ بے سائبانی کا جو احساس مجھ پر حاوی ہو رہا تھا' میں چاہوں بھی تو آپ کو نہیں بتا سکتی۔"

وہ بلک بلک کر رو رہی تھی اور کمرے سے باہر کھڑے حارث کی کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں۔ اشتعال کی شدید لہر نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جس لڑکی کا رونا دھونا اسے ہمیشہ بچکانہ لگتا تھا۔ اس کے آنسو آج برداشت سے باہر تھے۔ وہ اس کی سگی خالہ زاد تھی۔ کسی شخص کی یہ جرأت کیسے ہوئی کہ وہ اسے اس کے گھر جاکر ہراساں کر آئے۔

حارث کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ اس شہزاد کا جاکر منہ توڑ دے۔ وہ بھول گیا کہ وہ اماں کے کمرے کے باہر کیوں کھڑا ہے۔ وہ اماں کو کیا کہنے آیا تھا۔ اماں کو پکارے بغیر واپس پلٹ گیا۔

پتا نہیں ہانیہ کی واپسی کب ہوئی تھی۔ بہت دیر بعد اماں اسے کھانے کے لیے بلانے آئی تھیں۔ ہانیہ جا چکی تھی۔ کھانے کے دوران وہ منتظر رہا کہ اماں ہانیہ کے متعلق کوئی بات کریں گی۔ اس کے نگوڑ مارے بھائیوں اور کم بخت ماری بھابھیوں پر ضرور لعنت ملامت کریں گی' لیکن خلاف معمول اماں آج ہانیہ کے بارے میں ایک لفظ نہ بولی تھیں' لیکن ان کے چہرے پر چھایا اضطراب اور پریشانی حارث کی نگاہوں سے مخفی نہ رہ پائی۔

"کیا بات ہے اماں! آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں؟" اس نے ماں کو کریدا۔ وہ جواب میں کچھ نہ بولیں' بس ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بیٹے پر شکوہ کناں سی نگاہ ڈالی۔

"اتنی ناراضی سے کیوں دیکھ رہی ہیں' کچھ تو بولیں۔" وہ جانے ماں کے لبوں سے کیا سننے کا متمنی تھا۔

"بولوں تو تب نا' میرے بولنے کا کچھ فائدہ ہو۔ کھانا کھاؤ بیٹا! کوئی بات نہیں ہے۔ نہیں ہوں میں پریشان۔" اماں دھیرے سے بولی تھیں۔

حارث چپ چاپ ماں کو تکنے لگا۔ شدید شرمندگی نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اماں اس کی ہٹ دھرمی سے واقف تھیں' اسی لیے نہ صرف اپنی خواہش سے دست بردار ہو گئی تھیں' بلکہ اب اسے

ہانیہ کے حالات بتانے سے بھی اسی لیے گریزاں تھیں کہ ان کی نگاہ میں یہ بے کار تھا۔

☆ ☆ ☆

دو دن اور دو راتیں اس نے مسلسل سوچا تھا۔ ہانیہ کو سوچتا تو ترس اور ہمدردی کے ملے جلے جذبات دل میں ابھرتے۔ اماں کی حکم عدولی اور اپنی ہٹ دھرمی یاد آتی تو شرمندگی کا احساس بیدار ہوتا۔ یہ طے تھا کہ اماں کا دل دکھا کر وہ خود بھی کبھی مطمئن اور خوش نہ رہ سکتا تھا۔ گزرے بہت سے دن اس حقیقت کا بین ثبوت تھے۔

ہانیہ اماں کا انتخاب تھی۔ اس کی شخصیت کچھ ناپختہ تھی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ انسان میں بردباری اور سمجھ داری آ ہی جاتی ہے۔ جو کام کوئی اس سے زور زبردستی سے نہ کروا سکتا تھا۔ وہ بس خود بخود ہی ہو گیا۔ ہانیہ کے لیے دل قائل ہو گیا اور اس فیصلے پر دماغ مطمئن ہو گیا۔ اب اماں کو خوش کرنے کا مرحلہ باقی تھا۔

چھٹی والے دن افشاں آپا اور عینی آپا آئیں تو اس نے بہت معصوم سے انداز میں ماں بہنوں کو مخاطب کیا تھا۔

"آپ لوگوں نے ایک بار میری شادی کا ذکر کیا اور پھر یہ تذکرہ ہی بھول گئے۔ جانتے ہیں نا' میں کتنا شرمیلا ہوں۔ اس دن سے انتظار کر رہا ہوں کہ دوبارہ یہ ذکر چھیڑیں تو میں اپنی پسند بتاؤں۔"

"مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ یہ کسی لڑکی کے چکر میں ہے۔" عینی آپا کا صدمے سے برا حال تھا۔ شریف اور معصوم سا بھائی خود ہی کسی لڑکی کو پسند کرلے گا' کم از کم یہ بات ان کی برداشت سے باہر تھی۔

"تم اپنی پسند بتاؤ۔ ہم رشتہ لے جائیں گے۔" اماں نے پرسکون اور ہموار لہجے میں بیٹے کو مخاطب کیا۔

"جی۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ آپ لوگ جلد از جلد وہاں رشتہ لے جائیں کیوں کہ اس لڑکی کا ایک پرپوزل آیا ہوا ہے۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ اس کے گھر والے کسی اور کو ہاں کردیں۔"

"تمہارے آفس میں کام کرتی ہے نا؟" افشاں آپا نے یقین بھرے لہجے میں سوال کیا۔

"کب سے پسند کرتے ہو اسے اور اتنے دنوں سے یہ بات ہم سے کیوں چھپائی؟" اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی عینی آپا نے خفگی سے پوچھا تھا۔

"یہ سب سوال بے معنی ہیں۔ تم مجھے اس لڑکی کا نام پتا بتاؤ' میں کل ہی رشتہ لے جاؤں گی۔" اماں کا وہی ٹھنڈا ٹھار انداز تھا۔ حارث نے محبت سے مسکرا کر ماں کو دیکھا۔

"لڑکی کا نام پتا بتاؤں گا تو مجھے دو جوتے تو نہیں لگائیں گی۔" اماں جواب میں کچھ نہ بولی تھیں' بس حیرانی سے بیٹے کو دیکھا۔

"حیران مت ہوں اور کوئی غلط گمان بھی دل میں نہ لائیں۔ کسی ایسی ویسی لڑکی کے گھر نہیں بھیجوں گا آپ لوگوں کو' لڑکی بہت بھولی بھالی ہے' سیدھی سادی اور معصوم بھی۔ بس اسے بات بات پر رونا....."

"میں تجھے واقعی دو جوتے لگاؤں گی حارث! سیدھی طرح لڑکی کا نام بتا۔" اماں نے اسے گھورا تھا۔

"آپ سب کی پیاری ہانیہ اور کون۔" وہ مسکرایا۔

"اگر ہانیہ قبول ہے تو اس ڈرامے بازی کی کیا ضرورت تھی؟" افشاں آپا نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے اس کے شانے پر زوردار دھپ رسید کیا۔ وہ محض سر کھجا کر مسکرا دیا تھا۔

"اور تجھے کس نے بتایا کہ ہانیہ کا کوئی اور رشتہ آیا ہوا ہے؟" اماں کو اچانک اس کی ذرا دیر پہلے کی گئی بات یاد آئی۔

"کہیں تم نے اس روز ہانیہ کی باتیں تو نہیں سن لیں۔" اس کے جواب کا انتظار کیے بنا اماں نے ایک اور سوال داغا۔

"ہاں' لیکن ایسا غیر ارادی طور پر ہوا۔ میں تو آپ دونوں سے چائے کا پوچھنے گیا تھا۔" حارث نے جھٹ وضاحت دی۔ اماں کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی تھیں۔

"کہیں ایسا تو نہیں حارث کہ تو ہانیہ پر ترس کھا کر اس سے شادی پر راضی ہوا ہے۔" اماں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اُف اماں! اب آپ بال کی کھال تو مت اتاریں۔ آپ کی تسلی کے لیے بتا رہا ہوں کہ یہ فیصلہ میں نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور دل و دماغ کی آمادگی کے ساتھ کیا ہے۔" اس نے ماں کے ہاتھ تھام کر انہیں یقین دلایا تھا۔ اماں کی آنکھیں جھلملا گئیں۔ انہوں نے بے ساختہ بیٹے کی پیشانی چوم لی۔

"اللہ تجھے سدا خوش رکھے میرے بچے۔"

"آمین' آمین۔ اب باقی باتیں بعد پر اٹھا رکھیں اور چلیں ہانیہ کے گھر۔" عینی آپا تو فوراً" اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"ہاں تو اور کیا۔ آج ہم دونوں بہنیں اتفاق سے اکٹھی آئی ہیں تو بس پھر چلتے ہیں ہانیہ کے گھر۔ نیک کام میں دیر کیسی۔ چلیں اماں اٹھیں۔" افشاں آپا بھی بہن کی تقلید میں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بہنوں کی اس درجہ عجلت پر حارث کو ہنسی آگئی۔

"بس اتنا بعد میں۔ پہلے مٹھائی کا ڈبا اور کچھ پھل لا دو۔ خالی ہاتھ رشتہ مانگنے تھوڑی جائیں گے۔" اماں کی خوشی کا عجب ہی عالم تھا۔

"جو حکم جناب کا۔" وہ ہنستے ہوئے اٹھ گیا۔

اور پھر سارے مرحلے گویا پلک جھپکتے میں طے ہوئے۔ ہانیہ کے بھائیوں نے خالہ زاد بھائی کو شرف قبولیت بخش دی تھی۔ شروع میں توفیق بھائی نے کچھ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تھا اور وہ یہ یقیناً" نازو بھابھی کی آنکھوں کے اشارے پر کر رہے تھے' لیکن اماں نے بنا کسی لحاظ کے ان کی طبیعت صاف کر دی۔

"تم بار بار اپنے سالے کے رشتے کا جو حوالہ دے رہے ہو' ذرا بتاؤ۔ وہ میرے حارث کے پاسنگ بھی ہے۔ اس کے کرتوتوں کی وجہ سے چار جگہ تو اس کی منگنیاں ٹوٹی ہیں۔ کچھ تو خوف خدا کرو توفیق! بڑا بھائی تو باپ کی جگہ پر ہوتا ہے۔ صرف اپنی بیوی کی باتوں میں آکر جانتے بوجھتے ہانیہ کے ساتھ یہ ظلم کر رہے ہو اور میں یہ سب کچھ حارث کی ماں ہونے کے ناتے نہیں کہہ رہی۔ بھلے سے تم ہمیں ہانیہ کا رشتہ نہ دو' لیکن میں شہزاد سے بھی ہانیہ کی شادی نہیں ہونے دوں گی۔ ہانیہ کی ماں زندہ نہیں تو کیا ہوا؟ اس کی خالہ ابھی زندہ ہے' میرے ہوتے ہوئے کوئی اس کے ساتھ زیادتی نہیں کر سکتا۔"

اماں کا جذباتی پن عروج پر تھا۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپ خالہ جان! ہمیں ہانیہ کے لیے حارث سے اچھا لڑکا اور کہاں سے ملے گا۔ جب تک کوئی اور رشتہ نہیں تھا ہم شہزاد کے پروپوزل پر غور کر رہے تھے' لیکن کوئی حتمی فیصلہ تو نہیں کیا تھا نا۔ آپ بالکل مناسب وقت پر آگئیں۔ ہمیں یہ رشتہ بخوشی قبول ہے۔"

ہانیہ کے چھوٹے بھیا نے انہیں مخاطب کیا تھا۔ شمس بھیا نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ توفیق بھی کچھ شرمندہ سے نظر آئے اور جب نازو بھابھی نے تیکھے تیوروں سے "لیکن" کہہ کر کچھ بات کرنے کی کوشش کی تو انہیں چپ کروانے کا فریضہ ان کے میاں نے ہی انجام دیا۔

"تم خاموش رہو نازو! جب ہم تینوں بھائیوں نے فیصلہ کر لیا ہے تو تمہارے بولنے کی کوئی گنجائش نہیں۔" اور نازو بھابھی واقعی ایک منٹ میں خاموش ہو گئیں۔

"اگلے مہینے ہانیہ کے فائنل پیپرز ہیں خالہ! اس کے بعد آپ لوگ کوئی بھی مناسب تاریخ رکھ کر اسے رخصت کروا کر لے جائیے۔"

توفیق کے الفاظ سے اماں پر شادی مرگ طاری ہو گئی تھی اور ٹھیک دو ماہ بیس دن بعد وہ ہانیہ کو حارث کے سنگ رخصت کروا کر لے آئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

ہانیہ کا گھبرایا' بوکھلایا سا روپ حارث کے لیے نیا نہیں تھا۔ لیکن گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ کے ساتھ آج اس کا شرمایا' شرمایا سا روپ انتا انوکھا اور دلکش لگ رہا

تھا کہ حارث کا اس پر سے نگاہیں ہٹانے کو دل نہ چاہ رہا تھا۔ شاید وہ مشہور زمانہ محبت جو نکاح کے دو بولوں کے ساتھ مشروط ہوتی ہے، وہ اس کے دل میں بھی جنم لے چکی تھی۔ لیکن فی الوقت وہ محبت اور وارفتگی کا اظہار کر کے ہانیہ کی بوکھلاہٹ میں مزید اضافہ نہ کرنا چاہتا تھا۔

حارث چاہتا تھا کہ سب سے پہلے ان دونوں کے درمیان اپنائیت اور دوستی کا رشتہ استوار ہو۔ وہ ہانیہ کی غیر ضروری جھجک اور بوکھلاہٹ ختم کرنا چاہتا تھا اور اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب رہا تھا۔ اس کے دوستانہ رویے سے ہانیہ کی جھجک میں خاطر خواہ کمی ہوئی تھی، بلکہ شادی کے بعد ایک دن ہانیہ نے مسکراتے ہوئے اس بات کا اعتراف بھی کیا تھا۔

"مجھے ہرگز اندازہ نہ تھا کہ آپ اتنے فرینڈلی اور ہنس مکھ ہوں گے۔ پہلے تو آپ مجھے بہت خشک مزاج اور سنجیدہ ٹائپ بندے لگتے تھے، لیکن آپ تو بہت سوفٹ نیچر کے مالک ہیں۔"

"مجھے بھی ہرگز اندازہ نہ تھا کہ تم مسکرا کر بات کرتے ہوئے اتنی پیاری اور من موہنی لگو گی۔ پہلے تو ہمیشہ تمہیں رونے پر کمربستہ دیکھا تھا۔" حارث اسے دیکھ کر مسکرایا تھا اور وہ پیاری سی لڑکی اس ذرا سی بات پر ہی بری طرح شرما گئی تھی۔

"اچھا مجھے یہ بتا دیں کہ کل آفس کے لیے آپ کے کون سے کپڑے پریس کروں، پھر شام کے کھانے کی تیاری کروں گی۔" حارث کی جذبے لٹاتی نگاہوں کے سامنے بیٹھنا ہانیہ کے لیے آسان نہ تھا۔ اس نے جھٹ موضوع بدلا تھا۔

حارث مسکراتے ہوئے اٹھا اور وارڈروب سے کپڑے نکالنے لگا۔ ہانیہ ایک ذمہ دار بیوی اور بہو بننے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ حارث کو اس کی ایسی کوششوں پر ہنسی بھی آتی اور پیار بھی۔

گھریلو کام کاج میں وہ خاصی اناڑی تھی۔ بھابھیاں اس سے اوپر نیچے کے تو درجنوں کام کروالیتی تھیں، لیکن کریڈٹ لینے والے ذمہ داری کے کام کبھی اس کے سپرد نہ کرتیں اور کوکنگ تو اس سے کبھی نہ کروائی تھیں۔ اب شادی کے بعد اماں اسے دھیرے دھیرے گھر کے کام سکھا رہی تھیں۔ وہ بہت دل جمعی اور شوق سے اماں کے ساتھ کچن کے کاموں میں حصہ لیتی تھی۔

آج اماں کسی رشتہ دار کی عیادت کرنے گئی تھیں۔ پہلی بار کھانا تیار کرنے کی ذمہ داری صرف اور صرف ہانیہ کے کندھوں پر تھی۔

"بتائیں نا حارث! کیا بناؤں کھانے میں۔ مجھے تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا۔" مسئلہ اتنا بڑا نہ تھا لیکن وہ کافی پریشان لگ رہی تھی۔

"اتنی ٹینشن کیوں لے رہی ہو۔ دو تین پیاز کاٹو۔ اس میں دو تین انڈے پھینٹ لو اور مزیدار سا آملیٹ بنا لو۔ روٹی میں بازار سے لے آؤں گا۔" حارث نے مسئلے کا فوری حل نکالا تھا۔

"آپ سے تو مشورہ مانگنا بھی فضول ہے۔" وہ ذرا خفا ہوئی اور حارث کو اس کا یہ خفگی بھرا انداز بھی بہت بھلا لگا تھا۔

"کیا کہیں گی خالہ جان پہلی بار مجھ اکیلی کو کچھ بنانا پڑا، تو آملیٹ بنا کر کام چلا لیا۔ کوئی ڈھنگ کی چیز بتائیں حارث!" وہ اپنے مسئلے میں ہی الجھی ہوئی تھی۔

"اچھا یہ بات ہے۔" حارث کو جیسے بات سمجھ میں آگئی تھی۔ اس نے سرہلایا۔

"پھر یوں کرو چکن بریانی بنالو۔ چکن فریزر میں ہوگا ورنہ بتاؤ میں مارکیٹ سے لادیتا ہوں۔"

"چکن بریانی۔" ہانیہ نے تھوک نگلا۔ ہانیہ جیسی نو آموز ککُ کو بریانی کا نام سنتے ہی پسینہ آگیا تھا۔

"پیکٹ والی بنالو یار! ترکیب اس پر لکھی ہوگی۔" حارث اس کی شکل دیکھ کر مسئلہ پا گیا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے، بنالوں گی۔ ایسی مشکل بھی نہیں۔" اس نے جیسے خود کو تسلی دی۔ حارث نے بہت مشکل سے مسکراہٹ ضبط کی تھی اور پھر اس نے واقعی چکن بریانی بنالی تھی۔ اماں جب گھر آئیں تو کھانا بالکل تیار تھا۔

"خوشبو بتا رہی ہے کہ بریانی بنی ہے چلو بیٹا! جلدی

سے دسترخوان لگاؤ۔ بہت بھوک لگی ہے۔ میں ہاتھ منہ دھو کر آتی ہوں۔" اماں نے چادر اتار کر تہ کی۔

"جی خالہ جان! میں بس دسترخوان لگا ہی رہی ہوں۔" ہانیہ نے مستعدی سے جواب دیا تھا اور بہترین خوشبو والی بریانی جب دسترخوان پر رکھی گئی تو اماں اور حارث نے پہلی نگاہ بریانی پر ڈالی اور دوسری ہانیہ کے چہرے پر۔

"چاول کھلے کھلے نہیں رہے۔" ڈش میں نکالے گئے چاول واقعی آپس میں گتھم گتھا لگ رہے تھے۔ یہ بریانی سے زیادہ کھچڑی لگ رہی تھی۔ ہانیہ نے ڈھیرے سے بریانی کی پہلی برائی خود ہی گنوادی۔

"کھلے کھلے نہیں ہیں تو کوئی خاص مرجھائے ہوئے بھی نہیں ہیں۔ اور ذائقہ تو زبردست ہے۔" حارث نے پہلا نوالہ لے کر اس کی حوصلہ افزائی کرنا چاہی تھی اور اتنی سی بات سن کر ہی ہانیہ کے چہرے پر رونق آگئی۔

"تعریف میں مبالغے سے کام مت لو حارث! ورنہ ہانیہ کی کوکنگ میں مزید بہتری نہیں آئے گی۔" اماں بیٹے کو ٹوکے بنا نہ رہ پائیں۔ حارث کو ہرگز اندازہ نہ تھا کہ اماں اچانک یوں بول پڑیں گی۔ وہ واقعی چند لمحوں کے لیے خاموش سا ہو گیا۔

"بریانی کی خوشبو واقعی اچھی ہے بیٹا! لیکن اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں۔ کمال پیکٹ کے مسالے کا ہے۔ چاول بوائل کرتے وقت تمہیں معمولی سی کسر رکھنی چاہیے تھی۔ وہ کسر دم لگنے کے وقت برابر ہو جاتی۔ تم نے چاول زیادہ ابال لیے اس لیے تہہ لگانے کے بعد دم پر چاول کھل کر ٹوٹ گئے۔ پہلی بار بنائی ہے' ایسا ہو جاتا ہے۔ اگلی بار اس چیز کا دھیان رکھنا۔" اماں نے اسے نرمی سے ہی مخاطب کیا تھا' لیکن وہ بری طرح شرمندہ ہو گئی تھی۔

"آئندہ خیال رکھوں گی خالہ جان!" اس نے مرے مرے لہجے میں یقین دلایا۔ حارث بغور اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے میں مصروف تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ اس کی حساس طبیعت بیوی اس وقت ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہی ہے۔ آنسو اس کی آنکھوں سے نکلنے کو بے تاب ہوئے جا رہے تھے۔

"اچھا اماں! یہ بتائیں نسرین باجی کے شوہر کی طبیعت اب کیسی ہے۔ اسپتال سے ڈسچارج کیا انہیں۔" اس نے گفتگو کا موضوع بدلا تھا۔ اماں مریض کی طبیعت کا احوال دینے لگیں۔ ہانیہ نے اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر خود پر قابو پایا اور جس وقت وہ برتن سمیٹ کر کچن میں گئی تو حارث ماں کو جتائے بغیر نہ رہ پایا۔

"کیا تھا جو آپ دو بول تعریف کے بول دیتیں۔ اتنا چھوٹا سا تو دل ہے اس کا۔" ماں نے بغور بیٹے کو دیکھا' پھر ان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"وہ میری بھانجی ہے۔ ماں اس کی بچپن میں ہی رخصت ہو گئی۔ اب اسے طریقہ' سلیقہ سکھانا میری ذمہ داری ہے۔ ویسے اپنی بھانجی کی حمایت میں تمہارا بولنا مجھے اچھا لگا ہے۔" اماں نے مسکرا کر اسے مخاطب کیا۔

"آپ کی بھانجی اتفاق سے میری بیوی بھی ہے۔" ماں کے انداز پر اسے ہنسی آگئی تھی۔ اماں بھی محظوظ انداز میں مسکرا دیں۔

اماں واقعی اپنی بھانجی کو جی جان سے چاہتی تھیں۔ لیکن اسے طریقہ سلیقہ سکھانے کی کوشش میں معمولی سا سمجھوتا بھی نہ کرتی تھیں۔ جہاں غلطی ہوتی' برملا ٹوک دیتیں۔ ایسے میں حارث بغور ہانیہ کے تاثرات دیکھتا۔ خجالت اور خفت سے اس کا برا حال ہو رہا ہوتا۔ حارث کو لگتا کہ وہ اب روئی کہ تب' لیکن بہت جتن کر کے وہ اپنے آنسو کنٹرول کر ہی لیتی۔ اپنی حساس طبیعت بیوی کے یہ بن روئے آنسو حارث کو اپنے دل پر گرتے محسوس ہوتے۔

وہ جانتا تھا کہ شادی سے پہلے ہانیہ اماں کے پاس محض اس لیے آتی تھی کہ اپنے گھر والوں کے خلاف جو چھوٹے چھوٹے شکوے شکایت اس کے دل میں جمع ہوتے' وہ انہیں اماں کو سنا کر اپنے دل کا غبار نکال لیتی تھی۔ شادی کے بعد رونے کے لیے اسے اماں کا کندھا

میسر نہ تھا کیونکہ اکثر و بیشتر اسے اماں کی باتوں پر ہی رونا آتا تھا۔ اگرچہ اس نے کبھی حارث سے اس بارے میں ایک لفظ تک نہ کہا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات اس کے دل کا حال بتا جاتے۔

"تھوڑی سی تو رعایت دے دیا کریں۔ آخر بھانجی ہے آپ کی۔ آہستہ آہستہ سارے کام سیکھ ہی جائے گی۔"

اس روز بھی جانے ہانیہ سے کیا گڑبڑ ہوئی تھی کہ اماں نے اسے پورے آدھے گھنٹے کا لیکچر دے ڈالا۔ وہ جی خالہ، جی خالہ کرتی رہی تھی اور جب وہ منظر سے ہٹی تو حارث نے اماں سے "ہاتھ ہولا" رکھنے کی استدعا کی تھی۔

"آہستہ آہستہ نہیں۔ ماشاءاللہ ہانیہ نے گھر کے کام بہت جلدی سیکھ لیے ہیں۔ جو تھوڑی بہت کسر ہے، وہ بھی دور ہو جائے گی۔ میں ہوں نا اس کی رہنمائی کے لیے۔" اماں نے کمال اطمینان سے جواب دیا۔

کوئی اور ماں ہوتی تو بیوی کی حمایت پر بیٹے اور بہو سے بدظن ہو جاتی لیکن اماں کو تو حارث کی باتیں سن کر خوب ہی لطف آیا تھا۔ اگلے روز عینی آپا آئیں تو انہیں بھی مسکرا مسکرا کر حارث کی باتیں بتائی تھیں۔

"کہاں، شادی کرنے پر راضی نہ ہوتا تھا۔ کہتا تھا، روتی بسورتی لڑکی کو آپ میرے پلے باندھنا چاہ رہی ہیں اور اب ایسی کایا پلٹی ہے صاحبزادے کی کہ ہانیہ کو کچھ سمجھانے بھی لگوں تو اس سے برداشت نہیں ہوتا۔"

اماں بھانجی کے لیے بیٹے کی محبت دیکھ کر نہال ہوئے جا رہی تھیں۔ حارث ہانیہ کے سنگ خوش تھا۔ اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ اپنے انتخاب پر اماں مطمئن اور مسرور تھیں۔ یہ خوشی اس وقت بھی ان کے لہجے سے چھلک رہی تھی۔

"تو میں آپ سے یہ ہی تو کہتی تھی کہ ایک بار ہانیہ کو گھر آ لینے دیں۔ اس کا جادو آپ کے بیٹے کے سر چڑھ کر بولے گا۔ آپ کو خواہ مخواہ خدشے ستاتے تھے کہ حارث صرف آپ کی ناراضی کے خوف سے اس رشتے پر راضی ہوا ہے۔ کبھی کہتی تھیں، ہانیہ پر ترس کھا کر رضامندی دی ہے۔ جانے شادی کے بعد خوش رہ پائے گا یا نہیں۔ میں اور انشاں دونوں ہی آپ کو سمجھاتے تھے کہ سارے خدشے ذہن سے جھٹک ڈالیں۔ ہانیہ ماشاءاللہ ایسی پیاری اور من موہنی لڑکی ہے کہ حارث کے دل پر راج کرے گی اور دیکھ لیں، کتنی جلدی ہماری پیش گوئی پوری ہوئی۔" عینی آپا مسکراتے ہوئے اماں سے مخاطب تھیں۔

"ہاں، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ میرا انتخاب درست ثابت ہوا۔ میری ہانیہ کے آنے سے تو گھر میں اجالا سا بکھر گیا ہے۔" اماں کے لہجے میں ہانیہ کے لیے بے تحاشا پیار امڈ آیا تھا۔

"ایک منٹ اماں! کیا خیال ہے میں ہانیہ کو بھی بلا لوں۔ محبت کے غائبانہ اظہار کے بجائے یہ تعریفیں اس کے منہ پر کر ڈالیں۔ خوش ہو جائے گی وہ بھی۔" حارث نے مسکرا کر اماں کو مخاطب کیا۔

"یہ لڑکا تو باؤلوں جیسی باتیں کرنے لگا ہے۔ سمجھتا ہے، میں ہانیہ کے منہ پر اس کی تعریف نہیں کرتی۔" اماں اس بار تھوڑی سی خفا ہو گئی تھیں۔

"ہانیہ کی تعریف اماں کیوں کریں۔ اب یہ ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔" عینی آپا نے شرارت سے اس کا کان کھینچا تھا۔

وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ انہیں کیا پتا تھا کہ وہ تو یہ ذمہ داری بخوشی نبھانے کو تیار تھا لیکن اس کی شادی تو چھوئی موئی کے پودے سے ہوئی تھی۔ جب ذرا سا رومانٹک ہونے لگتا زوجہ محترمہ پر شرم اور گھبراہٹ طاری ہونے لگتی۔ وہ بلاشبہ چند ہی دنوں میں ہانیہ سے بے تحاشا محبت کرنے لگا تھا لیکن محبت کی یہ شدتیں ہانیہ پر عیاں کرنے کے بجائے فی الحال تو وہ اس سے دوستانہ اور بے تکلفانہ تعلق قائم کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ حارث کی خواہش تھی کہ ہانیہ یہ حقیقت تسلیم کرے کہ حارث صرف اس کا شوہر ہی نہیں بلکہ قابل اعتبار اور مخلص دوست بھی ہے۔ وہ ہر بات حارث سے بلا جھجک کہہ ڈالے لیکن شاید ہانیہ

ابھی اسے یہ رتبہ دینے پر تیار نہ تھی۔

وہ کئی دنوں سے نوٹ کر رہا تھا کہ ہانیہ بہت چپ چپ اور کھوئی کھوئی سی ہے۔ حارث جانتا تھا کہ اس گھر میں اسے کوئی بڑا مسئلہ نہ تھا لیکن چھوٹی چھوٹی بے شمار باتیں اکٹھی ہو کر اسے پریشان کر رہی تھیں اور اصل مسئلہ ہی یہ تھا کہ وہ یہ باتیں کسی سے نہ کہتی تھی۔

اماں گھر کے کاموں میں اس کی چھوٹی سی کی جانے والی غلطی نظر انداز کرنے پر تیار نہ تھیں۔ اس روز بھی ہانیہ دودھ کی پتیلی چولہے پر رکھ کر بھول گئی۔ بھول چوک انسان سے ہی ہوتی ہے مگر اماں نے اسے پندرہ منٹ کا لیکچر دے ڈالا تھا۔

"رزق کی قدر کرنی چاہیے بیٹا! کل تم گوشت کی ہانڈی چولہے پر رکھ کر بھول گئیں۔ آج سیر بھر دودھ ابال دیا۔ اور میں دیکھ رہی ہوں کہ آج کل تم کچھ الجھی الجھی اور پریشان ہو کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ ہانیہ۔" ایک لمبے سے لیکچر کے اختتام پر اماں نے قدرے نرم لہجے میں استفسار کیا تھا۔

"کوئی مسئلہ نہیں ہے خالہ جان!" ہانیہ نے پلکیں جھپک جھپک کر آنسو چھلکنے سے روکے تھے۔

حارث بس اسے دیکھ کر ہی رہ گیا۔ اس لمحے اسے کتنا ترس آیا تھا ہانیہ پر۔ سب کچھ کہہ سنا کر اماں اسے پوچھ رہی تھیں کہ مسئلہ کیا ہے۔ کیا اماں کو اندازہ نہ تھا۔ کہ وہ کتنی زود رنج اور حساس ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو لانے کے لیے تو کوئی معمولی بہانہ ہی درکار ہوتا تھا اور یہاں اماں صبح شام کسی نہ کسی بات پر اسے لائن حاضر کیے رکھتیں۔ بے شک اماں کی نیت بری نہ تھی۔ وہ اسے مکمل گرہستن کے روپ میں دیکھنے کی متمنی تھیں لیکن انہیں اپنی عزیز از جان بھانجی کی حساس طبیعت کو تو پیش نظر رکھنا چاہیے تھا نا۔ پر یہ بات اماں کو کون سمجھاتا۔

ہاں یہ بات ہانیہ کو سمجھائی جا سکتی تھی اور حارث یہ ہی چاہ رہا تھا کہ کوئی مناسب موقع میسر آئے تو وہ ہانیہ کو بہت پیار اور رسانیت سے اس حقیقت سے آگاہ کر دے کہ وہ ہانیہ کی دلی کیفیات سے بخوبی آگاہ ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ ہانیہ اسے صرف اماں کا بیٹا نہ سمجھے بلکہ اپنا شوہر اور اپنا قابل اعتماد دوست بھی سمجھے۔ شادی کے بعد آنسو بہانے کے لیے اسے خالہ کا کندھا میسر نہیں تو کیا ہوا خالہ کا بیٹا تو ہے' جو اب اس کا شریک حیات ہے۔

☆ ☆ ☆

اماں عینی آپا کے سسر کی عیادت کو گئی تھیں۔ انہوں نے حارث کو آفس فون کر کے گھر جلد آنے کی تاکید کی۔

اس نے جلد از جلد آفس کے کام نمٹائے تھے پھر باس سے چھٹی لے کر گھر کی راہ لی۔ ہانیہ کچن میں مصروف تھی۔ حسب توقع وہ حارث کو دیکھ کر حیران ہوئی۔

"آج آپ اتنی جلدی آ گئے۔ خیریت تو ہے؟" اس نے استفسار کیا۔

"اماں نے فون کر کے کہا تھا میری بہو گھر پر اکیلی بور ہو رہی ہے' فوراً اس کے پاس پہنچو۔ میں نے حکم کی فوری تعمیل کی اور دوڑا چلا آیا۔"

حارث نے شگفتگی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ہانیہ بھی مسکرا دی تھی لیکن اس کی آنکھوں نے اس مسکراہٹ کا ساتھ نہ دیا تھا۔ حارث کو آج بھی وہ بہت بجھی بجھی اور پژمردہ لگی تھی۔

"تم جلدی جلدی اپنے کچن کے کام سمیٹو اور بیڈ روم میں آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

حارث اسے نرمی سے مخاطب کرتا کچن سے چلا گیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ چائے کا کپ لیے بیڈ روم میں آئی تھی۔

"یہ لیجیے چائے۔ بسکٹ ختم ہو گئے۔ آج خالی چائے پر گزارا کرنا پڑے گا۔" وہ چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر پھر جانے کے لیے مڑی تھی۔

"تم کہاں جا رہی ہو۔ یہاں آؤ بیٹھو میرے پاس۔" حارث نے اسے پکارا تھا۔

"سنک برتنوں سے بھرا پڑا ہے حارث! برتن دھونے جارہی ہوں آپ کو کچھ اور چاہیے تو بتائیں۔ نمکو لادوں؟" اس نے عجلت بھرے انداز میں پوچھا تھا۔

"مجھے تمہارا کچھ وقت چاہیے۔ عنایت کردو گی۔" حارث اس بار قدرے خفا ہوا تھا۔ ہانیہ اس کے انداز پر حیران تو ہوئی تھی مگر خاموشی سے بیڈ کے سرے پر ٹک گئی۔ حارث چند لمحوں تک اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔

"تم جانتی ہو مجھ سے شادی کرنے کا تمہیں سب سے بڑا نقصان کیا ہوا ہے؟" کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد حارث نے استفسار کیا تھا۔ وہ تو پہلے ہی اس کے انداز پر حیران ہورہی تھی یہ بات سن کر مزید حیران ہوگئی۔

"آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں حارث؟" اس نے حیران نگاہیں حارث پر گاڑ کر پوچھا تھا۔

"شادی سے پہلے تم اپنا ہر دکھ سکھ یہاں اماں سے آکر کہہ دیا کرتی تھیں۔ شادی کے نتیجے میں بھانجی، خالہ کا رشتہ ختم ہوگیا اور ساس بہو کا رشتہ استوار ہوگیا۔ اور یہ اس شادی کا سب سے بڑا نقصان ہے۔" حارث نے گہری سانس اندر کھینچتے ہوئے اسے مخاطب کیا تھا۔

"آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ میں خالہ کی بھانجی نہیں رہی بلکہ ۔۔۔ بہو بن گئی۔"

"نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ میں تمہیں بالکل دوش نہیں دے رہا۔ میرا کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ تمہیں ایسا لگنے لگا ہے کہ اماں اب تمہاری خالہ نہیں بلکہ صرف ایک ساس بن کر رہ گئی ہیں۔" حارث نے وضاحت دی۔

"پتا نہیں آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔" ہانیہ نے بے چارگی سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

"آج ان آنسوؤں کو بہنے سے مت روکو ہانیہ! اپنے جی کا سارا بوجھ میرے سامنے ہلکا کرلو۔ بنا جھجکے تم اپنی ہر فیلنگ مجھ سے شیئر کرسکتی ہو۔ بلیو می! میں اماں کو کچھ نہ بتاؤں گا۔" بات کے آخر میں وہ مسکرایا تھا۔

"خالہ کا یہاں کیا ذکر؟" ہانیہ کے آنسوؤں میں روانی آگئی تھی۔

"خالہ کا ذکر کیے بنا جی کا بوجھ کیسے ہلکا ہوگا ڈیر وائف!" حارث اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل تک گیا تھا۔ ٹشو کا ڈبا اٹھا کر ہانیہ کے پاس رکھا اور پھر اس کے بالکل برابر میں بیٹھ گیا۔

"میں مانتا ہوں ہانیہ! اماں تمہارے ساتھ اکثر زیادتی کرجاتی ہیں۔ تم گھر کے کاموں میں ابھی پوری طرح ایکسپرٹ نہیں ہوئیں۔ آہستہ آہستہ تم سب کاموں میں ماہر ہوجاؤ گی لیکن اماں فی الحال تمہاری معمولی سی غلطی بھی نظرانداز کرنے پر تیار نہیں ہوتیں۔ تم یقیناً" ان کے اس رویے پر ڈس ہارٹ ہوجاتی ہو۔ میں بہت بار اماں کو سمجھا چکا ہوں لیکن اماں تمہیں بہو سمجھتیں تو کچھ رعایت دیتی نا۔ وہ تو روز اول سے تمہیں بیٹی سمجھتی ہیں۔ وہ بیٹی جس کی اپنی ماں اس کے بچپن میں اللہ کو پیاری ہوگئی اور اب اسے طریقہ، سلیقہ سکھانے کی ساری ذمہ داری ان کے کندھوں پر عائد ہوگئی۔ یقین کرو ہانیہ! اماں تم سے بے تحاشا محبت کرتی ہیں۔ وہ تمہاری پیٹھ پیچھے تمہاری بہت تعریفیں بھی کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ تمہارے آنے سے گھر میں ۔۔۔"

وہ بات کرتے کرتے رکا تھا۔ یک دم خیال آیا تھا کہ یہ وقت اماں کی صفائیاں پیش کرنے کا نہیں ہے۔ ان باتوں کے بعد تو شاید ہانیہ شرمندگی کے مارے اماں کے خلاف ایک لفظ بھی نہ بول سکتی جبکہ حارث چاہتا تھا کہ وہ اپنے دل میں جمع چھوٹی سے چھوٹی شکایت، ہر طرح کے شکوے کا کھل کر اظہار کردے۔ یہ سمجھانے کا نہیں، سننے کا موقع تھا۔ واحد طریقہ جس سے ہانیہ کے جی کا بوجھ ہلکا ہوسکتا تھا۔

"تمہیں پتا ہے عینی آپا اور افشاں آپا جب بھی میکے آتی ہیں اماں کے سامنے اپنے سسرال والوں کی ڈھیروں ڈھیر برائیاں کرکے اپنے جی کا بوجھ ہلکا کرکے واپس اپنے گھر کی راہ لیتی ہیں۔ چھوٹے بڑے مسئلے ہر

گھر میں ہوتے ہیں ہانیہ! بدقسمتی سے تمہارے میکے میں کوئی ایسا شخص نہیں جس کے سامنے تم اپنے جی کا بوجھ ہلکا کرسکو۔ چھوٹی چھوٹی باتیں جمع ہو کر تمہارے اندر کی گھٹن کو بہت بڑھادیں گی۔ میں چاہتا ہوں تم مجھ پر مکمل اعتبار کرو۔ بھول جاؤ میں اماں کا بیٹا ہوں۔ اماں سے یا عینی آپا وغیرہ سے جو بھی شکایت ہو' تم بلا جھجک مجھ سے ہر طرح کی بات کرسکتی ہو۔ ہاں آئندہ میں تمہاری آنکھوں میں گلابی ڈورے نہ دیکھوں۔ جانے چھپ چھپ کر کہاں روئی ہو اور کتنا روتی ہو۔ آئندہ صرف میرے کندھے پر سر رکھ کر آنسو بہانے ہیں۔ آئی سمجھ میں بات۔"

حارث نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اوپر کی۔ ہانیہ کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔ حارث نے بہت پیار سے اس کے آنسو پونچھے تھے۔

"خالہ جان سے مجھے ہرگز کوئی شکایت نہیں۔ میں انہیں خالہ کہہ کر مخاطب تو کرتی ہوں لیکن میں انہیں اپنی ماں ہی سمجھتی ہوں۔ پتا نہیں آپ اتنی دیر سے مجھے کیا سمجھا رہے ہیں۔ میرے پلے ایک لفظ نہیں پڑا۔ اگر میں چھپ چھپ کر روتی ہوں تو اس کی وجہ خالہ جان نہیں' آپ ہیں حارث! صرف اور صرف آپ۔" وہ پھر بری طرح رو پڑی تھی۔

"میں؟" حارث کو تو جیسے کرنٹ سا لگا تھا۔ اس نے بے یقینی سے زوجہ محترمہ کو دیکھا۔

"جب مجھے پسند نہیں کرتے تھے تو خالہ جان کے دباؤ میں آکر شادی کی ہامی کیوں بھری۔ کیوں جوڑا ایک ان چاہا رشتہ؟" وہ روتے روتے پوچھ رہی تھی۔

"تم سے کس نے کہا یہ سب؟" حارث سٹپٹا گیا تھا۔

"میں نے خود سنی تھیں اس روز آپ لوگوں کی باتیں۔ عینی آپا کہہ رہی تھیں کہ آپ نے محض خالہ جان کی ناراضی کے خوف سے یہ رشتہ جوڑا تھا۔ خالہ جان اور عینی آپا خوش ہو رہے تھے کہ ان کا انتخاب درست ثابت ہوا اور آپ میرے سنگ خوش ہیں۔ جبکہ میں تو اس دن سے شاک کی حالت میں ہوں۔

میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ آپ کسی دباؤ میں آکر مجھ سے شادی پر راضی ہوئے ہیں۔ حالانکہ مجھے یہ بات بہت پہلے سمجھ لینی چاہیے تھی۔ آپ پہلے دن سے میرے ساتھ دوستانہ تعلق استوار کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ دوستی دوستی کا راگ الاپتے رہے اور میں آپ کی محبت' وارفتگی اور التفات کو ترستی رہی۔ میں آپ کی بیوی تھی حارث! اور آپ مجھے کسی ناسمجھ اور کم عقل دوست کی طرح ٹریٹ کرتے رہے۔ میں خود کو مطمئن کرنے کے لیے لاکھ توجیہات دیں' لیکن پھر میری ساری خوش فہمیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ میں نے آپ لوگوں کی باتیں سن لیں۔ میں زبردستی آپ کی زندگی میں شامل کی گئی۔ یہ انکشاف مجھے کس اذیت میں مبتلا کر گیا' آپ اس کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے۔ میری نگاہوں میں میری ذات دو کوڑی کی ہو کر رہ گئی۔ اس سے تو اچھا تھا میرے بھائی میری شادی شہزاد کے ساتھ..."

"اس سے آگے ایک لفظ نہیں۔" حارث نے بے تحاشا خفا ہوتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔ وہ چپ تو ہو گئی مگر آنسو اب بھی مسلسل اس کے گال بھگو رہے تھے۔ حارث نے گہرا سانس اندر کھینچا تھا۔ صورت حال اس کی توقع کے بالکل برعکس نکلی تھی۔

"تم جس بے یقینی کی کیفیت میں ہو' پتا نہیں میری وضاحت کو قبول کرو گی بھی یا نہیں' لیکن اب تمہیں چپ ہو کر میری بات سننا ہوگی۔ فار گاڈ سیک آنسو بہانا بند کرو۔ یہ آنسو میرے دل پر گر رہے ہیں۔" حارث نے بے چارگی سے اسے مخاطب کیا تھا۔

"ہاں یہ سچ ہے کہ جب اماں نے پہلی بار میرے سامنے تمہارا نام لیا تھا تو میں نے فوراً ہی انکار کر دیا تھا۔ جانتی ہو کیوں؟" حارث نے پوچھا۔ ہانیہ نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے حارث کو دیکھا تھا مگر حارث کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا تھا۔

"میرے انکار کی وجہ تمہارے یہ ہی آنسو تھے مسز!" ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے حارث نے ٹشو کے ڈبے سے ٹشو نکال کر ہانیہ کو تھمائے تھے۔

"پچھلے کئی برسوں سے میں تمہارے ایک ہی روپ سے واقف تھا۔ اور وہ روپ یہ ہی رونے دھونے والا تھا۔ ایک روتی بسورتی لڑکی سے شادی کا میرا قطعاً" کوئی ارادہ نہ تھا۔"

"تو کسی نے گن پوائنٹ پر تو مجبور نہیں کیا تھا آپ کو۔ نہ کرتے مجھ سے شادی۔" اس بار ہانیہ تنک کر بولی تھی۔ حارث نے بہت مشکل سے اپنی مسکراہٹ ضبط کی۔

"مجھے کوئی گن پوائنٹ پر مجبور کر بھی نہیں کر سکتا مسز! میں ذرا وکھری ٹائپ بندہ ہوں۔" حارث نے اسے باور کروایا تھا۔ ہانیہ بس اسے خفگی سے دیکھتی رہ گئی۔

"جس طرح تم نے ہماری باتیں سن کر یہ کھٹراگ پھیلایا۔ اس طرح ایک دن میں نے بھی اتفاق سے تمہاری اور اماں کی باتیں سن لی تھیں۔ وہی دن تھا جب تم اماں کو شہزاد کے رشتے کے متعلق بتا رہی تھیں۔ اس روز تمہارے آنسو میری غیرت پر تازیانہ بن کر لگے۔ میرا بس نہ چل رہا تھا کہ میں شہزاد کو شوٹ کر دوں۔ اماں بھی تمہاری وجہ سے بہت اپ سیٹ تھیں، لیکن میرے ایک بار کے انکار کے بعد اماں نے دوبارہ میرے سامنے تمہارا نام تک نہ لیا تھا' جو کام مجھ سے کوئی زور زبردستی نہ کروا سکا' وہ بس خود بخود ہی ہو گیا۔ تم اسے ہمدردی کا نام دے لو یا فرماں برداری کا۔ بہر حال میں نے اماں کو تمہارے لیے ہاں کہہ دی تھی۔"

"مانتے ہیں نا آپ کہ یہ صرف ہمدردی پلس فرماں برداری تھی۔ مجبوری کا نہ سہی مگر یہ ہمدردی کا بندھن ہے نا۔" ہانیہ کی ہچکیاں پھر شروع ہو گئی تھیں۔

"ہاں نکاح سے پہلے تک یہ ہی صورت حال تھی۔" حارث نے فراخ دلی سے تسلیم کیا۔

"اب یہ مت کہہ دیجئے گا کہ نکاح کے بعد آپ کو مجھ سے محبت بھی ہو گئی ہے۔" وہ روتے روتے بول اٹھی تھی۔ حارث لب بھینچ کر اسے خفگی سے تکتا رہا۔

"اب کیوں خاموش ہو گئے۔ بولتے کیوں نہیں؟"

ہانیہ نے رندھی ہوئی آواز میں اسے مخاطب کیا۔

"کیا کہوں' جو کہنے لگا تھا اس سے تم نے منع کر دیا۔"

"مجھے بہلائیں مت حارث! اتنی بے وقوف اور کم عقل نہیں ہوں میں۔" وہ چڑ کر بولی تھی۔

"بے وقوف تو میں ہوں۔ شادی کے بعد سے اب تک اسی کوشش میں لگا رہا کہ ہمارے درمیان ایک دوستانہ سا تعلق استوار ہو جائے۔ تم مجھ پر اعتماد کرو۔ مجھ سے تمہاری جھجک ختم ہو جائے۔ اپنے دل کی ہر بات تم صرف میرے ساتھ شیئر کرو۔ میں سوچتا تھا' تمہاری زندگی میں پر خلوص رشتوں کی کمی رہی ہے۔ اپنے شوہر کو تم اپنا سب سے پر خلوص دوست مان لو۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں تم سے ڈھنگ سے اظہار محبت بھی نہ کر سکا اور اظہار محبت کرتا بھی تو کیسے۔ ذرا سا رومانٹک ہونے لگتا تھا تو تمہارے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی تھیں۔ میں حیران ہوتا تھا کہ میرے دل میں تمہارے لیے اتنی بے تحاشا محبت اچانک کیسے پیدا ہو گئی' لیکن میں اپنی محبت اور وارفتگی ظاہر کرنے کے بجائے پہلے انڈر اسٹینڈنگ ڈیولپ کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔ بتاؤ ذرا! اس روئے زمین پر مجھ سے بڑا گھامڑ اور کون ہو گا۔ اور جس کے لیے یہ سب کچھ کیا' آج اسی کی عدالت میں پیشی بھگتنا پڑ گئی۔ اس معزز شخصیت سے میری التماس ہے کہ شک کی عینک اتار کر صرف ایک بار میری آنکھوں میں جھانک لے اگر اسے واقعی ان آنکھوں میں محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر نظر نہیں آ رہا تو میں۔ ابھی اسی وقت اسے اچھے سے آئی اسپیشلسٹ کے پاس لے کر جانے لگا ہوں۔"

"آپ واقعی مجھ سے محبت کرتے ہیں حارث!"

کس بے یقین لہجے میں وہ استفسار کر رہی تھی۔ حارث کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔

"کون سی زبان میں کہوں کہ تو تمہیں یقین آئے گا۔" اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ہانیہ نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا تھا۔

"ہاں بتاؤ: نظر آگئی محبت یا واقعی چلیں کسی آئی کلینک پر؟" حارث نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

"اگر یہ اظہار پہلے کر دیتے تو میں کیوں اتنے دن پریشان رہتی۔" ہانیہ کو محبت پر یقین آیا سو آیا' ساتھ ہی پھر سے رونا بھی آگیا۔

"ذرا سی تعریف پر تو تم بیر بہوٹی بن جاتی تھیں۔ رومانس جھاڑنے لگتا تو جانے کیا حال ہوتا تمہارا۔"

حارث اسے شادی کے ابتدائی دن یاد دلا رہا تھا۔

"تو نئی نویلی دلہنوں کو شرم تو آتی ہی ہے نا' اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ شوہر ڈھنگ سے اظہار محبت بھی نہ کرپائے۔" حارث اس شکوے پر بھرپور انداز میں مسکرایا تھا۔

"میری دلہن اب بھی نئی نویلی ہی ہے۔ وہ مطمئن رہے اب اس کا شوہر اس سے محبت بھی کرے گا اور اظہار محبت بھی۔ کہو تو ایک غزل سنا کر اظہار محبت کی شروعات کروں؟" وہ شریر ہوا تھا۔

"بس کریں اب!" ہانیہ کے ہونٹوں پر شرمگیں سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"شروع کہاں کیا ہے اور ابھی سے بس کردوں۔ پھر میرے خلاف ایک اور چارج شیٹ تیار ہو جائے گی۔"

وہ ہنسا تھا۔ ہانیہ بھی جھینپ کر ہنس پڑی۔

"چلو شکر ہے آج ہم دونوں کی غلط فہمیوں کا خاتمہ ہوا۔ تم مجھ سے بدگمان تھیں اور میں سوچ بیٹھا تھا کہ شاید تم اماں کی باتوں پر ڈسٹرب رہتی ہو۔ میں سوچتا تھا جیسے تم اپنے گھر والوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر دل گرفتہ ہو جاتی تھیں' اماں کی باتیں بھی تمہیں ویسے ہی پریشان کرتی ہیں۔"

"آپ مجھے بہت امیچور سمجھتے تھے حارث! مجھے اپنے گھر والوں کی جن چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونا آتا تھا' وہ بے شک آپ کے لیے معمولی ہوں لیکن مجھے ان کے جن رویوں کو مسلسل بھگتنا پڑ رہا تھا' وہ سہنا کسی بھی نارمل انسان کے لیے آسان نہیں تھا۔ میری بھابھیاں مجھے صرف ایک بوجھ تصور کرتی تھیں۔ ان کے سرد و سپاٹ رویوں کو سہتے سہتے جب میں تھکنے لگتی' تو یہاں خالہ کے پاس آکر اپنے جی کا بوجھ ہلکا کرلیتی۔ ماں باپ کے بعد میرا گھر میرے لیے صرف ایک سرائے بن چکا تھا۔ اپنے ہی گھر میں اجنبیوں اور مہمانوں کی طرح رہنا کتنا تکلیف دہ امر ہے' اس کا اندازہ کوئی اور شخص لگا ہی نہیں سکتا۔" ہانیہ تھکے تھکے لہجے میں بولی تھی۔

"چلو' اپنے تکلیف دہ ماضی کو بھول جاؤ۔ اللہ نے مجھ سا محبت کرنے والا شوہر عطا کر کے کیا تمہاری ساری محرومیوں کا ازالہ نہیں کردیا۔"

"آپ سے شادی کے بعد مجھے ماں جیسی خالہ کی شفقت بھری چھاؤں ہمیشہ کے لیے میسر آگئی۔ میری اصل خوش نصیبی یہ ہے جناب!" ہانیہ نے اس بار مسکرا کر جتایا تھا۔

"تو جب ماں جیسی خالہ تمہارے کسی کام میں ماؤں کے انداز میں نقص نکالتی تھی تو تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بجنے لگتے تھے؟" حارث کو بروقت یاد آیا تو پوچھ بیٹھا تھا۔

"صرف اور صرف آپ کی وجہ سے۔ خالہ جب بھی مجھے کچھ سمجھانے لگتیں۔ آپ مجھے ایسے ٹکٹکی باندھ کر گھورنے لگتے کہ خفت کے مارے میرا برا حال ہو جاتا۔ میں سوچتی تھی کہ آپ اپنے دل میں مجھے پھوہڑ سمجھ رہے ہوں گے بس مجھے اسی لیے رونا آنے لگتا تھا۔"

"لو جی! یعنی کہ یہ قصور بھی میرے ہی کھاتے میں درج تھا۔" صدمے اور افسوس سے حارث کا برا حال ہونے لگا۔

"غلط فہمی تھی حارث! اب تو ختم ہوگئی نا۔" ہانیہ نے اسے تسلی دی۔ حارث اسے مصنوعی خفگی سے گھورنے لگا تھا۔

"اچھا اب ایسے ناراض ہو کر تو مت گھوریں۔ پرامس! آئندہ آپ کے خلاف کوئی غلط فہمی دل میں نہیں پالوں گی۔ جو بھی بات ہوگی سب سے پہلے آپ سے شیئر کروں گی۔ آخر آپ میرے بہترین دوست

بھی تو ہیں۔" ہانیہ نے اسے مسکرا کر مخاطب کیا تھا۔
"ہرگز نہیں۔ دوستی والی پیشکش محدود مدت کے لیے تھی۔ اب میں تمہارا شوہر ہوں۔ پہلے تم نے میرا دوستانہ روپ دیکھا تھا۔ اب میری محبتوں کی شدتیں بھی دیکھنی پڑیں گی اور اگر تم نے۔۔۔"
"میں سب کچھ دیکھ لوں گی حارث! پہلے ذرا کچن دیکھ لوں۔ ڈھیر دھلے برتنوں کا انبار جمع ہے اور شام کے کھانے کے لیے بھی کچھ بنانا ہے۔" ہانیہ بوکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ حارث نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ اپنے پاس بٹھایا تھا۔
"تمہارا یہ شرمایا' بوکھلایا سا روپ میرے ہوش اڑا دیتا ہے۔ جان من! پتا نہیں چند ہی دنوں میں کیسا جادو کر دیا مجھ پر۔ ہر وقت ہر گھڑی صرف تمہارے خیالوں میں ہی کھویا رہتا ہوں۔" حارث کی مخمور لہجے میں کی جانے والی سرگوشی' اس کی وارفتگی' ہانیہ اپنے دل کی دھڑکن کو سنبھالنے میں ناکام ہوئے جا رہی تھی۔
"مجھے آپ کی محبت کی صداقت پر دل سے یقین آ گیا ہے حارث! لیکن دوستی والی پیشکش کی مدت تھوڑے عرصے کے لیے اور بڑھا دیں پلیز۔"
وہ دھیرے سے گویا ہوئی تھی۔ اس کی پلکوں کی لرزش اور گالوں پر بکھرتی لالی اس کی دلی کیفیت کا پتا دے رہی تھی۔ حارث محظوظ انداز میں مسکرایا تھا۔
"صرف ایک ڈائیلاگ سن کر یہ حالت ہوئی ہے۔ یہ تو اظہار محبت کی ابتدا ہے بیوی!" اس نے اسے شریر انداز میں چھیڑا۔
"آج کے لیے یہ ہی بہت ہے۔ بس میں اب کھانا بنانے جا رہی ہوں۔" وہ یک لخت اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑاتی تیزی سے کمرے سے باہر نکلی تھی۔ حارث کے لبوں پر دلکش مسکراہٹ بکھر گئی۔ ماں کی فرماں برداری کا کیا خوب صورت اور حسین انعام ملا تھا اسے۔ اس کا رواں رواں اپنے رب کا شکر گزار تھا۔ بہت مطمئن انداز میں وہ بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔
اب وہ آنکھیں موندے دل ہی دل میں رومانٹک سی غزل یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا' جو آج شب اسے اپنی بیوی کو سنا کر باقاعدہ اور بھرپور اظہار محبت کرنا تھا۔ کیونکہ ہانیہ کا شکوہ بجا تھا۔ اظہار کے بنا محبت ادھوری تھی۔ اب اسے محبت بھی کرنی تھی اور ساتھ ہی اس کا بھرپور طریقے سے اظہار بھی۔ ساتھ ہی یہ اعتراف بھی کہ محبت کے بنا اس کی زندگی ادھوری تھی بالکل ادھوری کیونکہ محبت ہی تو زندگی ہے۔

☼

فریدہ فرید

راز ی نے، ریزن دیا تھا یا مذاق کیا تھا۔ ساتوں نفوس کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ ربیعہ کو لگا اس نے کچھ غلط سنا ہے۔ ہالہ اور خولہ ایک دوسرے سے تصدیق کرنے لگیں۔ عباد اور نعمان کے قہقہے پھوٹ پڑے تو ثانی کی گھوری بڑی زوردار تھی۔ لوفریت میں نمبرون نادر نے سیٹیوں کا طوفان مچادیا۔

یونیورسٹی فیلوز نے مل کر ویلنٹائن ڈے کے لیے اسپیشل پروگرام بنایا تھا۔ اور ثانی کے گھر میں اکٹھے ہو کر سلیبریٹ کرنے کا پروگرام پچھلے سات دن سے ان کے درمیان زیر بحث تھا۔ سب سے زیادہ ایکسائٹمنٹ اس دن کے حوالے سے وہ شرط تھی جس میں آٹھوں دوستوں نے مل کر طے کیا تھا کہ اس ویلنٹائن پر جس کو سب سے زیادہ سرخ گلاب، پھولوں کے گلدستے اور تحائف ملیں گے وہ ونر ہو گا۔

اس شرط کے حوالے سے عباد اور نادر نے اپنی ورجن کے حساب سے موبائل فون گرل فرینڈز کو تیار کر رکھا تھا۔ دونوں میں سے ہر ایک کا دعوا تھا کہ زیادہ تحفے وہ حاصل کرے گا۔ دوسری طرف نعمان اور ربیعہ نے تو پہلے سے ہی بکے آرڈر کر رکھے تھے۔ شرط جیتنے کے لیے پچھلے دو ماہ کی ساری جیب خرچی وہ اس ایڈونچر پر صرف کر چکے تھے۔ بھلا کسی کو کیا خبر ہوتی کہ پھول کسی نے دیے ہیں یا انہوں نے خود خریدے ہیں۔

ادھر خولہ اور ہالہ صرف پیدائش میں جڑواں نہ تھیں۔ عادات اور سوچ بھی یکساں تھی دونوں نے پچھلے کئی دن کی نیند برباد کر کے اپنی استعمال شدہ جیولری، سوٹ پیس اور گھر پر ہی موجود قدرے بہتر حالت میں موجود ڈیکوریشن پیس کو ویلنٹائن کے حوالے سے چمکیلے ریپرز میں سجا کر وہ تحائف تیار کیے تھے جن پر لکھے نام ان لوگوں کے تھے جن کا دنیا میں کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ یہاں کون سی سی آئی ڈی لگی تھی جو اصل بات جان سکتی۔ چیٹنگ میں نمبرون ثانی بھلا کہاں پیچھے رہنے والی تھی۔ تمام موبائل نیٹ ورکس کے تمام ایس ایم ایس اور کال پیکیجز سے جتنا فائدہ اٹھا سکتی تھی اٹھایا دن دگنی رات چوگنی کے محاورے پر عمل کرتے ہوئے اتنے فرینڈز بنا چکی تھی کہ اسے سو فیصد یقین تھا کہ اس کی سحر طراز باتوں میں گرفتار دوستوں میں سے اگر نصف نے بھی گلاب کا ایک ایک پھول بھیجا تو وہ یقیناً شرط جیت جائے گی۔

اب اتنے پاور فل ایونٹ پر رازی نے ایک دن پہلے شریک ہونے سے معذرت کرلی۔

☆ ☆ ☆

"ہاؤ سلی یو آر رازی، تم ویلنٹائن پارٹی میں آنے سے کیسے انکار کر سکتے ہو؟" ثانی نے اتنی دل گرفتگی اور اچنبھے سے کہا۔ گویا کوئی گمراہ رمضان کا فرض روزہ بنا کسی عذر کے چھوڑ دے تو یہ سن کر کسی واعظ کو بھی اتنی تکلیف نہ ہوگی جتنا ویلنٹائن ڈے پر نہ آنے کا سن کر رازی کے گروپ فرینڈز پر گزر رہی تھی۔

"میں جانتا ہوں یہ پارٹی میں آنے سے کیوں انکار کر رہا ہے۔"

نعمان نے رازی کی مسلسل خاموشی پر نکتہ اٹھایا۔ وہ رازی کے بالکل سامنے بیٹھا تھا اور باقی تمام دوست

دونوں کے درمیان 'رازی کی خاموشی اور نعمان کے اچانک تجسس پھیلانے پر سب نے ایک ساتھ رازی کی طرف سے گردن گھما کر نعمان کی طرف موڑی جیسے ریڈار گھومتا ہے۔

"کیونکہ اس کو کسی نے لفٹ ہی نہیں کرائی اور گلاب کا پھول کیا۔ اسے تو کوئی گلاب کی پتی بھی نہ دے۔ یہ شرط ہارنے کے خوف سے بھاگنے کے چکر میں ہے۔"

نعمان اپنی طرف سے بڑی پتے کی بات لایا تھا۔ مگر کسی نے اس کی اس بات کو اہمیت نہ دی۔

"یار لاسٹ ٹائم دادو نے مجھے سرپرائز کیا تھا۔ اس بار مجھے انہیں سرپرائز دینا ہے۔ میں تیرہ فروری کی رات کو پاکپتن چلا جاؤں گا۔ تاکہ چودہ فروری کا سورج جب طلوع ہو تو میری دادو سب سے پہلے میرا چہرہ دیکھیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے بڑا تحفہ ان کے لیے ویلنٹائن ڈے پر کوئی اور نہیں ہو سکتا۔"

راذی نے ویلنٹائن پارٹی میں شرکت کی جو وجہ بتائی تھی۔ وہ بلاشبہ سب کے لیے حیرت سے کم نہ تھی۔ ویلنٹائن جیسا حسین و رومانوی دن جسے ظاہرا" ایک دھڑکن رکھتے دو دلوں کے وصال کا دن کہا جاتا ہے۔ مگر درپردہ شرم و حیا' حدود و قیود سے ماورا غیر اخلاقی حرکتوں کے، داؤ پیچ کا دن ہے اور منانے والے وہ جو عشق کے ہجر و وصال کے مفہوم سے بھی ناآشنا ہوتے ہیں۔

ویلنٹائن کے بابت ایسی سوچ رکھ کر پروان چڑھنے والی نئی نسل کے لیے دادی اور پوتے کے مابین ایسی کسی سرگرمی کا ہونا باعث حیرت نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔

☼ ☼ ☼

"ثانی کیا بات ہے مائی ڈیر آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

وہ پارہ صفت طبیعت کی مالک تھی۔ سکون سے بیٹھنا اس کی سرشت میں نہ تھا۔ ماں' باپ کی اکلوتی اولاد ہونے کے باعث من پسند لائف گزارنے کے تمام حق رکھتی تھی۔ عید' شب برات اسے یاد ہو نہ ہو نیو ایر اور ویلنٹائن ڈے پر اس کا جوش و خروش دیدنی ہوتا تھا۔ فادر ڈے پر پاپا کو شرف ملاقات بخشتی تھی تو مدر ڈے پر ماما کو لفٹ کراتی تھی۔ بزنس میں الجھے فادر اور ویلفیئر ایکٹوٹیز میں مصروف ماما کے لیے یہی بہت تھا۔ مگر اس نئے سال کی ویلنٹائن پر کیا عجب ہوا کہ ثانی منہ سر لپیٹے روم بند کیے بیٹھی تھی۔ ماما کی تشویش بجا تھی۔

"ماما! اس اسٹوپڈ راذی نے سارا پروگرام خراب کر دیا۔ ویلنٹائن منائے گا اپنی دادو کے ساتھ' کتنی اسٹوپڈ سی بات لگتی ہے یہ۔"

ثانی بھڑک رہی تھی۔ راذی کی حرکت کا سن کر ماما کو بھی حیرت ہوئی۔ ویلنٹائن ڈے پر بوڑھوں کا کیا کام۔

"اس دقیانوسی کو رہنے دو' یہ کنویں کے مینڈک۔ نہ خود خوش ہوتے ہیں' نہ دوسروں کو ہونے دیتے ہیں' تم اپنی سیلیبریشن کرو۔"

ماما نے بھی خوب ناک چڑھا کر رائے زنی کی۔ اب وہ کیا بتاتی کہ سیلیبریشن تو ہوتا ہی تھی۔ دیگر احباب تو تھے ہی۔ مگر راذی کے بنا اس کا دل کہاں خوش ہوتا تھا؟

راذی نے نہ صرف خود ویلنٹائن کی شکل تبدیل کر دی تھی۔ بلکہ ان سب کو بھی مشورہ دیا تھا کہ شرط کے انداز کو قدرے ترمیم کے ساتھ رکھا جائے۔ گلاب کے پھول بکے کے ساتھ گلدستہ دعا بھی ایڈ کیا جائے۔ جو اس دن سب سے زیادہ دعاؤں کا ذخیرہ اکٹھا کرے گا وہی ونر ہوگا اور دعاؤں کا خزانہ ان بزرگوں کے پاس ہے جنہیں ہم کھنڈرات کہہ کر خود سے دور کر دیتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

"میری دادو' تایا ابو کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔ لاہور شفٹ ہو جانے کے بعد میرا ان سے کئی سالوں سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ بابا کب جا کر ان سے مل آتے تھے۔ مجھے کچھ خبر نہیں۔ فون پر ان کی مٹھاس بھری آواز دل کو اچھی لگتی تھی۔ مگر اتنی نہیں کہ دوڑ' دوڑا چلا جاؤں۔ مگر لاسٹ ایر دادو دل کے ہاتھوں مجبور اپنے پوتے کا چہرہ دیکھنے کے لیے' اچانک چلی آئیں۔ انہیں ویلنٹائن کے بابت کچھ خبر نہیں۔ وہ کوئی تحفہ یا پھول نہیں لائی تھیں۔ ہاں اتفاق تھا کہ جب وہ میرے سامنے آئیں تو کیلنڈر پر چودہ فروری کھلکھلا اٹھی تھی۔ میرے ہاتھوں میں تحائف کا ڈھیر تھا جو میرے فرینڈز کے لیے تھا۔ مگر وہ بوسہ جو میری پیشانی پر ان کپکپاتے ہونٹوں نے دیا۔ بائے گاڈ دنیا کا کوئی تحفہ اس لمس سے قیمتی نہ تھا۔ کوئی سیلیبریشن اس ایک Hug سے بڑھ کر نہ تھی جو دادو کی نحیف بانہوں میں میں نے منائی۔ یوم وفا اگر منانا ہے تو اس مقدس رشتوں سے مناؤ' سچی خوشی پاؤ گے۔"

راذی انہیں قائل کرنے کے درپے تھا۔ جن کے چہرے کے زاویے قطعاً" دیکھنے کے لائق نہ تھے۔

"میرے خیال میں راذی تمہیں تبلیغی جماعت جوائن کر لینی چاہیے۔"

نادر نے تمام تر لیکچر کو پھونکوں سے اڑاتے ہوئے

طنزیہ کہا۔

"وفا کر گئے، ہوئے پھولوں میں نہیں یارو.. ان بزرگوں میں ہی ملے گی۔ تمہارے قیمتی پھول کا حق دار ہرا ایرا غیرہ نہیں، بلکہ وہ ہیں جو تمہاری اصل تمہاری پہچان ہیں۔ محبت سڑکوں پر نہیں 'اپنوں سے رابطوں میں ملتی ہے۔ مسلی ہوئی کلیوں کے تحفے تمہیں کیا لطف دیں گے، جو ان بوڑھے لبوں سے نکلی دعائیں تمہیں دیں گی۔"

رازی پر کسی طنزو تحقیر کا اثر نہیں تھا۔ وہ اپنی کہے جا رہے تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ نسل نو موم کی مانند ہوتی ہے۔ جس سانچے میں ڈھالو ڈھل ہی جاتی ہے۔

☼ ☼ ☼

"پاپا! آپ کے پیرنٹس کہاں ہیں؟"

ثانی کا سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ ناشتے کی میز پر شاذو نادر ہی اکٹھا ہوتے اس کے ماں' باپ کو حیرت زدہ کر دیا۔ ثانی جیسی موج مستی میں مگن لڑکی سے ایسے استفسار کی امید ہی کب تھی؟

"کیا بات ہے ثانی! تمہیں بھی رازی والا وائرس تو نہیں لگ گیا۔"

"او نو ماما. میں تو بس جسٹ فار انفارمیشن پوچھ رہی تھی۔"

ماما جو رازی والے قصے سے واقف تھیں۔ طنزیہ بولی تھیں۔

"ثانی! آپ کے دادا ابو کا انتقال ہو گیا ہے اور دادی ماں گاؤں میں رہتی ہیں اکیلی۔"

پاپا کے اچھی خاصی سوچ بچار کے بعد مختصر جواب دینے پر ثانی نے اچنبھے سے "اکیلی؟" کہا۔

"نہیں' ایک غریب فیملی کو ساتھ رکھا ہوا ہے۔ انہی کے مسائل میں الجھی رہتی ہیں۔"

پاپا کا ہر سوال کا جواب دینا ماما کو اچھا خاصا کھٹک رہا تھا۔ اوپر سے پاپا کی جھکی نگاہیں' ہلکی سی پشیمانی کا عکس انہیں غصہ دلانے کے لیے کافی تھا۔

"آپ آفس سے لیٹ ہو رہے ہیں اور ثانی... فضول وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنی اسٹڈی پر توجہ دو۔"

ماما بیک وقت دونوں کو اس فضول موضوع سے دور کرنے کی غرض سے گویا ہوئیں۔ بھلا جنہیں شادی کی ابتدا سے ہی مکھن میں سے بال کی طرح نکال دیا تھا۔ آج اتنے سالوں بعد ان کا تذکرہ چہ معنی دارد۔۔۔

☼ ☼ ☼

"رازی! تم اب تک اپنی ضد پر اڑے ہو یار! صرف پانچ گھنٹے رہتے ہیں ویلنٹائن ٹائم اسٹارٹ ہونے میں۔ کل کا دن کتنی موج مستی کا ہو گا۔ تم اپنی دادو کو کسی اور دن سرپرائز دے دینا۔ ان کے لیے تو سارے دن ہی ویلنٹائن ہیں۔ 14 فروری کو ضائع مت کرو۔" ثانی اس دن کے واک آؤٹ کے بعد آج پھر گروپ ڈسکشن میں شامل ہوئی تھی اور سب کی طرح اسے سمجھانے کا فریضہ انجام دے رہی تھی۔

"دادو نہیں جانتیں 14 فروری کیا ہے؟ میں تو جانتا ہوں اور میں اپنا ویلنٹائن ڈے شاندار بنانا چاہتا ہوں۔"

"دادو سے لپٹ کر؟"

ہالہ نے اس کے انوکھے شوق پر چوٹ کرتے ہوئے بات مکمل کی۔ اس کی بات پر منہ بسورتے سب کے قہقہے نکل پڑے۔

"آف کورس! کیا ہی مہک تمہارے گلاب کے کاغذی پھولوں میں ہو گی جو میری دادو کے ٹچ میں ہے۔"

رازی اگر انہیں قائل نہیں کر پا رہا تھا تو یہ کوشش ان ساتوں کی بھی کامیاب نہ ہو رہی تھی۔

"بٹ رازی! اگر گرینڈ پیرنٹس نہ ہوں تو پھر۔"

عباد کے سوال نے سب کو چونکا دیا۔ وہ اب تک کے تمام مباحثے میں محض خاموش تماشائی تھا۔ اس کی کشمکش کا اصل کیا تھا۔ اب سامنے آیا تھا۔

"سو واٹ! ایسے رشتے کبھی مرتے نہیں' زندگی میں نہیں ملے تو اس ویلنٹائن پر ایک کلی ان کی قبر پر رکھ

دینا۔ ایصال ثواب کے لیے ایک بار درود پاک پڑھ لینا' سب سے بیسٹ ویلنٹائن تمہاری ہی ہوگی۔"
"دا لس انف رازی! تمہارا لیکچر اب میری برداشت سے باہر ہے۔"
ثانی اس نئے سبق پر آگ بگولہ ہو کر ایک بار پھر واک آؤٹ کر گئی۔
"رازی! میرے دادا' دادی ہمارے ساتھ ہی گھر کے ایک روم میں رہتے ہیں۔ میں نے انہیں آخری بار کب سلام کیا تھا۔ مجھے تو یاد بھی نہیں۔ اصل میں امی ان سے زیادہ میل جول رکھنا پسند نہیں کرتیں اور ابو نے بھی کبھی اصرار نہیں کیا۔"
نادر ماحول کے زیر اثر آتے ہوئے ان کا ذکر کرنے لگا۔
"تو دیر کس بات کی ہے۔ اس ویلنٹائن پر لیٹس ڈو اٹ! رازی نے فوراً" حل پیش کیا۔
"بٹ رازی! میری وہ درجن بھر گرل فرینڈز کا دل ٹوٹ جائے گا۔ جن کے ساتھ میں نے کل ویلنٹائن منانی ہے۔"
نعمان نے خباثت سے بھرانداز میں کہا۔ لیکن اس کی بات میں بھی متفق ہونے کی جھلک ملتی تھی۔
"درجن کے قریب فیک فرینڈز کے لیے تمہارے پاس ٹائم ہے۔ صرف چند منٹس رئیل رشتوں کے لیے نہیں نکال سکتے۔ اگر انہوں نے تم میں اپنی تربیت کے رنگ نہ بھرے ہوتے تو آج تم رنگ رلیاں منانے کے لائق نہ ہوتے۔"
یہ لیکچر رازی کے نہیں ہالہ کے لبوں سے نکلا تھا۔ سب دم سادھے اس کی صورت دیکھنے لگے۔ رازی نے باقاعدہ تالیاں بجائیں۔ ہالہ کی جڑواں خولہ کیا سوچ رکھتی تھی۔ کہنا ضروری نہ تھا۔ وہ دونوں اور ان کی سوچ ایک دوسرے کا پرتو تھی۔

☼ ☼ ☼

14 فروری کلینڈر کا ایک عام سا دن' کس من چلے' دل جلے' سر پھرے نے اسے "محبتوں کا دن" بنا کر نوجوان نسل کو ایک نئی جہت عطا کی۔ کاش وہ سامنے آتا تو اسے بتاتے کہ ہمارے اولڈ ہومز میں بھی اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ تہوار خود غلط نہیں ہوتے۔ انہیں منانے کا انداز اس کے صحیح یا غلط ہونے کا تعین کرتا ہے۔
"آج کے دن کا ونر کون ہے؟"
رات گئے اکٹھے ہونے والے دوستوں نے شرط کے حوالے سے دریافت کیا۔ نہ تو نعمان اور ربیعہ نے خود ہی سے خریدے کیک' کارڈ' نہ نادر اور عباد کی فیک فرینڈز نے تحائف کے انبار بھیجے۔ نہ ہالہ اور خولہ خود ہی سے بنائے گفٹ' سامنے لا سکیں۔ پھر شرط کس بات کی اور ونر ہونے کا کیا جواز؟
"اگر تم لوگ وہ نشان محبت دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہو جو میری دادو نے بوسوں کی صورت مجھے گفٹ کیے ہیں تو یقیناً" ونر میں ہی ہوں۔"
رازی نے اپنی ماتھے' گال' ناک' ٹھوڑی کو انگلی سے چھو کر تفاخر سے کہا۔
"نہیں... اگر میرا چہرہ تمہیں وہ خوشی دکھا سکتا ہے جو میرے دادا' دادی کو آج کی صبح میرے ان کے پاس جا کر سلام پیش کرنے سے حاصل ہوئی تو ونر میں ہوں گا۔"
نادر کے لہجے میں سچی خوشی کی جھلک چھپائے نہ چھپتی تھی۔
"نہیں... وہ ایک پھولوں کا ہار جو میں اپنے مرحوم دادا' دادی کی قبر پر چڑھا کر آیا ہوں۔ اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ شرط تو میں ہی جیتا ہوں۔"
عباد کو معلوم نہیں پتھر کی قبر سے سکون و محبت کو کون سے خزانے ملے تھے کہ اس کا چہرہ سورج کی مانند دمک رہا تھا۔
"تم لوگوں کے پاس صرف الفاظ ہیں جو نظر نہیں آتے۔ لیکن دیکھو! میرے پاس ثبوت ہے کہ شرط میرے ہاتھ سے کہیں نہیں گئی۔"
ربیعہ نے سو روپے کا مڑا تڑا بوسیدہ نوٹ سب کی نگاہوں کے سامنے لہرایا۔ سب بن کہے جان گئے کہ

چائے کا ایک کپ پلانے پر دادا نے پوتی کو انعام الفت سے نوازا تھا۔

"ہمارے دادا دادی نہیں ہیں مگر آج تایا ابو اور پھپھو کے لیے کیک اور کیک لے جاتے ہوئے ہم نے محبت و روابط کو ایک نیا موڑ دیا ہے۔ ہم سے جیت کے دکھاؤ۔"

ہالہ اور خولہ نے تفاخر سے فرضی کالر جھاڑ کر سب کو دیکھا۔ کوئی شک نہیں کہ ونر کہلائے جانے کے بہت قریب تھیں وہ دونوں۔

"ہر گز نہیں۔ تم نے کوئی تیر نہیں مارا میرے گرینڈ پیرنٹس نہیں۔ پاپا اکلوتے ہیں ان کے کوئی بہن بھائی نہیں۔ میں نے ایک پیارا سا گفٹ اپنے پڑوسی احسن صاحب کو پیش کیا۔ اب بتاؤ انعام کی رقم کہاں ہے؟"

نعمان کو درجن کے حساب سے کم عقلوں کو گفٹ بانٹتے "ایک کار خیر کا خیال آنا یقیناً" آئندہ کے لیے مثبت نتائج سامنے لے کر آئے گا۔

"بٹ رازی! ثانی نہیں آئی۔"

ربیعہ نے اچانک اس طرف توجہ مبذول کرائی تھی مگر یہ بات تو سب ہی کے دلوں میں کھب رہی تھی۔ وہ ان کے گروپ کی سب سے دل عزیز ممبر تھی۔ اس موقع کے لیے تو سب سے زیادہ پرجوش بھی وہی تھی مگر اس انوکھی ویلنٹائن پر سمجھوتا کرنے کو تیار نہیں ہوئی۔ سب اس کی کمی، شدت سے محسوس کرنے لگے۔

رازی کو نمبر ڈائل کرتے دیکھ کر سب جان گئے کہ وہ ثانی کو فون ملا رہا ہے۔

"ہیلو آنٹی! رازی بات کر رہا ہوں۔ ثانی کہاں ہے؟" ثانی کا موبائل مسلسل آف جا تا دیکھ کر اس نے اس کی ماما کا نمبر ملایا تھا۔

"محترم واعظ صاحب! وہ آپ کے کہے پر زیادہ ہی کنسنٹریٹ کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اپنی ماما کے کہے کو بھی اگنور کر دیتی ہے۔"

چبا چبا کے بولتی آنٹی مزید بات کے موڈ میں نہ تھیں۔ عمران کے کہے چند الفاظ رد کیے جانے لائق نہیں تھے۔ اسی لیے رازی نے فوراً" ثانی کے پاپا سے رابطہ کیا۔

"ہاں بیٹا! ثانی کے دل میں نجانے کیا سمائی؟ وہ آج صبح اپنی دادی ماں سے ملنے گاؤں چلی گئی ہے۔"

ثانی کو کس لمحے ہدایت کے تحفے نے سرفراز کیا کہ وہ بھی اس نئی ویلنٹائن کی سیلیبریشن کا حصہ بن گئی۔

سب کی خوشی دیدنی اور فطری تھی۔ سیٹیاں بج رہی تھیں۔ تالیاں پیٹی جا رہی تھیں۔ خوشی کے نغمے گائے جا رہے تھے۔ ثانی کے عمل نے سب کے دل کے شگوفے کھلا دیے تھے۔ نہ کسی نے زبان سے کچھ کہا، نہ بحث و تکرار ہوئی اور ایک سرپھری 'من موجی' نئی تہذیب کے رنگوں میں رنگی ثانی خود بخود اس ویلنٹائن کی فاتح قرار پا گئی تھی۔

ایک بند کمرے میں آٹھ نفوس نے ویلنٹائن کا ایک نیا انداز ایجاد کیا تھا۔ گر اللہ نے چاہا تو ایک دن ساری دنیا اس پر عمل پیرا ہوگی۔ خوشیوں کے مواقع جتنے ہوں، کم ہیں، مگر ہر تہوار تہذیب و اقدار کے دائرے میں ہو تو سچی خوشی تخلیق پاتی ہے۔

کنیز نور علی

نیا، چینل پر میزبان بول رہا تھا۔

"ناظرین! موجودہ صورت حال کے بارے میں ہم نے حکومتی موقف جاننے کے لیے وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے ہم سے بات کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اپوزیشن کا موقف آپ کے سامنے ہے۔ آپ اسکرین پر مناظر دیکھ سکتے ہیں کہ پُرامن مظاہرین پر تشدد کیا جا رہا ہے۔ ایسی صورت حال میں ہم تازہ ترین اطلاعات سب سے پہلے، آپ تک پہنچا رہے ہیں۔ آپ کو بتاتے چلیں کہ اپوزیشن پارٹی کے ترجمان نے اب سے کچھ دیر پہلے ہم سے بات کرتے ہوئے واضح کیا ہے، کہ ہمارے کارکنان کامل طور پر پرامن ہیں اور احتجاج کرنا ہمارا بنیادی حق ہے۔ ایسے میں حکومتی رویہ سمجھ سے بالاتر ہے۔ ایک طرف حکومت جمہوریت کے راگ الاپتی ہے، اور دوسری طرف کھلم کھلا ریاستی دہشت گردی کی جا رہی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ حکومت نے سازش کے ذریعے ہمارے پرامن مظاہرین پر تشدد کرنے کی کوشش کی لیکن عوام نے ان کی سازش کو ناکام بنا دیا ہے تو حکومت اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئی اور پولیس پرامن مظاہرین پر پل پڑی۔ پولیس کو ذاتی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا موجودہ حکومت کا شیوہ رہا ہے۔ یہ کہنا تھا اپوزیشن پارٹی کے ترجمان کا۔

انہوں نے مزید کہا کہ پولیس گردی کے ذریعے حکومت عوام کی آواز کو دبا نہیں سکتی اور دوسری طرف۔ ناظرین! ہم نے حکومتی موقف جاننے کے لیے وفاقی وزیر اطلاعات سے رابطہ کیا تو انہوں نے ہم سے بات کرنے سے ہی انکار کر دیا۔

ناظرین! ہماری ہمیشہ کوشش رہی کہ دونوں اطراف کا نقطہ نظر آپ تک پہنچائیں۔ ہم نے اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے آج بھی سب سے پہلے نیوز بریک کی اور ہر لمحہ بدلتی ہوئی صورت حال کی مکمل خبر فوٹیج کے ساتھ آپ تک پہنچائی۔ ناظرین! وفاقی وزیر اطلاعات نے ہم سے بات کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ کیا یہ آزادی اظہار کی نفی نہیں ہے۔ حالانکہ ہم دونوں اطراف کا نقطہ نظر واضح طور پر آپ تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں اسکرین پر مناظر۔ حکومت کی جانب سے کوئی عہدیدار اس حوالے سے بات کرنے کو تیار نہیں۔" میزبان اپنے چینل کی پالیسی کے مطابق حکومت کو رگید رہا تھا۔

صبا نے اگلا چینل بدلا۔ پیلا چینل آ گیا تھا۔ یہاں کی میزبان بہت روانی سے، کہہ رہی تھی۔

"ناظرین! حکومت صبر و تحمل اور برداشت سے کام لے رہی ہے اور پُرتشدد مظاہرین کو آپ اسکرین پر دیکھ سکتے ہیں۔ کیسے وہ لاٹھیاں اور ڈنڈے اٹھائے ہوئے ہیں اور توڑ پھوڑ میں مصروف ہیں۔ وفاقی وزیر اطلاعات نے اب سے کچھ دیر پہلے ہم سے بات کی ہے جس میں انہوں نے واضح کیا ہے کہ حکومت قانون ہاتھ میں لینے والوں کے خلاف کارروائی کرے گی۔ عوام کے جان و مال کی حفاظت ہماری اولین ترجیح ہے۔ تشدد، دھمکی اور دھونس کے حربے استعمال کرنے والے جان لیں کہ ہم ڈرنے والے نہیں۔ احتجاج

آپ کا حق ہے لیکن قانون ہاتھ میں لینے کی اجازت ہرگز نہیں دی جائے گی۔ پولیس اپنے دائرہ کار کے اندر رہتے ہوئے کارروائی کرے گی۔ سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے والوں سے آہنی ہاتھوں سے نمٹا جائے گا۔ یہ کہنا تھا وفاقی وزیر اطلاعات کا۔ ناظرین! انہوں نے مزید کہا کہ اپوزیشن پارٹی کے لیڈر مسلسل عوام کو اشتعال دلا رہے ہیں۔

ناظرین! تازہ ترین خبر آپ تک پہنچائیں کہ مظاہرین پولیس پر پتھراؤ کر رہے ہیں۔ انہوں نے ڈنڈے اٹھا رکھے ہیں۔ مشتعل مظاہرین اس سے پہلے

کچھ گاڑیوں کی توڑ پھوڑ کر چکے ہیں۔ جس کی فوٹیج آپ اس وقت اسکرین پر دیکھ سکتے ہیں۔ حکومتی موقف آپ کو ایک بار پھر بتاتے چلیں کہ وفاقی وزیر اطلاعات نے کہا ہے کہ حکومت صبر و تحمل اور برداشت کا مظاہرہ کررہی ہے۔ تشدد کی راہ اپنانے والوں کو اپنے انجام سے ڈرنا چاہیے۔ پاکستانی عوام ایسے طرز سیاست کو رد کرتے ہیں۔ اپوزیشن پارٹی کو ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھنا چاہیے۔"

پیلا چینل اپنی پالیسی کے مطابق اپوزیشن پارٹی کو رگید رہا تھا۔

صبا کے ماتھے پر فکرمندی کی لکیریں اور گہری ہوگئی تھیں۔

"ابا یہ کیا بنے گا۔" اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی بھی پھیل گئی تھی۔ "ملک کے حالات....."

سوال ادھورا ہی رہ گیا اور وہ یاسیت سے کسی غیر مرئی نقطے کو دیکھتی چپ سی ہوگئی۔ بھلا کیا بولے۔ یہ تو ایک روایتی سا گھسا پٹا سا جملہ ہوگیا ہے کہ ملک کے حالات کب بدلیں گے۔ کیا بنے گا۔ اب تو پوچھتے ہی حیا آتی ہے۔ ڈر لگتا ہے' خوف آتا ہے کہ کیا پوچھ رہے ہیں۔ لیکن پاس ہی بیٹھے ابا اسکرین سے نظریں ہٹا کر اس کی جانب متوجہ ہوچکے تھے۔

انہوں نے ٹی وی اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ہر چینل کی اپنی پالیسی ہوتی ہے نا۔ نیلا چینل اپنی پالیسی کے مطابق کام کرتا ہے اور خوب خوب کما رہا ہے۔ پیلا چینل اپنی پالیسی کو فالو کرتا ہے۔ وہ بھی خوب چل رہا ہے۔ ایسے ہی تم بھی سوچ لو' بلکہ ہر وہ شخص جسے یہ سوال تنگ کرتا ہے۔ ملک کے حالات والا سوال کرنے والا بھی اپنی ایک پالیسی بنالے اور پھر اس پر کام شروع کرلے۔ پھر اور کچھ نہ بھی بدلا تو وہ ایک شخص ضرور بدل جائے گا۔ اپنی پالیسی بناؤ اور شروع ہوجاؤ۔ ادھر ادھر نہ دیکھو۔ وقت سونے' ہیروں' جواہرات سے بہت بہت زیادہ قیمتی ہے۔ اسے ایک دھن میں ایک مقصد میں لگاؤ۔ پھر تمہیں یہ سوال تنگ نہیں کرے گا۔ سارا دن تم یہ نیلے پیلے ہرے چینل دیکھ کر اپنا سونے جیسا وقت سیاہ کردیتی ہو۔ یہ ایک بات ہی سیکھ لو ان سے' پالیسی بنانا اور اس پہ چل پڑنا۔" ابا شاید اس کے فارغ رہنے سے زیادہ ہی عاجز آئے بیٹھے تھے۔

صبا بھی پاکستان کے ڈھیر سے لوگوں کی طرح ٹی وی اور انٹرنیٹ کی ڈسی ہوئی تھی۔ اس نے ابا کی ساری گفتگو کو ذہن میں جما کر رکھنے کی سعی کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ وہاں ارادے کی مضبوطی کی چمک تھی' لیکن اس کی اپنی آنکھوں میں اب بھی بے یقینی تھی۔ بے حوصلگی تھی' جسے ابا نے پڑھ لیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس پر ہر تھوڑے عرصے بعد ایسے ڈپریشن کے دور آتے ہیں کہ وہ ٹوٹ سی جاتی ہے۔ ایسے میں وہ اکثر باتوں سے اس کا کتھارس کرتے تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ اب وہ اس ذہنی رویے پر قابو پائے۔ کوئی راستہ اپنائے' کوئی مقصد چنے' بس فارغ نہ رہے۔ وہ ایک بار پھر مضبوط لہجے میں گویا ہوئے تھے۔

"تم اپنے حصے کا کام کرو' اپنے حصے کی شمع جلاؤ' جب تک ایسا نہیں کروگی' تب تک ایسے ہی چیزوں پر تم کڑھتی رہوگی۔ کبھی ملک کے حالات پر روؤگی' کبھی معاشرے میں ہونے والی ناانصافی پر کڑھوگی۔ کبھی گھریلو جھگڑے تمہیں پاگل کریں گے۔ کبھی دوسروں کی خودغرضی تمہیں گھائل کرے گی۔ کیونکہ یہ چینلز تو صرف پیسہ کما رہے ہیں۔ رہی حکومت تو حکومت اور اپوزیشن دونوں کچھ نہیں کریں گے۔ جو کرنا ہے عوام نے' ہماری نوجوان نسل نے کرنا ہے۔ خود کو پہچانو۔ اگر ہر شخص اپنے حصے کا چراغ جلالے تو چاروں طرف روشنی پھیل جائے گی۔ اندھیرے کو مٹانے کے لیے آگے بڑھنا پڑے گا۔"

انہوں نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ صبا کو محسوس ہوا کہ ان کے ہاتھ کے لمس کا سکون اس کے اندر داخل ہورہا ہے۔

☼

نظیر فاطمہ

پنجابی کی ایک مشہور کہاوت ہے۔ ”کوئی رکھ وی کدی کلا نہ ہوئے۔“ (کبھی کوئی اکیلا اور تنہا نہ ہو۔) بالکل سولہ آنے درست ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ کلا پتر یعنی اکلوتا بیٹا بھی کسی کا نہ ہو۔ خاص طور پر وہ بیٹا جو سات بیٹیوں سے چھوٹا ہو۔

میں سرمد ہوں۔ فضل داد کا اکلوتا سپوت میرے بچپن سے لے کر اب تک جب کہ میرے دونوں بیٹے بھی شادی کی عمر کو پہنچ گئے ہیں' بہنوں کے ہاتھوں میری کیسے کیسے درگت بنی ہے۔ مت پوچھیں۔ بچپن میں میرا منہ چوم چوم کر میرے چہرے کا گوشت تک گھسا دیا۔ آج تک میرے چہرے پر ماس نہیں آیا۔ سارا سارا دن مجھے گود میں اٹھائے پھرتیں کہ میرے ساتھ کے لڑکے فٹ بال کے پیچھے بھاگنے لگے تو میں نے پاؤں پاؤں چلنا سیکھا۔ وہ بھی اللہ بھلا کرے میری دادی کا جنہوں نے رولا مچا کر مجھے ان کی گودوں سے نیچے اتروایا۔

☼ ☼ ☼

جب تک میں جوان ہوا' میری ساتوں بہنیں شادی شدہ ہو چکی تھیں۔ جب میں نے کمانا شروع کیا تو سمجھو میری بہنوں کی لاٹری نکل آئی۔ وہ اپنی بہت سی ضرورتوں کے لیے میری تنخواہ کا بڑا حصہ لے اڑتیں۔ اس کے لیے انہوں نے باقاعدہ باریاں لگا رکھی تھیں۔ جیسے ہی میری تنخواہ آتی' میری وہ بہن جس کی اس مہینے باری ہوتی' اپنے کسی مسئلے کے ساتھ آ موجود ہوتی۔ کسی کی چھت ٹپکنے لگتی' تو کسی کی پانی والی موٹر جل جاتی۔ جس طرح قیام پاکستان سے پہلے پنجاب گورا صاحب کے نزدیک "فروٹ گرین باسکٹ آف انڈیا" تھا۔ بالکل اسی طرح میں اپنی بہنوں کے لیے "فروٹ باسکٹ آف فضل ہاؤس" تھا۔

ابا کو جب ان کی اس کارروائی کا ادراک ہوا تو وہ کمر کس کر میدان میں آ گئے۔ تنخواہ ملتے ہی میری ساری تنخواہ اپنے قبضے میں لے لیتے اور مجھے خرچا دے کر باقی بچت کے خانے میں ڈال دیتے۔ یہ بات میری بہنوں کو بہت ناگوار گزری۔

"اماں! کبھی کبھی تو ہمیں لگتا ہے کہ ہم ابا کی سوتیلی بیٹیاں ہیں۔ کیا تھا جو سرمد ہماری تھوڑی بہت مدد کر دیتا تھا۔ ہم غیر نہیں ہیں اس کی۔ حق بنتا ہے ہمارا اس پر۔" بہنوں نے ہاتھ نچا نچا کر اماں سے شکوہ کیا۔

"وہ کہتے ہیں شادی کے بعد تم لوگ اپنے شوہروں کی ذمہ داری ہو' باپ اور بھائی کی نہیں۔ تمہارے شوہر جتنا کماتے ہیں تم لوگ اسی میں گزارا کرنا سیکھو۔"

"ابا تو ہمیں ویسے ہی ایک آنکھ دیکھنا پسند نہیں۔" بڑی آپا نے لمحوں میں ابا کی ساری محبتوں کو بھلا دیا۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ شادی سے پہلے کیسے تم لوگوں کو لاڈ اور چاؤ سے رکھا ہوا تھا۔ ہمیشہ انہوں نے تم لوگوں کو اچھا کھلایا' اچھا پہنایا اور اپنی حیثیت کے مطابق اچھے گھروں میں تم لوگوں کی شادیاں کیں۔ برے بھلے وقت میں بہن' بھائی ہی ایک دوسرے کے کام آتے ہیں مگر تم لوگوں نے تو روز کا تماشا ہی بنا لیا تھا۔ اسی لیے تمہارے ابا نے یہ قدم اٹھایا ہے۔" اماں نے ایمان داری کی انتہا کر دی۔

"تو سرمد کے کون سے بچے ہیں جن پر اسے خرچ کرنا ہے۔" چھوٹی آپا بھی تنک کر بولیں۔

"ابھی نہیں ہیں نا۔ شادی کریں گے تو بچے بھی ہو جائیں گے۔ بس تم لوگ اس کی کمائی پر نیت نہ لگایا کرو۔" بات بنتی نہ دیکھ کر ساتوں نے خاموشی اختیار کر لی۔

☼ ☼ ☼

میری سب بہنوں کی شادیاں بھرے پرے گھروں میں ہوئی تھیں۔ جہاں وہی ساس' نندوں کی روایتی چپقلش عام تھیں۔ جب گھر میں میری شادی کا ذکر شروع ہوا تو ساتوں باری باری آکر اپنے سسرالیوں کے مظالم سناتے ہوئے یوں روئیں کہ سیلاب کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ وہ تو ابا کی دھاڑ نے انہیں چپ کروایا' ورنہ تو شاید سارا گاؤں ان کے آنسوؤں میں بہہ جاتا۔

قصہ یہ تھا کہ ان سب کی کوئی نہ کوئی نند کنواری تھی اور ہر کوئی یہ چاہتی تھی کہ میری شادی اس کی نند سے ہو' تاکہ وہ اس کی نند بن کر گن گن کر بدلے لے سکے اور اپنے سسرالیوں کو ناکوں چنے چبوا سکے۔ بہنوں کو روتے دیکھ کر میرا دل چاہا کہ میں ساتوں کی نندوں

سے شادی کرلوں' سب کا بھلا ہو جائے گا۔ مگر ایسا میں صرف سوچ ہی سکتا تھا کہ اول تو چار سے زیادہ کی اجازت نہیں تھی اور دوسرے ابا کو ان جنجال پوروں سے لڑکی اپنے گھر نہیں لانی تھی۔ سو میں اور اماں جب آپاؤں کی دل جوئی کرتے کرتے جذباتی ہونے لگتے' ابا میدان میں آکر ان کو وہ کھری کھری سناتے کہ ان کو میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑتا۔

ان سب کی امیدوں پر سو فیصد پانی اس وقت پھرا' جب ابا شہر گئے اور اپنے کزن کی پڑھی لکھی سلجھی ہوئی بیٹی سے میری بات پکی کر آئے۔ اماں کو تو اپنے بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کا ارمان تھا' سو وہ ابا کی خوشی میں شریک ہو گئیں۔ آپاؤں کو خبر ہوئی تو اکٹھی آکر یوں روئیں جیسے خدانخواستہ کسی کی موت ہو گئی ہو۔ ان کو دیکھ کر پھر جو ابا کو جلال آیا تو پورا گھر ہل گیا۔

”تم لوگ کیا میرے گھر نحوست پھیلانے آگئی ہو۔ میرے اکلوتے پتر کی شادی طے ہوئی ہے اور تم لوگوں نے رونا پیٹنا ڈال دیا ہے۔ چلو نکلو' شام تک مجھے تم میں سے ایک بھی یہاں نظر نہ آئے۔ اگر تم لوگ میرے پتر کی شگن میں خوشی خوشی شریک ہونا چاہو تو منگنی میں آنا' ورنہ کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ادھر کا رخ کرنے کی۔ رخنہ ڈالنے والوں کی میں ٹانگیں توڑ دوں گا۔“

ابا سے کچھ بعید نہ تھا' وہ واقعی ٹانگیں توڑ کر ہاتھوں میں پکڑا دیتے۔ اس دھمکی کے بعد سب نے اپنے آنسو تو پونچھ لیے لیکن میری بیوی مطلب ہونے والی سے دل ہی دل میں بیر باندھ لیا اور اسے آٹھ آٹھ آنسو رلانے کا تہیہ کر لیا۔

میری منگنی سے شادی تک انہوں نے میری بیوی کو تنگ کرنے کے جو منصوبے بنائے' ان میں سے ایک آدھ کبھی کبھار میرے کانوں میں پڑ جاتا تو میں حقیقتاً“ پریشان ہو جاتا کہ مستقبل میں کیا ہو گا۔

بدلہ لینے کے حوالے سے انہوں نے جو فہرست بنا رکھی تھی' اس میں پہلے نمبر پر یہ تھا کہ وہ اس کی بری کے لیے ایک سے ایک گھٹیا جوڑا خریدیں گی۔ دوسرے نمبر پر اس کے جہیز کی چیزوں میں رج رج کے نقص نکالیں گی۔ مگر وہ بھول گئی تھیں کہ ابا ان سب کے باپ ہیں۔ اس وقت ان کو منہ کی کھانا پڑی۔ جب ابا نے بری بنانے کی ذمہ داری ان کو دی ہی نہیں۔ وہ شہر جا کر نادیہ (میری منگیتر) کے ہاتھ پر پیسے رکھ آئے کہ اپنی مرضی سے کپڑے خرید لے۔ جہیز کے ابا ویسے ہی بہت خلاف تھے۔ اپنی بیٹیوں کو تو انہوں نے حسب حیثیت جہیز دیا تھا کہ جہاں ان کی بیٹیاں بیاہی گئی تھیں' وہاں کے لوگوں کی سوچ ابا جیسی نہیں تھی۔ مگر اپنے بیٹے کی دفعہ تو وہ اپنی من مانی کر سکتے تھے' سو انہوں نے کی۔ گھر میں اللہ کے فضل سے ہر چیز موجود تھی۔ ابا نے میرے کمرے میں نیا فرنیچر' قالین اور پردے ڈلوا کر کمرا شادی تک لاک کر دیا۔

”اے سرمد! تو... تو ابھی سے ہم بہنوں کو بھول گیا ہے۔ بیوی کے آنے کے بعد تو ہاتھ سے پکڑ کر گھر سے ہی نکال دے گا۔“ میں دفتر سے واپس آکر ابھی موٹر سائیکل کھڑی کر رہا تھا' جب صحن میں بیٹھی آپا آنسو بہانے لگیں۔

”آپا! میں نے آپ کو دیکھا نہیں تھا۔“ میں فوراً“ ان کے پاس جا بیٹھا۔

”ہاں اب تو تیری آنکھوں میں تیری ہوتی سوتی بستی ہے۔ ہم تجھے کہاں نظر آئیں گے۔“ میری وضاحت پر ان کے دکھ میں مزید اضافہ ہو گیا۔ مزید وضاحتوں پر ان کے دکھ نے ایک سو اسی کی اسپیڈ پکڑلی' جسے بریک ابا کی کھنکھار نے لگائی۔

اسی طرح گرم سرد حالات کا سامنا کرتے ہوئے شادی کا دن آن پہنچا۔ میں بہت ڈرا ہوا تھا۔ آپاؤں کے رویے نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ آئندہ میرے ساتھ کیا' کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ میری بارات جانے لگی تو ساتوں باگ پھڑائی کے بجائے باگ کے ساتھ لٹک ہی گئیں' جس پر گھوڑی نے برا منا کر ادھر ادھر اچھلنا شروع کر دیا۔ گھوڑی کے اچھلنے سے ڈر کر جو بھاگیں تو باگ پھڑائی ”باگ چھڑائی“ میں بدلی اور میں نیچے گرنے سے بال بال بچا۔ خیر ان کے ہر نخرے اور تخریبی منصوبوں کے باوجود نادیہ میرے ساتھ

رخصت ہو کر آگئی۔

''او کڑیو! اب اور کوئی رخنہ نہ ڈالنا۔ نادیہ کو کمرے میں چھوڑ کر آؤ' تھک گئی ہوگی۔ تھوڑا آرام کرلے۔'' ابا کو بہو پر بڑے لاڈ آرہے تھے۔ وہ سب منہ بسور کر اسے کمرے میں چھوڑ آئیں۔

☆ ☆ ☆

نادیہ بہت اچھی لڑکی ثابت ہوئی۔ ابا تو ویسے ہی اس پر جان چھڑکتے تھے۔ اماں بھی اس کے ساتھ بڑا گھل مل کر رہتی تھیں' مگر جب ان کی بیٹیاں آجاتیں' تو اماں کے ایسے کان بھرتیں کہ ان کی بہو کی نادیدہ خامیاں بھی نظر آنے لگتیں تو وہ طنز کا ایک آدھ تیر برسا ہی دیتیں۔ نادیہ نے سمجھ داری سے حالات کا تجزیہ کرکے لائحہ عمل اپنایا تھا۔ لہٰذا جب ایسی صورت حال پیش آتی تو وہ خاموش ہو جاتی۔ بعد میں اماں کو اپنے طرز عمل پر افسوس ہونے لگتا کہ انہوں نے ناحق زیادتی کی۔ اپنی زیادتی کی تلافی میں وہ اور میٹھی ہو جاتیں اور نادیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی۔ آہستہ آہستہ اماں نے اس صورت حال پر قابو پالیا۔ بیٹیوں کی باتیں سن لیتیں' مگر بہو کو کچھ نہ کہتیں۔ کہتیں بھی کیوں' نادیہ نے بھی شکایت کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

''ہم آجائیں تو تیری بیوی کی جان نکلنے لگتی ہے۔ دو بج رہے ہیں' ابھی تک سب بھوکے بیٹھے ہیں۔ کھانے کا کوئی نام نشان نہیں ہے۔'' آپا نے میری کلاس لی۔

''تا تم سب اپنے ہاتھ پیر اپنے گھروں میں چھوڑ آتی ہو' جو خود اٹھ کر کچھ نہیں کرسکتیں۔ نادیہ کی کچھ مدد ہی کرو۔ بے چاری کب سے اکیلی لگی ہوئی ہے۔'' نادیہ جب سے امید سے ہوئی تھی ابا کے لاڈ اور بڑھ گئے تھے۔ اب بھی میرے بولنے سے پہلے ان کی جھڑکی سنائی دی تو وہ جو چارپائی پر آڑھی ترچھی پڑی ہوئی تھیں' یوں اٹھیں' جیسے سانپ دیکھ لیا ہو۔ ابا کو گھر سے باہر جاتے دیکھ رہی تو انہوں نے دل کی بھڑاس نکالنا چاہی تھی' مگر نجانے وہ واپس کیسے آگئے تھے۔

''نادیہ پتر! بس کر اب' یہ روٹیاں میں تنور سے لے آیا ہوں۔'' ابا نے روٹیوں والا لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔

''دیکھا اماں! اپنے شوہر کو' تیرے لیے تو تیلا توڑ کر دہرا نہ کیا اور اب بہو کے لیے روٹیاں بازار سے لے آئے۔ ہمارے ہوتے ہوئے کبھی بازار کی روٹی نہ کھائی ابا نے۔'' منجھلی آپا نے اماں کو بھڑکایا۔

''تیرے ابا کے لیے وہ روٹی گھر پر ہی بنائے گی۔'' اماں نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا۔

''اماں! تو بھی۔'' سب کی سب اماں کے یوں پارٹی بدل لینے پر تڑپ گئیں۔

''ہاں تو وہ دوسرے ہی سے ہے۔ سالن اور میٹھا اس نے گھر پر بنالیا۔ اب تم ساتوں اکٹھی آگئی ہو۔ ساتوں کے کل ملا کر اکیس تو بچے ہیں۔ وہ کیسے اتنی روٹیاں پکائے۔ خود تو تم میں سے کوئی اٹھ کر پانی بھی نہیں پیتی' مگر ہم تو اس کا خیال کریں گے نا' آخر کو وہ ہمارے بیٹے کی اولاد کو جنم دینے والی ہے۔'' اماں کی گنتی پر سب سے چھوٹی آپا بھڑک گئیں۔

''توبہ اماں! تو تو گن گن کر بتانے لگی۔ اب ہم بوجھ ہوگئے۔'' ساتوں کے آنسو پلکوں پر آن رکے۔ ساتوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہی تھیں کہ کسی ایک کے آنسو گالوں پر پھسلیں تو ان کے آنسو بھی آزاد ہوں۔

''تم بیٹیاں ہو اس گھر کی بوجھ کیوں؟ پر دھیو! اس کا بھی تو خیال کرنا چاہیے نا' آخر وہ بھی انسان ہے۔ جب تک وہ فارغ نہیں ہو جاتی' تم لوگ ایک ایک کرکے آیا کرو۔ اگر اکٹھی آؤ تو پھر کام مل کر کرلیا کرو۔'' ساتوں کے آنسو بیک وقت گالوں پر پھسلے اور سسکیاں ہونٹوں کی قید سے آزاد ہو گئیں۔

''تم لوگوں کو کیا ہوا؟'' ابا کمرے میں آئے۔ ان کو دیکھ کر ساتوں کے بہتے آنسو یوں خشک ہوئے جیسے بھارت نے ڈیم بنا کر ہمارے دریاؤں کو خشک کردیا ہے۔

''کچھ نہیں ابا! ایسے ہی دادی مرحومہ یاد آرہی

تھیں۔" آپا نے بات سنبھالی۔

میں ابا کی صحت اور درازی عمر کی دعا مانگا کرتا تھا کہ وہی تھے جو میری اتھری بہنوں کو قابو کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے کسی بات پر نادیہ کی حمایت کی تھی۔ جس پر ساتوں نے میرے اتنے کان کھینچے کہ مجھے یقین ہو گیا کہ آج یا تو میرے کان الگ ہو کر ان کے ہاتھوں میں چلے جائیں گے یا ہاتھی کی طرح پنکھے کی صورت تو ضرور ہی اختیار کر لیں گے۔ اس کے بعد میں نے توبہ کی تھی کہ ان کے سامنے کبھی نادیہ کی طرف داری نہیں کروں گا۔ جب بھی میں ابا کی غیر موجودگی میں بہنوں کے ہتھے چڑھ جاتا تو اپنی بیوی کے بارے میں ان کی لن ترانیاں چپ سادھ کر سنتا رہتا۔ بعد میں نادیہ سے معذرت کرتا تو وہ ہنس کر ٹال دیتی۔

"کوئی بات نہیں، ویسے بھی بڑے بڑے کانوں والا سرمد مجھے بالکل اچھا نہیں لگے گا۔" وہ کہتی اور ہم دونوں ہنس پڑتے۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا کہ نادیہ عام عورتوں کی طرح انا پرست نہیں تھی۔ وہ بہت سمجھ دار تھی۔ اسے معلوم تھا اپنی نندوں کو کیسے قابو کرنا ہے، سو وہ کامیابی سے ان کے ساتھ نباہ کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

تیسرے نمبر والی آپا کو بات کا بتنگڑ بنانے میں کمال حاصل تھا۔ ایک دن وہ گھر آئیں تو ابا برآمدے میں بچھی چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے سفید صافے سے منہ ڈھانپ رکھا تھا۔ انہوں نے سلام کیا تو جواب ندارد، وہ چیخ مار کر بین کرنے لگیں۔

"ہائے ابا! ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔ ہائے! دیکھو سب اپنے اپنے مزوں میں ہیں۔ ہائے دیکھو! دونوں میاں، بیوی دن دہاڑے اپنے کمرے میں گھس کر بیٹھے ہیں اور میرا ابا اکیلے پڑا پڑا مر گیا... ہائے ابا... ہائے ابا۔"

انہوں نے مجھے اور نادیہ کو یوں لتاڑا جیسے ملک الموت ہم دونوں کے پاس آیا تھا اور ہم نے اسے ابا کی جان نکالنے کی اجازت دے دی ہو، میں نادیہ اور اماں بھاگ کر برآمدے میں پہنچے۔ ہمارا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس سے پہلے، کہ صورت حال کو سمجھتے۔

"ہائے ابا... ہائے ابا" کر کے، روتی ہوئی آپا کے منہ سے "ہائے اماں..." کی زوردار آواز نکلی۔

ابا کی لاٹھی زور سے ان کے بازو پر پڑی تھی اور تکلیف کی وجہ سے ان کا راگ ہی بین بدل گیا تھا۔

"کیا مجال ہے کہ دو گھڑی آرام کر لے بندہ۔ میں سو رہا تھا، مرا نہیں تھا۔" ابا نے کڑے تیوروں سے کہا۔

"ہائے ابا! سو رہے تھے تو بتا نہیں سکتے تھے۔ لے کے میرے اتنے آنسو ضائع کرا دیے۔" انہوں نے بازو سہلایا۔ گویا انہیں ابا کے زندہ ہونے کی خوشی سے زیادہ اپنے آنسوؤں کے ضائع ہونے کا غم ہوا تھا۔

"تو... اب میں کیا اپنے سرہانے بینر لگوا لوں کہ میں سو رہا ہوں، مرا نہیں۔ حد ہوتی ہے بے وقوفی کی۔" ابا اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆ ☆ ☆

ہمارے ہاں پہلے بیٹے کی ولادت ہوئی تو ابا خوشی سے اللہ کے حضور جھک گئے۔ مٹھائی بانٹی۔ میرے بیٹے کی ساتوں پھپھیاں ایک ایک ماشے کی سونے کی انگوٹھیاں لائیں اور بدلے میں آدھے آدھے تولے کے جھمکوں کی فرمائش کر دی۔ ابا تو سنتے ہی بھڑک اٹھے۔

"تم لوگ اپنی لائی ہوئی مندریاں واپس لے جاؤ۔ تم لوگوں کے لیے دو ڈھائی لاکھ روپے کہاں سے لائے جائیں۔" ابا نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا مگر اماں اس دفعہ بیٹیوں کے ساتھ تھیں۔

"بھری پری سسرال میں رہتی ہیں۔ بھائی کے بیٹے کی ودائی تو بنتی ہے نا، آدھے تولے کی نا سہی، کچھ ہلکا پھلکا ہی سہی، پر سونے کی چیز ان لوگوں کا حق بنتی ہے۔" سو مرتے کیا نہ کرتے جیسے، تیسے پورا کیا گیا۔

جب میرا دوسرا بیٹا پیدا ہوا تو بڑی آپا نے ایک نیا شوشا چھوڑ دیا۔

"دے سرمد! جس طرح اماں کے گھر پہلے سات بیٹیاں پیدا ہوئی تھیں پھر بیٹا تو مجھے لگتا ہے کہ اسی طرح تیرے گھر پہلے سات بیٹے ہوں گے پھر بیٹی۔ اس لیے بچوں میں زیادہ وقفہ نہ رکھنا۔"

یہ سن کر نادیہ سچ میں بے ہوش ہوگئی۔ آپا کی بات سے ڈر کر جو اس نے فل اسٹاپ لگایا تو نندوں کے طعنوں اور اماں کی نصیحتوں کے باوجود "بچے دو ہی اچھے" کی پالیسی پر کاربند رہی اور ہمیشہ کی طرح ابا کی سپورٹ تو اسے حاصل تھی ہی۔

☆ ☆ ☆

میں اسی طرح اپنی بہنوں سے درگت بنواتا رہا اور میرے بیٹے موسیٰ اور ہارون اپنے تعلیمی مدارج طے کرتے رہے۔ جب میرے دونوں بیٹے آگے پیچھے انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخل ہوئے تو میری آپائیں جو میری درگت بناتے وقت پکی اتحادی ہوتی تھیں ان میں پھوٹ پڑنا شروع ہوگئی۔

وجہ تھی میرے بیٹے۔

"جی۔ آپ ٹھیک سمجھے، میری ہر بہن یہ چاہتی تھی کہ میں اپنے بیٹوں کے لیے اس کی بیٹی لوں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میری سب بہنیں مجھ سے بڑی ہیں تو ان کی بیٹیاں میرے بیٹوں کی ہم عمر کیسے ہوگئیں۔ تو اطلاعاً عرض ہے کہ میری ہر آپا کے بچوں کی تعداد سات سے آٹھ عدد ہے۔ لہٰذا ان کے آخری دو، دو بچے میرے بیٹوں کے ہم عمر یا ان سے تھوڑے چھوٹے تھے۔

لہٰذا اب ہر کسی کی یہ کوشش تھی کہ وہ میرے زیادہ سے زیادہ قریب ہوجائے۔ اس چکر میں وہ ایک دوسری کی دہ دہ برائیاں بیان کرتیں کہ میں گنگ ہوجاتا۔ وہ سب شاید یہ بات بھول گئی تھیں کہ ہمارے ابا بھی زندہ ہیں، جنہوں نے کبھی میرے ساتھ زیادتی نہیں ہونے دی تو میرے بیٹوں کے ساتھ بھلا کیسے ہونے دیں گے؟ میں چپ چاپ ان کی باتیں سنتا رہتا۔

میں اپنے بیٹوں کے لیے سب سے پہلے اپنی بھانجیوں کے بارے میں ہی سوچتا، آخر بہنوں کا بھائیوں پر بہت حق ہوتا ہے مگر بات دراصل یہ تھی کہ ان سب کی بیٹیاں ایک سے بڑھ کر ایک شوخیاں اور زبان دراز تھیں۔ روپیٹ کر میٹرک، ایف اے کیا اور سمجھو تعلیم مکمل۔ باقی کا سارا وقت گھریلو سیاستوں اور چغل خوری میں گزرتا۔ میری آپاؤں کا کہنا تھا کہ ان کی بیٹیاں اپنی چنڈال پھوپھوں پر گئی ہیں اور ان کی نندوں کے خیال میں پوری کی پوری اپنی ماؤں پر پڑی تھیں۔ ایسے موقع پر میری بہنوں کی نندیں پنجابی کی یہ کہاوت باآواز بلند دہراتی تھیں۔ "ڈھنگ دابی تے ماں اتے دھی" (جیسی ماں ویسی بیٹی)

شکر ہے رب تعالیٰ کا۔ میرے بیٹے مجھ پر نہیں بلکہ اپنے دادا پر پڑے تھے۔ معاملہ فہم اور نڈر۔ جب میری بہنوں کا تقاضا حد سے بڑھنے لگا تو ابا نے اپنے پوتوں کے ساتھ ایک خفیہ میٹنگ کی، جس کے بارے میں مجھے بہت بعد میں خبر ہوئی۔

☆ ☆ ☆

اچانک میرے بیٹوں کی محبت اپنی پھوپھیوں کے ساتھ دن بدن بڑھنے لگی۔ وہ ان کے ساتھ رازداری سے کھسر پھسر کرتے۔ میں یا نادیہ جاتے تو خاموش ہوجاتے۔ یہ صورت حال مجھے اور نادیہ کو ہولانے لگی۔

"سرمد! اپنے بیٹوں کو کنٹرول کرو۔ اگر انہوں نے اپنی کسی پھوپھی زاد کو پسند کرلیا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔" وہ آنسو پونچھتی اور میں خاموش رہتا اور دل ہی دل میں نادیہ سے کہتا کہ اگر ایسا ہوگیا تو اسے اپنی جان دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ آپاؤں کی راج دلاریوں نے اس کی جان خود ہی نکال لینی تھی۔ میں اور نادیہ جل جل کر خاک ہو رہے تھے اور ابا کا اطمینان دیدنی تھا۔

مجھے حیرت کا شدید ترین جھٹکا بلکہ جھٹکے تب لگنا شروع ہوئے جب چھ ماہ بعد باری باری بڑی تینوں بہنوں نے اپنی ان بیٹیوں کی منگنیاں اپنی سسرال میں

کردیں بہن کے لیے وہ موسیٰ اور ہارون کو داماد کی حیثیت سے پسند کرچکی تھیں۔ اس کے بعد باقی چاروں بھی بہانے سے سنا گئیں کہ وہ بھی عن قریب اپنی بیٹیوں کی بات اپنے سسرالی رشتہ داروں میں پکی کردیں گی۔ میں جو اس مسئلے کو لے کر بہت پریشان تھا' اس کایا پلٹ پر حیران رہ گیا۔

"اباجی! یہ آپاؤں کو کیا ہوا؟"

ہم سب رات کو اکٹھے بیٹھ کر چائے پی رہے تھے۔ اماں جلدی سونے کی عادی تھیں' سو وہ اپنے کمرے میں جاچکی تھیں۔

"تو ساری عمر لگا رہتا تو بھی اس مسئلے کو حل نہیں کرسکتا تھا اور میں تیرے ساتھ کوئی زیادتی ہوتے دیکھ نہیں سکتا۔ یہ میرے دونوں شیر بالکل مجھ پر گئے ہیں۔ ان سے پوچھ لینا' میں سونے جارہا ہوں۔" ابا نے موسیٰ اور ہارون کے کندھوں کو تھپکی دی۔

"بابا!" دونوں نے اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔

"اف! بہت ایکٹنگ کرنا پڑی ہم دونوں کو۔" موسیٰ مسکرا رہا تھا۔

"حالانکہ آپ اور امی ہم سے ناراض رہنے لگے تھے کہ کہیں ہم پھوپھیوں کے داماد نہ بن جائیں۔" ہارون ماں کے برابر جا بیٹھا۔

"مگر یہ سب ہوا کیسے؟" نادیہ ابھی تک حیران تھی۔

"دادا نے یہ مشن ہم دونوں کے سپرد کیا تھا۔ سو ہم نے پلان بنایا۔ جب بھی کوئی پھپھی یہاں آتیں ہم ان سے خوب محبت جتاتے اور ان سے کہتے' پھپھو آپ اتنی اچھی ہیں۔ ہمارا بس چلے تو آپ کی بیٹی سے شادی کریں' مگر آپ ہماری امی کو تو جانتی ہیں نا' اول تو وہ مانیں گی نہیں اور مان بھی گئیں تو آپ کی بیٹیوں پر ظلم ڈھا کر آپ سے بدلے لیں گی اور آپ تڑپ تڑپ کر ختم ہوجائیں گی اور دادا کو بھی آپ جانتی ہیں وہ تو شروع سے امی کی ہی سائیڈ لیتے ہیں۔ وہ سر ہلانے لگتیں۔ لیکن ہم ایسا نہیں چاہتے۔" موسیٰ سانس لینے کو رکا تو ہارون شروع ہوگیا۔

"ریحانہ اور عالیہ پھپھو سے ہم نے کہا کہ آپ یقین کریں ہم نے خود سنا' وہ امی سے کہہ رہے تھے کہ عالیہ اور ریحانہ کی بیٹیوں سے شادی کرواکر وہ ان کے باپوں سے بدلہ لیں گے جو ان کا ادھار لے کر کھا چکے ہیں۔ "میں ابھی ابا سے بات کرتی ہوں۔" میری بات پر ریحانہ پھپھو اٹھنے لگیں تو موسیٰ نے پکڑ کر بٹھالیا اور کہنے لگا۔ کیا کرتی ہیں پھپھو آپ نے یہ سب ان سے پوچھا تو پھر وہ ہمارا آپ سے ملنا بند کردیں گے اور پھر آپ کو اندر کی خبریں ملنا بند ہوجائیں گی۔" ہارون نے ایک ٹھنڈی سانس بھری تھی۔" اس طرح کی برین واشنگ کر کرکے ہم نے یہ کام کروایا ہے۔" دونوں نے کالر اکڑائے۔

"پر بیٹا! وہ میری بہنیں ہیں' تم لوگوں کو ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔" میرا دل عجیب سا ہو رہا تھا۔ آخر میں ان کا اکلوتا بھائی تھا۔

"ہم جانتے ہیں بھائی' بہنوں کا مان ہوتے ہیں لیکن اس مان کے نام پر بھائیوں کی کھال تو نہیں کھینچنی چاہیے نا۔ اپنے حق کا شور مچانے کے ساتھ ساتھ اپنے فرائض پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ اسی میں سب کی بھلائی ہے۔" موسیٰ اور ہارون نے تسلی دینے کے انداز میں میرے ہاتھ دبائے۔

"بابا! آپ پریشان نہ ہوں۔ اب ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ اب کوئی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" ہارون نے لاڈ سے کہا۔

"اور نہ ہی اب کوئی آپ کے کان کھینچ کر لے کرسکتا ہے۔" نادیہ نے لقمہ دیا تو سب کا بلند قہقہہ پڑا۔

اباجی ہمیشہ کہتے تھے کہ میرا پتر اکیلا ہے اور اکیلی تو لکڑی بھی نہیں جلتی' اس لیے میں ہر معاملے میں اپنے پتر کے ساتھ کھڑا ہوتا ہوں اور اب اباجی نے میرا ساتھ دینے کے لیے اپنے دونوں پوتوں کو تیار کردیا تھا۔ مجھے ان پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ دادا کے تربیت یافتہ دونوں پوتے میرے دائیں بائیں یوں سہارا بن کر کھڑے تھے کہ مجھے لگا میرا اکلوتا پن ہمیشہ کے لیے کہیں جا چھپا ہے۔

☆

لبنیٰ جدون

وہ گھر، ماں باپ اور دولت سب کچھ چھوڑ آیا۔ وہ بھوک اور پیاس کی شدت سے نڈھال ہو کے جگہ جگہ لاوارثوں کی طرح پڑا رہنا چاہتا تھا۔ وہ خود کو فنا کر دینا چاہتا تھا۔ وہ دعا کی طرح مٹی ہو جانا چاہتا تھا۔ اس مٹی میں ہی رُل جانا چاہتا تھا۔ جس میں وہ اپنی دعا کو اپنے ہاتھوں سے دفن کر چکا تھا۔

اس کا ہارا ہوا وجود تھا اور ایک ایسا سفر تھا جس کی کوئی منزل نہ تھی اور نہ ہی کچھ حاصل۔ بے سمت راستوں کا راہی بن گیا۔ جھلسا دینے والی دھوپ میں چلا جا رہا تھا کہ اچانک فائرنگ شروع ہو گئی اور ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ اس نے کوئی پروا نہ کی کہ اب اسے اس زندگی کی خواہش ہی کب تھی۔

پھر نجانے کیسے اس نڈھال وجود میں اتنی طاقت آ گئی کہ اس نے بھاگتے ہوئے ایک حملہ آور کو پکڑ لیا۔ پولیس بھی وہاں پہنچ گئی اور انہیں گرفتار کر لیا۔ سیٹھ ارمغانی نے اس کا شکریہ ادا کیا مگر وہ نقاہت سے بے ہوش ہو چکا تھا۔ فوراً اسپتال پہنچایا گیا۔

شام کو سیٹھ ارمغانی اسے دیکھنے اسپتال آئے تو اس کے متعلق جاننا چاہا مگر اس کے لب چپ کے قفل نہ توڑ سکے۔

"تم بتاؤ زین! میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟" انہوں نے اپنا سوال دہرایا۔

پہلی بار اس نے منہ کھولا کہ اسے ایک وقت کا پیٹ بھرنے کے لیے نوکری چاہیے۔ سیٹھ ارمغانی نے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ وہ ایک ہی دفعہ نہیں مرنا چاہتا تھا بلکہ قطرہ قطرہ زہر اپنے وجود میں اتارنا چاہتا تھا۔ اپنے ہی وجود پہ سانسیں تنگ کرنا چاہتا تھا۔

رات وہ ایک ہوٹل پر روکھی سوکھی کھا کر بان کی تنگی چارپائی پر لیٹ جاتا۔ تب دعا حساب کتاب لینے آ جاتی۔ وہ اسے اپنی مجبوریوں کی داستان سناتا مگر ہر روز وہ اس سے ناراض چلی جاتی اور بان کی چارپائی کانٹوں کا بستر بن جاتی۔ اس کے نوکیلے کانٹے ساری رات اس کے وجود کو لہولہو کرتے اور وہ روتے روتے سوچتا نجانے کب نیند اسے اس اذیت سے چھٹکارا دلائے گی۔ مگر

ناولٹ

سوتے ہی ماضی بھیانک انداز میں سامنے آجاتا تھا۔ ایک ایک جملہ 'ایک ایک مرحلہ 'ایک ایک لمحہ حساب لیتا تھا۔ ماضی۔۔۔ اے میرے ماضی۔۔۔ مجھے اپنی اذیت سے آزاد کردے۔۔۔ میرا دامن چھوڑ دے۔۔۔ وہ چلاتا مگر۔۔۔ بے سود۔۔۔

☼ ☼ ☼

وہ بھی روایتی سی کہانی کا روایتی کردار تھا۔ سوتیلے رشتوں کی آگ میں جلتا رہا۔ وہ اس آگ کو بھڑکانا نہیں چاہتا تھا مگر وہ کب تک اس آگ پر پانی ڈال ڈال کر بجھاتا۔ وہ تنہا اس آگ کو نہیں بجھا سکتا تھا۔

سکندر ہمیشہ اس سے مقابلے پر رہتا تھا۔ سوتیلی ماں نے قدم قدم پر اپنا زہریلا رنگ دکھا کر ثابت کر دیا کہ وہ زین کی سوتیلی ماں تھیں۔ جن کی وجہ سے اس کی اماں تڑپ تڑپ کر قبر میں اتر گئیں۔

زین نے ایک ایک دن اذیت میں کاٹا۔ کوئی من پسند چیز اس کے ہاتھ میں سکندر نہ رہنے دیتا۔ وہ اس کا جھکا سر دیکھ کر فاتحانہ انداز میں قہقہے لگاتا تو زین کا دل چاہتا کہ یہاں سے بھاگ جائے مگر کہاں۔۔۔ جان نہ پاتا۔ لیکن اب کے وہ جو چھیننا چاہتا تھا' وہ زین کی متاع حیات تھی۔ اس کے لیے اس نے لڑنے کا ارادہ کر لیا۔

"زین! میں نے کتنی دفعہ کہا ہے کہ میرے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ کچلے جاؤ گے۔" سکندر بدلحاظی سے اس کے سامنے آکے بولا۔

زین حیرت سے اسے دیکھنے لگا اس نے کسی اور کی محبت میں خود دعا سے منگنی ختم کی تھی۔ لیکن یہ جاننے کے بعد کہ دعا اور زین ایک دوسرے سے شادی کرنے کے خواہش مند ہیں تو سکندر کے دل میں نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ جیسے زین نے جبراً ان دونوں کو جدا کیا ہو۔

دعا تو نجانے کب سے زین کی محبت میں گرفتار تھی' لیکن ماں کے فیصلے کو دل سے تسلیم کرتے ہوئے سکندر کے لیے رضامندی دے دی تھی۔ اب جب رب نے ان دونوں کو نواز ہی دیا تھا تو کیسے منہ موڑ لیتے۔۔۔ لیکن اب سکندر اس بگڑے بچے کی طرح ہو گیا تھا جو اپنا پھینکا ہوا کھلونا کسی کے ہاتھ میں دیکھ کر چھین لیتا ہے۔

"جاؤ۔۔۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ دعا کوئی میرے نام کی جانے والی جائیداد نہیں ہے' جو تم پہ قربان کر دوں۔" زین نے سختی سے کہا تو وہ چنگھاڑنے لگا۔

"تم جانتے نہیں ہو زین مجھے۔۔۔ میں چھین لیتا ہوں۔۔۔ مجھ سے مت ٹکراؤ' کرچی کرچی ہو کے یوں بکھرو گے کہ ساری عمر سمیٹنے میں گزر جائے گی۔ یہ ریت کے گھروندے سمندر کی لہروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے زین ابتسام!" وہ اس کے سامنے آکے بولا۔ اس کا انداز گفتگو ہمیشہ سے جارحانہ تھا۔ زین البتہ بہت محتاط رہتا تھا۔

ان کے درمیان زر کا مسئلہ تھا اور نہ زمین کا بھی تھی کہ ابا نے سکندر اور زین کے حصے کی جائیداد ان کے نام کر دی تھی۔ اماں کو اعتراض تو ہوا مگر وہ کچھ نہ کر سکیں۔ وجود زن وجہ فساد بننے چلا تھا۔

"یہ گھٹیا پن کی انتہا ہے سکندر۔۔۔ میری اور اس کی شادی ہونے والی ہے۔" یہ وہ واحد مقام تھا جہاں زین نے بھی ہتھیار اٹھا لیے تھے۔ حالانکہ وہ اس مزاج کا نہ تھا۔

"وہ بہت بڑی غلطی کر رہی ہے۔۔۔ تم میں ہے ہی کیا پسند کیے جانے والا۔۔۔ ایک بزدل اور ڈرپوک شخص۔ دیکھ لینا زین ابتسام! میں اس بار بھی تم سے وہ چھین لوں گا جو تمہیں چاہیے۔" سکندر نے اس کی صلح جو فطرت کا تمسخر اڑایا۔

زین چپ چاپ وہاں سے نکل گیا' سکندر کا قہقہہ دور تک اس کا پیچھا کرتا رہا۔

اور اگلے دن روتے ہوئے دعا اس کے پاس آئی اور اچانک ہی اس کے ساتھ آن لگی حالانکہ دونوں کے درمیان محبت ہونے کے باوجود ایک حد تھی۔

"دعا۔۔۔ تم ٹھیک تو ہو نا۔۔۔ پلیز بتاؤ ہوا کیا ہے۔" وہ گھبرا گیا۔

"زین! اپنی آنکھیں کھلی رکھو۔ پلیز۔۔۔ مجھے لگتا ہے تم سب کچھ بھول گئے ہو۔ سکندر کی فطرت' اس

کی کمینگی تمہیں کچھ یاد نہیں ہے۔" اس کا نازک سا وجود زین کے بازوؤں میں ہلکے ہلکے کانپ رہا تھا۔
"سکندر کو دیکھو۔ وہ کتنی ذلالت پر اتر آیا ہے۔"
"دعا... تم پلیز اسے اگنور کر دیا کرو۔ اس کے منہ بالکل نہ لگنا، کہنے دو اسے بکواس۔ جلد ہی نکاح کرلوں گا۔ پلیز اس وقت اس سے قطعاً" مقابلہ کرنے کی کوشش نہ کرنا میری خاطر۔" اس نے سمجھانا چاہا۔
"زین! وہ بہت تنگ کرتا ہے۔" اس کی بھیگی بھیگی آواز زین کو تڑپا گئی۔
"تھوڑی برداشت کا مظاہرہ کرو میری خاطر... ہم شادی کے فوراً" بعد اسلام آباد شفٹ ہو جائیں گے۔" وہ اسے کرسی پہ بٹھاتے ہوئے بولا۔
"اور کوشش کرنا کہ تمہارا اس سے سامنا نہ ہو، کیونکہ انسان انسانیت کی حدوں سے نکل جاتا ہے تو وہ انسان نہیں رہتا اور نہ ہی اس کے نزدیک رشتوں کی کوئی اہمیت رہتی ہے۔"
"تو پھر... کیا ہوگا زین؟" آنکھوں میں امڈتے آنسوؤں کو رگڑتے ہوئے پوچھا۔
"ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم پریشان نہ ہو... چلو آؤ... میں تمہیں چھوڑ آؤں۔ اندھیرا ہونے والا ہے۔" جونہی وہ کمرے سے نکلے، سکندر نے راستہ روک لیا۔
"اوہ... آج تو بڑے بڑے لوگ آئے ہیں۔" وہ دعا کے گرد چکر لگاتے ہوئے خباثت سے مسکرایا۔
"چلو دعا..." زین اسے لے کے آگے بڑھنے لگا تو پھر وہ سامنے آگیا۔ زین نے دعا کا ہاتھ پکڑ لیا کہ وہ ڈر رہی تھی۔ وہ حریص نظروں سے دعا کو دیکھنے لگا۔
"سکندر! تنگ مت کرو کہ سنبھلنا مشکل ہو جائے۔"
"کتنی شرافت سے میں تم سے دعا کو مانگ رہا ہوں اور تم کہہ رہے ہو..." وہ بے غیرتی کی آخری حدوں پر تھا۔
"تم بھائی کی خاطر اتنی سی قربانی نہیں دے سکتے۔ بھائی پر ایک لڑکی کو ترجیح دے رہے ہو۔ کیا یہی تمہاری اماں نے سکھایا ہے۔" وہ جانتا تھا کہ ماں کے نام لیتے ہی وہ بھڑک اٹھتا تھا۔
"انہوں نے مجھے جو سکھایا ہے، اسی وجہ سے میں اب تک تمہیں برداشت کر رہا ہوں۔" زین نے دعا کا ہاتھ تھاما اور جلدی سے وہاں سے نکل گیا۔
"دعا پلیز۔ خود کو سنبھالو... سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
"تمہیں یقین ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ جانور ہے۔ وحشی درندہ ہے۔ یہ کچھ بھی کر سکتا ہے، کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔" وہ روئے جا رہی تھی۔
"اچھا میں تائی اماں سے بات کرتا ہوں تاکہ کم از کم نکاح پہلے ہو جائے۔ اس کے بعد وہ کچھ نہیں کر سکے گا۔" زین نے کہا۔ تو وہ چپ ہو گئی۔
اسی شام زین نے ابتسام بیگم سے تمام حالات گوش گزار کیے۔ وہ پریشان ہو گئیں۔ حرکتیں تو وہ بھی اس کی دیکھ رہی تھیں۔ انتہائی بدلحاظ اور بدتمیز ہو گیا تھا۔ ان سے بھی بدتمیزی کر جاتا۔
زین نے انہیں اس بات پر رضامند کر لیا کہ اس کے نوٹس میں لائے بغیر وہ دونوں نکاح کر لیں اور رخصتی کے بعد وہ دونوں ملک ہی چھوڑ جائیں گے۔ انہوں نے اسی وقت ہی امریکا فون ملایا اور بھائی جان سے بات کی۔
خفیہ طور پہ سب طے کیا گیا اور تین دنوں کے اندر ہی نکاح ہو گیا۔ بھائی جان نے ایک ہفتے کے اندر آنے کا وعدہ کیا۔
"ابو... میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھول پاؤں گا۔ آپ کی وجہ سے مجھے زندگی میں پہلی خوشی ملی ہے۔" اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی باپ سے شکوہ کر ہی ڈالا۔
"بہت شرمندہ ہوں تم سے میرے بچے... مجھے معاف کر دو۔ میں... اپنی ناانصافی کی سزا سکندر کی صورت بھگت رہا ہوں۔" انہوں نے سر جھکا کر کہا۔
زین خاموش ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

اس پر نظر ڈالنے سے پہلے وہ اس رب کے سامنے جھک گیا۔ جس نے یوں نوازا تھا کہ پورا وجود ایک ترنگ میں آگیا تھا۔

وہ خواب آنکھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ اس کا ہاتھ تھامے اسے دیکھ رہا تھا۔ سرخ خوب صورت جوڑے میں وہ زین کے جذبوں کی طرح دہک رہی تھی۔

عجب سرور کی سی کیفیت تھی۔ اتنی آسانی سے محبت مل گئی۔ زندگی اس قدر خوب صورت ہو گئی۔

جذبات سے بوجھل ہو کر زین نے اس کا ہاتھ تھاما ہی تھا کہ سرے کا دروازہ دھڑ دھڑ بجنے لگا۔ باہر ایک شور سا مچ گیا تھا۔ زین گھبرا گیا۔

دعا فوراً" بیڈ سے اٹھی۔

"کون۔۔۔" زین نے دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا تو سامنے سکندر کے ساتھ چہرے ڈھانپے تین بندے تھے' جو اسے دھکا دیتے ہوئے اندر آگئے۔ زین کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا انہوں نے زین کو پکڑ لیا۔

"سکندر۔۔۔ رک جاؤ۔۔۔ سکندر خدا کے لیے۔۔۔ رک جاؤ۔" زین دھاڑ رہا تھا مگر اتنی دیر میں شیطان اپنا کھیل کھیل چکے تھے۔

لمحوں میں سکندر نے تیزاب کی پوری بوتل دعا پہ انڈیل دی تھی۔

"کہا تھا تمہیں کہ یہ سرخ جوڑا نہیں پہنے گی۔ تم نہیں سمجھے میری بات۔۔۔ تمہاری وجہ سے اس کی زندگی گئی۔"

وہ اپنا مکروہ کھیل کھیل کر تیزی سے نکل گئے۔ وہ چیخ رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی۔

زین خود کو چھڑانے میں ناکام ہو گیا تو تڑپ تڑپ کر رونے لگا تھا۔

چھوٹی ماں بے ہوش ہو کر گر گئیں۔ ابا جان یوں بے بسی سے بیٹھے تھے کہ جیسے فریاد کر رہے ہوں اللہ کے نام پر۔۔۔ میرا گھر۔۔۔ میرے بچے۔۔۔ میری دعا۔ اللہ اے اللہ۔۔۔

وہ شیطان اپنا کام کر کے بھاگ گئے تو زین دعا کو بازوؤں میں اٹھا کر پاگلوں کی طرح اسپتال پہنچا مگر وہ چلی گئی۔ کوئی بھی شکوہ گلہ کیے بغیر۔

ایک طوفان زین کی زندگی میں آیا اور ایک قیامت تائی اماں کے اوپر ٹوٹی تھی۔ اکلوتی اولاد کی موت قیامت سے کم تھی؟

زین چپ چاپ دعا کو دیکھے جا رہا تھا۔ جس کا چہرہ تو سامنے نہ تھا مگر ایک سفید چادر میں اس کے ہونے کا احساس تھا۔

اس ظالم نے زین سے اس کی دعا کو آخر چھین ہی لیا تھا۔ وہ نڈھال ہو کر گر گیا۔ چھوٹی ماں آگے بڑھیں تو اس نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ابو نے صرف بے بسی سے دیکھا۔ سب کچھ تو انہیں کا لٹا تھا۔

اگلے دن پولیس نے مختلف جگہوں پر چھاپے مار کر سکندر کو ایک دوست کے گھر سے گرفتار کر لیا۔

☼ ☼ ☼

وقت نے تو بہرحال گزرنا تھا۔ وہ کیا جانے کہ کس کا کیا کیا لٹ گیا تھا۔

طوفان آکر گزر گیا۔ پیچھے کیا تباہی ہوئی۔ کس کس کا جہان لٹ گیا۔ کون بین کر رہا تھا۔ کس کی ممتا تڑپ رہی تھی۔ دکھ' درد۔۔۔ مایوسی۔۔۔ حزن و ملال اور اداسی کے اس کھیل میں وقت نے اپنی دوڑ لگائی ہوئی تھی۔ آنسو آنکھوں سے رواں تھے اور وقت اپنی رفتار کے گھوڑے دوڑا رہا تھا۔

ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔۔۔ بارہ۔۔۔ چوبیس۔۔۔ اور پھر چالیسواں۔۔۔ دنیا والوں نے اپنی ساری رسومات ختم کر دیں۔

تایا جان نے اپنی واپسی کی فلائٹ بک کروالی۔ اس بار بھی وہ تنہا ہی جا رہے تھے۔ زین ان کی طرف آگیا۔

"تایا جان۔۔۔!"

"ہوں۔۔۔" ان کی آواز کا بھیگا پن زین سے چھپا نہ رہا۔

"تایا جان! آپ واپس جا رہے ہیں؟"

"اب یہاں میرے لیے بچا ہی کیا ہے۔" وہ ہارے

ہوئے لہجے میں بولے۔

"تائی اماں بالکل تنہا ہو گئی ہیں... کیسے رہیں گی وہ اب... کیا وہ آپ کے ساتھ نہیں جاسکتیں...؟"

"نہیں... جب تک اس احساس گناہ سے آزاد نہیں ہو جاتا کہ میری وجہ سے ایک آباد گھر اجڑا تھا۔ ایک معصوم دودھ پیتی بچی کو ماں کی ممتا سے میری وجہ سے دور ہونا پڑا۔" وہ چلا اٹھے۔

"معاف نہیں کر سکتے کیا آپ... دکھ کی اس گھڑی میں ایک دوسرے کے دکھ کے ساتھی بن جائیں۔ تکلیف کا احساس کم ہو جائے گا۔"

"نہیں زین... ہم دونوں کبھی ایک نہیں ہو سکتے' اس بات کا اندازہ مجھے دعا کی پیدائش کے کچھ دن پہلے ہی ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے دھوکا کھایا تھا۔ وہ جھوٹ کے ساتھ میری زندگی میں آئی تھی' صرف دولت کی ہوس میں... ممتا جیسے جذبے کی تذلیل کر کے... میں نے اسے دولت دے دی۔ اس سے زیادہ کی نہ اس کی خواہش تھی اور نہ طلب... اگر مجھے پہلے علم ہو جاتا تو میں اولاد جیسی نعمت کبھی اس کی گود میں نہ ڈالتا۔ دیکھ لیا تم نے... کیا ہوا میری اولاد کا انجام... دیکھ تم نے... بد قسمت عورت... خود بھی نامراد رہی اور مجھے بھی بے سکون رکھا۔ کاٹ لے اب اس اذیت بھری زندگی کو..." وہ سختی سے بولے' پھر وہ نہیں رکے۔

تایا جان کے جانے کے بعد وہ ان کی طرف آیا تو وہ تنہا بیٹھی تھیں' سوچوں میں گم تھیں۔

"تائی اماں۔ بہت شرمندہ ہوں آپ سے۔ آپ کی بیٹی کی حفاظت، نہیں کر سکا۔ اس درندے کو پہچانتے ہوئے بھی اس کا اعتبار کر بیٹھا۔" وہ ان کا ہاتھ تھام کر رو پڑا۔

"زین... میرے بچے... میرے رب نے... تو کیا جانے کس پکڑ میں مجھے یہ سزا دی ہے۔ نہ تیرا قصور تھا... نہ میری بچی دعا کا... قصور وار تو صرف میں تھی... یہ میری سزا ہے۔ اللہ تیرے زخم کا مداوا کرے۔ میرے زخموں کا کوئی مرہم نہیں ہے۔ میں

نے خود اپنی دعا ٹھکرا دی تھی پھر کیسے توقع کرتی کہ رب پھر مجھے نواز دے گا۔"

وہ کھوئی کھوئی بول رہی تھیں۔ دعا ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کی موت اور موت بھی ایسی کہ ایک زمانہ رو دے۔ ماں دیوانی نہ ہوتی تو کیا ہوتی۔

ہر ٹی وی چینل پر اس کی خبر چلی تھی۔ اعلا حکام نے بھی اس خبر کا نوٹس لے لیا تھا۔ اس کا مقدمہ سپیڈی کورٹ میں چلائے جانے کا حکم تھا۔

☆ ☆ ☆

زین کے اندر عجیب سی وحشت نے بسیرے ڈال دیے تھے۔ ابا جان صدیوں کے مریض بن گئے۔ چھوٹی ماں اس سے نظریں نہیں ملاتی تھیں۔ وہ خود بھی فاصلے پر رہتا تھا۔ وہ کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آکر دعا سے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا تھا۔

وقت گزر رہا تھا۔ وہ ہر تاریخ پر عدالت جاتا۔ ہر بار سکندر کا پیغام ملتا کہ ایک بار زین اس سے مل لے مگر اب وہ اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگرچہ اب اس کے پاس کھونے کو کچھ نہ بچا تھا مگر دعا کی ــــ موت کا وہ بدلہ ضرور لینا چاہتا تھا۔

چھ ماہ کے اندر مقدمہ اپنے انجام کو پہنچا اور سکندر کو سزائے موت کا حکم ہوا۔

اب اس کی زندگی کی آخری امید زین تھا۔ ہر طرف سے اس کی اپیل مسترد ہو چکی تھی۔ صدر نے بھی سزا کا حکم بحال رکھا۔ جس صبح اسے پھانسی ہونی تھی۔ اس رات چھوٹی ماں جھولی پھیلائے اس کے سامنے آئیں۔

"زین ــــ جھولی پھیلا کر تم سے اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگنے آئی ہوں۔ میں جانتی ہوں اس کا جرم ناقابل معافی ہے مگر میں ماں ہوں۔ میرا دل کٹ رہا ہے۔ میرے کلیجے پر چھریاں چل رہی ہیں۔"

"وہ بھی تو ماں ہی تھی جس نے اپنی بیٹی کو کتنے ارمانوں کے ساتھ سرخ جوڑے میں رخصت کیا تھا۔ اس کی اذیت کا اندازہ ہے آپ کو۔ کوئی ازالہ ہے اس کے دکھوں کا؟" وہ زخمی نظروں سے دیکھ کر رہ گئیں۔

"یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اگر آپ میں ہمت ہے تو اس ماں سے جا کر بھیک مانگیں، جس نے سہاگ کے جوڑے میں اپنی بیٹی کا جھلسا ہوا وجود دیکھا ہے۔ میں جانتا تھا کہ میں بہت کمزور انسان ہوں۔ رشتوں کے جنگل میں پھنس کر کمزور پڑ جاؤں گا تو وہ کم از کم اپنی بیٹی کا مسخ چہرہ نہیں بھولیں گی۔"

چھوٹی ماں مایوس لوٹ گئیں۔

وہ رات بہت بھاری تھی۔ وقت لمحہ لمحہ بھڑکتی آگ کی مانند اسے جھلسا جھلسا کر گزر رہا تھا۔ وہ رات بہت طویل تھی۔ گزر کے نہ دے رہی تھی۔

ابا جان ــــ چھوٹی ماں اور زین ابتسام پر قیامت کا وقت تھا۔

فجر کی اذان کی آواز کانوں میں گونجی تو چھوٹی ماں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

ماں کی فریادیں آسمانوں کو چھونے لگیں۔ ان کی چیخیں زین کے دل میں لگ رہی تھیں۔

زین بے چین ہو کر گھر سے نکل آیا۔

آنسو یوں رواں ہوئے کہ اسے لگا وہ ان میں بہہ جائے گا۔ کاش وہ بوڑھے ماں باپ کو اس کھو دینے کی اذیت سے بچا لیتا، جس سے وہ گزرا تھا۔

بہت دیر بعد پتا نہیں کہاں کہاں گھوم کر وہ مردہ قدموں سے واپس آیا تو منظر اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔

میت کے سامنے چھوٹی ماں رو رہی تھیں۔ سفید چادر میں لپٹا بے بس وجود دیکھ کر ایک لمحے کو اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔

ابا جان کی نظر زین پر پڑی تو لڑکھڑاتے ہوئے اس کی جانب بڑھے۔ مگر وہ پیچھے ہٹ گیا۔

"جو کچھ ہوا وہ عین انصاف ہے مگر کیا کروں کہ میں اور بے چین ہو گیا ہوں۔ مجھ سے سکندر کا یہ روپ دیکھا نہیں جا رہا۔ میں ــــ ایک دفعہ پھر میں ہی ہارا ہوں۔" وہ وہیں میت کے پاس بیٹھ گئے۔

چھوٹی ماں کے بین جاری تھے۔ اس نے محسوس

کیا۔ وہ خود بھی رو رہا ہے۔

کیا فاتح ایسے ہوتے ہیں۔ بکھرے اور ٹوٹے ہوئے۔

زین جانتا تھا کہ اس نے کچھ بھی غلط نہیں کیا تھا مگر دل مضطرب کا کیا کرتا۔ جواب بھی پر سکون نہیں تھا۔

سکندر وا اپنے ہاتھوں سے دفنایا تو کئی مواقعوں پر بولے جانے والے اس کے تلخ جملے کانوں میں گونجنے لگے۔

وہ تو غرور کی اونچی مسند پر بیٹھ کے اسے اپنے قدموں کی خاک کہتا تھا آج خود ہی خاک کا ڈھیر بن گیا تھا۔

اس دشت کی سیاحی میں چھ ماہ گزر گئے۔ موبائل نمبر بدل لیا' اپنی حالت بدل لی' زندگی بدل لی تاکہ کوئی اسے نہ پہچان سکے۔ وہ اپنی شناخت سمیت کھو جائے۔

✲ ✲ ✲

اچانک صورت حال بدل گئی۔ وہ جو کسی کی محبت میں تڑپ رہا تھا' کوئی اس کی محبت میں تڑپنے لگا۔ اسے حیرت تھی کہ اس حلیہ میں بھی اس پر کسی کا دل آسکتا ہے۔

عام سا شکن زدہ کئی بار کا دھلا ہوا لباس... کئی دنوں بعد یاد آتا تو شیو بنالیتا' ورنہ کوئی فکر بھی نہ ہوتی۔ سیٹھ ارمغانی کی اکلوتی لاڈلی بیٹی جس کا وہ ڈرائیور تھا۔ اسے یونیورسٹی لاتا لے جاتا تھا۔ اس کے بدلے بدلے تیور وہ کئی دنوں سے محسوس کر رہا تھا۔ اب وہ صاف صاف اظہار پر اتر آئی تھی۔

"پلیز زین... کیوں نہیں سمجھتے ہو تم..." سحر نے بے بسی سے اس پتھر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

مگر زین انتہائی پر سکون انداز میں ڈرائیونگ کرتا رہا جیسے ان دونوں کے علاوہ بھی گاڑی میں کوئی تیسرا موجود ہو' جس سے سحر مخاطب ہو۔

"زین..." سحر کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ اسے کندھے سے پکڑ کے جھنجھوڑ ڈالا۔ جھٹکا لگنے سے گاڑی لہرا کے فٹ پاتھ سے جا ٹکرائی۔ سحر گھبرا گئی۔ زین نے جھٹکے سے سر گھما کر اسے دیکھا۔

"زین سوری..." وہ رو دینے والی ہو رہی تھی۔

"تمہارے حق میں بہتر ہے کہ چپ رہو' ورنہ میں یہیں گاڑی چھوڑ کے چلا جاؤں گا۔" وہ دہاڑا۔

سحر خاموش ہو گئی کہ اس سے کوئی بعید نہ تھا کہ وہ ایسا کر بھی گزرتا۔ وہ شرمندگی سے رو پڑی۔

"میں آخری دفعہ تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ میرے پاس تمہارے لیے کچھ نہیں ہے۔ تم پتھر سے سر پھوڑ رہی ہو۔ تمہاری کوششوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔" وہ پتھریلے لہجے میں بولا۔

"کچھ احساس ہے تمہیں کہ تم کس کی محبت کو ٹھکرا رہے ہو۔ میں سیٹھ ارمغانی کی بیٹی... ان کی ساری جائیداد کی اکلوتی وارث... سب کچھ میرا ہے... اور میں..."

"محترمہ! ایک بات یاد رکھیے گا تمہارے باپ کی بے پناہ دولت اور تمہاری یہ خوبصورتی میرے لیے بے وقعت ہے۔ میری زندگی میں دولت کی کبھی کمی نہیں رہی۔ تم نہیں جانتیں میں کون ہوں۔ سو اپنے کام سے کام رکھا کرو۔" اس نے نہایت سرد مہری سے کہا۔

"زین..." سحر کی آواز گلے ہی میں گھٹ کے رہ گئی۔

"میں اس سے زیادہ نہ کچھ کہنا چاہتا ہوں اور نہ ہی سننا چاہتا ہوں۔" وہ ہاتھ اٹھا کے بولا اور جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کر کے ریورس گیئر میں ڈال دی۔

سحر اس کے بعد لب بھی نہ کھول سکی۔ ہوش اس کی آواز پہ آیا۔

"اتریں..." سر اٹھایا تو گاڑی گھر کے وسیع و عریض کار پورچ میں کھڑی تھی۔ کچھ دیر پہلے اسے اپنی حیثیت سے آگاہ کرنے والا گاڑی کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔

وہ مردہ قدموں سے اتری اور گھر کے اندر بڑھ گئی۔

وہ وہاں سے سیدھا سیٹھ ارمغانی کے آفس آگیا۔

گاڑی کی چابیاں ان کے سامنے میز پہ رکھ دیں۔

"سر! میں ذہنی طور پہ اس قابل نہیں کہ ڈرائیونگ کر سکوں۔"

"تم نے خود ہی آفس جاب سے انکار کیا تھا ورنہ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ تم اپنے معیار کا کام کرو۔۔۔ تمہارے پاس اتنی ڈگریاں ہیں۔" انہوں نے کہا۔

زین خاموش رہا۔ سیٹھ صاحب جانتے تھے وہ آفس میں کام نہیں کرنا چاہتا وہ تقریباً روز ہی اس سے اصرار کرتے تھے مگر پتا نہیں کیوں وہ ٹال دیتا تھا۔ اب بھی سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ اتنا ضرور وہ جانتے تھے کہ کوئی کرب ہے۔۔۔ جو اندر اندر ہی اسے کاٹتا رہتا ہے۔

"زین۔۔۔ تم یہاں آفس میرے ساتھ آجاؤ اور بی بی کے ساتھ میں اختر کی ڈیوٹی لگا دیتا ہوں۔" کچھ دیر بعد سیٹھ ارمغانی نے دھیرے سے کہا تو اس نے مزید سر جھکا لیا گویا سے ان کا یہ فیصلہ منظور تھا۔

لیکن اگلے دن جب اختر یونیورسٹی سے سحر کو لینے گیا تو تنتناتی ہوئی باپ کے۔۔۔ آفس چلی آئی۔

"ارے بیٹا۔۔۔ کیا ہو گیا ہے۔۔۔ کیوں اتنے غصے میں ہو۔" انہوں نے پریشانی سے پوچھا۔

"ڈیڈ! مجھے اختر کے ساتھ یونیورسٹی نہیں آنا۔" وہ اپنی بات پہ ڈٹی رہی۔

"بیٹا! زین اب راضی نہیں۔"

"میں کچھ نہیں جانتی ڈیڈ! میری گاڑی زین ہی ڈرائیو کرے گا۔"

"اچھا تم بیٹھو۔ میں زین کو بلوا کے تمہارے سامنے ہی بات کرتا ہوں۔" انہوں نے انٹرکام پہ زین کو اندر بھیجنے کا کہا۔

زین کچھ دیر بعد اندر آیا۔ سیٹھ ارمغانی نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"زین! سحر کی خواہش ہے کہ گاڑی تم ہی ڈرائیو کرو۔"

"سر! اپنی ذہنی حالت کے پیش نظر میں نہیں سمجھتا کہ میں یہ ذمہ داری اٹھا پاؤں گا۔۔۔ پلیز۔"

"زین دراصل اختر نے ایک دو دفعہ گاڑی مار دی تھی۔۔۔ اسی لیے سحر ڈر رہی ہے اس کے ساتھ۔۔۔"

"سر! آپ کوئی نیا ڈرائیور رکھ دیں ان کے لیے۔"

زین نے بہترین مشورہ دیا۔

"ڈیڈ! ہر کسی پر اعتبار نہیں کر سکتے۔ میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔" سحر نے کہا تو زین کا دل چاہا کہ اس کا سر توڑ دے۔

"ٹھیک ہے سر مگر ایک شرط پر۔۔۔" وہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔

"وہ کیا۔۔۔؟" اس کی بات پر سحر کی دھڑکنوں کی رفتار ایک دم بڑھ گئی۔

"آپ سحر بی بی سے کہہ دیں کہ وہ گاڑی میں خاموش بیٹھیں گی۔ یہ بہت بولتی ہیں۔ میں ڈسٹرب ہوتا رہتا ہوں۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں سحر کی شکایت کر دی۔ سیٹھ ارمغانی کچھ نہ سمجھے۔ مسکرا دیے مگر سحر اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر شرمندہ ہو گئی۔ کہنے کو تو زین نے کہہ دیا مگر اب اسے شرمندگی ہو رہی تھی۔ سحر کی شرمندگی دیکھ کر۔ اس نے سیٹھ ارمغانی کے ٹیبل سے گاڑی کی چابیاں اٹھائیں۔۔۔ گاڑی کی طرف بڑھا مگر سحر نے "سوری زین" کہہ کر چابی اختر کے حوالے کر دی۔

زین کو خوشی ہوئی کہ اسے سنبھلنے کا سلیقہ تھا۔

گاڑی گیٹ سے نکلی تو وہ بجھے دل سے اپنی سیٹ پر آ گیا۔

☼ ☼ ☼

"انیس! مجھے امید ہے میں اسے ڈھونڈ لوں گی۔۔۔ اس سے معافی مانگے بنا تو مجھے موت بھی قبول نہیں۔"

چھوٹی ماں ایک بیٹے کی موت اور دوسرے کی جدائی میں تڑپنے لگیں۔ "کتنا ظلم کیا میں نے زین کے ساتھ' دعا کے ساتھ۔ کیا میرے لیے بخشش کا کوئی راستہ ہو گا۔۔۔" وہ سوال کرتیں اور کوئی جواب نہ پاتیں۔ کیونکہ بہت سے سوالات کے جوابات ان کے اپنے اندر ہی مل جاتے تھے۔

"پتا ہے انیس! مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی' جب سوتی ہوں یوں لگتا ہے، جیسے تیزاب کی بارش میرے وجود پر برس رہی ہے۔۔۔ میں سو نہیں پاتی۔۔۔ مجھے بے

خوابی کا مرض لاحق ہوگیا ہے.... میں یوں ہی سسک سسک کر جی رہی ہوں.... میں تڑپ تڑپ کر مرنا چاہتی ہوں جیسے دعا تے تکلیف سہی۔ جو میرے لیے سکندر کی پھانسی کے پھندے سے کئی گنا زیادہ اذیت ناک ہے.... لیکن ایک بار زین مل جائے تو.... ہلکی سی امید ہے کہ شاید.... وہ مجھے معاف کردے....''

انیس ابتسام نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مغرب کی نماز کو چل دیے۔ واپسی میں وہ زبردستی بھابھی کو ساتھ لانے میں کامیاب ہوگئے۔ پھر ان کی کوششوں سے پہلی دفعہ بھائی جان نے بھابھی سے فون پر بات کی۔

''میں نے آپ سے دھوکا کیا۔ مجھے معاف کردیں۔''

وہ رو پڑیں۔

''میں نے بہت سے لوگوں کی زندگی برباد کی.... آپ کی اپنی اور اس شخص کی جس نے میرے سہارے کھڑا ہونا چاہا.... اپنی اولاد کو جو عورت پھینک آئے.... اس کی زندگی میں مسرتوں کا کوئی حق نہیں ہوتا.... اسی لیے تو مجھے میری دعا نصیب نہیں ہوئی۔''

''ایک دفعہ اپنی بیٹی کے پاس ضرور جانا معافی مانگنے....'' ان کا اتنا کہنا تھا کہ سسکیاں روکنا ناممکن ہوگئیں۔

''میں آپ کی اجازت کی منتظر تھی....''

''اجازت ہے....'' اور رابطہ ٹوٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

''سحر آئی ایم سوری....'' گاڑی سیدھے روڈ پر ڈالتے ہوئے اس نے بیک ویو مرر سے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش رہی۔ آج اختر چھٹی پر گیا تھا۔ سیٹھ ارمغانی میٹنگ میں تھے۔ انہوں نے اپنے پی اے کے ذریعے کسی کو سحر کو پک کرنے کا پیغام بھیجا تو زین نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور خود لینے چلا گیا۔

سحر نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''سحر! یقین کرو کہ میں بہت چھوٹا سا ٹوٹا پھوٹا انسان ہوں.... مجھ سے اپنے ساتھ چلنے والے لوگوں کی خوشیاں سنبھالی نہیں جاتیں۔ تم تو اتنی نازک سی ہو کہ ایک کانٹے کی چبھن بھی نہ سہہ پاؤ۔'' اس کی خاموشی کے باوجود وہ بولتا رہا کہ وہ جانتا تھا کہ اس سے تھوڑی زیادتی ہوگئی تھی۔

''سحر! میں نے کسی کو بہت شدت سے چاہا تھا۔ تم تصور بھی نہیں کرسکتیں کہ وہ میرے لیے کیا تھی.... تم بہت اچھی ہو مگر مجھے اب کسی اور کی تمنا نہیں رہی۔''

اس نے اپنی خوبصورت آنکھوں کو بے رحمی سے رگڑ ڈالا کہ آنسو اس کے دل کی کیفیت کا بھرم نہ توڑ ڈالیں۔

''میں آج بھی اس کی محبت کو اپنے وجود کا حکمران پاتا ہوں.... اس کی محبت نے مجھے سکھایا ہے کہ کسی کو تکلیف دینا محبت کرنے والوں کو زیب نہیں دیتا۔ اسی لیے مجھے تمہیں ہرٹ کرکے افسوس ہو رہا ہے....'' وہ چپ رہی۔ کافی دیر خاموشی رہی۔

''سحر....'' زین نے چونک کر بیک ویو مرر میں دیکھا۔ پھر اس کے ہوش گم ہوگئے۔ وہ پچھلی سیٹ پر بے ہوش پڑی تھی۔

''او مائی گاڈ....'' وہ گھبرا گیا۔ اس نے سائیڈ میں گاڑی روکی اور اس کی طرف کا دروازہ کھول کے اسے پکارنے لگا۔ اس کے گال تھپتھپائے۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو قریبی اسپتال لے آیا۔

ڈاکٹر نے چیک اپ کیا اور ایک ٹیسٹ لکھ کردیا۔ یہاں تک سب ٹھیک تھا مگر اچانک ڈاکٹر نے اس کے ہوش اڑا دیے۔

''فکر کی کوئی بات نہیں۔ آپ کی مسز بالکل ٹھیک ہیں۔ ان فیکٹ شی از پریگننٹ....'' ڈاکٹر صاحبہ مسکراتے ہوئے بتا کے چلی گئیں۔ زین کی حالت ابتر ہوگئی۔

''تو یہ تھی اپنے باپ کے، غریب ملازم کو پٹانے کی وجہ.... تُف....'' اس نے غرا کر کہا۔

''زین....'' اس نے بمشکل آواز نکالی۔

''بس....'' اس نے ہاتھ اٹھا کے اسے کچھ بھی بولنے سے روکا۔ سحر کی تو روح ہی تھرا اٹھی۔

"تم سونے کا چمچہ منہ میں لے کے پیدا ہوئیں۔۔۔ خوبصورت ہو۔۔۔ تم نے بار بار بتانے کی کوشش کی۔۔۔ کسی اور کو بھی بتایا ہوگا اور وصول بھی کیا۔۔۔ نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔۔۔" وہ ڈاکٹر کی رپورٹ والا لفافہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے بولا۔

"تم تو میری سوچ سے بھی بڑی چیز نکلیں۔ کمال بازی کھیلنی چاہی میرے ساتھ تم نے۔ واہ داد دینی پڑے گی مجھے تمہاری ذہانت کی۔" وہ تالیاں بجاتے ہوئے بولا۔

"زین یہ رپورٹ صحیح نہیں ہے۔" اس نے بولنے کے لیے بمشکل خود کو جمع کیا۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنا گر سکتی ہو۔ بہر حال اب اٹھو۔ گھر جانا ہے۔" وہ کہہ کے باہر نکل گیا۔

وہ بمشکل اٹھی اور باہر تک آئی۔ دماغ بری طرح چکرا رہا تھا۔ وہ کاؤنٹر پہ بل ادا کر کے پلٹا تو آگے بڑھ کے اسے تھاما کہ وہ گرنے ہی والی تھی۔ انسانیت اور ارد گرد کے لوگوں کی نظروں کی وجہ سے بھی اسے تھامنا پڑا۔

"زین پلیز۔۔۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ یقیناً" ان سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔" راستے میں اس نے ایک بار پھر بولنے کی کوشش کی۔

"پلیز چپ ہو جاؤ۔۔۔ مگر اتنا ضرور سوچو کہ تمہارے باپ کی عزت نیلام ہو جائے گی۔ اسے کچھ لوگ اس شہر میں پہچانتے ہیں۔" زین اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ لفظ چبا چبا کے بولا۔

گاڑی جب پورچ میں رکی تو سیٹھ ارمغانی نے اپنے بیڈ روم کی کھڑکی سے سحر اور زین کو آتے دیکھا۔ ایک خیال ان کے ذہن میں کوندا۔

"اگر سحر کو زین اچھا لگتا ہے تو واقعی وہ اچھا بھی ہے۔ کیا برائی ہے اگر وہ سحر کا ساتھی بن جائے۔ سحر میری اکلوتی اولاد ہے۔ اس کی خوشی میں ہی میری خوشی ہے۔ لیکن کیا وہ مان بھی جائے گا۔" یہ سوال انہیں الجھن میں ڈال گیا۔

☆ ☆ ☆

"زین! میں اپنی بیٹی کی خواہش کے لیے تمہارے سامنے ہوں۔ وہ میری اکلوتی اولاد ہے۔" وہ سر جھکا کے بولے تو زین کو لگا کہ جیسے کسی شکاری نے جال پھینک دیا ہو۔

"یہ ممکن نہیں ہے سر۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔" اس نے فوراً" انکار کیا۔

"کیا تمہیں کوئی اور پسند ہے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میری بیوی کا انتقال ہو چکا ہے اور اس کے علاوہ میں کسی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں اب کوئی رشتہ نہ بنا سکتا ہوں اور نہ نبھا سکتا ہوں۔" اس نے ہر بات صاف صاف بتائی۔

"سحر بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ تمہیں بھی سنبھال لے گی۔"

"جو خود کو نہ سنبھال سکے' وہ بھلا کسی کو کیا سنبھالے گا۔" نہ چاہتے ہوئے بھی زبان پھسل گئی۔

"کیا مطلب۔۔۔؟" وہ الجھے۔

"میرا مطلب ہے میں خود کو اگر نہیں سنبھال پا رہا تو اور کیسے کسی کو سنبھال سکتا ہوں۔" اس نے فوراً" بات بنائی۔

"فیصلہ کرنے میں کچھ وقت لے لو بیٹا۔۔۔ اور فیصلہ کرنے سے پہلے جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ وہ بھی سن لو۔۔۔" وہ خاموش رہا۔

"میں بھی تمہاری طرح بہت تنہا تھا زین اور آج تک ہوں۔ مجھے میرے علاقے سے صرف اس لیے نکال دیا گیا کہ میں نے اپنی مرضی سے شادی کر لی تھی۔ میں بہت پڑھا لکھا نہیں تھا۔ صرف بی۔ اے کیا ہوا تھا۔ اور میری بیوی ایم۔ اے۔ انگلش تھی۔ اس کی خاطر سب کچھ چھوڑنا پڑا۔ سارا خاندان چھٹ گیا۔ پنچایت نے میرے خاندان کو علاقہ بدر ہونے کا حکم دیا۔ مگر میرے باپ نے اپنا آبائی گاؤں اور گھر چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ میں بھی جوانی کے نشے میں چور تھا۔۔۔ محبت کا نشہ بھی سر چڑھ کی بول رہا تھا' سو اپنے بوڑھے والدین اور ایک بہن کو چھوڑ کر اکیلا ہی اپنی پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ شہر آ گیا۔ وہ ایک اچھے پرائیویٹ

ادارے میں نوکری کرنے لگی۔ میں آگے بڑھنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ مجھے پتا ہی نہ چلا کہ اس نے راستے بدل لیے۔ اسے ایک دولت مند شخص مل گیا۔ اس نے مڑ کے یہ بھی نہ دیکھا کہ اس سے کیا کیا چھوٹ گیا... بچی... میں... جس نے اس کی خاطر سب کچھ ہی چھوڑ دیا تھا۔ جب تنہا ہوا تو ماں باپ کی طرف بھاگا۔ وہاں جا کے پتا چلا کہ وہ تو میرے بعد قبر میں اتر گئے۔ آج میرے پاس دولت ہے لیکن میں خالی ہاتھ ہوں۔" وہ چند لمحوں کے لیے رکے۔

زین نے دکھ سے انہیں دیکھا۔

"میں صرف اس انتظار میں ہوں کہ میں سحر کو محفوظ ہاتھوں میں دے دوں۔" وہ آس بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

"سر! اس کے لیے آپ کو ایک مضبوط شخص ہی ڈھونڈنا چاہیے۔ میں تو بہت کمزور سا انسان ہوں۔" وہ زچ ہوا۔

"میں نے ہر ممکن طریقے سے اپنی بیٹی کی اچھی تربیت کی ہے۔ پھر بھی وہ کمی رہ ہی جاتی ہے جو ایک ماں کی تربیت میں ہوتی ہے۔ وہ مجھ سے قریب ہے مگر پھر بھی فاصلہ ہے۔ میں جانتا ہوں۔" انہوں نے اقرار کیا۔

"آئی ایم سوری سر... مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"زین! وہ ایک شریف اور باکردار لڑکی ہے بیٹا... اس کے نزدیک یہ دولت اور آسائشیں سب ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔" وہ بول رہے تھے اور پردے کے پیچھے کھڑی سحر کی دھڑکنیں بے قابو ہو رہی تھیں۔

"سر آپ اپنی بیٹی کو مس جج کر رہے ہیں۔" سحر کے پسینے چھوٹ گئے۔

"ک... کیا مطلب..."

"مطلب، آپ اسی سے پوچھیے گا۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"زین! کھل کے بات کرو... کیا کہنا چاہتے ہو تم۔"

اس نے ڈاکٹری رپورٹس انہیں تھمادیں۔ وہ پڑھ کے نہ کوئی طوفان آیا تھا اور نہ زلزلہ لیکن سیٹھ ارمغانی کی شخصیت کی عمارت زمین بوس ہو گئی۔ کتنے مان اور بھروسے کے ساتھ وہ اس شخص کے ساتھ بات کر رہے تھے کہ ان کی بیٹی ایک شریف اور باکردار لڑکی ہے اور اس کی تربیت انہوں نے کی ہے۔ شرمندگی سے سر جھک گیا۔

نظریں تک ملانا محال ہو گیا۔

وہ سینہ مسلتے ہوئے ادھر ادھر بے چینی سے پھرنے لگے۔

"سر! آپ سحر سے پوچھیے اس آدمی کا نام... باقی میں سنبھال لوں گا۔" زین نے ان کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے کہا تو وہ کچھ سوچتے ہوئے اس کے سامنے آن کھڑے ہوئے اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولے۔

"زین! میں نے اگر اس کی پسند پر سر جھکا لیا تھا تو اللہ اور رسول کے نزدیک اس کی مرضی کو اس کا حق سمجھ کے مگر میں اتنا بے غیرت تو نہیں ہوں کہ اس کی رسوائی کو گلے لگا لوں گا۔ تم پوچھ لو اس سے اس شخص کا نام اور رخصت کر دو اس کے ساتھ۔" انہوں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"سر! ہوش سے کام لیں۔"

"ہوش سے... ہوش سے کام لوں... میں... جس نے تمام عمر بیوی کی بے وفائی پر آنسو ضبط کیے رکھے کہ میرے سامنے سحر تھی جینے کی آس۔ اس نے یہ صلہ دیا۔ میری تمام عمر کی ریاضتوں کا یہ صلہ دیا اس نے... میں زندہ نہیں چھوڑوں گا اسے... مار دوں گا اسے..." وہ دیوانوں کی طرح اس کے کمرے کی طرف بڑھے۔ زین نے بمشکل انہیں سنبھالا۔

"میں اسے جان سے مار دوں گا۔ اسے زندہ دفن کر دوں گا..." وہ دوبارہ اٹھے مگر پھر ٹوٹ کر بیٹھ گئے۔ پسینے سے شرابور ہو رہے تھے۔ دل پر بھاری بوجھ پڑا تو طبیعت بگڑنے لگی۔

"سر! پلیز خود کو سنبھال لیں۔"

"کیسے سنبھالوں خود کو... کتنا تماشا لگے گا۔ کیا یہ بات چھپ سکتی ہے۔" وہ سینے کو بری طرح مسلنے لگے۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوتے دیکھ کر زین

نے ایک لمحے کی تاخیر نہ کی اور انہیں اسپتال لے گیا۔
"ہلکا سا انجائنا کا اٹیک ہے۔" ڈاکٹر نے بتایا تو سحر کی سسکی نکلی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے ڈیڈ کے لیے تکلیف کا باعث بن گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب چھوٹی ماں کی آنکھ کھل گئی۔ انہیں سکندر کا جیل کا وہ کٹھن وقت اور وہ رو رو کر رب سے دعائیں مانگنا۔ اس کی آواز کا وہ درد جوان کا دل کاٹتا تھا۔ سنائی دینے لگیں۔
"اماں! زین سے کہیں۔۔۔ ایک دفعہ آکر مجھ سے مل لے۔ مجھے معاف کردے۔ بس ایک بار۔۔۔ آخری بار۔۔۔ اعتبار کرلے۔۔۔ معاف کردے۔ بس آخری بار۔"
سلاخوں کے اس پار وہ تڑپ رہا تھا اور ماں بے بس تھی۔
"میں اپنے مقام سے گرا ہوں۔۔۔ انسانیت کو رسوا کیا۔ اسی لیے تو سجدے میں گرا ہوں۔۔۔ گڑگڑا رہا ہوں۔۔۔ معاف کردے۔۔۔ بخش دے۔۔۔ رحم کردے۔ کہ تیرے پاس تو طاقت ہے۔۔۔ تو تو عالی مقام ہے۔ مجھ ناچیز کا گناہ بخش دے یا مجھے پل صراط پر چلا کہ میں یا ڈوب جاؤں یا پار لگ جاؤں۔۔۔ میرے رب۔۔۔ مجھ سے یہ دودھاری تلوار کی اذیت نہیں سہی جارہی یا تو راضی ہوجا یا اسے منانے کے لیے کوئی راستہ دکھا دے۔ مجھے اشارہ دے میرے رب۔۔۔ مجھے راہ دکھا۔۔۔ مجھے اس اذیت سے نکال۔۔۔ مجھے بخش دے۔" وہ روتے ہوئے سجدے میں گر گیا تھا۔
"دعا سے کہو اماں۔۔۔ اس کی قبر پر لے کر چلو۔ اس سے کہو۔۔۔ وہ بھی معاف کردے۔ یا اللہ میں کس کس کا گناہ گار ہوں مجھے بچالے یا اللہ! اماں زین۔"
وہ چیختے چیختے نڈھال ہوجاتا تھا۔ عارفہ بیگم اس کی دیوانوں والی حالت پر روتیں۔۔۔ تڑپتیں۔۔۔ زین سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہتیں کہ ایک دفعہ جاکر اس سے مل لو۔۔۔ مگر وہ نہ ملا۔۔۔ نہ معاف کیا۔
وہ بھلا معاف کرتا بھی تو کیوں۔۔۔ سزاوار کو اپنے کیے کا خمیازہ تو بھگتنا پڑتا ہے۔ اللہ نے بھی ہاتھ کے بدلے ہاتھ، آنکھ کے بدلے آنکھ۔۔۔ جان کے بدلے جان کہا ہے۔ وہ دشمن بن کر بھلے کچھ بھی کرجاتا مگر بھائی کے روپ میں اس نے جو کیا، وہ ناقابل معافی ہے۔ زین صاف انکاری ہوگیا تھا۔
وہ اٹھیں اور وضو کرکے، سکندر کی بے چین روح کے لیے ہاتھ اٹھالیے۔۔۔ نفل تہجد وظیفے۔۔۔

☼ ☼ ☼

"زین! یہ دیکھو میرے جڑے ہاتھ۔۔۔ میری کھوکھلی عزت کا پاس رکھ لو۔۔۔ میں مرجاؤں گا۔۔۔ میری نام نہاد عزت کا بھرم رکھ لو۔۔۔ میں پہلے اس کی ماں کے ہاتھوں رسوا ہوا اور اب اسی نے مجھے جینے کے قابل نہیں چھوڑا۔ نجانے کیوں، مجھے لگتا ہے تم میرا مان رکھ لوگے۔" سیٹھ ارمغانی اسپتال سے واپس آئے تو اس کے آگے بے بسی سے ہاتھ جوڑ دیے۔
"زین ایک بے بس اور مجبور باپ تمہارے آگے اپنی عزت کی خاطر ہاتھ جوڑتا ہے۔" انہوں نے حقیقتاً اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔
"زین! صرف نکاح کرلو۔ بھلے ساری زندگی میرے گھر پر بیٹھی رہے۔ میری عزت بچالو زین۔۔۔ اس مجبور باپ کی عزت رکھ لو۔ جو سب کچھ کھو کے بنائی ہے۔ اچھے تھے وہ لوگ جو پیدا ہوتے ہی ان جیسوں کو دفن کردیتے تھے۔" ان کی بے بسی زین سے برداشت نہ ہوسکی۔
"سر ٹھیک ہے۔۔۔ میں سحر سے شادی کے لیے تیار ہوں۔ شاید اسی طرح۔۔۔" وہ نجانے کیا بولنے چلا تھا کہ دروازے میں کھڑی سحر کی لرزتی آواز نے اسے ہوش دلا دیا۔
"نہیں۔۔۔ ڈیڈ۔۔۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے ماردیں۔۔۔ ورنہ میں خود کو ماردوں گی مگر۔" وہ ہلکی نقاہت زدہ آواز میں بول رہی تھی۔
"بکواس بند کرو۔۔۔ ایک گناہ دنیا میں کرلیا اور موت بھی ایسی ہی چننا چاہتی ہو جو حرام ہو۔" سیٹھ ارمغانی

نے انتہائی غصے سے کہا۔
وہ چپ ہو گئی کہ ڈیڈ کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ مزید کوئی بات کرتی۔
"سر! سادگی سے نکاح کر دیں۔ میں تیار ہوں۔"
زین نے سر جھکا کے صرف اتنا کہا۔
"زین! تم ہر بار میری زندگی میں فرشتہ بن کے آئے ہو۔ ایک بار میری زندگی اور اس بار میری عزت بچا رہے ہو۔ میں تمہارے احسانات کا حق کیسے ادا کر پاؤں گا۔"
"سر! احسانات کیسے... بے کار سی زندگی ہے۔ چلیں کسی کے کام تو آئی۔" وہ تلخی سے بولا اور کمرے سے نکل گئے۔
سحر بالکل چپ تھی۔ لبوں کو سی لیا تھا۔ جس کو پانے کے لیے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ اب جب مل رہا تھا تو ارمانوں نے کفن اوڑھ لیا تھا۔
کچھ قریبی لوگوں کی موجودگی میں وہ زین کی زندگی میں داخل ہو گئی۔ اس نے سفید رنگ کا خوب صورت لباس پہنا تھا۔ نکاح کے بعد اسے زین کے ساتھ بٹھایا گیا تو سحر کی دوستوں نے اپنی سی کوشش کر کے وہاں شادی کا ماحول کر ڈالا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی زین کی نظریں اس کی کلائیوں میں پڑی سلور اور سفید چوڑیوں کی اداسی بھری کھنک میں الجھ رہی تھیں۔
وہ کمرے میں آیا تو وہ یک دم گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ خاموشی سے چلتے ہوئے بیڈ کے سامنے رکھی کرسی پہ بیٹھ گیا۔ وہ بیڈ کے کنارے رخ پھیر کر بیٹھ گئی۔ دونوں کی نظریں جھکی تھیں۔ مکمل خاموشی... گہرا سکوت...
"تم سب بھول جاؤ... جو بھی ہوا... وہ تمہارا اور تمہارے اللہ کا معاملہ ہے۔ میں بھی ایک بہت گنہگار سا شخص ہوں۔ پتا نہیں اس رشتے کو نبھا بھی پاؤں گا کہ نہیں... سحر آئی ایم سوری... میں صرف یہ رشتہ کاغذ کی حد تک باندھ رہا ہوں۔ امید ہے، تم سمجھو گی اور اس مسئلے سے فارغ ہو کے اگر الگ ہونا چاہو تو بھی مجھے منظور ہو گا۔" وہ پتھر کا بت بنی رہی۔

دونوں کے درمیان ایک بار پھر آ گئی۔ دماغی طور پر دونوں اپنے اپنے محاذوں پر برسرپیکار تھے۔ وہ دھیرے سے اٹھا اور اسے دونوں کندھوں سے تھام لیا، لیکن وہ اپنی کیفیت سے باہر نہ آ سکی۔
"سحر... سوری... مجھے تمہارا پردہ رکھنا چاہیے تھا۔ سیٹھ صاحب سے شیئر نہیں کرنا چاہیے تھا۔" زین نے کہا تو وہ سوچ کے دائرے سے باہر نکلی۔ آنکھیں کھول کے زین کو دیکھا۔
اس کی گرفت سے خود کو نکال کے انتہائی سرد مہری سے بولی۔
"آپ نے کیا غلط کیا۔ ایک سچی بات ہی تو بتائی ڈیڈ کو۔"
"کبھی نہ گرنا کوئی کمال نہیں ہوتا بلکہ گر کے سنبھل جانا کمال ہوتا ہے، اور مجھے یقین ہے تم سنبھل جاؤ گی۔" زین کے الفاظ گولی کی طرح اس کے وجود میں پیوست ہو گئے۔
"تو کیا مجھے ایک دفعہ گرنا ہو گا اپنا کمال دکھانے کے لیے۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔
"اور نہیں... جتنا گرنا تھا گر چکی ہو... کافی ہے۔" زین کو اس کی ڈھٹائی پہ غصہ تو بہت آیا مگر ضبط قائم رکھا۔
"اللہ آپ کو اس نیکی کے بدلے بہت بڑا اجر دے گا۔ آپ نے جہاں اتنا کیا ہے ایک درخواست اور مان لیں۔"
"بولو۔"
"اپنے بیان پر قائم رہیے گا۔ اس رشتے کو نکاح تک ہی محدود رکھیے گا۔"
"بے فکر رہو۔ تم میرے گھر میں رہتے ہوئے بھی مجھے محسوس نہیں کرو گی۔ اس رشتے کا ایک ہی مقصد تھا، جو تم اچھی طرح جانتی ہو۔ اس کے بعد خود کو آزاد کروا لینا۔" وہ چلا گیا۔
ٹیرس پہ سگریٹ پیتے زین کو دیکھ کر وہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔
زین نے اس کی نگرانی پہ ایک آدمی کو لگا دیا جو فلیٹ

کے ارد گرد ہی رہتا تھا۔ زین کو ڈر تھا کہ وہ بچے کو کوئی تکلیف نہ پہنچا دے۔ دن گزرتے جا رہے تھے۔ وہ اس فلیٹ میں قید ہو کے رہ گئی اس نے بھی باہر جانے کی ضد نہ کی۔ وہ خود ہی اسے سیٹھ ارمغانی سے ملوانے لے جاتا۔

☼ ☼ ☼

زین کبھی کبھی خود سے لڑ لڑ کے تھک جاتا تھا تو سارا غصہ سحر پہ ہی اتارتا۔ کچھ ایسا کہہ جاتا جو سحر کے جسم کو آری سے کاٹ ڈالتا۔ وہ دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

ملازمہ اسے اکثر بتاتی کہ وہ بہت ہی کم کھانا کھاتی ہے۔ دودھ وغیرہ بھی نہیں لیتی تھی۔

ملازمہ نے ہی اطلاع دی کہ بی بی کی طبیعت خراب رہنے لگی ہے۔ پیٹ میں بہت زیادہ درد ہوتا ہے۔ وہ بہت گھبراہٹ کا شکار ہونے لگا تھا۔

اس وقت بھی اس کے اندر طوفان بپا تھا۔ تباہی مچی تھی۔ اٹھا اور اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ وہ بستر پہ لیٹی تھی۔ زین کو آتے دیکھا تو جلدی سے سیدھی ہو کے بیٹھی اور چادر اپنے گرد لپیٹی۔

"صبح تیار رہنا۔ میں نے لیڈی ڈاکٹر سے ٹائم لے لیا ہے۔"

"مجھے کسی کو نہیں دکھانا۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"تب دکھا دیا تھا جب اسے چھپانے کا وقت تھا۔ اب تو بے خوف ہو کر جانا چاہیے کہ اس بچے پر کوئی انگلی نہیں اٹھا پائے گا۔"

"میں تب بھی خود نہیں گئی تھی۔"

"کیا ثابت کرنا چاہتی ہو تم کہ تم پر ظلم ہوا ہے۔"

"جہاں آنکھیں دیکھتے ہوئے بھی لوگ نابینا اور کان سنتے ہوئے بھی بہرے ہو جائیں جہاں رشتوں کو بے اعتباری کی نذر کر دیا جائے وہاں کوئی بے گناہ ہوتے ہوئے بھی کیسے، سزا سے بچ سکتا ہے۔"

"مجھ سے زیادہ کس نے بے گناہی کی سزا سہی ہو گی۔" وہ لمبی ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولا۔

"اس کا بدلہ پھر آپ نے مجھ سے لے لیا۔"

"مجھے عادت نہیں ہے بدلہ لینے کی۔ میں نے ہمیشہ ہار مانی ہے۔ اب بھی چاہتا ہوں کہ تم بھی سب بھول کر اپنا خیال رکھو۔"

"اپنا خیال رکھوں کس کے لیے؟ کسی کو میری ضرورت نہیں ہے حتیٰ کہ میرے باپ کو بھی نہیں۔"

"تھوڑی سی بھی اگر شرم ہے تمہارے اندر۔ اپنے گناہ پر نادم ہو تو مزید گناہ کے راستے پر نہ بڑھو۔"

زین کو اس کی ڈھٹائی پر آگ لگ گئی۔

"نہیں ہے میرے اندر تھوڑی سی بھی شرم۔ بیچ دی ہے میں نے۔" وہ چلائی تو زین کا مضبوط مردانہ ہاتھ اس کے چودہ طبق روشن کر گیا۔ وہ چکرا کر رہ گئی۔

کمرے میں سحر کی آنکھوں سے برسات جاری تھی، اور باہر اس کے وجود میں آگ لگی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ سب کچھ چھوڑ کر بھاگ جائے۔ اپنی دعا کی قبر پر بیٹھ کر زندگی گزار دے۔ مجاور بن جائے اور وہیں موت اس پر مہربان ہو جائے۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔

گھبرانے لگا۔ اس کے اندر کا غبار بڑھا تو وہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

اس وقت بھی وہ درد کی شدت سے دہری ہوئی جارہی تھی۔

"سحر۔۔۔ کیا ہوا ہے تمہیں۔۔۔ اوہ مائی گاڈ۔۔۔" وہ اسے، گاڑی تک لایا اور اسپتال پہنچایا۔

ڈاکٹرز نے مکمل چیک اپ کے بعد ٹیسٹ لکھ کے دیے۔

ڈاکٹرز نے رپورٹس اسے تھمائیں اور بتایا کہ کم خوراکی سے پیٹ میں درد ہے۔ اس نے خود پریگننسی کا کہا تو ڈاکٹر نے اس سے انکار کیا کہ ایسی کوئی بات ہے۔

"لیکن ڈاکٹر صاحب۔۔۔" زین کی آواز پھٹ گئی۔

ایک آسمان ٹوٹا تھا۔ کڑکتی ہوئی بجلیاں زین کو جلا گئیں۔

یہ سب کیا ہوا ہے۔ وہ الجھن میں پھنس گیا۔ اچانک اسے ایک خیال آیا کہ کہیں اس نے بچہ مار تو نہیں ڈالا۔

"کیا کیا ہے تم نے بچے کے ساتھ۔۔۔؟" اگلے دن وہ اس کے سر پر کھڑا تھا۔

"کیا تم نے بچے کو۔۔۔"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"لیکن تمہاری اسپتال کی رپورٹ۔۔۔ جب تم۔۔۔" اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ بولے اور کیسے پوچھے۔

"ان کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔" وہ ٹھہر ٹھہر کے بولی تو زین پریشان ہو گیا۔

"دیکھو تم تو بالکل پہلے جیسی ہی ہو۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔" وہ اس کی ظاہری اور جسمانی حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا تو وہ افسردگی سے مسکرا دی۔

"ڈاکٹر نے تمہارے سارے ٹیسٹ کیے ہیں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔"

"دوبارہ معلوم کریں۔"

"ڈاکٹر کو چھوڑو۔۔۔ تم بتاؤ مجھے۔۔۔"

"ڈاکٹر کو کیسے چھوڑ دوں۔۔۔ رہی میری گواہی تو اس کا کیا اعتبار۔۔۔ تب نہیں مانی گئی تو اب کیوں۔ اب صرف انتظار کریں اس وقت کا آپ بھی اور میں بھی۔۔۔ جب میری گود میں بچہ آئے گا۔"

زین نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

"دیکھو سحر۔۔۔ مجھے مزید مت الجھاؤ۔۔۔ میں بہت ٹوٹا ہوا انسان ہوں۔۔۔ مجھے سچ سچ بتاؤ کیا یہ کوئی غلط فہمی تھی۔"

"غلط فہمی۔۔۔ زین۔۔۔ کیا یہ لفظ مناسب ہوگا۔ کسی کی عزت، وقار، انا، کردار، اعتبار۔۔۔ سب داؤ پہ لگ گیا اور آپ پلڑے میں ایک لفظ غلط فہمی کو رکھنا چاہ رہے ہیں۔"

"تو کیا یہ۔۔۔" سحر کو اس کی آواز کا کھوکھلا پن صاف سنائی دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کسی ہو جانے والے حادثے کی واضح تحریر پڑھی جا سکتی تھی۔

"جی۔۔۔ ایسا کچھ اس وقت بھی نہیں تھا زین! جب آپ نے میرے باپ کے سامنے مجھے ذلیل کیا تھا۔ مجھ پر میرے بے داغ کردار پر تہمت لگائی تھی۔ میں آپ کو معاف نہیں کروں گی۔۔۔ نہ آپ کو اور نہ سیٹھ ارمغانی کو۔۔۔ کیا حق تھا آپ دونوں کو مجھے بے عزت کرنے کا۔" وہ چلانے لگی۔

"تمہارے سامنے ہی تو اس اسپتال میں ڈاکٹر نے یہ سب کہا تھا۔" زین نے اسے کندھوں سے تھامنا چاہا تو وہ جھٹکے سے اس سے دور ہوئی۔

"اسی اسپتال سے ایک دن بعد فون بھی آگیا تھا، معذرت کا کہ انہوں نے غلطی سے سائرہ نامی لڑکی کی رپورٹ مجھے دے دی تھی۔"

"سحر۔۔۔" اس نے سخت بے بسی سے اسے پکارا۔

"اگلے ہی دن میں نے شہر کے چار اسپتالوں سے ٹیسٹ کروائے تھے زین۔۔۔ یہ لیں۔۔۔ میں جانتی تھی کہ مجھے ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔" وہ پاگلوں کی

طرح اپنے بیگ کی جانب دوڑی اور زپ کھول کے اندر سے فائل نکالی اور پھر سے زین کے سامنے میز پر رکھ دی۔

"یہ دیکھیں وہ رپورٹ جو آپ نے وصول کی تھی۔ پڑھیں اس پر لکھا نام۔۔۔"

"تم نے بتایا کیوں نہیں۔۔۔" زین نے فائل کی طرف دیکھے بنا گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔

"کیونکہ کسی نے مجھے بتانے کا موقع ہی نہیں دیا اور نہ ہی پوچھا۔ بس سزا سنا دی۔" وہ سنجیدگی سے بولی اور چہرہ دوسری جانب موڑ لیا۔

"آئی ایم سوری سحر۔۔۔ آئی ایم رئیلی ویری سوری۔۔۔" زین کے وجود میں یک دم ایک ہلچل سی مچ گئی۔ اسے لگا' ایک دفعہ پھر اس کی دعا تیزاب سے جل رہی ہو' مگر اب کی بار زین کا وجود آزاد تھا۔ کسی کے ہاتھوں کے شکنجے میں نہیں تھا۔ اس بار اس نے جلایا تھا' کسی سکندر نے نہیں۔

وہ دونوں آمنے سامنے تھے۔ دونوں جل رہے تھے۔ دونوں ہی۔۔۔ وہ بے اعتباری کی آگ میں اور وہ ندامت کی آگ میں۔۔۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اپنا قول نہ بھولیے گا۔ وہ تو یاد ہوگا۔" وہ اسے کیا یاد دلانا چاہ رہی تھی۔

"کیا مطلب۔ کک۔۔۔ کون سا قول۔۔۔" اس کا دل کانپا کہ وہ یک دم بہت اجنبی سی بن گئی تھی۔

"آپ نے کہا تھا کہ جوں ہی میں بچے سے فارغ ہو جاؤں گی اپنی زندگی کا فیصلہ کر سکوں گی۔ اب میں فارغ ہو گئی ہوں۔ کیا میں فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتی ہوں؟"

"سحر۔۔۔ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ آئی ایم سوری۔" وہ بے تحاشا شرمندہ تھا۔

"اب شرمندہ ہونے سے کوئی فائدہ ہے نہ نقصان۔ بس مجھے آزاد کر دیں۔ یہی میرا فیصلہ ہے۔ امید ہے آپ کو اعتراض نہیں ہوگا۔" وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولی۔

"معاف نہیں کر سکتی ہو۔"

"میں فیصلہ کر چکی ہوں۔"

"سحر! میری بات سنو۔ میں واقعی شرمندہ ہوں۔"

"آپ نے کہا تھا کہ آپ اپنے قول سے نہیں پھرتے۔" وہ چیخ گئی۔

"تم بھی جس محبت کی دعوے داری کر رہی تھیں' اس سے پیچھے ہٹ رہی ہو۔"

"ایک عزت بچانے کے لیے معاہدہ کیا گیا تھا اور اب اس معاہدے کی مدت ختم ہو گئی ہے۔" وہ چیخ پڑی۔

"پاگل مت بنو سحر۔ میں مانتا ہوں کہ مجھ سے بہت بڑی ناانصافی ہوئی ہے تمہارے ساتھ' لیکن اس کی سزا خود کو دینا عقل مندی تو نہیں' میں نے غلطی کی' میں سزا سہنے کو بھی تیار ہوں۔"

"مجھے کسی کو کوئی سزا نہیں سنانی۔ بس میرا فیصلہ کر دیں۔" وہ کمرے میں چلی گئی۔ وہ بھی اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ خیال آنے پر وہ دوبارہ اس کے کمرے میں گیا تو وہ نہیں تھی۔ وہ دیوانوں کی طرح سیٹھ ارمغانی کے پاس پہنچا۔ حسب توقع وہ وہیں تھی۔ اس کا سانس بحال ہوا۔

"مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے زین۔۔۔ میں اس کی ماں کے کیے کی سزا اسے سنا بیٹھا۔ اسے موقع ہی نہیں دیا' کیوں اتنا بے رحم ہو گیا تھا میں۔"

اب وہ موقع دینے کو تیار نہیں تھی۔ اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ اس کے ساتھ نہیں رہنا۔ وہ اس کے کمرے کا دروازہ بجاتا رہا مگر وہ نہ کھلا۔

زین ایک دفعہ پھر ہارا تھا۔ ایک اور مات مقدر ہوئی۔ اب کے اس میں کسی کا ہاتھ نہیں تھا۔

اس بار وہ اپنے ہی ہاتھوں ہارا تھا اور اس بار یوں ٹوٹا کہ دوبارہ کھڑے ہونے کی ہمت نہیں تھی۔

وہ کچھ سننے اور ماننے کو تیار نہ تھی یہاں تک کہ سیٹھ ارمغانی کی بھی۔۔۔

رات بستر پر آئی تو نظروں کے سامنے زین کی تصویر گھوم گئی۔ اتنے ظالم لگتے تو نہیں تھے تم۔۔۔ پھر کیوں زین۔۔۔ کیا یہ محبت کا بدلہ تھا۔ شرمندگی بھرے، چند جملے۔ ندامت۔۔۔ اور تھوڑی سی مزاحمت کہ سحر مت جاؤ اور پھر یہ کہہ کے راستے سے ہٹ جانا کہ میرے مقدر میں صرف ہارنا ہی لکھا ہے۔۔۔ سب کچھ تو میری مرضی پر چھوڑ دیا ہے زین۔۔۔ تو پھر میں نے محبت کی۔۔۔ جنگ لڑی اور جیت بھی لی۔۔۔ یہ میرا دعوا ہے۔۔۔ جھٹلا کر دکھاؤ۔ اب لیکن میری ضد ہے کہ باقی کی جنگ تم لڑو۔ دریدہ دامن کے ساتھ اب بھی میں ہی قدم بڑھاؤں کیا۔ یہ زیادتی نہیں ہے میرے ساتھ زین۔۔۔ ایک دفعہ زین۔۔۔ صرف ایک دفعہ مجھے اذن سفر تو دو۔۔۔ میں تو کب سے تیار ہوں۔۔۔ میرا اسباب سفر تو میرا محبت بھرا دل ہے، جس کو صرف تمہاری تمنا ہے۔۔۔

وہ روتی رہی۔۔۔ سلگتی رہی۔ تڑپتی رہی۔

☼ ☼ ☼

وہ تینوں سیٹھ ارمغانی کے محل نما گھر آ گئے۔ سیٹھ ارمغانی انہیں دیکھ کر پتھر کے بت بن گئے۔

"زینت۔۔۔!" ان کا سر جھکا رہا۔

"یہ تلخ اور کڑوی حقیقت ہے کہ تم میرے سامنے کھڑی ہو۔" وہ تلخی سے گویا ہوئے۔

"تم تو سب کچھ مجھ سمیت جہنم میں جھونک گئی تھیں۔ پھر آج میری دہلیز تک کیسے آنا ہوا۔ کیا یہ دیکھنے کہ اس آگ میں جلے وجود کیسے زندگی گزار رہے ہیں تو دیکھو۔۔۔ یہ ہے وہ بچی، جس کو تم پھینک کر چلی گئی تھیں۔ اس کے کردار پر وہ داغ لگا، جو جرم اس نے نہیں کیا اور تم کتنی گنہگار تھیں، مگر بنا سزا کے زندگی گزار رہی ہو۔ تم نے تو کوئی سزا نہیں سہی، سزا تو میں اور میری بیٹی سہہ رہے ہیں۔" سیٹھ ارمغانی گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھے۔

انیس ابتسام نے زینت بی بی کے پتھر وجود کو تھام رکھا تھا۔

عارفہ بیگم آگے بڑھیں اور سحر کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر صوفے تک لے کے آئیں جہاں زینت بی بی سر جھکائے آنسو بہا رہی تھیں۔ ماں اور بیٹی ملیں تو آنسوؤں کی برسات شروع ہو گئی۔

"میری بچی۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔۔۔ اللہ کے واسطے مجھے معاف کر دو۔" انہوں نے اسے خود سے لگاتے ہوئے کہا۔

وہ بالکل خاموش تھی۔

"سحر بیٹی۔۔۔ کچھ تو بولو۔" زینت بی بی نے اس کے پتھر وجود کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

لیکن وہ ہنوز خاموش رہی۔ پھر تھوڑی دیر بعد اٹھ کر چلی گئی۔

وہ کیسے اس عورت کو قبول کر لیتی جو اسے اور اس کے ڈیڈ کو چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔

وہ مایوس ہو کر چلی گئیں تو ڈیڈ اس کی طرف آ گئے۔

"سحر وہ تمہاری ماں ہے۔۔۔ مت ٹھکراؤ اسے۔۔۔ معاف کر دو۔"

"ڈیڈ! پلیز مجھے مجبور نہ کریں۔" اس نے چہرہ دوسری طرف موڑتے ہوئے کہا۔

"بیٹا۔۔۔ سب اللہ پر چھوڑ دو۔۔۔ وہ بہت کرب سے گزر رہی ہوگی۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ ممتا کبھی نہیں مرتی۔"

"ڈیڈ! میں آپ کے کرب کا اندازہ بھی کر سکتی ہوں۔"

"سحر! میاں بیوی کا رشتہ دنیاوی رشتہ ہوتا ہے۔ توڑا جا سکتا تھا، سو اس نے توڑ دیا، لیکن تم سے جو رشتہ ہے وہ نہ تم توڑ سکتی ہو اور نہ وہ۔ خونی رشتہ ہے تمہارے اور اس کے درمیان۔۔۔"

"رشتے جذبوں سے پروان چڑھتے ہیں ڈیڈ۔۔۔ اور ان جذبوں کو انہوں نے اپنے پاؤں تلے روند دیا ہے۔"

"تمہاری جنت ان ہی قدموں کے نیچے ہے۔ بہتر ہوگا

کہ تم سب، کچھ بھول کر اس کے دکھ میں شریک ہو جاؤ۔"

"ڈیڈ..." وہ ان سے لگ کر رو دی۔ دونوں کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

ٹھک... ٹھک... دروازہ بجا تو وہ بمشکل اٹھا اور دروازہ کھولا، مگر سامنے چھوٹی ماں اور نحیف اور کمزور سے کھڑے ابا جان کو دیکھ کر ساکت ہو گیا۔

"آپ..." زین نے تیزی سے آگے بڑھ کر انہیں تھام لیا۔

"زین میرے بچے... ہمیں ضرورت ہے تمہارے سہارے کی۔" وہ بیلے پڑے زین کے چہرے کو دیکھ کر تڑپ گئے، جو پچھلے تین دن کے بخار کی وجہ سے کافی کمزور ہو گیا تھا۔

"مگر مجھے تو خود ضرورت ہے سہارے کی ابا جان... کیسے سہارا بن سکتا ہوں میں کسی کا..."

"ہم اتنے عرصے سے دیوانوں کی طرح ڈھونڈ رہے ہیں تمہیں..." انیس ابتسام اس کے ساتھ لگ کر بولے۔

"میں نے سب کو معاف کر دیا ہے... پلیز آپ بھی مجھے معاف کر دیں۔ آزاد چھوڑ دیں مجھے... مجھے میری زندگی جینے دیں... میں یہاں بہت سکون میں ہوں۔ زندگی میری خواہش کے عین مطابق ہے۔" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اگر تمہیں ہمارے ساتھ رہنا منظور نہیں تو اپنی تائی اماں کا سہارا بن جاؤ۔"

"تائی اماں..." وہ حیران ہوا۔

"بھابھی بہت تنہا ہو گئی ہیں۔ بیٹی مل تو گئی ہے مگر معاف کرنے کو تیار نہیں۔ انہیں کچھ نہیں ملا نہ زندگی سے اور نہ رشتوں سے..." چھوٹی ماں نے کہا تو زین نے سر جھکا لیا۔

"زین! مجھے معاف کر دو۔ اپنی گنہگار ماں کو معاف کر دو۔" عارفہ بیگم نے روتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

"میں نے کبھی بھی آپ کو گنہگار نہیں سمجھا اماں... سکندر نے جو کچھ کیا اس کے ساتھ مٹی ہو گیا۔ آپ کیوں اس کی وجہ سے شرمسار ہو رہی ہیں۔" زین نے ان کے جڑے ہاتھ تھام لیے۔

"میں نے ہر لمحہ خود کو تمہارے لیے تڑپتے دیکھا ہے زین بیٹا... میں نے سکندر کی موت کو دل سے قبول کر لیا ہے، مگر تمہاری جدائی میرے دل کے لیے ناقابل قبول ہے۔ وہ گھر تمہاری آمد کا منتظر ہے اور میں نے تمہیں ساتھ لے کر ہی جانا ہے۔ مجھے یقین ہے تم میرا مان نہیں توڑو گے۔" وہ بضد تھیں۔

"اماں..."

"زین! میں تمہاری اذیت کا اندازہ کر سکتی ہوں۔ سکندر سے مجھے محبت تھی، مگر اس کی درد بھری موت کی اذیت میں اپنے دل میں محسوس کرتی ہوں، اس کا دکھ مجھے کسی پل چین نہیں لینے دیتا۔ میری عمر بھر کی پونجی تھا سکندر۔ لٹ گئی، لیکن جو خزانہ اب میرے ہاتھ لگا ہے تمہاری محبت کی صورت، وہ انمول ہے۔ اب اسے میں لٹنے نہیں دوں گی۔" وہ آنسو بھری آواز میں بولیں۔

زین نے نظریں جھکا لیں۔ وہ جانتا تھا کہ ان کو اس عمر میں جدائی کی اذیت دینا مناسب نہ تھا۔

زین نے ان دونوں کو اپنے بازوؤں میں سمو لیا۔ پھر تو وہ ان کے ساتھ لگ کر اتنا رویا کہ خود ان دونوں کو اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ ان دونوں نے اللہ کے بعد فہد کا ڈھیروں شکر ادا کیا کہ جس کی بدولت وہ زین تک پہنچ پائے تھے۔ فہد زینت بی بی کے بھائی کا بیٹا تھا اور پولیس ڈپارٹمنٹ میں تھا۔

☼ ☼ ☼

"کہیں سکون نہیں ملا تائی اماں! اس لیے لوٹ آیا ہوں۔" تائی اماں کے گلے لگتے ہوئے اس نے اپنی ہار تسلیم کر لی۔

"زین! تیرے ساتھ تیرے ماں باپ کی دعائیں تھیں۔ تو خوش قسمت ہے میرے لال۔" اسے اپنے کمزور سے بازوؤں میں چھپا کے وہ کتنی دیر روتی رہیں۔

"تائی اماں! خوش قسمت میرے جیسے ہوتے ہیں کیا۔ جو ساری زندگی ادھورے رہتے ہیں، جن کی جھولی میں صرف ناکامیاں ہوتی ہیں۔" وہ اپنے خالی ہاتھوں پر نظریں جمائے مایوسی سے بولا۔

"نہیں میرے بچے! ایسے نہیں کہتے۔ وہ رب کسی کو اس کی ہمت اور طاقت سے زیادہ نہیں آزماتا۔ اس نے تیرے حصے کی خوشیاں اپنے پاس رکھی ہوئی ہیں۔" وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولیں۔

وہ اداسی سے مسکرا دیا۔

وہ تائی اماں کو اپنے ساتھ لے آیا تھا اب تنہا نہیں تھیں۔ ابا جان نے زین کو بتایا کہ انہوں نے تائی اماں کے پہلے شوہر سے رابطہ کرلیا ہے اور اب ان کی بیٹی بھی جلد ہی مان جائے گی۔

"تائی اماں! ایک اقرار کرنا چاہتا ہوں۔" سر جھکا کر بات کرنے کی ہمت کی۔ کئی دفعہ ہمت باندھتا کہ تائی اماں کو اپنی شادی کے متعلق بتائے۔ پھر چپ رہ جاتا۔

"بولو میرے بچے۔"

"میں نے دعا کی محبت سے بے وفائی کی ہے۔ کسی اور سے شادی کرلی ہے۔" تائی اماں کے دل کو دھچکا تو لگا، مگر فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔

"یہ بے وفائی نہیں ہے اللہ کی رضا میں راضی ہونا ہے۔ بہت خوشی کی بات ہے۔ کیا سب جانتے ہیں۔ بھائی جان اور بھابھی۔"

"صرف آپ کو بتا رہا ہوں۔" اس نے وہ بات جو اپنے ماں باپ سے بھی چھپا رکھی تھی۔ انہیں اپنے اوپر بیتنے والی ساری اذیت بتا دی۔

"اوہ۔"

"تائی اماں! میری نہ کوئی دعا قبول ہوئی اور نہ میرے مقدر میں کوئی چمک دار سحر ہے۔ میں وہ سیاہ بخت ہوں جو بہتے دریا پر چلا جائے تو وہ بھی خشک ہو جائے۔" وہ خود سے مایوس تھا۔

"اب صرف چند قدموں پر خوشی تمہاری منتظر ہے جان۔ اب ان شاء اللہ یہ کالی رات کٹ جائے گی۔" وہ اس کا ماتھا چومتے ہوئے بولیں۔

"تو اسے منا لے میرے بچے! اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں۔

"نہیں مانتی تائی اماں۔ بہت کوشش کی ہے۔" وہ ہار مانے بیٹھا تھا۔ "میں اسے واپس لاؤں گی۔" وہ بولیں۔

"کبھی نہیں آئے گی۔" اس نے مایوسی سے سر نفی میں ہلایا۔

"نہیں زین! عورت کا دل بہت نرم ہوتا ہے۔ وہ جس سے محبت کرتی ہے اس سے ضد تو لگا سکتی ہے مگر اس سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کرتی۔" تائی اماں نے کہا تو وہ سر ہلا کر مسکرا دیا۔

"پتا ہے زین! میں سوچ رہی تھی کہ ایک دفعہ پھر تمہیں آزمائش میں ڈالوں گی۔ اپنی دوسری بیٹی کے لیے تمہارے آگے جھولی پھیلاؤں گی۔ مگر۔" وہ افسردگی سے بولیں۔

"تائی اماں! کیا اس کی شادی نہیں ہوئی ابھی۔" زین نے پوچھا۔

"نہیں۔ تب ہی تو اپنے گھر میں تھی۔"

"اللہ بہتر کرے گا۔ اللہ نے ہر ایک کے حصے کی خوشیاں رکھی ہوتی ہیں۔ بس وقت کا انتظار صبر سے کرنا چاہیے۔"

"بے شک ایسا ہی ہے اور ان شاء اللہ تمہارے حصے کی خوشیاں بھی بہت جلد تمہارے دامن میں ہوں گی۔" وہ دعائیں دینے لگیں تو اس نے آمین کہا۔

کمرے میں آیا تو بے چینی سے سگریٹ پر سگریٹ پینے لگا۔ پھر موبائل اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔

"ہیلو۔ سحر۔" بے تابی سے پکارا۔

"جی بول رہی ہوں۔" دھیمی سی آواز کانوں میں

گونجی۔

"میں جانتا ہوں میرے جرم کو معاف کرنا آسان نہیں' مگر تمہیں مجھ سے محبت بھی تو ہے۔ یا وہ بھی میری سیاہ بختی سے، ہار گئی ہے۔"

وہ خاموش رہی۔ آنسو دامن کو بھگوتے رہے۔

"سحر۔۔۔ پلیز۔"

"زین! میرے، مقدر میں تو ماں کا ہی پیار نہیں تھا اور کسی کا کیا ملتا' بس نے تسلیم کرلیا ہے کہ آپ میرا مقدر نہیں ہیں۔ زبردستی میں آپ کی زندگی میں' داخل نہیں ہو سکتی۔"

"کیا تم یہی چاہتی ہو کہ یہ رشتہ ٹوٹ جائے۔"

"میں کیا چاہتی ہوں اس بات کو چھوڑیں۔ جو آپ چاہتے ہیں وہ کریں۔ میرے ساتھ آج تک جو کچھ ہوا' کیا وہ میں نے چاہا تھا۔" اس نے روتے ہوئے فون بند کردیا۔

☼ ☼ ☼

"سحر۔۔۔ مجھے معاف کردو میں بھٹک گئی تھی۔ نفس کی غلام ہوگئی تھی' میں نے محبت اعتبار' رشتے۔۔۔ سب کو رسوا کیا' لیکن ممتا کی تڑپ قدم قدم پر میرے ساتھ رہی۔ میں نے اپنی بچی کا نام تمہارے نام پر رکھا اپنے شرمندہ ممتا کے جذبے کی تسکین کے لیے' لیکن مجھے سزا مل گئی جس رشتے کی قدر نہ کرسکی' وہ پھر بھی مجھے نصیب نہ ہوا۔" وہ بے بسی سے رو رہی تھیں۔ سحر سیٹھ ارمغانی کے اصرار پر ان سے ملنے بالآخر آہی گئی تھی اور اب ان کے، ساتھ لگ کر آنسو بہائے جارہی تھی۔

کتنا بڑا درد ان کے نام ہوا تھا۔ ان کی ممتا کی تڑپ سب کو جھلسا رہی تھی۔ کچھ درد ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی درماں نہیں ہوتا۔ کچھ زخم تمام عمر مندمل نہیں ہو پاتے۔

"سکون تو آپ کی اس بیٹی کو بھی نصیب نہیں ہوا۔ تقدیر نے قدم قدم پر وہ چوٹ لگائی کہ یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ آپ کی بیٹیاں بہت بدقسمت ہیں۔"

انیس ابتسام اور عارفہ بیگم نے، دونوں ماں بیٹی کو تنہا چھوڑ دیا۔

اس وقت زین کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ جب واپس آیا تو ابا جان نے بتایا کہ تمہاری تائی ماں کی بیٹی آئی ہوئی ہے۔ مل لو۔ وہ ان کی طرف آیا تو دروازے میں ہی کھڑا رہ گیا۔ اس کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے سحر کو وہاں دیکھ کر۔ سحر تائی اماں کی بیٹی۔

دعائے سحر۔ زین کو یاد آیا۔۔۔ یہی نام نکاح کے دن مولوی صاحب نے لیا تھا۔

"آؤ۔۔۔ بیٹا! باہر کیوں کھڑے ہو۔ آؤ میں تمہیں اپنی بیٹی سے ملواؤں۔" تائی اماں کی نظر اس پر پڑی تو مسکراتے ہوئے اسے پکارا۔

"دعا! یہ میرا بیٹا۔۔۔ زین۔" تائی اماں کے کہنے پر وہ مڑی اور پتھر کی بن گئی۔

"آپ کا بیٹا۔۔۔"

"سحر۔۔۔" زین نے بے یقینی سے، اسے پکارا۔

"زین۔۔۔ تم جانتے ہو سحر کو۔ تو کیا یہ ہی وہ سحر۔۔۔ وہی۔۔۔" وہ بھی الجھ گئیں۔

"جی تائی اماں! یہ سحر ہے میری بیوی۔۔۔" زین نے جھٹ اقرار کیا۔

تائی اماں کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ ان کے چہرے کے، خوشی کے رنگ دیکھ کر سحر کچھ بول بھی نہ سکی۔

"ایک منٹ۔۔۔ میں اپنے بچوں کے لیے شکرانے کے نفل ادا کر آؤں۔۔۔" تائی اماں جان بوجھ کر درمیان سے ہٹ گئیں کہ دونوں کے درمیان موجود برف کی دیوار ان کے ایک اور رشتے کی نوید بن کر پگھل جائے۔

وہ سر جھکائے صوفے پر بیٹھی تھی۔ چہرے پر بھرپور سنجیدگی تھی۔ زین نے اس کا ہاتھ تھاما' مگر وہ مکمل بے نیاز تھی۔

"معاف کردو۔۔۔ پلیز۔۔۔ میری جھولی میں یہ سوچ کر خوشیاں ڈال دو کہ تم میرے دل کی خوشی ہو۔ میری زندگی کی ایک مدھم سی امید۔۔۔ بہت غلط کیا تمہارے

ساتھ۔۔۔ دراصل میرے ساتھ کبھی اچھا ہوا ہی نہیں جو میں کسی کے ساتھ اچھا کرتا۔"

"زین۔۔۔" وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی اور اس سے لگ کر رونے چلی گئی۔ خود زین کے آنسو اس کے بالوں میں گر رہے تھے۔

"بہت برا کیا ہے آپ نے میرے ساتھ۔۔۔ بہت برا۔۔۔" وہ خفگی سے بولی۔

"سحر! جرم ناقابل معافی ہو تو الفاظ لبوں پر نہیں آتے۔ اسی لیے تم سے معافی مانگنے کے بجائے اپنے رب کے سامنے گڑگڑاتا رہا ہوں۔ یقین جانو میں نے اماں تا" وہ سب نہیں کیا تھا۔" وہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"اللہ کو منا لینا آسان ہوتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کو معاف بھی کر دیتا ہے۔ لیکن زین! بندوں کے درمیان حساب کتاب بہرحال بندوں کے درمیان ہی ہوتا ہے میرا اور آپ کا حساب کتاب ابھی باقی ہے۔" وہ نظریں ملائے بنا بولی۔

"ہر حساب کتاب کے لیے تیار ہوں۔ بہت ندامت اور شرمندگی ہے میرے دامن میں۔ بنا حساب دیے تو مجھے بھی سکون نہیں ملے گا۔"

"زین میں بہت تھک گئی ہوں۔" وہ رو پڑی۔ زین نے اس کے گرد اپنے بازوؤں کا گھیرا اور مضبوط کر ڈالا۔

تائی اماں نے اندر آنے سے پہلے گلا صاف کر کے اپنے آنے کا اشارہ دیا۔ وہ جلدی سے الگ ہو گئی۔ ان کے شاداب چہرے تائی اماں کے دل کا گلشن مہکا گئے۔ فوراً" ان دونوں پر آیت الکرسی پڑھ کر پھونکی۔ ڈھیروں دعائیں دیں۔

زین اسے ابا جان اور چھوٹی ماں کی طرف لے آیا۔

"زین بیٹا۔ اللہ نے بہت کرم کر دیا ہے۔" ابا زین کو گلے لگا کر بولے۔

"اب وقت ضائع مت کرو۔ اپنے حصے کی خوشیاں وصول کرو۔"

"ابا۔۔۔ آپ پریشان نہ ہوں۔۔۔ بس تھوڑا وقت لگے گا سیٹ ہونے میں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ مسکرایا۔

"میری جان۔۔۔ میری زندگی کی ایک ہی خواہش باقی ہے کہ میں اپنے بیٹے کے چہرے پہ سکون اور بھرپور خوشی دیکھ سکوں۔ بہت دکھ ملے ہیں تمہیں۔۔۔ اب ایک ہی صورت میں سکون میں پا سکوں گا' جب اپنے بیٹے کی زندگی میں خوشیاں دیکھوں گا۔" ان کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

"بہت پیاری بچی ہے۔ مجھے اس میں دوسری دعا کا چہرہ نظر آیا ہے اور وہ تمہاری تائی اماں کی بھی دل کی تمنا ہے۔ ان کا سکون ہے' جو ان کی دعا کے ساتھ ہی کھو گیا تھا۔"

زین نے مسکرا کے ان کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔

"جاؤ میری بیٹی کو اس کے گھر چھوڑ کر آؤ۔" انہوں نے سحر کو اپنی ماں سے۔ ملنے بھیجا تھا اور وہ زین کے ساتھ لوٹ رہی تھی۔ جب ساری بات ان کے گوش گزار کی گئی تو انہوں نے زین کو گلے لگا لیا۔

سکون کی ایک لہر نے ان کے پورے وجود کا احاطہ کر لیا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن سب۔ تائی اماں سمیت اسے لینے پہنچ گئے۔ اماں نے اس کے لیے جلدی جلدی جو ہو سکا خرید ڈالا۔ سیٹھ ارمغانی کے چہرے پر خوشی تھی۔

"سیٹھ صاحب۔ ہم سحر کو اپنی بیٹی بنا کر لے جا رہے ہیں۔۔۔ خواب میں بھی آپ اسے یاد کریں گے تو ہم اسے آپ کے پاس بھیج دیں گے۔" چھوٹی ماں سحر کو پیار کرتے ہوئے بولیں۔

سیٹھ ارمغانی نم آنکھوں سے مسکرا دیے۔

وہ رات اپنے دامن میں ستاروں کی بارات لے کر آئی تھی۔ ہر طرف روشنی تھی۔ محبتوں کی بارش نے دونوں کے وجود کو بھگو دیا۔۔۔ عجیب سا سرور تھا۔ نشہ

تھا۔۔۔ محسوسات اور جذبات کی عجیب سی دنیا تھی کہ قدم بہکنے لگے تھے۔

محبت کی پناہوں میں میٹھی نیند آئی۔ اذان کی آواز پر وہ اٹھا تو سحر بیڈ پر نہیں تھی۔

یہ سوچ کر کہ وہ اماں ابا کی طرف گئی ہوگی۔ زین نماز کے بعد سیدھا وہاں پہنچا' جہاں اس کے قدم پہنچ کے لڑکھڑا گئے۔ اس مٹی کے ڈھیر پہ کوئی اس سے پہلے ہی ہاتھ اٹھائے ہتھیلیوں کو آنسوؤں کی برسات سے بھگو رہا تھا۔ کون تھا۔۔۔ وہ الجھا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس سائے کے سامنے آن کھڑا ہوا مگر دعا میں مگن وجود نے اس کی جانب ایک نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ زین کی سانسیں رکنے لگی تھیں۔

"سحر تم یہاں۔۔۔" زین نے حیرت سے دو قدم آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی۔ زین کو کندھے پر دباؤ محسوس ہوا تو وہ پلٹا۔ چھوٹی ماں اس کے سامنے تھیں۔ رویا رویا چہرا۔

"اسے میں لائی تھی۔"

زین کی حفاظت میں سحر کو دے کر وہ پلٹ گئیں۔

"آپ کو برا تو نہیں لگا میں آپ سے اجازت کے بغیر گھر سے۔۔۔ نکلی۔" سحر نے پوچھا تو زین نے اسے کندھوں سے تھام لیا۔

"سحر۔۔۔ میری آدھی زندگی اس مٹی کے ڈھیر کے نیچے اور آدھی تمہاری پناہوں میں ہے۔۔۔ نہ اس سے ناراض ہو سکتا تھا۔۔۔ نہ کبھی تم سے۔۔۔ میری تو اب یہی دعا ہے کہ تم خوش رہو۔۔۔"

زین نے مسکرا کر دونوں ہاتھ اٹھائے اور جذب دل سے دعا مانگنے لگا۔

اور دعائیں تو یوں ہی منظور ہوتی ہیں۔۔۔ اس کے لیے صرف رب کا در کھٹکھٹانا پڑتا ہے۔ بے شک نوازنے والی ذات ایک ہی ہے۔ آزمائش تو وہ اپنے محبوب بندوں کے نصیب میں ہی لکھتا ہے۔

سیما بنت عاصم
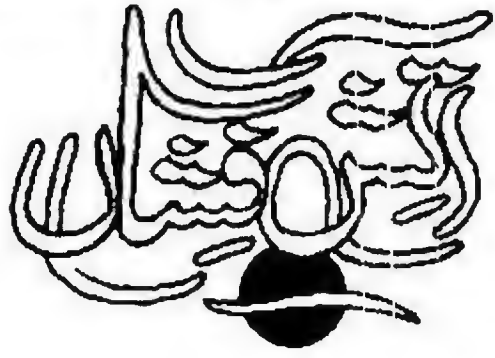
تابندہ نے جلدی جلدی دال میں بگھار لگایا اور دوسری پتیلی میں کڑکڑاتے گرم مسالے اور تیزپات میں بھیگے ہوئے چاول جھونک کر پانی بڑھایا۔ دیگچی میں چمچہ چلاتے ہوئے اس کے گداز خوب صورت ہاتھوں کی سرخ چوڑیاں چھن چھن بج رہی تھیں۔ قریب کھڑی اس کی سات سالہ بیٹی عرشیہ نے حسرت سے اک نظر اسے دیکھا تھا۔ اس نے تابندہ کی شادی کی تصاویر دیکھی تھیں۔ آٹھ سال پہلے وہ کتنی من موہنی کومل سی ہوا کرتی تھی۔ مگر اب جیسے تلخی حالات کی دھوپ نے اس کا رنگ و روپ کملا دیا تھا۔ وجود پر سر تاپا یاسیت کا بسیرا تھا۔ انہیں نانی کے گھر آئے ہوئے ہفتہ بھر ہوا تھا اور اس ہفتہ بھر میں اپنے گھر سے نہ کوئی رابطہ نہ واسطہ۔ چند گلیاں چھوڑ کر اس کا ددھیال تھا، جہاں اس کے پاپا تھے اور آتش فشاں جیسا مزاج رکھنے والی الماس پھپھو، جو اس سارے فساد کی جڑ تھی۔

تابندہ نے میکے آتے ہی ہمیشہ کی طرح سارے کاموں کا بوجھ اٹھالیا تھا۔ وہ صبح سے شام تک جتی رہتی۔ یہاں وہاں سے کام ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکال لیتی۔ محض امی کے اس سوال سے بچنے کے لیے کہ "تم گھر کب جاؤ گی یا یہ کہ اتنے دن ہوگئے، تنویر نے مڑ کر خبر بھی نہ لی۔ آخر بات کیا ہے؟"

امی پر اس کی تلخ زندگی کا ہر پہلو خوب روشن تھا، اس لیے ہولتیں۔ مگر یہ بھی تھا کہ کسی بھی وجہ کو لے کر وہ کبھی میکے آکر نہیں بیٹھی تھی، نہ دکھڑے روتی۔ شاید اسی لیے تنویر بھی اس کا فیصلہ بدل جانے کا منتظر تھا، جو وہ چلتے وقت سنا کر آئی تھی۔ اس نے امی سے لوٹنے کا کوئی ذکر کیا تھا اور نہ ہی لوٹنے کا کوئی ارادہ تھا۔

وہ پہلا دن تھا۔ ثنازیہ امی کو کھانے کی ٹرے دینے آئی تو اسے دیکھ کر منہ بنا کے چل دی۔ پھر وہ خود ہی سمجھ گئی کہ اب چھٹی..... وہ چھوٹے بھائی تبریز کی بیوی تھی، جو گھر کی اوپری منزل پر رہتا۔ اس کی تاکید تھی کہ امی کو کھانا وقت پر دو، مگر جب وہ نہ ہوتا تو..... خیر امی اس کی دست نگر بھی نہ تھیں۔ ابا ان کے لیے بہت کچھ چھوڑ کر گزرے تھے۔ تابندہ آتی تو خود ہی امی کا چولہا چوکی سنبھال لیتی۔ ورنہ سوکھے منہ بیٹھی رہتی۔ تبریز آتا تو رسمی حال احوال لے کر کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھ جاتا۔ مانو دونوں میاں، بیوی نے اپنی دنیا الگ بنا رکھی تھی۔ عرصہ ہوا تھا تبریز کو گھر اور گھر کے معاملات سے لاتعلقی اختیار کیے ہوئے۔ بڑا بھائی فیملی سمیت دبئی میں مقیم تھا۔ چھوٹی رخشندہ خالہ کے گھر بیاہ کر اسلام آباد گئی تھی۔ امی سے وہ ہر ممکن دامن بچاتی رہتی تھی۔

"مگر تابہ....." بات ان پر کھل ہی گئی۔ تب ہی گھنٹہ بھر اسے بیٹھ کر سمجھایا۔ زندگی دھوپ چھاؤں کا نام ہے اور یہ کہ وقت سدا ایک سا نہیں رہتا۔ آج نہیں تو کل تنویر کو اچھی نوکری مل ہی جائے گی۔ مگر امی سے کچھ بھی کہنا سننا بے کار تھا۔ انہوں نے کبھی اس کی بات سنی تھی، نہ سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ تابندہ کیسے کہتی کہ حالات کی تنگی اور ذلت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ الماس کے مزاج کے سبب اس کا ایک ایک پل وہاں پہاڑ بن کے گزرتا ہے۔ اس پر مستزاد، تنویر کی مجرمانہ خاموشی۔ وہ آٹھ سالوں سے حالات بدلنے ہی کی تو

منتظر تھی۔ یوں میکے کی دہلیز پر آکر بیٹھنا ہوتا تو کاہے کو ولدر چینتی اگرامی کہاں سنتی تھیں۔

تنویر سے تابندہ کی شادی تنویر کی یک طرفہ محبت کا شاخسانہ تھی۔ تنویر نے اسے راستے میں کہیں آتے جاتے دیکھا تھا اور پھر رشتہ لے کر امی کے پاس آپہنچا۔ تنویر تعلیم یافتہ، خوش شکل، مہذب، خاندانی تھا۔ امی کو بھلا اور کیا درکار تھا۔ اپنی شادی کے لیے اپنی ماں، بہن کی مخالفت کو واضح کرتے ہوئے اس نے بالا ہی بالا سارے معاملات طے کیے تھے۔ اگر جھوٹ بولا تو صرف اپنی جاب کے متعلق۔ شاید اس وقت خود اسے بھی امید تھی کہ اچھی جاب جلد یا بدیر مل ہی جائے گی۔

بعدازاں اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے تابندہ سے معافی مانگ لی تھی۔ وہ تابندہ کو پانے کے لیے کچھ جھوٹی سچی کہہ گیا تھا تو یہ اس کی چاہت ہی کہلائی جاسکتی تھی۔ مگر بات کہنے میں صرف زبان ہلتی

ہے، جبکہ عمل میں ساری زندگی بھی رگڑی جا سکتی ہے۔ تنویر فطرتاً" سہل پسند اور شاہانہ مزاج رکھنے والا آدمی تھا۔ اس کا اندازہ تابندہ کو بہت جلد ہو گیا تھا۔ شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ ساس کے حکم پر سسرال چلے آئے تھے اور تب اسے معلوم ہوا کہ تنویر کی شادی کے لیے ساس و نند کا اختلاف بجا ہی تھا۔ تنویر نے بھی ایک دھیلا کما کر ماں کے ہاتھ پر نہ رکھا تھا۔ سارا گھر الماس کی کمائی پر چلتا تھا جو اپنی مضبوط پوزیشن کی وجہ سے گھر بھر پر حاوی تھی۔ جب تک ساس زندہ رہیں، انہوں نے معاملات سنبھالے رکھے۔ الماس کی تنخواہ بھی ان ہی کے ہاتھ میں آتی تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بہتیری کوشش کی کہ کسی طرح الماس ٹھکانے لگ جائے، مگر اس کے مزاج بہت اونچے تھے۔ خیر سے، بینک میں افسر تھی، کسی رنڈوے، دوہاجو کے لیے آمادہ بھی ہو جاتی تو کم از کم تعلیم یافتہ، باحیثیت تو ہوتا۔۔۔ مگر الماس جیسی نچلے طبقہ کی ڈھلتی عمر، قبول صورت لڑکی کو بیاہنے کوئی اعلا گزیٹڈ آفیسر تو آنے سے رہا۔ سو ان کی کوششیں رائیگاں گئیں۔ تنویر اعلا جاب یا کسی کاروبار کے خواب دیکھتا تو یہ خواب بھی پورے ہوتے نہ نظر آتے؟

اس کے مقدر میں لہو کے ہزار گھونٹ تھے، جو پیتے آٹھ سال گزرے تھے کہ ساس نے دہلیز پر قدم رکھتے ہی اس کے کانوں میں یہ بات پھونک دی تھی کہ اسے صرف شکر کے ساتھ وقت گزارنا ہے۔ وہ خود تو خاصی بے ضرر سی تھیں۔ جب تک حیات رہیں، ان پر ابر کرم بن کر چھائی رہیں۔ اس نے بھی ہمیشہ صبر، شکر کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا تھا۔ ان کی زندگی میں آٹے، دال کا بھاؤ معلوم بھی نہ ہوا تھا۔ شاید زندگی اسی خاموش سمجھوتے کی نذر ہو جاتی، اگر جو الماس کا چیختا چلاتا وجود نہ ہوتا۔ تنویر اسی رفتار بے ڈھنگی پر قائم تھا۔ انہوں نے الماس سمیت سب کچھ سنبھال رکھا تھا، مگر ساس کے گزرنے کے بعد تو جیسے حاکمیت ہی الماس کے تصرف میں آگئی تھی اور پل پل اسے کچوکے دینا اس کا چلن ٹھہرا۔ ماں کے گزرنے کے بعد تو وہ سب اس کے لیے بوجھ بن گئے تھے۔ وہ ہر آئے گئے کے سامنے رونا لے کر بیٹھ جاتی۔ تنویر کو برا بھلا کہتی۔ تابندہ میں کیڑے نکالتی۔ بچیوں کی جھوٹی سچی شکایتیں، وہ بھی علی الاعلان!

گو کہ گھر کا نظام اس نے ساس کی زندگی میں بھی سنبھال رکھا تھا۔ وہ جب تک زندہ رہیں، حالات معمول پر رہے۔ اولاً" ہی انہوں نے تابندہ کے کانوں میں یہ بات پھونک دی تھی کہ اگر عافیت درکار ہے تو الماس کے سامنے اف نہیں کرنی، ورنہ تم نہیں یا یہ نہیں۔ تابندہ آج بھی اس ہدایت پر کاربند تھی مگر۔۔۔

الماس کی لغت میں تسلی کا لفظ درج ہی نہیں تھا۔

وہ صفائی کی رسیا تھی۔ تعطیل کے دن اس کا سارا وقت صفائی دھلائی، جھاڑ پونچھ میں گزرتا۔ ایسے میں بچیوں کی معمولی سی کوتاہی بھی اسے آگ بگولہ کر جاتی تھی۔ فطرتاً" خاموشی و تنہائی پسند تھی، اسی حساب سے حدبندیاں تھیں۔ ٹی وی مت چلاؤ۔ اندھیرا رکھو، یہ دھو۔۔۔ تابندہ ہر ممکن احتیاط برتتی، مگر بچے پھر بچے ہوتے ہیں۔ بھولے سے بھی اس کے کمرے تک آجاتے تو پونی پکڑ کر باہر نکال دیتی۔ گھر کی ہر چیز پر اس کا قبضہ تھا اور یہ احسان کہ اس کی ملکیت ہے۔ تنویر کچھ ہاتھ لگتا تو کرلیتا، نہیں تو نہ سہی۔ اسے فکر بھی نہ تھی۔ روٹی تو چل ہی رہی تھی اور اس روٹی کی قیمت کتنی بھاری چکانی پڑتی تھی۔ یہ کوئی تابندہ کے دل سے پوچھتا۔

الماس کا پارہ ہمہ وقت آسمان پر رہتا تھا۔ کچن میں جاتی تو برتن اٹھا اٹھا کے پٹختی۔ ہر وقت در پردہ اسے سنائی رہتی تھی۔۔۔ طنز۔۔۔ ملامت، طعنے۔۔۔ اسے اپنے عہدے کا غرور، کمائی کا زعم تھا۔ ٹپ ٹاپ سے رہتی۔ شاہانہ زندگی گزارتی۔ آفس کی گاڑی میں ٹھسے سے بیٹھ کر جاتی۔ بچیاں ترستیں تو والدین کی تنگ دستی، دست نگر ہونے کے طعنے۔ تنویر کہتا کہ وہ شروع ہی سے ایسی ہے، جس کی جان کو آجائے، اس کا خون پی جاتی ہے گویا اس معاملہ میں وہ خود کہیں قصوروار ہی نہ تھا۔

اسے ان سب کا ہنسنا، بولنا تک ناگوار گزرتا تھا۔ تنویر اپنی فیملی میں خوش رہتا تھا۔ مگر اس کا اپنا احساس کمتری عود کر آتا۔ یا یہ خلش سر اٹھاتی کہ یہ وہی تنویر تھا، جس کی نااہلی کے سبب اس نے اب تک گھر بھر کا بار اٹھائے رکھا اور جس نے شادی کا فیصلہ ان ماں، بیٹی کو پرے پھینک کر کیا تھا۔ وہ جیسے سراپا آگ بن جاتی۔ تابندہ کہاں تک سنتی۔ اس نے اپنی سلائی مشین جھاڑ پونچھ کر نکال لی۔ چند بچے ٹیوشن پر لگا لیے۔ عرشیہ، فاریہ کے ساتھ پڑھا دیتی مگر اس سے اتنا ہی ہوتا کہ روز مرہ کا خرچ نکل آتا۔ گھر کے بلوں کی ادائیگی، راشن، روز مرہ کی سبزی ترکاری، دودھ والے کا بل، یہ وہ... وہ تنخواہ پر مہینہ بھر کے لیے فریج بھر دیتی۔ تابندہ بچتی تو کہاں تک بچتی۔ گھر میں ہر چیز الماس کی لائی ہوئی تھی، اور اگر وہ کچھ لاتی تو اک نیا فساد کھڑا ہو جاتا۔ ممکن ہے، وہ چڑ کر بقیہ چیزوں پر پابندی لگا دیتی۔ اس کی زندگی اور تنگ کر دیتی طنز و ملامت کے ڈونگرے برسا برسا کر۔

الماس تو جیسی تھی، سو تھی، تنویر بھی چپ چاپ سنتا رہتا۔ بات گھوم پھر کر وہی تنویر کی کم حیثیتی پر آن رکتی تھی۔ اور بات اگر خود تک رہتی تب بھی گوارا تھی۔ مگر اب بچیوں پر منفی اثرات پڑ رہے تھے۔ وہ احساس کمتری کا شکار ہونے لگی تھیں۔ وہ اسی چخ چخ سے بچنے کے لیے ہفتے کی شام میکے آجاتی اور اتوار کی رات کو جاتی۔ مگر ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے کوئی کب تک بچ سکتا ہے۔ ٹکراؤ ہو ہی جاتا۔

اس دن بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ اپنے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بیڈ پر ٹانگیں پھیلائے مزے سے ٹی وی دیکھتے ہوئے چاکلیٹ کھا رہی تھی۔ جب فاریہ پہنچ گئی۔ وہ بچی ہی تو تھی۔ سو اس کی نظر ٹک گئی۔

"ہاں... لو کھا لو... تمہیں بھلا کہاں نصیب ہوں گی امپورٹڈ چاکلیٹ۔" اس نے تلخی سے کہتے ہوئے چاکلیٹ "تقریباً" فاریہ کے منہ میں ٹھونس ہی دی تھی۔ فاریہ روتی ہوئی لوٹی تھی۔ تابندہ کے دل کو ٹھیس لگی تھی۔

وہ اور تنویر چپ سے رہتے تھے... مگر بچیاں... اور اب اس نے ٹھان لی تھی کہ یہ اذیت و ذلت بھری زندگی اس کی بچیوں کا نصیب نہیں بنے گی۔ وہ محتاج ہے، نہ نااہل۔ اسے خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر نئی زندگی کی شروعات کرنی ہے۔

☼ ☼ ☼

اس صبح امی سودا سلف لینے ٹلیں تو اس نے بستر سمیٹ کر جلدی جلدی صفائی ستھرائی کی اور کچن کا کام نمٹایا۔ کچھ کپڑے دھلنے کو پڑے تھے۔ واشنگ مشین میں گھما کر نتھارے اور رسیوں پر پھیلانے کے بعد تخت پر سلائی مشین رکھ کر جھاڑ پونچھ کے بعد تیل ڈالا۔ نوکری اتنی جلدی تو ملنے سے رہی۔ تب تک کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔

"مما!" عرشیہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"ہم گھر کب جائیں گے؟" وہ ایک حساس و ذمہ دار بچی تھی۔ اس کی پڑھائی کا حرج ہو رہا تھا۔ دل پر پتھر رکھ کر تابندہ نے اسے نچلے درجے کے اسکول میں داخلہ دلوایا تھا۔ ارادہ تھا کہ آمدنی کی سبیل بنتے ہی سب سے پہلے عرشیہ کو بہتر اسکول میں بٹھانا ہے۔ تابندہ نے کھینچ کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ پھر اس کا سر سینے سے لگا کر پوچھا۔

"عرشی! بیٹا! اگر ہمیں ہمیشہ نانی کے گھر رہنا پڑے تو رہ لوگی؟"

"مگر کیوں مما!" اس نے کچھ دیر سوچ کر پوچھا۔

"بیٹا! حالات بدلنے کے لیے انسان کو کبھی کبھی جگہ بدلنی پڑتی ہے۔ کچھ لوگوں کو چھوڑنا یا کبھی کسی کو اپنانا پڑتا ہے۔ مما جاب کریں گی تو ہماری مشکلات دور ہوں گی۔ ہم بہتر زندگی گزار سکیں گے۔ آپ کو مما کا ساتھ دینا ہوگا، دوگی نا۔" وہ ایک بار پھر سوچ میں پڑ گئی تھی، پھر کہا۔

"مجھے بس اپنی مما کے ساتھ رہنا ہے۔"

عرشیہ نے اس معصومیت سے کہا تھا کہ تابندہ کو اس پر ڈھیروں ڈھیر پیار آ گیا تھا۔ اسے بازوؤں میں بھینچ

کر چٹا چٹ پیار کیا تو آنکھوں کے گوشے خود بخود بھیگنے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

تابندہ کی ذات سے امی کو سو سکھ تھے۔ تب بھی وہ اسے بٹھا کے نہیں ––– رکھ سکتی تھیں۔ شاید وہ اس کی خاموشی کے عقب میں چھپے مفہوم کو جانچ گئی تھیں۔ اور معاملہ اندرونی ہو کہ بیرونی.... وہ بے بس ہوتیں تو پہلی پکار عادل کو پڑتی۔ عادل بھی ایک ہی آواز پر لبیک کہتا بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوتا۔ اس بار بھی یہ ہی ہوا۔ اسی شام عادل آیا تھا۔ گھنٹہ بھر امی سے کھسر پھسر چلی۔ تابندہ اپنے کمرے میں اندھیرا کیے فاریہ کو فیڈر پلانے کے بعد عرشیہ کو تھپکیاں دے رہی تھی۔ عادل اس کا کزن ہی نہیں۔ اس کا پرستار بھی تھا اور اس سے شادی کا خواہش مند بھی.... مگر تابندہ نے انکار کر دیا۔ ہمیشہ سے عادل کا اس گھر میں عمل دخل تھا۔ وہ ساتھ کھیل کود کر پلے بڑھے تھے مگر اس نے عادل کے لیے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔ خصوصاً گھر میں اس کے عمل دخل کے سبب اب شادی کی صورت میں دنیا کی زبانیں کھل سکتی تھیں اور اسے اپنا کردار اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز تھا پھر عادل نے بھی کہا تھا کہ زبردستی کسی کو خود سے باندھ لینا محبت نہیں ہے۔ ہم اگر کسی کا ساتھ مانگیں تو اس کا پیار بھی میسر ہو۔ کیونکہ کسی کو پالینا محبت کی جیت نہیں' بلکہ کسی کو اپنا بنا لینا محبت کی جیت ہے۔

مگر وہ آج بھی اپنی محبت پر قائم تھا۔ امی کا خیال تھا کہ وہ عادل کی بات مانتی ہے۔ وہ اس کا خیال بھی اتنا ہی رکھتا تھا۔ ہمیشہ اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار رہتا۔ یہ اس کی محبت کی راستی نہیں تو اور کیا کہلاتی کہ وہ آج بھی تنہا تھا۔ اس تک آنے سے پہلے اس نے اپنے مخصوص انداز میں دروازہ بجایا تھا اور پھر دیوار سے لگے سوئچ بورڈ کے بٹن کو کھٹ سے آن کیا تو سارے کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ تابندہ لب بھینچے عرشیہ کو تھپکتی رہی اور عادل اس کے سامنے بیٹھ کر تادیر افسوس بھری نظروں سے یوں تکتا رہا جیسے اسے تابندہ سے اس عمل کی توقع نہ ہو۔

"مجھے پتا ہے تمہیں امی نے بلوایا ہے کہ مجھے سمجھا بجھا کے میرے دماغ میں گھسا خناس نکالو۔" تابندہ کو کہنا پڑا۔

"اگر ایسا ہے بھی تو کیا حرج ہے۔ وہ تمہارا برا تو نہیں سوچتیں؟"

"انہوں نے اب تک میرا بھلا ہی تو چاہا ہے۔" اس کی آواز گمبھیر ہو گئی۔

"کیا تم جیسی سمجھ دار اور حوصلہ مند لڑکی کو یہ بتانا پڑے گا کہ نصیب سے ٹکرانا حماقت ہے؟"

"ہونہہ.... نصیب! انسان اپنی خطاؤں کو نصیب کے کھاتے میں رکھ کر کس آسانی سے ہاتھ جھاڑ لیتا ہے۔"

"تم پھپھو کے لیے اتنی تلخ کیوں ہو جاتی ہو۔ وہ ماں ہیں تمہاری؟"

"اور ماں ہونے کے باوجود انہوں نے ہمیشہ میرے ساتھ ناانصافی رکھی ہے۔" اس کے اندر کسی پرانے سسکتے آزار نے سر اٹھایا تھا۔

"اب جو وقت گزر گیا' اس کی لکیر پیٹنے سے کیا حاصل۔ اگر آج پر نظر رکھو تو...."

"میرا آج بھی امی کی بے پروائی کے سبب برباد ہے۔ تنویر کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ یوں مجھے بیاہنے پر تل گئیں۔ جیسے میں روٹیاں زیادہ کھاتی تھی۔ اس نے جو جھوٹے سچے آسرے پکڑا دیے' ان پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ مجھ پر کیا گزرے گی؟"

اب اگر عادل یہ جتاتا کہ وقت ہی ایسا چل رہا ہے کہ لڑکیوں کی شادی کے معاملہ میں سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے، اور یہ کہ پھپھو نے مات اپنی سادگی سے کھائی تھی۔ وہ ہی نصیب کی کھوٹی نکلی' ورنہ انہوں نے اس کا برا تو نہ چاہا تھا۔ تو تابندہ یقیناً چڑ جاتی اور عادل اس کے احساسات کی بہت پروا کرتا تھا۔ سو یہ ہی کہہ سکا۔

"راستے کی کٹھنائیوں سے ہار کر منزل چھوڑ دینے

سے بہتر ہے کہ کٹھنائیوں کو سہل کرنے کی تدبیر کرو۔"

"تم اسے نہیں جانتے۔ وہ عورت نہیں آتش فشاں ہے اور اس ایک عورت نے گھر بھر میں حشر ڈھا رکھا ہے۔ آنکھ کھلتے ہی اس منحوس کی کھیچ ہو جاتی ہے۔ آتے جاتے 'طنز' ملامت' طعنے' اٹھا پٹخ' دست نگر ہونے کا عذاب' اس کی ذلت ہے۔ اس پر تنویر کی خاموشی و بے کاری۔۔۔ میں کم از کم اس کی طرح یہ ذلت نہیں سہہ سکتی۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو' ذلت بھلا کسے گوارا ہوتی ہے۔ ویسے وہ جاب کرتی ہے تو گھر میں رہتی کتنے گھنٹے ہوگی؟"

"تم اسے بھگتو تو تمہیں پتا چلے کہ اسے پل بھر جھیلنا بھی کسی عذاب سے کم نہیں ہے۔ وہ ایک ایک چیز کی چوکسی کرتی ہے۔ ہر چیز میں تالا ٹھونک کے جاتی ہے' جیسے ہم چور ہیں۔ بچوں سے کرید کرید کر دن بھر کی روئیداد پوچھتی ہے' تاکہ کیڑے چن کر مجھے بے عزت کر سکے۔ صاف سیدھی بات ہے کہ اسے ہم سب سے پرخاش ہے۔ بس۔۔۔"

"اور تم ہار کر میدان چھوڑ دو گی؟ وہ لڑکی ہے' اس کے بیاہنے تک ہی صبر کرلو۔"

"ہونہہ! اب کیا بیاہے گی؟ آدھا چونڈا تو گھر بیٹھے ہی سفید ہو گیا ہے۔"

"ایسا مت کہو۔ جوڑ تو اللہ نے سب کا بنایا ہے اور شادی کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔"

"اگر اس کے غارت ہونے کی ایک فیصد بھی امید ہوتی تو مجھے یہ قدم نہ اٹھانا پڑتا۔ مگر لگتا ہے وہ اس گھر سے ایک انچ ہلنے کو تیار نہیں ہے۔ اپنا معیار اتنا بڑھا رکھا ہے کہ کم از کم اس روئے زمین پر تو ایسا شہزادہ نصیب ہو نہیں سکتا۔ مجھے تو لگتا ہے اس کی نظریں مکان پر ہیں۔ یہ وہ ہمیں اتنا زچ کر دینا چاہتی ہے کہ ہم میدان چھوڑ بھاگیں اور میں یہ بھی کر گزرتی' اگر تنویر ناکارہ ثابت نہ ہوتا تو۔۔۔"

"تابی! کوئی انسان صد فیصد اچھا نہیں تو برا بھی نہیں ہوتا۔ الماس جیسے لوگوں کو خود کار دکیے جانا بھی غصہ میں مبتلا کرتا ہے۔ تم نے کبھی اس کے اندر اتر کر اس کے آزار جانچنے کی کوشش کی؟ اس کے قریب ہو کر۔۔۔"

اس بار وہ سچ مچ چڑ اٹھی۔ وہ بھلا کیوں اس کی جوتیاں سیدھی کرے۔ سچ تو یہ تھا کہ کوئی تعلق بنتا ہی نہ تھا۔

"میری اپنی بھی کوئی زندگی ہے عادی! مجھے کوئی ضرورت نہیں کہ ہر کسی کے آگے پیچھے پھر کر اس کی تیوری سیدھی کرنے کی کوشش میں لگی رہوں۔ میں بھی انسان ہوں۔ میری بھی کوئی عزت ہے۔"

"تابی! وقت کیسا بھی برا ہو بدلتا ضرور ہے۔"

"تب تک میں پاگل ضرور ہو جاؤں گی یا پھر خودکشی کرلوں گی۔" وہ کچھ دیر لب بھینچے' کچھ سوچتا رہا' پھر کہا۔

"چلو اس تکرار کا اتنا تو نتیجہ نکلا کہ تمہیں کم از کم تنویر سے کوئی شکایت نہیں ہے' اور یہ ہی سب سے اہم نکتہ ہے۔"

"اس کی خاموشی ہی اس کی کمزوری ہے' جو اس کی بے کاری کے سبب ہے عادل! الماس کی زبان اگر تالو سے چپک کر رہ جائے تو بھی کسی کے ٹکڑوں پر پلنے کا احساس کم جان لیوا نہیں ہوتا۔ کبھی جاب تو تنویر کو ملتی ہے' نہ ملے گی۔"

"تو جاب کو گولی مارو۔ کسی کاروبار کے لیے قرضہ بھی لیا جا سکتا ہے۔ میں ہوں نا۔"

"خدا کے واسطے عادی! میں ویسے ہی تمہاری بہت زیربار ہوں۔ اب تنویر کو بے ساکھی پکڑ کر چلنا مت سکھاؤ۔"

"اگر تم نے جاب کا فیصلہ کیا ہے تو میدان چھوڑنے کیا تک بنتی ہے؟"

"جب کما کے بھی مجھے ہی کھلانا ہے تو اس کے نام کا لیبل بھی کیوں چپکا کے رکھوں؟ میری بچیاں کیوں محرومی کی زندگی گزاریں' جبکہ میں انہیں اچھی زندگی دے سکتی ہوں۔ بی اے کیا ہے میں نے۔"

"مجھے پتا ہے تم دے سکتی ہو۔ مگر تم سے یہ کس نے کہا کہ پیسہ ہر محرومی کا ازالہ بن سکتا ہے؟" یہ پہلی بار تھا کہ تابی نے کسی معاملہ میں اتنی دیر حجت کی ہو۔

"جن کے باپ نہیں رہتے' وہ بھی تو زندہ رہتے ہی ہیں۔" اس کی آواز بھیگنے لگی۔ "اگر امی کو میرا یہاں رہنا ناگوار ہے تو میں انہیں لے کر کہیں اور چلی جاؤں گی۔"

"اچھا۔" وہ مسکرایا۔ "مثلاً" کہاں؟"

وہ لاجواب ہوئی تو لب بھینچ کر رہ گئی۔ کچھ دیر بعد کہا۔ "تم میرا مذاق اڑا رہے ہو؟"

"میں نے تو صرف ٹھکانہ پوچھا ہے۔"

"کہیں بھی۔ اللہ کی زمین بہت بڑی ہے۔"

"ہاں۔ مگر اللہ نے کچھ حدود بھی تو بنائی ہیں' عورت کے لیے۔ وہ بے سہارا ہو جائے تو کہیں ٹھکانہ نہیں ملتا۔ دنیا مجبور عورت کی ضرورت کو کیش کرتی ہے۔ تم کہاں تک بچو گی۔ عورت لوہے کی بھی ہو' رہتی تو عورت ہی ہے نا۔ تابندہ! جہاں کئی زندگیاں تمہارے ساتھ جڑی ہوں' وہاں زندگی کے فیصلے ازخود نہیں کیے جاتے۔ تمہارے ایک فیصلے سے کیا کچھ بگڑے گا۔ کچھ اندازہ ہے تمہیں۔ مجھے تمہاری کسی بھی خوبی سے انکار نہیں ہے۔ مگر کسی بھی فیصلے سے پہلے مڈل کلاس کے کچھ ان گھروں پر نظر ضرور دوڑا لینا جہاں بیاہی بیٹیاں کسی بھی وجہ سے اجڑ کر آبیٹھتی ہیں' ہر جگہ نہیں تو اکثر و بیشتر تمہیں اک نفسانفسی ضرور نظر آئے گی۔ پروردگار نے مرد و عورت کے ذمہ مختلف ذمہ داریاں رکھی ہیں۔ عورت کو صنف نازک بنایا' اسی حوالے سے اسے فرائض بخشے ہیں۔ یہ عورت جب کسی بھی وجہ سے دہری ذمہ داری کا بوجھ اٹھاتی ہے تو تھک کر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے۔ مرد کی بے کاری اور عورت کی بربادی عموماً "فرسٹریشن" بن جاتی ہے۔ یہ فرسٹریشن منفی رخ پر چل پڑتی ہے تو آس پاس کے لوگ زیر عتاب ضرور آتے ہیں۔ ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا لیکن ایسا بھی ہوتا ہے۔ کیا تم خود کو کسی رسک پر رکھنا چاہو گی؟"

تابندہ کی آنکھیں پھیل کر سکڑی تھیں۔ جیسے پل کے ہزارویں حصے میں کسی سسکتے آزار نے سر اٹھایا۔ اس کا ایک ایک لفظ جیسے تابندہ کے اندر اترتا جا رہا تھا۔

"بات تلخ سہی' مگر سچ ہے کہ تنہا عورت کا دگنا بوجھ اٹھانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔ وہ ہارتی نہیں تو تھک ضرور جاتی ہے اور یہ تھکن ٹوٹ پھوٹ کا باعث بنتی ہے۔ میں تمہیں اسی ٹوٹ پھوٹ سے بچانا چاہتا ہوں۔"

عادی کی بات راست ہی تھی۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں جیسے اسے کہیں دور لے گئی تھی۔ یہ کوئی خلش نہ تھی۔ بس اک ان کہا سا بوجھ جو جانے کب سے اس کے دل کو مٹھی میں لیے ہوئے تھا۔

ہوتا ہے نا! بعض چیزیں انسان کے اندر پلتی پنپتی ہیں۔ سانسوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ مگر وہ ان کے وجود سے بھی خبر رہتا ہے۔ یہ بھی اک ایسا ہی آزار تھا۔

عرشیہ سو چکی تھی۔ عادل نے چلتے ہوئے کھٹ سے بٹن بند کر دیا تھا۔ اندھیرا ہو گیا اور جیسے ماضی جاگ گیا۔

☼ ☼ ☼

جانے کتنے سالوں کی بات تھی۔ ابا کی وفات ہونے کے بعد اماں اکیلی رہ گئی تھیں۔

پھر گھر بھر کی دہری ذمہ داری امی کے ہی کاندھوں پر آپڑی۔ مگر دنیا کو اک ٹارگٹ نصیب ہو گیا تھا۔ تنہا' جوان' خوش شکل عورت' ہر کوئی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے پر تل گیا تھا۔ پڑوس کے انکل جمیل اکثر بہانوں سے اپنی چھت سے ان کے گھر جھانکتے۔ امی خاطر میں نہ لاتیں۔ مگر خائف ضرور رہتیں۔ پھر اک روز وہ گھر کے دروازے پر چلے آئے۔

"کوئی خدمت میرے لائق ہو تو بتایئے گا۔" امی ان کی تاک جھانک سے برگشتہ تھیں۔ مگر نرمی ہی میں عافیت تھی۔

"آپ بس اپنی فکر رکھیے۔ ہماری فکر چھوڑ دیجئے۔"

"فکر کیوں نہ کریں۔ دونوں گھروں کی دیوار ملی ہے۔ پڑوس کا بڑا حق ہوتا ہے۔" ان کا لہجہ معنی خیز تھا۔ وہ ضبط کا کڑوا گھونٹ بھر کر بھی بول اٹھیں۔

"آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"بس اتنا کہ آپ ہمارا خیال رکھیے' ہم آپ کا رکھیں گے۔" وہ مونچھیں مروڑنے لگے۔

اسے یاد تھا' امی کا چہرہ شدت ضبط سے سرخ پڑ گیا۔ انہوں نے دھڑ سے دروازہ بند کر دیا تھا۔ مگر پھر ادھر سے کھٹا کھٹ پتھر آنے لگے۔ امی لرزتی کانپتیں۔ مگر بہرحال چار بچوں کی ماں تھیں۔ سوچتیں کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بج سکتی۔ آخر کار ان کے حوصلے پست ہو ہی جائیں گے۔ مگر معاملہ اس کے برعکس ٹھہرا۔

وہ جھلستی گرمیوں کے دن تھے۔ رات میں لائٹ جاتی تو امی چارپائیاں صحن میں ڈال کر وہیں بچوں کو کھانا کھلاتیں۔ چارجنگ لیمپ جلا کر اسکول کا کام مکمل کرواتیں۔ بچے سو جاتے تو بعد میں انہیں اٹھا کر اندر لے جاتیں۔ اس دن بھی یہ ہی ہوا تھا۔ جب وہ سب صحن میں اپنے کھٹولوں پر سو رہے تھے۔ جانے کتنا وقت گزرا تھا' اسے تو بس اتنا یاد تھا کہ امی نے کپکپاتی آواز میں ان کو جگایا تھا۔

"بارش ہو رہی ہے' جلدی اندر چلو۔" وہ سر سے پیر تک لرز رہی تھیں۔ تیزی سے سب کو اندر لے جا کر کنڈی تالے ٹھونک لیے۔ صبح پتا چلا کہ انکل جمیل ان کے گھر کود گئے تھے۔

مگر امی نے ایک لفظ بھی کسی سے نہ کہا۔ کیچڑ میں پتھر پھینکو تو چھینٹیں خود پر ہی آتی ہیں۔ بس انہوں نے خود کو محدود کر لیا تھا۔ پھر سڑی گرمی میں بھی امی کنڈی تالے لگا کر رکھتیں۔ بچوں کو مرغی کی طرح پروں میں سمیٹ کر رکھتیں۔ انہوں نے گلی محلے میں بچوں کا کھیلنا تک بند کر دیا تھا۔ بس اسکول' ٹیوشن اور گھر۔ خود بھی تقریباً" قطع تعلق کر لیا اور لوگ کہتے کہ پیسے کی گرمی ان کے دماغ کو چڑھ گئی ہے۔ مگر انہوں نے کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی۔ گھر کے کاموں کا بہانہ کر دیتیں۔ وہ بچوں کو اسکول لینے جاتیں تو واپسی میں سودا لیتی آتیں۔ اسکولز' بینک' بلز' راشن کی لمبی قطاریں' یہ وہ۔ ان دہری ذمہ داریوں کے بوجھ سے جیسے وہ سر تاپا تھکن میں ڈوب گئی تھیں۔ اس تھکن نے انہیں توڑ ڈالا تھا۔

تابندہ نے ایک تکلیف دہ بچپن گزارا تو امی کے مزاج کی گرمی کی بدولت۔ وہ کچن میں کھڑی ہو جاتیں تو یا وہ آسمان کو چھوتا۔ پاس پڑی تیلی اٹھانے کے لیے بھی پرجلال آواز تابندہ کو پڑتی۔ وہ لرزتی کانپتی دور سے دوڑ کے آتی۔

"کہاں مرگئی تھی۔ اتنی دیر سے بلا رہی ہوں۔ جب تک میں کام کر رہی ہوں' یہیں کھڑی رہ۔"

وہ کچن کی دیوار سے لگی دھوپ میں کھڑی رہتی۔ بہن' بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔ اس لیے زیادہ زیر عتاب آتی۔ ان کا چڑچڑاپن' غصہ' بدمزاجی' وہ پتے کی طرح لرزتی رہتی۔ صبح آنکھ کھلتے ہی امی کا دھاڑنا شروع ہو جاتا۔

"شہزادی! اٹھ جا۔ تیرے باپ کی نوکر نہیں لگی ہوں۔" چھوٹی سی عمر میں امی نے اس پر ڈھیروں دفعات لگا رکھی تھیں۔ وہ علی الصبح جاگ کر اپنے ساتھ بہن' بھائیوں کے بھی کپڑے پریس کرتی۔ اولاد کے لیے نرمی یا چھوٹ کا لفظ ان کی لغت میں نہ تھا۔ آج بھی وہ اس وقت کو یاد کر کے لرزتی تھی۔ امی کے اندر جیسے آگ بھڑکتی تھی۔ دہری ذمہ داری کا بار' تنہائی' جذباتی ناآسودگی اور دنیا۔۔۔ مانو کوئی خنجر تھما دے تو کسی ایک کو گھونپ دیں۔

اک بار انہوں نے تبریز کا سر دیوار میں ٹکرا ٹکرا کر مارا۔ "تو مر جائے تو اچھا ہے' میں اکیلی جان کیا کیا کروں؟" تبریز کو بخار تھا۔ اس کا دل آٹھ آٹھ آنسو روتا۔ وہ یوں ہی بچوں کو کوستی نظر آتیں۔

"پورے چار ہیں' گنتی کے چار' اک آدھ کم بھی نہیں ہوتا۔" اس وقت وہ یہ ہی سمجھتی کہ ماں کو ان سب سے نفرت ہے۔ وہ ابا کو یاد کرتی جو کتنا پیار کرتے تھے۔ ان کے لیے قیمتی سامان' کھلونے' چاکلیٹس لاتے۔ محلے میں ابا کی دھاک تھی۔ مگر اب ان کا کون دفاع کرتا۔ امی کہتیں۔ اب تمہارا باپ سر پر نہیں بیٹھا ہے۔ گلی میں کھیلو گے' کسی سے ملو گے تو شکایتیں بھی آئیں گی۔

امی نے اسے دوپہر کی شفٹ میں داخل کروادیا۔ وہ صبح کا سارا کام کر کے بارہ بجے سدھارتی' شام کو لوٹ کر یونیفارم اتارتے ہی گھر کے دھندوں میں لگ جاتی۔ مگر انہیں اپنا غبار نکالنے کا موقع مل ہی جاتا۔ بس نہ چلتا' اس کے منہ میں جاتا نوالہ تک چھین لیں۔ بیماری ان کے نزدیک جھوٹ ڈھونگ تھی اور پڑھائی بہانہ۔

"تجھے نہیں پتا ابھی کتنے کام پڑے ہیں' تو بیگ کھول کر بیٹھ گئی۔" اکثر وہ ہاتھ میں پکڑی چیز اس کو کھینچ مارتیں۔ وہ چٹنی مسالا پیستی تو ہاتھوں میں آگ لگ جاتی' مگر پروا کسے تھی۔ عذر دے کر بھی کام کرنا ہی پڑتا۔ امی کو چوں بھی منظور نہ ہوتی تھی اور فرمائش' لاڈ و نخروں کے تو وہ چاروں معنی بھی بھول گئے تھے۔ ان کا پکایا بچوں کے منہ کو نہ لگتا تو بھی پروا کسے تھی۔

"کھانا ہے تو کھاؤ' ورنہ بھوکے سو جاؤ۔" کئی بار تو بچ بچ کوئی نہ کوئی بھوکا ہی سو جاتا۔ امی ہر معاملہ میں من مانی و ہٹ دھرمی کی عادی ہو گئی تھیں۔ شاید اسی کو عورت ذات کی تریاہٹ کہتے ہیں۔ مگر یہ تریاہٹ بے سبب نہیں ہوتی۔

☆ ☆ ☆

گھر کے عقبی حصہ میں ابا کے ہاتھ سے لگایا اک چھوٹا سا باغ تھا۔ آم پپیتے اور امرود کے درخت گھر سے متصل سڑک سے نظر آتے۔ اک روز اک مناسب قدوقامت کا بھوری آنکھوں والا گورا چٹا آدمی دروازے پر چلا آیا۔

"سلام بی بی صاب!" سندھی ٹوپی لگائے' اجرک کی بکل مارے عجزو انکسار کا پیکر۔ وہ سانول تھا۔ جو ہاتھ جوڑے درخواست گزار تھا۔

"اس باغ کا پھل ہم کو بیچ دو بی بی صاب! ہم اس باغ کی گوڈی کرے گا' پانی دے گا۔ جب فصل تیار ہو گی تو منڈی بیچ کر آئے گا۔ آدھا منافع آپ رکھنا۔"

امی کو بھلا اور کیا درکار تھا۔ اجڑا باغ بیٹھے بٹھائے آمدنی دینے جا رہا تھا۔ ابا کے بعد اس باغ کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ سانول نے اپنی محنت سے باغ میں جان ڈال دی تھی۔ اس باغ کی دیکھ بھال میں وہ صبح سے شام تک مصروف رہتا۔ کبھی تھک کر ہانپتا تو کسی درخت سے لگ کر بیٹھ جاتا۔ امی اسے ٹھنڈا پانی' کبھی شربت گھول کر بھیج دیتیں۔ کبھی دیر سویر ہو جاتی تو بلا کے کھانے کی ٹرے پکڑا دیتیں۔ اک روز وہ امی کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

"ایک بات بولوں بی بی صاب! آپ کے ہاتھ میں بڑا ذائقہ ہے۔ مجھ سے دو وقت کی روٹی کے صدقے ہزار کام کروالو۔ بس کھانے' پینے کا آسرا کر دو۔"

امی مسکرا دیں۔ وہ فطرتاً" نیک طبع تھیں۔ بے چارہ سانول پردیس میں بے گھر تھا۔ وہ اسے اندر بلا کے کھانا کھلانے لگیں۔ ڈھیروں کام سانول نے اپنے ذمہ لے لیے تھے۔ بچوں کو اسکول سے لے آتا۔ کسی نہ کسی بچے کو کندھے پر لاد کر سودا سلف لا دیتا۔ کبھی کوئی بیمار پڑتا تو ڈاکٹر کے پاس لے جاتا۔ مانو اک خاموش معاہدہ۔

امی اب کھانا پکاتیں تو سانول کی پسند ناپسند کا خیال رکھتیں۔ وہ امی کے ہاتھ کے ذائقہ کی تعریف کرتا۔ پھر بات ہاتھ کے ذائقہ سے' ہاتھ کی تعریف پر آ گئی۔ تابندہ کا خیال تھا۔ امی اسے جوتے مار کر نکال دیں گی مگر امی اب خوش رہنے لگی تھیں۔ وہ سانول کا انتظار کرتیں۔ اس کے پسندیدہ کھانے پکاتیں اور سجتی سنورتیں۔ مانو اک چھوٹی سی بے ایمانی۔ جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ بس تسلی تھی' سہارا تھا' شاید آسودگی۔

وہ کھل اٹھتیں۔ جب وہ امی کو سراہتا' یا یہ کہتا کہ وہ شخص بہت خوش نصیب تھا۔ آپ جس کا نصیب تھیں۔ شاید وہ اسی ستائش کے لیے خود کا خیال رکھنے لگی تھیں۔

اس بار وہ دنیا سے بھی بے پروا ہو گئی تھیں۔ سانول کسی کام سے گاؤں گیا تو کئی سوغاتیں لایا۔ ستو' دھنیے کا تیل' اچار اور ساتھ میں امی کے لیے سندھی کڑھائی سے سجی چادر۔

پھر وہ امی سے ابا جیسی فرمائشیں کرنے لگا۔ یہ رنگ پہنو' یہ نہ کرو۔ وہ کرو۔ امی بھی ہر چھوٹی بڑی بات اس

سے کرنے لگیں۔

"کل ہم شادی میں گئے تھے" میں نے نیلی ساڑھی باندھی۔"

"اوہ! نیلا رنگ تو تم پر بہت سجتا ہے۔" وہ امی کو اس بے تکلفی سے پکارتا تو یہ حوصلہ ان ہی کا بخشا ہوا تھا۔

"ہاں.... سب یہ ہی کہہ رہے تھے۔"

"مگر میں نے تو نہیں دیکھانا۔"

پھر اگلے روز امی نے اسے نیلی ساڑھی باندھ کر دکھائی۔ بچوں کے اسکول سے شکایتیں آنے لگی تھیں۔ امی کی توجہ اب گھر اور بچوں سے ہٹ رہی تھی۔ مگر سانول نے ان کی تھکن بانٹ لی تھی۔ وہ مطمئن ہوگئی تھیں اور شاید آسودہ بھی۔ جانے کتنے دن گزرے۔ پھر سانول کے گھر سے بلاوا آگیا۔ اس کی شادی ہو رہی تھی۔ سانول حساب کتاب کر کے چلا گیا۔ پھر نہ لوٹا۔ جانے امی نے اسے یاد کیا نہ کیا۔ کب، کب اور کہاں، کہاں اس کی کمی محسوس کی یا نہیں کی۔ مگر دنوں میں جیسے سب کچھ بدل گیا۔ شاید پہلے جیسا ہوگیا... یا پھر پہلے سے بھی بہتر.... کیوں، کیسے اور پتا نہیں، وہ منٹوں میں جیسے سالوں پیچھے کی سیر کر آئی تھی۔

عادل کا ارمان بجا تھا۔ بار.... تھکن.... ٹوٹ پھوٹ.... یہ لفظ اس کے لیے نئے نہ تھے۔ وہ خود ان کا عذاب اپنی جان پر جھیل چکی تھی۔ دہری ذمہ داریوں کا بار اٹھانے میں عورت تھک کر ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔ اس کی اپنی ذات ختم ہوجاتی ہے، اندر خلا رہ جاتا ہے تو محرومی عود کر آتی ہے۔ یہ ناآسودگی، تھکن اسے آتش فشاں بنا دیتی ہے۔ جو پھٹتا ہے تو آس پاس کے لوگ زیر عتاب آتے ہیں۔

الماس.... امی اور وہ خود....

ایک ہی کہانی کے تین رخ تھے۔

الماس کی چیخ پکار، امی کی بے ایمانی، تابندہ کا فیصلہ محرک ایک ہی تھا، محرومی۔

اسے الماس نہیں بننا تھا اور کسی بے ایمانی کا تو وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ اسے لوٹنا تھا۔ صبر شکر کے ساتھ اچھے وقت کا انتظار ہی نہیں کرنا تھا، الماس کے اندر اتر کر اس کی محرومیوں کو بھی ٹٹولنا تھا۔ ممکن ہے سمجھوتے کی کوئی راہ نکل آئے۔

یہ اس کا فیصلہ تھا۔

☼

فرح بخاری

شامِ خزاں طویل سہی

ہوائی جہاز علامہ اقبال انٹرنیشنل ایرپورٹ لاہور پر لینڈ کرنے والا تھا۔ عازم نے عینک بند کر کے جیب میں پھنسائی اور کتاب بند کر کے ہینڈ بیگ میں ڈال لی۔ سارہ نے بالکل اچانک ہی زوردار طریقے سے اس کی کلائی تھامی۔ جس پر پہلے تو عازم چونکا لیکن پھر مسکراتے ہوئے خود ہی اس کی نرم انگلیاں اپنے ہاتھوں میں پھنسالیں، وہ آنکھیں بند کیے کسی ورد میں مگن تھی۔ ہمیشہ سے اسے لینڈنگ کے مرحلے سے خوف آتا تھا۔ جب جہاز کے پہیے ایک تیز گڑگڑاہٹ کے ساتھ رن وے پر دوڑتے تو اسے لگتا ابھی یہ پھٹ جائیں گے اور ان میں آگ لگ جائے گی اور پھر ایک زوردار دھماکا...

"ہمیں لینے کون آرہا ہے...؟" سارہ نے ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ دونوں اس وقت سامان کے انتظار میں کنویر بیلٹ کے قریب کھڑے تھے۔

"یقیناً" عرفان بھائی آئیں گے۔"

"اوہ... میں نے سوچا" اب ان کی نئی جاب ہے کیا پتا شیڈول وغیرہ چینج ہو۔"

"ہوں..." عازم نے مختصر جواب دے کر آتے جاتے سامان پر نظر ڈالی۔

"کیا بات ہے عازم! آپ بہت چپ چپ ہیں۔ حالانکہ آپ تو وطن آنے کے لیے برسوں بے چین رہے ہیں اور بالآخر ہم ہمیشہ کے لیے آہی گئے۔ یا پھر آپ پچھتا رہے ہیں جاب چھوڑ کر...؟" سارہ نے پورے سفر کے دوران محسوس کیا کہ اس بار عازم کے انداز میں وہ ہمیشہ والی شوخی اور جوش مفقود ہے۔ وہ تو

مکمل ناول

جہاز کے سفر میں بے تکان بولنے کا عادی تھا۔ جبکہ یہ پہلا سفر تھا' جو عازم نے سوتے اور کتاب پڑھتے گزارا تھا۔

"نہیں بالکل نہیں۔" اس نے فوراً" سارہ کا خیال رد کیا۔ "وطن واپس آنا میرا خواب تھا' جو الحمدللہ آج پورا ہو گیا ہے اور میں بہت خوش بھی ہوں۔ بس فیوچر کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ آگے بھی تو کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا۔" اس نے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"ہمیں کیا کرنا ہے فیوچر کے بارے میں سوچ کر۔" سارہ نے اداسی سے آہ بھر کر کہا تو عازم نے ایک نظر اسے دیکھا اور توجہ دوسری جانب مبذول کر لی۔

باہر نکلے تو اپریل کی ٹھنڈی خوشگوار ہوا نے استقبال کیا۔ جانی پہچانی مہک کو نتھنوں میں محسوس کرتے ہی عازم کے لب مسکرا اٹھے۔

"کیا بات ہے اپنے وطن کی... اور پھر لاہور کی..." وطن کی زمین پر پڑنے والے پہلے قدم ہمیشہ ہی اسے بڑے جادو اثر لگتے۔ "پتا نہیں کیا ہے اس مٹی میں... زندگی تو اس میں محسوس ہوتی ہے۔" عرفان بھائی نے ہاتھ ہلایا تو وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھا اور بھائی کے گلے لگ گیا۔ سارہ سے سلام دعا کا تبادلہ ہوا پھر وہ ٹرالی اس سے لے کر پارکنگ کی طرف بڑھ گئے۔

"بہت دبلے ہو گئے ہیں عرفان بھائی۔"

"بس یار... فیلڈ کا کام تو خون بھی نچوڑ لیتا ہے' ہماری تو ابھی چربی کم ہوئی ہے۔" وہ تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے بیگز گاڑی میں ایڈجسٹ کرنے لگے۔

"چلو تم آگے آجاؤ... بھابی! یہ چھوٹا بیگ آپ اپنے پیروں میں رکھ لیں۔" وہ گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھے۔

"موسم تو بہت زبردست ہے آج۔" عازم نے باہر جھانکا۔

"ہاں بارش کی پیشن گوئی بھی ہے شاید... فقہ بتا رہی تھی۔" عرفان نے گاڑی پارکنگ ایریا سے نکالی۔

"اماں کی طبیعت اب کیسی ہے...؟"

"بہتر ہے پہلے سے' اب تم آ گئے ہو امید ہے' بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔" عرفان نے محبت سے بھائی کو دیکھا' وہ بھی مسکرا دیا۔ گاڑی اب رنگ روڈ پر رواں دواں تھی۔

☆ ☆ ☆

"اف...!" وہ تھک کر گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھی۔ چار بجے کالج سے آنے کے بعد دل چاہتا گھر پہنچتے ہی کوئی گرم چائے کا کپ سامنے حاضر کر دے' لیکن یہاں کے ماحول میں ایسی خواہش تو بس ایک خواب تھا' اماں ان بے جا چونچلوں کو پسند نہیں کرتی تھیں۔ خزران نے زبردستی اپنا ذہن چائے سے ہٹایا۔ پرس الماری میں رکھ کر پہلے کپڑے تبدیل کیے پھر لاؤنج میں آ کر بچوں کو آواز دی اور وہ سیکنڈز میں سامنے آ کھڑے ہوئے۔

"ماما! آپ آ گئیں..." مناہل اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

"تم لوگوں نے پھر کپڑے چینج نہیں کیے... بری بات ہے بیٹا!" خزران نے بمشکل غصہ ضبط کیا۔ مناہل اور رافع کی نئی کلاسز ابھی پانچ روز پہلے شروع ہوئی تھیں۔ اماں نے بس پہلے دو دن ہی ان کا خیال رکھا تھا۔

"دادی نے کہا خود تبدیل کر لو... لیکن مجھے تو گھر والے کپڑے ملے ہی نہیں۔" رافع نے بیڈ پر چھلانگ لگائی۔

"اچھا کوئی بات نہیں... چلو نہا کر صاف کپڑے پہن لو... پھر مل کر کھانا کھاتے ہیں۔ دیکھو! ماما کا بھوک سے برا حال ہے۔" اس نے جلدی جلدی تولیہ اور کپڑے نکال کر رافع کو باتھ روم میں دھکیلا۔ کھانے کے دوران وہ دونوں مسلسل اسے نئی کلاس' نئی ٹیچرز اور نئے نئے دوستوں کے متعلق معلومات فراہم کرتے رہے۔

"خزران... کھانا کھا لیا...؟" اماں نے اپنے کمرے سے ہانک لگائی تو وہ فوراً" دوپٹے سے ہاتھ

صاف کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم لوگ کھانا ختم کرکے سیدھا اپنے کمرے میں چلے جانا' خبردار جو تائی کے کمرے میں اودھم مچایا۔" وہ انھیں تنبیہہ کرتی اماں کے کمرے میں آگئی۔

"جی اماں! کھانا کھالیا ہے۔ آپ کو کچھ چاہیے؟"

"ارے، دو گھنٹوں سے اپنی عینک ڈھونڈ رہی ہوں' قرآن پاک سامنے رکھا ہے' دیکھو کیسی بے حرمتی ہو رہی ہے۔ جاؤ ذرا گاڑی کے ڈیش بورڈ پہ دیکھو! صبح میں آصف کے ساتھ بینک گئی تھی۔ شاید وہیں بھول آئی ہوں۔"

"جی اماں...!" وہ فوراً پورچ میں آئی۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ ڈیش بورڈ تو کیا اوپر نیچے' آگے، پیچھے پوری گاڑی کھنگال ڈالی لیکن عینک ہوتی تو ملتی۔ وہ پیشانی پونچھتی بمشکل سیدھی ہوئی کہ مین گیٹ کی بیل بجی۔ وہ اس وقت گیٹ کے بالکل قریب تھی' اس لیے خود ہی آگے بڑھی۔

"کون...؟"

"میں... عازم حیدر!" ٹھہرے ٹھہرے پرسکون لہجے پر وہ بری طرح چکرا گئی۔ ہر ڈیڑھ' دو سال کے وقفے کے بعد یہ مانوس آواز یونہی اس کے دل کی دنیا کو زیر و زبر کر دیا کرتی تھی۔ اس نے گھبرا کر دوپٹا سر پہ لیا اور نہایت شرمندگی سے ایک نگاہ اپنے حلیے پر ڈال کر بدقت تمام چھوٹا دروازہ کھول دیا۔

"السلام علیکم...!" وہ ایک اڑتی پڑتی نگاہ عازم پر ڈال کر ایک طرف ہو گئی۔

"وعلیکم اسلام" ... وہ اس کے حلیے پر گہری نگاہ ڈالتا' بہت سے سوال دل میں لیے حیران حیران سا اندر بڑھ گیا۔ خزران گیٹ بند کرکے پلٹی اور اسے اپنی معیت میں ڈرائنگ روم تک پہنچایا۔ اس نے اماں کو اس کی آمد کا بتایا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بچے پتا نہیں کہاں بھاگ گئے تھے۔

وہ کھوئی کھوئی سی بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔ عازم اس کا سگا پھپھو زاد تھا یوں تو سات منگیتر بھی... لیکن اس کی سسرال میں دوسرے تعلق سے سب ہی ناواقف تھے کیونکہ اس کی اور عازم کی باقاعدہ منگنی نہیں ہوئی تھی۔ بس گھر کے بڑوں نے آپس میں کہہ رکھا تھا۔ عازم کا خزران کے سسرال میں آنا جانا لبنیٰ بھابھی کی وجہ سے شروع ہوا تھا۔ عازم اور لبنیٰ بھابھی کا بھائی حمزہ ملائشیا میں ایک ہی جگہ کام کرتے تھے۔ عازم جب بھی چھٹی پر آتا تو حمزہ اس کے ہاتھ لبنیٰ کے لیے تحائف وغیرہ بھیج دیا کرتا اور یوں ہر ڈیڑھ دو سال بعد عازم کا ایک بار ضرور اس طرف آنا ہوتا۔ خزران نے کبھی اس کی آمد کو ناگواری یا شک کی نظر سے نہیں دیکھا کیونکہ عازم پر بھروسا بہت پرانا تھا۔

"عازم کو میرے حالات کا علم تو ہو گیا ہو گا۔ سنجیدہ پھپھو اور فضہ بھابھی نے اسے بتایا تو ہو گا۔ پتا نہیں کیا سوچ رہا ہو گا وہ یہ سن کر... میری حالت پر رحم... یا پھر بے حد غصہ' کہیں وہ اپنے غصے کا اظہار اماں کے سامنے نہ کر بیٹھے۔" وہ اضطراری کیفیت میں پیر کے انگوٹھے سے قالین کھرچے جا رہی تھی۔

"مما! آپ کو لبنیٰ تائی بلا رہی ہیں۔" رافع نے کمرے میں جھانک کر کہا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

ڈرائنگ روم سے اماں اور عازم کے بولنے کی آواز آرہی تھی... وہ کچن میں داخل ہو گئی۔

"آؤ بھئی... ایک تو صبح سے سر میں درد ہے۔ اوپر سے مہمان کی خاطر مدارت بھی مجھے کرنا پڑ گئی۔" لبنیٰ کی اکتاہٹ پر خزران کو حیرت تو بہت ہوئی کیونکہ عازم ان کی وجہ سے یہاں آتا تھا اور ان ہی کا مہمان تھا لیکن بہرحال اس نے خود کو کچھ بھی کہنے سے باز رکھا۔

"اچھا خیر... یہ دوسری ٹرے تم لے آؤ۔ میں چائے لے جا رہی ہوں۔"

"تم تو ہمیشہ کے لیے واپس آگئے۔" اماں کی آواز باہر تک آرہی تھی۔

"جی بس... بہت سے ضروری کام نمٹانے ہیں۔ یہاں آئے بنا نہیں ہو سکتے تھے۔"

"کام دھندے کے متعلق کیا سوچا ہے؟" اماں نے

اگلا سوال داغا۔
"پہلی ترجیح تو جاب ہے۔ آسانی سے چند ماہ کے اندر مل گئی تو بہت اچھا ہے۔ ورنہ کچھ بزنس وغیرہ کا سوچوں گا۔"
اس نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے خوب فرصت سے خزران کو دیکھا لیکن وہ نظر چرا گئی۔ لبنیٰ بھابھی ٹرے رکھ کر خود بھی وہیں بیٹھ گئیں لیکن خزران چائے دے کر کے لاٹ گئی۔

☆ ☆ ☆

بچے ٹی وی دیکھتے دیکھتے نو بجے سے کچھ پہلے ہی سو گئے۔ وہ شکر کرتی اٹھ گئی۔ صبح کے لیے کپڑے تو پریس کرنے نہیں تھے کیونکہ آج ویک اینڈ تھا۔ خزران نے سوچا تھوڑا سا کالج کا کام ہی دیکھ لے۔ کچھ نئی کلاسز اسے دی گئی تھیں۔ اس نے ارادہ کیا کہ نوٹس تیار کر لے۔ کتابیں وہ ساتھ اٹھا لائی تھی۔
سب کچھ ترتیب سے رائٹنگ ٹیبل پہ رکھ کر وہ کمرے سے نکلی کہ اگر اماں جاگ رہی ہیں تو پوچھ لے، انہیں کوئی ضرورت تو نہیں۔ لیکن ان کے کمرے کی بند لائٹ دیکھ کر سمجھ گئی کہ وہ سو چکی ہیں۔ آصف بھائی اور لبنیٰ بھابھی کے کمرے سے البتہ ابھی تک بچوں کے شور کی آواز آرہی تھی۔ اس نے لاؤنج کی فالتو بتیاں بجھا کر صرف ایک جلنے دی۔ فون کی گھنٹی نے ماحول کی خاموشی توڑی تو اس نے لپک کر ریسیور اٹھایا تاکہ اماں کی نیند میں خلل نہ پڑے۔
"ہیلو...!" خزران نے ریسیور کان سے لگایا۔
"ہیلو... کون ہے؟" کوئی جواب نہ پا کر وہ دوبارہ بولی۔
"ہوں... اپنی تصدیق کر رہا تھا کہ تم ہی ہو۔" عازم کی سنجیدہ آواز ماؤتھ پیس میں ابھری تو خزران کا دل بیچ بیچ ڈوب کر پسلیوں میں چلا گیا۔
"سب سو رہے ہیں عازم!" اس نے بمشکل آواز نکالی۔
"اچھی بات ہے... زیادہ تسلی سے بات ہو گی۔" وہ شاید مسکرایا تھا۔
"لیکن مجھے کوئی بات نہیں کرنی... آصف بھائی یا لبنیٰ بھابھی میں سے کوئی یہاں لاؤنج میں آگیا تو...؟"
"دیکھو! گھر کا نمبر میں نے بھی مجبوری میں ڈائل کیا ہے کیونکہ تمہارا سیل نمبر میرے پاس نہیں ہے۔ تمہارے علاوہ کوئی اور فون اٹھاتا تو میں بنا بات کیے بند کر دیتا۔ مجھے تمہارا نمبر چاہیے۔" ابھی اس کا لہجہ قطعی تھا۔
"لیکن...!" خزران نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔
"پلیز رازی! اگر ابھی تم سے بات نہ ہوئی تو میری دماغ کی رگ بھی پھٹ سکتی ہے۔ تم جانتی ہو میرا تم سے بات کرنا کتنا ضروری ہے۔ بحث میں مت پڑو۔ اپنا نمبر بتا کر روم میں جاؤ، تاکہ تسلی سے بات ہو سکے۔" وہ ہرگز مصالحت کے موڈ میں نہیں تھا۔ خزران نے اسے اپنا نمبر دے دیا۔
"ٹھیک ہے، میں پانچ منٹ تک کال کرتا ہوں۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔
خزران نے کمرا اندر سے بند کیا اور رائٹنگ ٹیبل کے پاس آبیٹھی۔ عازم کی ٹھیک پانچ منٹ بعد کال آگئی۔
"مبارک ہو...!"
"جی...؟" وہ ایسے آغاز پر حقیقتاً گڑبڑا گئی۔
"ارے بھئی۔ کالج کی پروفیسر بن گئی ہو۔ مبارک دے رہا ہوں۔"
"اوہ...!" وہ بری طرح جھینپ گئی۔ "تھینکس۔"
"جاب کب لگی... اور گریجویشن کے بعد مزید پڑھائی کا موقع کب ملا...؟"
"تقریباً" سال ہو گیا ہے۔ شادی کے بعد ایم اے اکنامکس اور پھر ایم ایڈ بھی کر لیا تھا۔"
"چلو اچھا ہے" اتنی کم عمر میں یہ واقعی بہت بڑی کامیابی ہے۔"
"اب ایسی بھی کم عمر نہیں۔" وہ شرمندہ ہو گئی۔
"ہاں ویسے عقل کے حوالے سے تو بچوں کو بھی

مات دیے بیٹھی ہو۔" عازم کا لہجہ ایک دم سنجیدہ ہوا۔ خزران جواباً بول نہیں پائی۔ دل بری طرح سکڑا تھا۔ یقیناً اب وہ اصل موضوع پر آگیا تھا۔

"کیا واقعی یاسر نے تمہیں طلاق دے دی ہے۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔ ایسے کیوں پوچھ رہے ہو۔۔۔؟" وہ حیران ہو گئی ایسے۔ بے تکے سوال پر۔۔۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ یاسر اور اس کی طلاق ہو چکی ہے۔ بھلا شک کی کیا گنجائش۔

"میں نے سوچا شاید تم تردید کرو گی۔"

"کیا مطلب۔۔۔ میں کیوں تردید کروں گی۔" وہ خاک نہیں سمجھ پائی۔

"بھئی تم طلاق کے بعد بھی سسرال میں بیٹھی ہو' مجھے لگا شاید لوگ جھوٹے ہیں' ورنہ علیحدگی کے بعد وہاں رہنے کا کیا جواز۔۔۔؟"

"بہت ساری وجوہات ہیں۔" اس نے خود کو کھل کر بات کرنے کے لیے تیار کیا۔

"جیسے۔۔۔؟"

"پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یاسر یہاں نہیں رہتا۔ وہ اپنی سیکنڈ وائف کے ساتھ بحرین میں ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یاسر نے جو زیادتی میرے اور بچوں کے ساتھ کی' اس کی سزا بلاوجہ اماں کو کیوں ملے۔ میرے بچے دادی کے ہاتھوں میں پلے بڑھے ہیں۔ یہاں سب ان سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میں کیسے بچوں کو ان سے دور کروں۔"

"بس یہی دو وجوہات ہیں۔۔۔؟" عازم نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔؟" وہ اسے مسلسل الجھا رہا تھا۔

"اگر صرف یہی وجہ ہے تو میں کل ہی جنید سے بات کرتا ہوں کہ وہ آکر تمہیں لے جائے۔ حیرت ہے کیسا بھائی ہے۔ بہن طلاق کے بعد بھی سسرال میں پڑی ہے اور اسے کوئی پرواہی نہیں۔ اسے تو چاہیے تھا اگلے دن بازو سے پکڑ کر تمہیں اپنے گھر لے آتا۔"

"اب اس میں جنید بھائی کا کیا قصور۔ میں اپنی مرضی سے یہاں رہ رہی ہوں۔"

"تمہاری تو عقل گھاس چرنے گئی ہے۔" وہ اس پر بری طرح برسا۔ "کس دنیا میں رہتی ہو جاہل! تمہاری ساس اپنے بیٹے اور نئی بہو سے ملنے کے لیے تڑپ رہی ہے' لیکن تمہاری یہاں موجودگی کی وجہ سے انہیں بلا نہیں پا رہی۔"

"ایسا کہا اماں نے ؟" خزران نے حیرت سے دہرایا۔ "انہوں نے کہا تھا یاسر نے میرے اور بچوں کے ساتھ جو کیا' وہ ساری عمر اس کی صورت بھی نہیں دیکھیں گی۔ آصف بھائی بھی ہرگز اسے معاف کرنے

کو تیار نہیں۔"

"شاید تب تک وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ نئی بہو کراچی کے بہت بڑے جیولر کی بیٹی ہے۔"

"یہ بات یہاں سب کو پتا ہے کہ اس لڑکی کا باپ سونے کا تاجر ہے۔" خزران نے عازم کے اندازے کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔

"اچھا اور تمہیں لگتا ہے یہاں یہ بات سن کر کسی کی رال نہیں ٹپکی ہو گی۔ یہ لوگ اس امیر کبیر دلہن کا استقبال کرنے کے لیے بے چین ہیں اور تم۔" وہ پھر غصہ کھا گیا۔

"غلط فہمی ہے تمہاری۔" خزران نے لہجہ سخت کیا۔ "سب تمہارے مفروضے ہیں۔ تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ میں اپنی پوری تنخواہ اماں جی کے ہاتھ پر رکھتی ہوں۔ وہ جیسے چاہے استعمال کرتی ہیں۔ پھر کیوں وہ ہمارے یہاں سے جانے پر خوش ہوں گی۔"

"مائی گاڈ۔۔!" وہ چلایا۔ "تمہاری آمدنی پر پلنے کے بعد بھی ان کا رویہ تمہارے ساتھ شکر گزاروں والا ہونے کے بجائے احسان جتانے والوں جیسا ہے۔ ایک نظر اپنے بچوں کو دیکھو۔ گلی میں پھرتے بچے بھی ان سے اچھی حالت میں ہوتے ہیں۔ انہیں چھوڑو' خود کو دیکھو۔ گھروں میں کام کرنے والی ماسیاں بھی شرما جائیں۔ ڈوب مرو کہ تم ایک کالج کی پروفیسر ہو۔۔۔ پکوڑے بیچ کر ڈگری حاصل کی ہے کیا؟" وہ اچانک اتنے غصے میں آیا کہ ایک لحظے کو خزران سہم سی گئی۔

"کل ہی اپنا سامان باندھو اور جنید کی طرف چلو۔ اس کی تو میں ٹھیک ٹھیک خبر لیتا ہوں۔" وہ اس کی توقع سے کہیں بڑھ کر غصے میں تھا۔

"پلیز عازم! میری بات ٹھنڈے دماغ سے سنو۔" خزران کے ہاتھ پیر ہی پھول گئے اس کا رویہ دیکھ کر۔

"دیکھو! یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔ جنید بھائی تو بہت بار مجھ سے کہہ چکے ہیں کہ میں ان کے ہاں آجاؤں لیکن۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ "تم سمیعہ بھابھی کی طبیعت تو جانتے ہو۔۔۔ پھر جب سے میری طلاق ہوئی ہے' ان کا رویہ اور بھی بدل گیا ہے۔ ہر لمحہ انہیں یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں میں دو بچوں سمیت ان کے سر پر نہ جا بیٹھوں' جنہیں اکیلے رہنے کی عادت ہو جائے' انہیں کسی کی مداخلت اچھی نہیں لگتی۔ میں صرف ملنے بھی چلی جاؤں تو وہ نہایت روکھے انداز میں ملتی ہیں۔"

"ہوں۔۔۔ تو یہ کہو ناں کہ یہ تیسری وجہ ہی اصل بنیاد ہے۔ چلو مان لیا لیکن جب تم پوری تنخواہ دے کر سسرال بلکہ سابقہ سسرال میں رہ رہی ہو تو تمہارا رویہ اتنا غلامانہ کیوں ہے۔ کیوں تم اور تمہارے بچے تن کر مالکوں کے اسٹائل میں نہیں رہتے؟؟"

"یہ تو بری بات ہے۔" اس نے فوراً" بات کاٹی۔ "پیسہ دے کر احسان جتاتی اچھی لگوں گی کیا۔۔۔؟"

"ہاں جانتا ہوں۔۔۔ ایٹی کیٹس میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے میڈم نے۔۔۔ لیکن جو لوگ تمہاری کمائی کھا رہے ہیں' کم از کم انہیں ذرا تو اتنا پتا ہو کہ جس کا کھاتے ہیں' اس کے گن بھی گاتے ہیں۔"

"ان کا رویہ بھی میرے ساتھ ٹھیک ہے۔ خوامخواہ تمہیں غلط فہمی ہوئی۔" خزران باوجود کوشش کے اپنے لہجے کی کمزوری پر قابو نہ پا سکی۔

"دنیا تم پر باتیں بنا رہی ہے بے وقوف لڑکی۔۔۔ جب سے آیا ہوں۔ خاندان بھر میں یہی سرگوشیاں گردش کر رہی ہیں کہ خزران علیحدگی کے بعد بھی سسرال میں بیٹھی ہے۔۔۔ سمیعہ بھابھی کا رویہ تمہیں نظر آتا ہے اور جیٹھانی لبنیٰ کی پریشانیاں دکھائی نہیں دیتیں۔ جب یاسر سے تمہارا کوئی رشتہ باقی نہیں رہا تو آصف بھی اب تمہارا جیٹھ نہیں ہے۔ نہ تم اس کی بھابھی ہو۔ گھر میں جوان' خوب صورت عورت کے رہتے' لبنیٰ کو سوتے جاگتے ہول اٹھتے ہیں۔" وہ بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا۔

"فضول باتیں مت کرو عازم! آصف بھائی سے میرا جو احترام اور عقیدت کا رشتہ ہے' کم از کم اس پر تو انگلی مت اٹھاؤ۔" وہ بری طرح بگڑ گئی۔

"انگلی نہیں اٹھا رہا۔۔۔ میں نے تو لبنیٰ بھابھی کے

رویے سے، جو محسوس کیا وہی بتا رہا ہوں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ ایسے بے ہودہ وہم میں کبھی نہیں پڑیں گی۔"

"اوکے، لیو اٹ... تمہاری لبنیٰ بھابھی کو تو میں زیادہ نہیں جانتا... ہم سمیعہ بھابھی کی بات کرتے ہیں۔ اب وہ تو میرے ماموں زاد کی بیوی ہے۔ اس کو تو میں قریب سے، جانتا اور سمجھتا ہوں۔ یہاں تم اپنی سابقہ سسرال پر ہر مہینے بلاوجہ پوری تنخواہ لٹا رہی ہو۔ اگر اس کا آدھا سمیعہ کے ہاتھ پر رکھ دو تو نہ صرف عزت سے سگے بھائی کے گھر رہنے کا ٹھکانا مل جائے گا بلکہ یہی بھابھی تمہارے پیر دھو دھو کر بھی پییں گی۔ پھر نہ دنیا کی باتیں ہوں گی اور نہ ایسی غلامانہ زندگی جو میں آج دیکھ کر آیا ہوں۔"

اس نے اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں مفت مشورہ دیا اور خزران کچھ بولنے کی کوشش میں منہ کھولے بیٹھی رہ گئی اسے حیرت ہوئی کہ اتنی ٹھوس، جامع اور پتے کی بات اس کے دماغ میں کیوں نہ آئی۔

"تم میری باتوں پر غور کرو۔ جنید سے فی الحال میں اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کرتا... اور ہاں... اب نکلو اس دکھ سے کہ یاسر نے تمہارے ساتھ بے وفائی کی اور تمہیں چھوڑ دیا۔ اب کوئی نیا غم پالو... اپنی اولاد کی فکر کرو، اس وقت ان کا واحد سہارا صرف اور صرف تم ہو۔ راتوں کو تکیے بھگونا اور دنیا والوں کی ہمدردیاں بٹورنا بند کرو... دم ہے تو ان دو معصوموں کے لیے کچھ کرکے دکھاؤ۔ جنہیں بلاوجہ رشتوں کی چکی میں پیس کے رکھ دیا ہے۔ نکالو انہیں دادا، دادی اور چچا چچی کے چکر سے... انہیں صرف تمہارا وقت، تمہاری ثروت اور تمہارا ساتھ چاہیے۔ کیوں انہیں زبردستی پرانے رشتوں سے چپکا کر بیٹھی ہو... تمہاری ساس صاحبہ نے آج کی ایک گھنٹے کی ملاقات میں کوئی تین مرتبہ آہ بھر کر یاسر کو یاد کیا اور کہا کہ اس کی وجہ سے چپ ہوں... ہر کسی کو اپنی اولاد سے مطلب ہوتا ہے۔"

وہ اجازت لیتے لیتے بھی پوری تقریر کر گیا۔ خزران نے خاموشی سے فون رکھ دیا۔

"یہ تو میں ہمیشہ سے جانتی ہوں عازم! کہ تم میرے سچے خیر خواہ ہو لیکن آج بھی اتنا ہی درد محسوس کرتے ہو۔" وہ خاموشی سے آکر بچوں کے ساتھ لیٹ گئی۔ چھت کو گھورتے، الجھی الجھی سوچوں سے نتیجے اخذ کرتے جانے کب وہ آٹھ سال پیچھے چلی گئی۔ یاسر سے شادی طے پانے سے محض دو مہینے پہلے تک بھی اس کی اور عازم کی دنیا کسی انقلاب اور طوفان سے قطعاً ناواقف اور انجان تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا کر رہی ہو پاگل... یہ ایکسیلیٹر ہے۔" عازم اپنے غصے پر حسب عادت قابو نہ پا سکا۔

"جاؤ میں نہیں سیکھتی ڈرائیونگ۔" وہ زور سے کندھا جھٹک کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ عازم کو ہنسی آگئی۔

"یار! تین مرتبہ بتا چکا ہوں لیکن تمہیں بریک اور ایکسیلیٹر کا فرق ہی سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"تو ٹیچر کی طرح سمجھاؤ ناں... مالکوں جیسا رعب کیوں ڈال رہے ہو۔" خزران نے منہ پھلایا۔

"ہم کہاں کے مالک ملکہ عالیہ! گاڑی بھی آپ کی ہے اور بندہ بھی آپ کا غلام ہے۔" وہ رومانٹک ہونے لگا تو خزران نے مسکراہٹ دبائی۔

"اچھا بس بس... جب تمہارے گھر آجاؤں تب کہنا۔ فی الحال ابو کو منانے کا کچھ سوچو۔"

"ارے یار! یہ ابو کہاں سے آگئے بیچ میں۔ کیوں لانگ ڈرائیو کا ناس مار رہی ہو۔" عازم سچ مچ بدمزا ہو گیا۔ خزران زور سے ہنس پڑی۔

عازم نے اب ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ خزران نے مزید ڈرائیونگ پریکٹس کا ارادہ ترک کر دیا اور گھوم کر فرنٹ سیٹ پر آبیٹھی۔

"کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے سر پر لٹکی تلوار ہٹ نہیں جائے گی۔ یہ دو "ابے" ہمیں سچ مچ ہی نہ لے ڈوبیں۔ ابھی بھی وقت ہے نہ جاؤ ملائشیا اور ان دو ابو جان کے آپس کے اختلافات پر دھیان دو۔"

"اور کتنا سر پٹخوں رازی جان.... ! روز ایک نئے آئیڈیے اور نئے حل کے ساتھ ان کی خدمت میں پہنچتا ہوں لیکن لمبی لمبی بے مقصد بحثوں کے بعد بھی ان چار دکانوں کا مسئلہ کالا باغ ڈیم کی طرح بجائے حل ہونے کے وہیں ٹھپ ہو جاتا ہے۔"

"پھر ہو گا کیا عازم.... ؟" خزران کی تشویش کچھ اچانک ہی بڑھی تھی۔

"پوچھوں گا ان نند بھابی سے جنہوں نے دو معصوم بچوں کو ناسمجھی کی عمر میں ایک دوسرے سے منسوب کر دیا۔"

"یعنی ہمارا رشتہ ہونا اصل غلطی ہے۔" خزران اس کے جملوں پر جزبز ہونے لگی۔ "ویسے اتنے ناسمجھ بھی نہیں تھے ہم۔ میں پندرہ سال کی تھی اور جناب شاید سترہ اٹھارہ سال کے۔" اس نے یاد دلایا۔

"چلو مان لیا لیکن جب ہماری ماؤں کے شوہروں کی آپس میں نہیں بنتی تھی تو کیا ضرورت تھی ایسا نازک پنگا لینے کی.... لے کہ ہماری زندگی مصیبت میں ڈال دی۔"

"تمہیں میں مصیبت نظر آتی ہوں۔" وہ روہانسی ہو گئی۔ "پھر کیوں جگہ جگہ ساتھ لیے پھرتے ہو۔"

"محبت کا روگ جو بھی پالتا ہے نری مصیبت ہی تو مول لیتا ہے۔" وہ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ خزران کا چہرا ایک دم گلابی ہو گیا۔

"صرف بولنا آتا ہے۔ کرتے تو کچھ ہو نہیں۔" اس نے منہ بنا کر شکوہ کیا تو عازم کا بے ساختہ قہقہہ بلند ہوا۔

"اب اس میں ہنسنے والی کون سی بات ہے۔ تمہارے دماغ کا بھی بس اللہ حافظ ہے۔" خزران کو اس کی بے وقت کی ہنسی بالکل اچھی نہیں لگی۔

"بولنے سے پہلے سوچا تو کرو۔ خیر یہ بتاؤ۔ میرے ملائشیا جانے سے کیوں ناخوش ہو؟" اس نے موڑ کاٹتے ہوئے ایک نظر خزران کو دیکھا۔

"کیونکہ تم جھوٹے اور وعدہ خلاف ہو.... میں تو تمہیں خدا حافظ کہنے بھی نہیں آؤں گی۔" وہ پرانی بات یاد آنے پر پھر سے غصہ کھا گئی۔

"ارے اتنا غصہ.... یار! تمہاری قسم ارادہ تو میرا بھی یہی تھا کہ جانے سے پہلے ہماری شادی کا کچھ سلسلہ ہو جاتا یا کم از کم نکاح ہی ہو جاتا تاکہ وہاں جا کر میں تمہیں بلوانے کے لیے کچھ کرتا۔ تمہیں بلوانے کے لیے نکاح نامے کی کاپی بہت ضروری ہے۔ لیکن دیکھ لو یہ نئے حالات.... خالد نے مجھے واقعی یہی کہا تھا کہ دو ماہ بعد آنا ہے لیکن اب اچانک یہ کہہ کر فوراً بلا لیا کہ وہاں ایک جگہ خالی ہوئی ہے اور نیا بندہ ارجنٹ چاہیے۔ اگر میں نہ گیا تو وہ کسی اور کو لگالیں گے۔ یار! ایک سال کی تو بات ہے۔ تم لوگ شادی کی تیاریاں شروع کرو۔ سال گزرنے کا پتا بھی نہیں چلے گا۔"

"باتوں کے شہنشاہ ہو تم۔ خود تو ابھی نہیں بیٹھے ہو اور ہمارا ولیمہ بھی کروا دیا۔" وہ بالکل اس کی باتوں میں نہیں آرہی تھی۔ عازم نے مسکراتے ہوئے گاڑی روک دی۔

"تمہارا باپ ویسے بھی میری شکل سے نالاں ہے۔ اب اگر بنا نوکری کے نٹھلوں کی طرح جا کر شادی کی بات کروں گا تو جوتے مار کے بھگائے گا۔"

"شرم نہیں آتی۔ کیسی رف لینگویج بول رہے ہو۔ میرا باپ تمہارا سگا ماموں ہے۔" وہ برا مان گئی۔

"ہونے والا سسر بھی تو ہے۔" وہ زور سے ہنسا تو خزران مسکرانے لگی۔ "بدتمیز کہیں کے...."

"کہیں کے نہیں.... ہفتے بعد تو ملائشیا کے کہنا۔"

"بہت خوش ہو ناں؟" خزران پھر سے اداس ہو گئی تو عازم نے ایک آہ بھری۔

"نہیں رازی.... قسم سے دل بہت بھاری ہے۔ لیکن مرد ہوں ناں۔ اپنے جذبات چھپانے پڑتے ہیں۔"

"دل کیوں بھاری ہے.... ؟" خزران نے بے ساختہ سوال کیا۔

"اب یہ بھی پوچھو گی۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"ہاں نا.... مجھے کیا پتا۔"

"تم لڑکیاں بھی ناں.... ذرا بھروسا نہیں کرتیں۔

اب سوچ رہی ہوگی ضرور اس کی وجہ "میں" تو نہیں ہو سکتی۔ ماں کی وجہ سے اداس ہوگا۔ دوستوں کی وجہ سے یا پھر گھر چھوڑنے کے خیال سے... ہوں؟" اس نے تائید طلب نظروں سے دیکھا تو خزران نے شرمندگی سے نچلا لب دبا لیا۔

"تم کبھی کچھ بتاتے بھی تو نہیں ہو... ہر وقت تو غصے میں رہتے ہو۔"

"غصہ کرنے والوں کا دل نہیں ہوتا کیا...؟" اس نے سادگی سے خزران کا ہاتھ تھاما تو وہ بری طرح گھبرا گئی۔ آج تو بڑا مہربان رویہ تھا۔ یہ دعوا تو وہ حلفیہ کر سکتی تھی کہ عازم صرف اور صرف اسی کو چاہتا ہے۔ لیکن وہ طبیعت کا ایسا لاابالی اور لاپروا تھا کہ ہمیشہ بس مستی کے موڈ میں رہتا تھا جبکہ وہ خود پھول کی پتیوں سے نازک جذبات والی رومانٹک اور جذباتی لڑکی تھی۔ پندرہ برس کی عمر میں امی اور پھپھو نے اسے عازم کے نام سے منسوب کر دیا تو بس ہمیشہ کے لیے دل کی لوح پر کندہ ہو گیا۔ لیکن اس کے ابو اور پھوپھا کے اختلافات کا اونٹ برسوں گزرنے پر بھی کسی کروٹ نہیں بیٹھ رہا تھا۔

خزران کے والد توفیق حسین نے پراپرٹی خریدنے کا ارادہ کیا تو کسی نے مین روڈ کی چار دکانیں دکھائیں، جو انہیں بہت پسند آئیں۔ سوچا دکانیں کرایہ پر اٹھا دیں تو ہر مہینے معقول کرایہ بھی ملنے لگے گا۔ لیکن دکانوں کی قیمت ان کی بساط سے قدرے زیادہ تھی۔ انہوں نے اپنے بہنوئی جاوید علی یعنی عازم کے والد سے بات کی تو چار میں سے وہ ایک دکان خریدنے پر رضامند ہو گئے۔ یوں چاروں دکانوں کی رقم یکمشت ادا کر کے معاملہ حل کر لیا گیا۔ جاوید علی ان دنوں پارٹ ٹائم چھوٹا موٹا بزنس کرنے کا ایسے بھی سوچ رہے تھے۔ دکان کا مالک بننے کے بعد ارادہ مزید پختہ ہو گیا۔ عازم ابھی میٹرک میں تھا لیکن عرفان نے گریجویشن مکمل کر لیا تھا۔ انہوں نے عرفان کی مدد سے آٹو اسپیئر پارٹس کی دکان کھول لی۔ کام چل نکلا اور آہستہ آہستہ پوری طرح قدم جم گئے۔ البتہ توفیق حسین نے اپنی تین دکانیں کرایہ پر لگا دی تھیں۔ لیکن چند ماہ بعد جیسے ہی ریٹائرمنٹ ملی اور بہت سارا پیسہ اکٹھا ہاتھ آیا تو ملنے جلنے والوں نے مشورہ دیا کہ دکانوں کی جگہ ڈبل اسٹوری مارکیٹ تعمیر کرا لیں۔ بات ان کے دل کو لگی اور انہوں نے نیچے سپر مارکیٹ اور اوپر گارمنٹس شاپ بنوانے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن اس بڑے منصوبے میں بڑی رکاوٹ جاوید علی کی دکان تھی۔ توفیق حسین کو اب وہ چوتھی دکان ہر قیمت پر چاہیے تھی کیونکہ اسے واپس لیے بنا مارکیٹ تعمیر نہیں ہو سکتی تھی۔ انہوں نے جاوید علی سے کہا کہ وہ اپنی دکان انہیں بیچ کر اپنا کاروبار کہیں اور شروع کر دیں۔ لیکن جاوید صاحب اس بات پر اڑ گئے کہ ان کا کاروبار لوکیشن کی وجہ سے کامیاب جا رہا ہے۔ اگر جگہ تبدیل کر دی تو کام ٹھپ ہو جائے گا۔ اور ویسے بھی وہ اپنی دکان کے قانونی مالک ہیں۔ بنا اپنی مرضی کے وہ کیوں دکان سے دستبردار ہوں... عازم اور عرفان کئی طرح کے آئیڈیاز لے کر ماموں کی خدمت میں حاضر ہوتے اور کبھی جنید پھوپھا کو قائل کرنے کے لیے ان کے پاس آ بیٹھتا لیکن ڈھاک کے وہی تین پات کے مصداق معاملہ تھا کہ سلجھنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ وقت کافی آگے سرک گیا۔ خزران اس وقت بیسویں سال میں تھی اور گریجویشن کر رہی تھی۔ عازم ایم بی اے فائنل کرنے کے بعد فارغ تھا۔

اس کے دوست خالد نے ملائیشیا میں اس کی جاب کے لیے کوششیں شروع کر دی تھیں۔ اور پھر پتا بھی نہیں چلا اور دنوں میں اس کا کام ہو گیا۔

عازم ملائشیا چلا گیا تو خزران کے وہی شوق رہ گئے۔ دن میں اسے لمبی لمبی ای میلز لکھتی اور رات کو چیٹنگ کرتی۔ ان ہی دنوں یاسر کی والدہ اپنی بہو لبنیٰ کے ساتھ ان کے گھر آئیں۔ خزران انہیں جانتی تھی نہ پہلے کبھی دیکھا تھا۔ اس لیے بالکل بھی ان کی آمد پہ دھیان نہیں دیا لیکن پھر تھوڑے دنوں کے وقفے سے وہ لوگ دوسری اور پھر تیسری مرتبہ آئے تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ امی سے پوچھا تو وہ چھپا گئیں اور خزران ہکا بکا بیٹھی رہ گئی۔ ابو نے یاسر سے اس کی بات پکی کر دی

تھی۔

اسے اور تو کچھ نہیں سوجھا فوراً" فضہ بھابھی کو فون کر دیا۔ وہ بھی سن کر کافی پریشان ہوئیں۔ شام کو سنجیدہ پھپھو' سکینہ پھپھو اور فضہ بھابھی ابو سے بات کرنے کے لیے ان کے گھر آگئیں۔ لیکن ان کا آنا تھا کہ گھر میں طوفان کھڑا ہو گیا۔ اس کے ابو نے سنجیدہ پھپھو کو خوب سنائیں کہ انہوں نے اپنے شوہر کو دکان واپس دلوانے کے لیے ایک بار بھی کوشش نہیں کی۔ حتیٰ کہ سکینہ پھپھو پر بھی سخت ناراض ہوئے کہ وہ بجائے بھائی کا ساتھ دینے کے بہن کی حمایت میں بولنے آ گئیں۔ اور یہ اعلان بھی صاف الفاظ میں کر دیا کہ خزران اور عازم کا رشتہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ چکا ہے۔ اور وہ اسی مہینے کے آخر میں خزران کی شادی کرنے والے ہیں۔ سنجیدہ نہایت مایوس دل لیے بھائی کے گھر سے واپس لوٹ گئیں۔ ان کے لیے سب سے مشکل مرحلہ عازم کا سامنا تھا۔ اس کے بے شمار سوالات کا جواب دینا انتہائی مشکل کام تھا۔ اس سے تو یہ بھی توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ ملائیشیا سے ہی واپس آجاتا۔ لیکن جب تقدیر اپنی من مانی کرنے پر آتی ہے تو ساری راہیں کوشش کے باوجود مسدود ہو جایا کرتی ہیں۔

عازم کی ابھی نئی جاب تھی۔ چھٹی بھی نہیں مل رہی تھی اور پاسپورٹ بھی کمپنی کے پاس تھا۔ ایک مخصوص مدت پوری ہونے تک اسے جاب چھوڑنے کی اجازت نہیں تھی۔ سوائے کسی انتہائی ایمرجنسی کے' اس کا واپس آنا ممکن نہیں تھا۔ قسمت نے کچھ ایسے اس کے ہاتھ پیر باندھ دیے تھے کہ ساری بھاگ دوڑ رائیگاں گئی اور عازم روتی گڑگڑاتی خزران کے آنسو تک نہیں پونچھ پایا۔

اور وہ معاشرے کی اپنے جیسی بے شمار دوسری لڑکیوں کی طرح فرماں برداری پر مجبور کر دی گئی۔ عازم کی محبت کو باپ کی دہلیز پر دوسری تمام سہانی یادوں سمیت دفن کر کے یاسر حسنین کے گھر آگئی۔ شروع کے دنوں میں وہ بہت خوفزدہ اور ڈری ڈری رہی کہ کسی بھی وقت اس سے عازم اور اس کے رشتے کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ لیکن صرف ایک بار اس کی ساس نے ذکر چھیڑا۔

"سنا ہے' تمہاری پھپھو سنجیدہ اس لیے شادی میں نہیں آئیں کیونکہ وہ اپنے بیٹے کی شادی تم سے کرنا چاہتی تھیں؟"

"جی۔۔۔ ان کی یہ خواہش ضرور تھی لیکن ہمارے گھر میں کوئی ایسا نہیں چاہتا تھا۔"

خزران نے سوچا سمجھا جواب دیا تو انہوں نے بھی لاپروائی سے سرہلا دیا۔ اور بات آئی گئی ہو گئی اور یاسر تو گھونگھٹ اٹھاتے ہی خزران کی موہنی صورت کا ایسا دیوانہ ہوا کہ دن رات' صبح شام سوائے خزران کے گرد پروانے کی طرح گھومنے کے' اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ اور وہ بھی رفتہ رفتہ یاسر کی محبتوں کی عادی ہوتی چلی گئی۔

یاسر بحرین میں کام کرتا تھا اور شادی کے لیے دو ماہ کی چھٹی لے کر آیا تھا۔ یاسر کا ارادہ تو یہی تھا کہ بحرین واپس جاتے ہی خزران کو اپنے پاس بلالے' لیکن اماں نے خزران کی طبیعت کو دیکھتے ہوئے منع کر دیا۔ وہ امید سے تھی اور چونکہ پہلا بچہ تھا اس لیے اماں کو وہم لاحق ہو رہے تھے کہ وہ اکیلی کیسے رہ پائے گی۔ یوں فوری طور پر اس کا جانا کینسل ہو گیا۔

اور نو مہینے بعد جب رافع اس کی گود میں آیا۔ عین ان ہی دنوں میں عازم کا ملائشیا میں ایک سال پورا ہوا اور وہ پہلی چھٹی پر پاکستان آیا۔ گھر والے تو اسے پہچان ہی نہیں پائے۔ سنجیدہ اپنے بیٹے کی حالت دیکھ کر تڑپ اٹھیں۔ ایسے لٹے پٹے' شکست خوردہ' خاموش عازم کو انہوں نے کب یہاں سے رخصت کیا تھا۔

پہلا شک انہیں یہ لاحق ہوا کہ عازم کہیں نشے کی لت میں تو مبتلا نہیں ہو گیا۔ لیکن اپنی عمدہ تربیت کے مان نے انہیں ایسا سوچنے سے باز رکھا۔ وہ جان گئیں کہ عازم کی یہ حالت خزران کی شادی کے باعث ہوئی ہے۔

انہوں نے فضہ کے ساتھ مل کر اگلے ہی دن سے

لڑکی کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ عازم چونکہ دو ماہ کی چھٹی لے کر آیا تھا اس لیے وہ پُر یقین تھیں کہ کہیں نہ کہیں سلسلہ ضرور جم جائے گا۔ یوں قرعہ فال سارہ کے نام نکلا۔ سارہ کا تعلق غیر خاندان سے تھا۔ جلد شادی کرنے پر ان کی طرف سے زیادہ حیل و حجت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور عازم کے ملائشیا جانے سے بیس دن پہلے سارہ بیاہ کر ان کے گھر آ گئی۔ کزن کی حیثیت سے خزران نے بھی شادی میں شرکت کی۔

انسانی ذہن بھی اللہ تعالیٰ نے خوب بنایا ہے۔ انقلابی تبدیلیوں کی آمد سے پہلے تو انہیں سوچنا بھی ناممکنات میں سے لگتا ہے۔ لیکن وہی انقلابی تبدیلیاں جب وقوع پذیر ہو جاتی ہیں تو بڑی سہولت سے ذہن نہ صرف انہیں قبول کر لیتا ہے بلکہ بعض حالات میں ہم یہ بھی سوچنے لگ جاتے ہیں کہ "اب" جو ہوا' وہی ٹھیک ہے۔ خزران جو کبھی یہ سوچا کرتی تھی کہ شاید اب وہ زندگی بھر عازم کا سامنا نہیں کر پائے گی' بڑے ہی نارمل دل و دماغ سے ہر فنکشن میں شریک ہوئی۔ البتہ عازم کا شادی کے دوران جتنی مرتبہ بھی اس سے سامنا ہوا' وہ ایک سنجیدہ نگاہ اس پر ڈال کر رخ بدل گیا۔

عازم نے ملائشیا واپس جاتے ہی سارہ کو اپنے پاس بلوانے کی کوششیں شروع کر دی تھیں اور شادی کے تین ماہ بعد ہی وہ عازم کے پاس ملائشیا چلی گئی۔ ادھر ایک سال پورا ہونے پر یاسر بھی پاکستان آ گیا۔ خزران اس کی آمد پر بے حد خوش تھی لیکن جانے کیسے وہ ایک مہینہ پر لگا کر اڑ گیا۔ یاسر بھی واپس جاتے ہوئے بہت اداس تھا۔ خصوصاً" رافع کو چھوڑ کر جانا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ اس نے خزران سے وعدہ کیا کہ جاتے ہی وہ انہیں بلوانے کی کوشش کرے گا۔ خزران حد سے زیادہ پر امید تھی کہ جلد ہی وہ اور رافع یاسر کے پاس ہوں گے۔ لیکن یاسر نے واپس جاتے ہی کمپنی کی صورت حال اور اپنی جاب کے حالات کے بارے میں بتایا کہ فی الحال معاملات زیادہ ٹھیک نہیں چل رہے" کچھ دن بعد....

پھر یہ "کچھ دن بعد" کا سلسلہ طویل ہوتے ہوتے مزید ایک سال لے گیا اور یاسر دوسری چھٹی پہ پاکستان آ گیا۔ اور اس بار جب وہ گیا تو خزران ایک مرتبہ پھر امید سے تھی۔ یعنی اب تو کچھ کہنا ہی بے کار تھا۔ اور مناہل کی پیدائش کے بعد تو وہ مصروف اس قدر ہو گئی کہ سوچنے کا بھی وقت نہیں ملتا تھا۔ کچھ گزرے تین سالوں نے یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ اماں اس کے پردیس جانے کے حق میں نہیں تھیں۔ کیونکہ اس کے بحرین جانے سے یاسر کے اخراجات ایک دم سے بڑھ جاتے اور گھر بھیجی جانے والی رقم پر برے اثرات مرتب ہوتے۔

خزران نے یہ سب دیکھ سمجھ کر خاموشی اختیار کر لی اور یاسر کو اپنے بلوانے کے متعلق کہنا چھوڑ دیا۔ اب اس نے کیلنڈر سے دوستی کر لی تھی۔ جہاں یاسر کے آنے جانے اور پھر انتظار کے بے شمار دنوں کا حساب درج تھا۔ بلکہ یاسر کے پاس بحرین نہ جانے کا ایک فائدہ یہ ہو گیا کہ اس نے آگے پڑھائی جاری رکھی۔ شادی کو چھ سال گزر گئے۔

رافع پانچ سال کا اور مناہل تین سال کی تھی' جب پہلی مرتبہ معمول کے مطابق چلتی لگی بندھی زندگی میں پریشانی کی ہوا چلی۔ آصف بھائی کے ایک دوست کی بیوی سعدیہ ان کے گھر آئی تو اس نے اماں کو بتایا کہ اس نے یاسر کے متعلق کچھ سنا ہے۔ سعدیہ کا بھائی بحرین میں رہتا تھا۔ اس نے بتایا کہ یاسر وہاں کسی پاکستانی لڑکی میں انوالو ہے' بلکہ شادی بھی کرنا چاہتا ہے۔ اماں کو یقین تو نہیں آیا لیکن سعدیہ کو بھی وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔ وہ ایک پڑھی لکھی سوبر لڑکی تھی۔ بلاوجہ لگائی بجھائی کرنا اس کی فطرت نہیں تھی۔ اماں نے اسی شام خزران سے بات کی اور کہا کہ وہ صاف صاف یاسر سے اس بارے میں پوچھ گچھ کرے۔

خزران کی کیفیت بھی کچھ اماں جیسی ہی تھی۔ ایسے اچانک اتنی بڑی بات کا سامنے آنا کچھ ناقابل یقین سا لگ رہا تھا۔ پھر ابھی دو ماہ پہلے ہی تو یاسر چھٹی گزار کر گیا تھا۔ اس کے رویے اور محبت میں اس نے کہیں کوئی تبدیلی محسوس نہیں کی تھی۔ پھر بھی اس نے یاسر سے

بات کرلی لیکن ظاہر ہے کہ وہ صاف ٹال گیا اور بات آئی گئی ہوگئی۔ حتیٰ کہ مہینوں گزر گئے اور بات خزران کے دماغ سے بھی نکل گئی کہ اچانک ایک دن آصف بھائی کے نام یاسر کا خط آگیا۔ حالانکہ دونوں بھائی انٹرنیٹ اور فون کے ذریعے ایک دوسرے سے رابطے میں تھے' پھر بھی یاسر نے خط کا سہارا لیا۔ شاید وہ شرمندگی سے بچنا چاہ رہا تھا۔

اس نے لکھا کہ وہ قرۃ العین سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کا تعلق کراچی سے ہے لیکن وہ اپنے والدین کے ساتھ بحرین میں رہتی ہے۔ عینی مجھ سے شادی کی شدید خواہش مند ہے اور وہ خزران اور بچوں کو قبول کرنے کو بھی تیار ہے' لیکن اس کے والد ہرگز ایک شادی شدہ مرد کو داماد بنانے کو راضی نہیں ہیں۔ بالآخر بہت مشکلوں سے انہوں نے اس شرط پر شادی کی اجازت دے دی کہ میں اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دوں تب ہی عینی سے شادی کرسکتا ہوں۔۔۔ اور یاسر عینی کی محبت میں خزراں کو طلاق دینے کو تیار ہو گیا تھا۔

آصف بھائی کے ذمے اس نے یہ کام لگایا کہ وہ اماں کو بتادے اور خزران کو سمجھائے۔ آصف کو خط پڑھ کر شدید غصہ آیا اور یاسر کو فون کرکے کسی بھی قسم کے تعاون سے "قطعاً" انکار کردیا۔ اماں بھی سن کر سخت ناراض ہوئیں' کہ خزران اور بچوں کو بے قصور اتنی بڑی سزا دینا سراسر زیادتی ہے۔ خزران کا تو یہ حال تھا' کہ اسے یہ سب کچھ جھوٹ اور مذاق لگ رہا تھا۔ اس نے یاسر کو فون کیا کہ ابھی وہ ہنس کر کہہ دے گا کہ ڈیئر یہ سب مذاق تھا۔ لیکن وہ تو آگے سے رونے لگا۔

"میں بہت مجبور ہوگیا ہوں خزران! تم تو جانتی ہو' میں تم سے اور بچوں سے کتنا پیار کرتا ہوں۔"

"کک کیا بات ہے یاسر! کیسی مجبوری' پلیز کھل کر بتائیں۔" اس کے تو ہاتھ پیر ہی پھول گئے یاسر کو روتا دیکھ کر۔

"میں نے عینی کے باپ سے لاکھوں روپے کا قرض لیا تھا لیکن میرے حالات ابھی ایسے نہیں ہیں کہ رقم انہیں لوٹا سکوں۔۔۔ اور انہیں لگتا ہے کہ میں کسی بھی وقت جاب چھوڑ کر پاکستان بھاگ جاؤں گا اور واپس نہیں آؤں گا۔ وہ مجھے اب ہر طرح سے پھانس رہے ہیں۔"

"آپ نے قرض کیوں لیا یاسر اور۔۔۔ اور آپ کو وہاں روکے رکھنے کا حل شادی ہی کیوں۔۔۔ آپ ہم سے کہیں ناں' ہم یہاں رقم کا کوئی بندوبست کرتے ہیں۔" وہ سادگی سے اس کی دلجوئی کرنے لگی۔

"کچھ نہیں ہو سکتا خزران۔۔۔! یہ لوگ بہت ہوشیار ہیں۔ ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ میرے پاس فرار کی کوئی راہ نہیں۔۔۔ میں بہت بری طرح پھنس چکا ہوں۔۔۔" وہ ابھی بھی رو رہا تھا۔

"آپ واپس آجائیں یاسر۔۔۔ پلیز جاب چھوڑ کر جلد از جلد ہمارے پاس آجائیں۔" وہ رو رو کر اس کی منتیں کرنے لگی۔ لیکن ہوا یہ بس یہ کہ ایک ہفتے بعد یاسر کی طرف سے طلاق نامہ آگیا اور وہ ایسی بے وقوف تھی' شدید دکھ کی کیفیت میں بھی یہی سوچے جارہی تھی کہ پتا نہیں یاسر وہاں کن مجبوریوں کا شکار ہوگیا ہے' لیکن یاسر کے فریب کا پردہ بھی جلد ہی چاک ہو گیا۔

وہ طلاق کا کوئی بیسواں روز تھا۔ آصف بھائی کی بڑی بیٹی لاریب لیپ ٹاپ لے کر اوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی۔

"یہ دیکھیں خزران چچی۔۔۔ یاسر چاچو کی نئی دلہن۔" وہ تقریباً" دھکا دیتے ہوئے اس کے قریب آبیٹھی' اور لیپ ٹاپ اس کے سامنے کیا۔ خزران نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہ دیکھیں! یاسر چاچو نے اپنے فیس بک اکاؤنٹ پر ہنی مون کی نئی پکچرز اپ لوڈ کی ہیں۔"

مصر کے حسین مضافات میں وہ اپنی نئی دلہن کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے نہایت شاداں و فرحاں دکھائی دے رہا تھا۔ مسکراہٹ اس کے لبوں سے جدا ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کہیں وہ اسے اپنے ہاتھوں سے آئس کریم کھلا رہا تھا تو کہیں وہ لڑکی اس کے بازو سے چپکی کھڑی تھی۔

خوب صورت نقوش کی مالک وہ گوری سی لڑکی یاسر کو پا کر نہایت مسرور لگ رہی تھی۔ زندگی سے بھرپور۔ ان تمام تصاویر میں کہیں بھی یاسر افسردہ اور مجبوریوں کا مارا نہیں لگ رہا تھا۔

اس رات پہلی مرتبہ خزران نے اپنی اور یاسر کی شادی کی تصاویر پرزے پرزے کرکے ڈسٹ بن کے حوالے کیں۔ گزشتہ بیس راتوں سے جنہیں ہاتھ میں اٹھا کر وہ بین کیے جا رہی تھی۔ حالانکہ ان تصاویر کو سنبھال کر رکھنا ویسے بھی اب بے معنی تھا۔ وہ سے اپنی زندگی سے نکال چکا تھا۔ اب وہ اس کی کچھ نہیں لگتی تھی۔ دل نے تسلیم کر لیا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ ہار، لیکن اب پچھلے پانچ' چھ ماہ کے دوران نہیں کم ہوئی تھیں تو اس کی بے چینی اور شدید احساس محرومی۔ وہ رات رات بھر جاگ کر سوچتی کہ کہاں کمی رہ گئی تھی' خوب صورتی' تعلیم' اچھی عادات' یاسر کے لیے محبت' اولاد' سب کچھ تو تھا پھر کیوں۔۔۔؟

لیکن عازم کے دو ہی جملوں نے ایسا زوردار اثر کیا کہ ذہن پر پڑی جمود کی گرد ہٹنا شروع ہو گئی تھی۔ اسے کیسے پتا چل جاتا ہے ہر بات کا۔۔۔ جب اس نے کہا کہ "کلو اس احساس سے کہ یاسر نے تم سے بے وفائی کی ہے۔۔۔ چھوڑ دو تکیے بھگونا اور لوگوں کی ہمدردیاں بٹورنا تو خزران نے نہایت شرمندگی محسوس کی۔۔۔ صحیح تو کہتا ہے' جو ہو چکا وہ بدل نہیں سکتا' پھر کیوں وہ سوچ سوچ کر بلاوجہ اپنا اور بچوں کا نقصان کر رہی ہے' جبکہ یاسر وہاں دونوں ہاتھوں سے زندگی کی خوشیاں سمیٹ رہا تھا۔

صبح کی نماز پڑھنے کے بعد وہ کتنی ہی دیر جائے نماز پر گم صم بیٹھی رہی۔

"کتنی بڑی بے وقوف ہوں میں۔" خود پر ہنستے ہوئے جانے کہاں سے دو آنسو بہہ کر گال پہ اتر آئے۔ انہیں صاف کرتے کرتے وہ زار و قطار ہچکیوں سے رونے لگی۔ دیر تک رونے سے دل کا کتنا غبار ہلکا ہو گیا۔ وہ جائے نماز لپیٹ کر کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔

جنید بھائی نے یوں تو ہمیشہ اس کا بہت خیال رکھا تھا لیکن امی' ابو کے گزر جانے کے بعد تو انہوں نے خزراں کو اپنی ذمہ داری سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ ہمیشہ ہر خوشی' غم' عید' برات کے موقع پر جتنا ان سے بن پڑا' انہوں نے بہن کے لیے کیا۔ سمیعہ بھی شروع سے یہی دیکھتی آ رہی تھیں کہ باوجود اپنے محدود وسائل کے جنید نے کبھی بہن کے معاملے میں کمی نہیں آنے دی۔

لیکن بہن۔۔۔ اس نے کیا کیا تھا آج تک۔۔۔ ہمیشہ سسرالیوں کو خوش کرنے کے جتن کرتی رہی۔۔۔ لین دین کی لسٹ سے اس نے بھائی کو قطعی طور پر خارج سمجھا ہوا تھا۔ کبھی بھائی' بھابی یا بھتیجیوں کے لیے کوئی معمولی سا تحفہ بھی نہیں لیا تھا۔ عازم نے احساس دلایا تو خزراں خود کو کوس کوس کر تھکنے میں نہیں آ رہی تھی۔ ناشتا بنانے اور کرنے کے دوران بھی وہ ایسی ہی سوچوں میں گم تھی۔

"خزران پلیز! تم ذرا یہاں بیٹھ جاؤ۔ مجھے آصف کے سلائس پر مکھن لگانا ہے۔" لبنیٰ بھابھی نے آہستہ آواز میں کچھ جتانے کے سے انداز میں درخواست کی تو وہ چونکی۔ بے دھیانی میں جانے کب وہ آصف بھائی کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور اماں کے پاس جا بیٹھی۔

"مناہل کو ڈاکٹر کے پاس کب لے جانا ہے؟ میں ابھی آدھے گھنٹے تک ایک ضروری کام سے باہر جاؤں گا۔" آصف نے براہ راست اسے مخاطب کیا' جواب ابھی اس کے منہ میں تھا کہ لبنیٰ بھابھی بول پڑیں۔

"کوئی بات نہیں آصف! آپ جائیں۔۔۔ خزران کے ساتھ میں چلی جاؤں گی۔ ویسے بھی اتنی صبح ڈاکٹر کہاں آتے ہیں۔ کیوں خزران۔۔۔؟"

"جی بھابھی۔۔۔!" وہ مختصر جواب دے کر مناہل کو کھانا کھلانے لگی۔

"تو تم یہاں بھی درست تھے عازم! جانے میں کس دنیا میں رہتی ہوں۔ لبنیٰ بھابھی کے ایسے جملوں سے تو میرا روز واسطہ پڑتا ہے۔ لیکن اس نہج پر کبھی سوچا ہی نہیں۔ کیا لبنیٰ بھابھی کے مستقل سر درد کی وجہ میں

ہوں...؟" انہیں یہ مسئلہ ڈیڑھ دو ماہ پہلے شروع ہوا تھا۔ "تو کیا وہ میری یہاں موجودگی سے پریشان ہیں؟"
خزراں چند اور سوالات کا بوجھ لیے ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ گئی۔
کمرے میں آکر اس نے سب سے پہلے اپنا پرس کھنگالا' لیکن وہاں سے برآمد ہوئے بس ڈھائی' تین ہزار۔ اماں کے ہاتھ پر پوری تنخواہ رکھنے کے بعد وہ صرف اپنی ضرورت کی رقم ہی پرس میں رکھا کرتی... اس نے تھوڑی دیر کچھ سوچا' پھر الماری سے چیک بک نکال کر پرس میں ڈالی۔ طلاق سے پہلے چونکہ یاسر اسے ہر مہینے الگ سے رقم بھیجا کرتا تھا۔ اس لیے وہ اپنی تنخواہ بینک سے نکلواتی ہی نہیں تھی۔ کم از کم پانچ' چھ ماہ کی تنخواہ اس کے پاس اب بھی محفوظ تھی۔
بچوں کو تیار کرنے کے بعد اس نے اپنے لیے بھی ایک اچھا سوٹ نکالا۔ لبنیٰ بھابھی سے اس نے کہہ دیا' کہ وہ کچھ دیر کے لیے جنید بھائی کے گھر جائے گی۔ انہوں نے تو جان چھوٹ جانے پر ویسے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔ خزراں اماں کو بتانے ان کے کمرے میں چلی گئی۔
مناہل کو کچھ دن سے اسکن الرجی کا مسئلہ شروع ہوا تھا۔ پہلے اسے ڈاکٹر کو دکھایا' پھر مارکیٹ سے جنید بھائی' سمیعہ بھابھی اور سندس' یسریٰ کے لیے شاپنگ کی۔ جوش محبت ایسا غالب تھا کہ اس نے پوری رقم اڑا دی۔
جنید بھائی کے گھر بنا اطلاع آکر انہیں حیران کرنے کی کوشش کی' لیکن وہاں عازم کو بیٹھے دیکھ کر خود حیران ہو گئی۔ وہ سب اس وقت باہر صحن میں بیٹھے تھے۔ خزراں نے شاپنگ بیگز بھابھی کو تھمائے اور خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔ بچے البتہ سندس اور یسریٰ کو ڈھونڈتے اندر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ سمیعہ بھابھی سامان رکھنے اندر گئیں تو جنید بھائی بھی ان کے پیچھے چلے گئے۔ شاید اس کی خاطر مدارت کے سلسلے میں۔
"تم کب آئے؟" خزراں نے تنک کر اسے گھورا تو وہ دبی دبی مسکراہٹ لیے اسے دیکھنے لگا۔

"آج لگ رہی ہو پروفیسر صاحبہ۔ ویسے خوشی ہوئی تمہیں یہاں دیکھ کر۔" وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔
"تم کیوں خوش ہو رہے ہو۔ میرے بھائی کا گھر ہے۔ اکثر ہی آجاتی ہوں۔" وہ خوامخواہ صفائی دینے لگی۔
"ہاں ابھی یہی بتا رہا تھا جنید کہ میڈم کی صورت دیکھنے کو بھی ترس جاتے ہیں۔" اس نے نہایت شوخی بھرے لہجے میں اسے مزید چڑایا۔ پچھلی رات کی ڈانٹ پھٹکار اور غصے کا شائبہ تک نہیں تھا۔
"تم نے کوئی بات تو نہیں کی بھیا سے؟" وہ ایک دم گھبرا گئی۔
"کون سی بات؟" وہ ہنسنے لگا۔
"وہی جو تم کہہ رہے تھے کہ میرے یہاں رہنے کی بات ان سے کرو گے۔" وہ دھیمی آواز میں سرگوشی کرنے لگی۔
"ارادہ تو تھا' لیکن اب لگتا ہے ضرورت نہیں پڑے گی۔" وہ ہنسا تو خزراں بری طرح شرمندہ ہو گئی۔
"تمہیں گھر میں آرام نہیں آتا... خاندان بھر کی ٹوہ لیتے پھر رہے ہو؟"
"غصہ کرتی ہو تو تم سے بہت اپنی اپنی لگتی ہو۔" وہ آنکھوں میں چمک لیے پھر تنگ کرنے لگا۔ خزراں مزید غصہ کھا گئی۔
"اور جب تم ہنستے ہو نا تو زہر لگتے ہو۔" وہ پاؤں پٹختی اندر کی طرف بڑھ گئی۔ پیچھے عازم کا بھرپور قہقہہ بلند ہوا۔

☼ ☼ ☼

وہ جب سے جنید بھائی کے گھر سے آئی تھی' عجیب مخمصے کا شکار تھی۔ سمیعہ بھابھی تو چند ایک چھوٹے موٹے تحائف پاکر ہی اس قدر ممنون ہو گئی تھیں کہ ان کا لہجہ' برتاؤ' خاطر مدارت سب میں اس روز واضح تبدیلی آئی تھی۔ زبردستی اسے رات کے کھانے پر بھی روک لیا۔ خزراں ان سب کے لیے جو ڈریسز لے گئی تھی بھابھی ایک ایک چیز کی تعریف کیے جا رہی

تھیں۔

عازم سے گفتگو کے بعد ویسے تو مسلسل وہ اس نہج پر سوچ رہی تھی کہ اب اسے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ بھابھی کی طرف سے اچھے رسپانس کے بعد تو وہ جلد از جلد اسے عملی جامہ پہنانے کا سوچنے لگی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اماں اور آصف بھائی سے کس طرح بات کرے۔ زندگی نے ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا تھا کہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اسے سو مرتبہ سوچنا پڑتا تھا۔

کمرے میں یہاں سے وہاں چکر کاٹتے اس نے بے شمار جوں سوچ ڈالے۔ لیکن کسی بھی نتیجے پر پہنچنے میں سخت کنفیوژن محسوس کی۔ عازم سے بات کیے بنا چارہ نہیں تھا۔ لیکن وہ بے شرم... بولتا بہت ہے۔ خزران نے تین مرتبہ موبائل اٹھا کر واپس رکھ دیا۔ بچے سونے کے لیے آئے تو انہیں تھپکیاں دیتے بالآخر کال ملانے کا مضبوط ارادہ کرلیا۔

"اہے نصیب..." بنا سلام دعا عازم نے شوخی سے آغاز لیا۔

"سارہ کہاں ہے؟" وہ پریشان ہوگئی کہ عازم کے شوخ معنی خیز لہجے سے سارہ کچھ اخذ نہ کرلے۔

"ارے وہ تو اپنی سرزمین پر لینڈ کرتے ہی ہفتہ دس دن کے لیے میکے رخصت ہوجاتی ہے۔ آخر وہاں جاؤ بھی تو خوب کیے جاتے ہیں۔" وہ ہنسا تو خزران نے پہلا سکون کا سانس لیا۔

"پھپھو کے گھر سے کب آئے تم لوگ؟"

"ہاں... اماں کے گھر تو دو ہی دن رہے۔ پھر سارہ اپنی امی کے گھر چلی گئی اور میں یہاں کی صفائی وغیرہ میں مصروف ہوگیا۔ ابھی پچھلے تین دنوں سے اپنے گھر میں ہوں۔" وہ اب سنجیدگی سے بات کرنے لگا تھا۔ خزران نے بھی سہولت محسوس کی۔

"عازم! مجھے تم سے مشورہ کرنا تھا۔"

"ہوں... ہوں... کہو۔"

"مجھے لگتا ہے تم صحیح کہہ رہے تھے۔ اب مجھے بھیا کے گھر آجانا چاہیے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا ان سب سے بات کا آغاز کیسے کروں۔"

"صاف لفظوں میں کہہ دو کہ میرا یہاں رہنا اب مناسب نہیں۔" عازم قدرے حیران ہوا اس کی سوچ بچار پر۔

"ایسا تو میں شروع شروع میں کہہ چکی ہوں۔ یہ لوگ زبانی بہت ہمدردی جتاتے ہیں۔ بچوں سے ایسی شدت کی محبت ظاہر کرتے ہیں کہ مجھے کچھ بھی بولنے کی ہمت نہیں ہوتی۔"

"تو تم بھی یہ سمجھتی ہو کہ ان کے دلوں میں کچھ اور ہے اور لبوں پہ کچھ اور۔"

عازم کو خوشی ہوئی جان کر کہ خزران حقیقت کا ادراک رکھتی ہے۔ وہ تو سمجھ رہا تھا شاید ایسوں کے ہاتھ بے وقوف بن رہی ہے۔

"سب سمجھتی ہوں عازم! سات سال گزارے ہیں ان کے ساتھ۔ میں تو بس سمعیہ بھابھی کے رویے کی وجہ سے مجبور تھی۔ وہ گتھی تم نے اتنی آسانی سے سلجھا دی۔ اب تو ایک ایک لمحہ یہاں گراں گزر رہا ہے۔ ہاں البتہ علیحدگی کے فوراً بعد ان سب نے مجھے بہت سپورٹ کیا۔ طلاق کے فوراً بعد کا کچھ عرصہ میں نے انتہائی تکلیف اور اذیت میں گزارا۔ مجھے لگتا تھا میں اپنے آپ کو مار ڈالوں گی یا مجھے برین ہیمبرج ہوجائے گا۔ یہ سوچ ہی بہت اذیت ناک تھی کہ یاسر سے ہمیشہ کے لیے ہر رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔ اس کی بے وفائی اور بے حسی مجھے ایک ڈراؤنا خواب لگتی تھی۔ دل ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتا تھا کہ اس کا دل میری اور بچوں کی محبت سے خالی ہوچکا ہے۔ اماں اور آصف بھائی فون پر یاسر سے جھگڑا کرتے۔ صاف الفاظ میں اسے کہتے کہ اب وہ اس سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔ مجھے ہر طرح کی تسلی دی کہ کبھی مجھے بے سہارا نہیں چھوڑیں گے۔ ان ہی سب باتوں کی وجہ سے میں ان کی ممنون ہوتی چلی گئی۔ تنخواہ اماں کے ہاتھ پہ رکھنے کا فیصلہ بھی اس لیے کیا کہ اب میں یہاں کی کسی چیز پر اپنا حق محسوس نہیں کرتی۔ لیکن مجھ سے ہمدردی کا یہ رویہ بس مہینہ ڈیڑھ کی بات ثابت ہوئی۔ یاسر سے

ان سب کی فون پر بات ہوتی رہتی تھی۔ وہی بار بار فون کر کے جانے کیا کچھ کہتا رہتا تھا۔ شاید معافی مانگی ہو یا خود کو صحیح ثابت کرنے کے دلائل دیے ہوں۔ بہر حال جو بھی ہوا۔ پچھلے تین' چار ماہ سے میں تو یہی دیکھ رہی ہوں کہ نہ میرے بچوں کا ٹھیک سے خیال رکھا جاتا ہے' نہ ہی میری کسی بات کو اب یہاں کوئی اہمیت دی جاتی ہے۔ یاسر کے خلاف بولنا بھی سب بند کر چکے ہیں۔"

"پھر تو تمہیں بہت پہلے یہاں سے چلے جانا چاہیے تھا' کیوں اتنے مہینوں سے ان سب کے برے رویے سہہ رہی تھیں۔" وہ ایک بار پھر حیران ہو گیا۔

"یہ سب اتنا آسان کہاں ہے۔" وہ خاصی بے چارگی سے بولی' جس پر عازم مزید تپ گیا۔

"اچھا اور جتنی آسانی سے تمہاری ہنستی بستی زندگی تباہ ہوئی' اس کے متعلق کیا کہو گی اسٹوپڈ لڑکی۔۔۔ ایسی بے چاروں اور مظلوموں والی باتیں کرتی مجھے سخت بری لگتی ہو۔ اتنی ہی بے بس اور لاچار ہو تو جلا دو اپنی ڈگریاں اور لات مارو نوکری پر۔۔۔ تمہیں تو چاہیے تھا پہلی فرصت میں کہیں الگ کوئی گھر یا فلیٹ لے کر اپنے بچوں سمیت وہاں شفٹ ہو جاتیں۔ کیا تم الگ رہنا افورڈ نہیں کر سکتیں؟" وہ پھر اس کی کلاس لینے لگا۔

"بچوں کا کیا کرتی۔۔۔ مجھے تو کالج جانا ہوتا ہے۔ روز یہاں سے شیخوپورہ جاتی اور آتی ہوں۔۔۔ اتنا ٹائم ہو جاتا ہے۔" وہ منمنائی۔

"کیا میڈ کا کال پڑ گیا ہے شہر میں۔۔۔ گھر تو کر ہی سکتی ہو' ذاتی گاڑی بھی رکھ سکتی ہو' لیکن جاہلوں کی طرح ساری رقم ان ناقدروں کے ہاتھ پہ دھر کے ماسیوں جیسے حلیے میں ان کی نوکریاں دے رہی ہو اور یہ جو شیخوپورہ سے روزانہ لیٹ آنے کا رونا رو رہی ہو تو محترمہ! روزانہ لاہور والوں کو اپنا چہرہ کرانا بہت ضروری ہے کیا۔ یا بنا آپ کے آئے یہاں سورج غروب نہیں ہوتا۔ بھئی! وہاں ہاسٹل ہو گا' اسٹاف کے لیے کوارٹرز ہوں گے اور بھی ٹیچرز رہتی ہوں گی۔ بچوں کو اپنے ساتھ رکھو اور آرام سے سیٹ ہو جاؤ۔" وہ اسے مختلف حل بتاتے بتاتے پھر طیش میں آ گیا۔

"یقین نہیں آتا' تم وہی خزران ہو جو کالج کے اسٹیج پر دھواں دھار تقریر کرتے ہوئے مائیک توڑ دیا کرتی تھی۔" وہ اسے لتاڑنے لگا اور خزران خاموشی سے اس کی پھٹکار سنے گئی۔

"جانتی ہو خزران! جب میں کبھی نیوز میں سنتا یا پیپر میں پڑھتا کہ ایک عورت نے غربت کے ہاتھوں تنگ آ کر بچوں سمیت نہر میں چھلانگ لگا دی یا پیٹرول چھڑک کر خود کو آگ لگالی' زہر کھالیا۔۔۔ تو دونوں طبیعت بوجھل رہتی۔۔۔ الفاظ سوتے جاگتے میرے کانوں میں گونجتے رہتے اور میں یہی سوچتا کہ کیوں اس نے اپنی اور بچوں کی زندگی اپنے ہی ہاتھوں اتنی آسانی سے ختم کرلی۔۔۔ کیا اس کے پاس اور کوئی حل نہیں تھا۔ کسی کے گھر کام کر لیتی' کہیں مزدوری کر لیتی۔ بچوں کا پیٹ بھرنے کی خاطر ہاتھ ہی پھیلا لیتی۔ چلو بہت غیرت مند تھی اور بھیک مانگنا گوارا نہیں تھا تو ایدھی ہوم سینٹر میں بچوں کو چھوڑ آتی۔ لیکن غیرت مند کہاں تھی۔ خود بھی حرام موت مر گئی اور بچوں کا قتل بھی سر پر لے لیا۔۔۔ کیوں کر لیتے ہیں لوگ ایسے بے رحم فیصلے۔۔۔ پر اب تمہیں دیکھ کر سوچتا ہوں' شاید وہ عورتیں ٹھیک تھیں۔۔۔ ان پڑھ' غربت میں پلی عورت اور کر بھی کیا سکتی ہے۔ جب تم جیسی اعلا تعلیم یافتہ' برسر روزگار عورت کا یہ حال ہے تو جو جی میں آئے حوا کی بیٹیو! کرو۔ سب جائز ہے۔" وہ بولنے پہ آیا تو بے تکان بولے چلا گیا۔ خزران لب چبائے اپنے آنسو پینے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن بہت مشکل تھا۔ بے لگام آنسوؤں کی لکیر گردن تک بہہ آئی۔ وہ کانپتے ہاتھوں سے اپنا چہرہ صاف کرنے لگی۔

"تم اس وقت کہاں تھے عازم! جب مجھ پر اتنی بڑی قیامت گزری' میں بہت اکیلی ہو گئی تھی۔"

وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ عازم نے کرب سے ہونٹ کاٹے۔ خزران کا رونا اس کا دل چیر رہا تھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ تمہاری تکلیف نیزے کی طرح دل کے آر پار ہوئی تھی۔ لیکن خاموش رہا۔ خزران کا درد بانٹنے

کو تو وہ اب بھی جی جان سے حاضر تھا' لیکن زبانی ایک جملہ بھی ادا کرنا سراسر اس سے دشمنی کرنے کے مترادف تھا' کیونکہ یہی ہمدردی کے بول سن سن کر تو گزشتہ پانچ چھ ماہ سے وہ مظلومیت کی چادر اوڑھے بیٹھی تھی۔ اگر وہ بھی یہی سب کچھ کرنے لگتا تو کون سمجھاتا اسے کہ نہ وہ مظلوم ہے نہ کمزور۔

"خود کو سنبھالو خزران... اور سنو! یہاں سے جانے کا ایک سیدھا ساحل ہے میرے پاس... سن رہی ہو نا؟"

"ہوں..." خزران نے دھیان اس کی طرف لگایا۔

"پہلے جنید سے بات کرو' اسے کہو کہ میں اب آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ پھر اسے سمجھاؤ کہ وہ تمہاری ساس کے پاس آئے اور انہیں کہے کہ لوگ خزران کے یہاں رہنے پر بہت باتیں بنانے لگے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اب وہ مزید یہاں رہے۔ لہٰذا وہ تمہیں لینے آئے ہیں۔ کیا کہتی ہو؟"

"ہاں... یہی صحیح ہے... میں پہلے بھیا سے بات کرتی ہوں۔" اس نے ایک دم اپنے اندر سکون اترتا محسوس کیا۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ سو طرح کے جملے اور مکالمے رٹنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اماں سے اس طرح بات شروع کروں گی' پہلے یہ کہوں گی' پھر وہ کہوں گی... عازم نے جو حل بتایا اس کے مطابق تو اماں سے براہ راست بات کرنے کا مسئلہ ہی ختم ہو گیا۔ جانے اس کا اپنا دماغ کیوں بند ہو کر رہ گیا تھا۔

"دو باتیں میری یاد رکھنا... پہلی یہ کہ جب تک اس گھر میں ہو' یاسر کی یادوں سے جڑی رہو گی' جو کہ اب سراسر نقصان کا سودا ہے۔ جوں ہی جگہ تبدیل ہوگی' نہ صرف دماغ کھلے گا' بلکہ پوزیٹو خیالات آنا شروع ہوں گے۔ مثبت سوچوں کو اپنے اندر جنم دو... ابھی جینے کے لیے بہت کچھ ہے۔ میں نے شاید تم سے زیادہ دنیا دیکھ لی ہے۔ یہاں زخموں پہ مرہم بھی پیسوں سے رکھا جاتا ہے۔ رکھ رکھاؤ' میل جول' رسموں رواجوں اور رشتے ناتوں کے سب کھیل آج صرف پیسے سے چلتے ہیں اور تم نے بہت حد تک اس سے نہ صرف نبھا کر لیا ہے' بلکہ بہت سہولت سے اسے اپنی زندگیوں میں شامل کر لیا ہے۔ تمہارے لیے شاید یہ نئی بات ہو' لیکن اسی سے تمہاری اور تمہارے بچوں کی خوشیاں جڑی ہیں۔ انسانوں سے امیدیں وابستہ کرنے کا خیال ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دو۔ تمہارا اچھا برا سوائے تمہارے کوئی نہیں سوچ سکتا اور امید... صرف اللہ سے۔ رکھو... سن رہی ہو نا۔" عازم کو اس کی طویل خاموشی پر تشویش ہوئی۔

"ہاں..." وہ ہلکا سا ہنسی۔ "تمہارے آخری جملے سے پہلے تم سے امید لگائے بیٹھی تھی۔ تم نے پل میں وہ مان چھین لیا۔"

"اوہ..." عازم شرمندگی سے ہنس پڑا۔ "میں تو بھئی فلسفہ جھاڑ رہا تھا۔ بولو کیا کام ہے؟"

"چھوڑو' پھر کبھی بتاؤں گی۔" اس نے فون رکھ دیا۔

"ارے... سنو تو..." بات اس کے منہ میں رہ گئی۔ پھر اس نے بھی موبائل ایک طرف پہ رکھ دیا۔

☆ ☆ ☆

عازم نے واقعی سچ کہا تھا۔ بھیا کے گھر آکر ذہن ایک دم دوسرے کئی معاملات کی طرف ایسے منتقل ہوا کہ دنوں اس کے پاس کچھ سوچنے کا جیسے وقت ہی نہیں رہا۔

جنید بھائی نے اس کے کہنے کے مطابق یاسر کے گھر والوں سے بات کی اور اگلے ہی دن اسے اپنے گھر لے آئے۔ وہ آخری رات خزران نے اپنے کمرے میں بہت تکلیف میں کاٹی۔ کمرے کی ایک ایک چیز یاسر کی یادوں سے جڑی تھی۔ وہ کمرا جہاں وہ بیاہ کر آئی تھی۔ سوچا نہیں تھا' ایک دن وہاں سے ایسے حالات میں جانا پڑے گا۔ یاسر کی اس کے لیے محبت' بچوں سے والہانہ لگاؤ' دونوں کی آپس کی انڈر اسٹینڈنگ' کبھی کسی بات نے ایک لمحے کے لیے بھی اس وہم میں نہیں ڈالا کہ یاسر بدل سکتا ہے۔ وہ بھی شادی کے محض سات سال بعد... پتا نہیں لوگ کیوں کہتے ہیں کہ اولاد میاں' بیوی کے رشتے کو مزید مضبوط کرتی ہے۔ یاسر

نے تو بچوں کا بھی نہیں سوچا۔ وہ اگلے ہی روز بمع سازو سامان بھیا کے گھر آگئی۔ وہ سامان جو بھیا اور ابو نے اس کی شادی کے موقع پر بڑے پیار سے بنوایا تھا۔ خزران نے چند دن کے اندر سب بیچ کر رقم بھیا کے حوالے کردی۔ جنید بھائی کے گھر جیسے اس نے نئی زندگی کی شروعات کیں۔ سمیعہ بھابھی کے ہاتھ پر اس نے یہ کہہ کر تنخواہ رکھی کہ۔۔۔

"بھابھی! یہ پیسے آپ کہیں سنبھال کر رکھ لیں۔ میرے پاس کوئی محفوظ جگہ نہیں ہے۔" اور ہفتے بھر بعد اس میں سے آدھی رقم لیتے ہوئے نہایت سلجھے طریقے سے کہہ دیا۔

"باقی رقم آپ استعمال کرلیں بھابھی! اب میں اور بچے آگئے ہیں تو ظاہر ہے اخراجات بڑھ جائیں گے۔"

"لیکن یہ رقم تو بہت زیادہ ہے۔" سمیعہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"کوئی بات نہیں بھابھی! پیسہ تو کام ہی آتا ہے۔ جو رقم گھر کے خرچ سے بچ جایا کرے، آپ خود رکھ لیا کریں۔ میں نے اپنے استعمال کی رقم لے لی ہے۔"

اس نے نرمی سے بھابھی کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا تو سمیعہ مارے خوشی کے کچھ بول ہی نہیں پائیں۔

بہت سارے دن گزر گئے تھے۔ صبح کالج جانے کے لیے تیار ہوکر نکلتی تو ناشتا تیار ہوتا۔ کالج سے واپس آتی تو بچے نہا دھو کر کھانا بھی کھاچکے ہوتے اور اکثر جنید بھائی کی بیٹیوں کے ساتھ آرام سے بیٹھے کارٹون دیکھ رہے ہوتے۔ وہ سخت شرمندہ ہوکر شام کے کام بھابھی سے لینے کی کوشش کرتی، لیکن وہ اسے منع کردیتیں۔

"یہ سب میرے روٹین کے کام ہیں خزران! تمہارے آنے سے کوئی ایکسٹرا بوجھ نہیں پڑا۔"

"لیکن بھابھی! سارا دن کام میں جتے رہنا بھی ٹھیک نہیں۔۔۔ مجھے نہیں لگتا آپ کو ریسٹ ملتا ہے پھر میں بھی آپ کی ہیلپ نہیں کرپاتی۔ آپ کہیں تو ہم کوئی کام والی رکھ لیں۔" خزران نے چند دن میں ہی نوٹ کرلیا کہ بھابھی بہت کام کرتی تھیں۔

"کام والی۔۔۔" سمیعہ نے حیرت سے زیر لب دہرایا۔

"ٹھیک ہے۔ کوکنگ وغیرہ تو میں خود ہی کروں گی۔ بس یہ جھاڑو، پوچا کوئی اور لے لے تو بیچ میں بہت آرام مل جائے گا۔"

سمیعہ نے بھروسے مند کام والی کا بندوبست خود ہی تین روز کے اندر کرلیا۔ خزران نے اس طرف سے سکون کا سانس لیا۔ یہ سب کرنے کے پیچھے اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ شروع دن سے بھابھی کے ساتھ جیسے اچھے حالات آرہے ہیں۔ وہ فضا قائم رہے اور چھوٹے موٹے مسائل اس تعلق پر اثر انداز نہ ہوں۔ شام کے وقت بچوں کو پڑھانے کی ذمہ داری بھی اس نے خود اٹھالی۔ رافع اور مناہل کے ساتھ ساتھ وہ یسری اور سندس کو بھی پڑھانے لگی۔ اس سے بھی سمیعہ کو کافی آرام مل جاتا۔ جنید بھائی بھی اس کے آجانے سے بہت خوش تھے۔ ایک دن شام کی چائے پیتے ہوئے اسے کہنے لگے۔

"تمہارے آنے سے گھر کا وہی پرانا ماحول تازہ ہوگیا۔ امی ابا کی یاد آجاتی ہے۔"

ابا کا انتقال خزران کی شادی کے ڈیڑھ سال بعد اچانک دل کی تکلیف کے باعث ہوا تھا اور امی ان کے گزرنے کے بعد ایک سال ہی زندہ رہیں۔ قسمت کے فیصلوں کو واقعی کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ اگر ابا ایک، ڈیڑھ سال اور اس کی شادی کی جلدی نہ کرتے تو آج وہ عازم کی بیوی ہوتی، لیکن زندگی ہمارے بنے تلے اصولوں کے مطابق کہاں چلتی ہے۔

ابا کی وفات کے بعد دکانوں کو مارکیٹ بنانے کا منصوبہ خود ہی دھرا رہ گیا تھا۔ جنید نوکری والا بندہ تھا۔ نہ اس کے پاس مارکیٹ بنانے کے لیے وقت تھا اور نہ پھوپھا، پھپھو سے تعلقات بگاڑنے کا کوئی ارادہ۔۔۔ عرفان اور عازم کے ساتھ بحیثیت کزن نہایت اچھے دوستانہ تعلقات تھے۔ وہ انہیں بھی قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے دکانیں کرایہ پر ہی رہنے دیں اور پھوپھا اپنی دکان پر اپنا کاروبار چلاتے رہے۔

✲ ✲ ✲

کالج کی چھٹی ہوگئی تھی۔ وہ گھر واپسی کے لیے روانہ ہوئی۔ شہر پہنچی تو تین بج چکے تھے۔ اس نے پہلے بینک جانے کا ارادہ کیا۔ سمیعہ بھابھی کو فون کر کے اس نے بتادیا کہ ذرا لیٹ گھر پہنچے گی۔ بینک پہنچ کر ابھی وہ پارکنگ کے لیے جگہ ڈھونڈ رہی تھی کہ اے ٹی ایم مشین کے سامنے کچھ ہنگامہ نظر آیا۔ خزران نے گاڑی کا شیشہ نیچے کر کے سمجھنے کی کوشش کی۔ تب ہی نظر عازم پر پڑی۔ دو پولیس والے اسے کھینچتے ہوئے پولیس وین کی طرف لے جارہے تھے اور وہ لنگڑا کر چلتے ہوئے تقریباً گھنچا جارہا تھا۔ لوگوں کی اچھی خاصی بھیڑ ان کے پیچھے تھی۔ خزران بجلی کی سی تیزی سے باہر نکل کر ان کی طرف بڑھی۔

"کیا ہوا عازم! کیا بات ہے آفیسر۔" وہ بالکل وین کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ عازم نے اسے دیکھ کر سکون کا گہرا سانس لیا اور نیچے بیٹھتا چلا گیا۔

"کون ہیں آپ؟" پولیس والے نے اسے بری طرح نظرانداز کرنے کی کوشش کی۔

"میں کالج کی پروفیسر ہوں۔ یہ میرے کزن ہیں اور ایک شریف شہری ہیں۔ آپ انہیں اس طرح کیوں لے جارہے ہیں۔ معاملہ کیا ہے؟" خزران نے قدرے رعب سے تعارف کرایا۔

"یہ شریف آدمی اے ٹی ایم سے رقم چرا کر بھاگ رہا تھا۔" پولیس والے نے اپنا کیس مضبوط کرنے کی کوشش کی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" خزران بری طرح بگڑی۔ "بولو عازم! کیا معاملہ ہے۔" وہ نیچے کو جھکی لیکن عازم چپ رہا۔ گھٹنے کی چوٹ شاید اسے کافی تکلیف پہنچا رہی تھی۔ دو، تین لوگ مجمع میں سے آگے نکلے۔

"باجی! یہ آدمی بے قصور ہے۔ لیکن یہ پولیس والے ہماری بات ہی نہیں سن رہے۔ ادھر آؤ بابا جی۔" انہوں نے ایک بزرگ کو پیچھے سے نکالا۔ "یہ آدمی مشین سے پیسے نکال رہا تھا۔ تب ہی دو لڑکے اندر گھسے اور اس بوڑھے آدمی سے رقم چھیننے لگے۔ ان صاحب نے دیکھا تو فوراً اندر گھسے اور اس بوڑھے آدمی کو ڈاکوؤں سے چھڑانے لگے۔ تب ہی یہ دو پولیس والے آگئے اور انہوں نے سمجھا کہ رقم چھیننے والے لوگ تین ہیں۔ وہ دو اصل مجرم تو بھاگ گئے۔ انہوں نے اسے پکڑلیا۔" اس لڑکے نے ہمت کر کے تفصیل بتائی تو پولیس والے شرمندگی سے بغلیں جھانکنے لگے۔

"چھوڑیں اسے۔۔۔" خزران نے غصے سے پولیس والے کو دیکھا اور سہارے سے عازم کو اٹھانے کی کوشش کی۔ ایک دو اور بھی مدد کو آپہنچے اور عازم کو خزران کی گاڑی تک پہنچایا۔

"بنا تصدیق مارنا بھی شروع کردیا۔ کم از کم لوگوں کی سن تو لیا کریں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ عازم کو لڑکوں نے فرنٹ سیٹ پر بٹھا دیا تھا۔ خزران نے گاڑی دوبارہ روڈ پر ڈالی۔

"کیا ضرورت تھی دوسروں کے معاملے میں پڑنے کی اگر خدانخواستہ ان کے پاس پسٹل ہوتا تو۔۔۔"

"پسٹل تو دونوں کے پاس تھے۔ لیکن چلانے میں اناڑی تھے۔" وہ ہنسا۔

"تو کیا انہوں نے فائر بھی کھولا تھا؟" خزران کا دل لحظے کو ڈوب سا گیا۔

"ہاں۔۔۔ ایک لڑکے نے گولی چلائی تھی۔ دروازے کا شیشہ ٹوٹ گیا۔"

"تم بھی نا عازم!" وہ جھلا گئی۔ "پلیز یہاں احتیاط سے رہا کرو۔ یہاں تو ہر قدم پر ایسے خطرات کا سامنا ہے۔"

"ہاں، پر مجھے تو تمہارے پولیس والے لے ڈوبے۔۔۔ سنا تھا یہاں پولیس کبھی موقع پر نہیں پہنچتی۔ لیکن داد دینی پڑے گی کیا کمال ایفی شینسی ہے۔"

"کہاں کی ایفی شینسی۔۔۔ مجرم تو بھاگ گئے اور لے کے تمہاری ٹانگ۔۔۔" جملہ خزران کے منہ میں رہ گیا۔ اس نے پہلی مرتبہ عازم کی ٹانگ پر توجہ کی۔ گھٹنا اس بری طرح چھل گیا تھا کہ پینٹ پر خون نظر آنے لگا تھا۔ "اوہ تمہاری ٹانگ سے تو خون بہہ رہا ہے۔ عازم! یہ زخمی کیسے ہوئی۔"

"ہائے مت پوچھو۔" اس نے کرب سے آنکھیں بند کیں۔ "ظالموں نے تابڑ توڑ ڈنڈے برسائے اور گھونسا ۔ اس لیے چھل گیا' کیونکہ گھسیٹ کر لا رہے تھے۔ پتا نہیں راستے میں کیا کچھ آیا' نہیں پروا کب تھی۔"

"پہلے تمہیں اسپتال لے جاتی ہوں۔"

"نہیں بھئی۔ اب نہیں اور خوار ہونے کی سکت نہیں ہے۔ تم مجھے گھر تک چھوڑ دو' میرے پاس فرسٹ ایڈ کا سب سامان موجود ہے۔"

"لیکن عازم! چوٹ گہری نہ ہو۔" وہ بہت پریشان نظر آ رہی تھی۔

"اب کوئی چوٹ گہری نہیں لگتی۔" وہ ہنس پڑا۔

"تم یہاں آئے کیسے تھے۔ آئی مین گاڑی یا بائیک وغیرہ تھی تمہارے پاس؟" خزران نے بات بدلی۔

"نہیں۔ مجھے عرفان بھائی نے یہاں ڈراپ کیا تھا۔ وہ آگے کسی کام سے چلے گئے۔ واپسی پر ٹیکسی کرنے کا ارادہ تھا۔ لیکن۔" وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم چونکا۔ "تم کس کی گاڑی لیے ہوئے ہو۔ ڈرائیونگ بھی خود۔ حیرت ہے میں نے دھیان ہی نہیں دیا۔" وہ ایک دم حیران نظر آنے لگا۔ خزران ہنس پڑی۔

"اپنی گاڑی ہے۔"

"اپنی۔ مطلب جنید کی؟ لیکن اس کے پاس تو بائیک ہے۔" وہ خود ہی سوال جواب کرنے لگا۔

"نہیں بھئی۔ میری اپنی ہے۔" وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔

"کب لی؟"

"جنید بھائی کے گھر آتے ہی خرید لی تھی۔ بینک کے توسط سے لی ہے۔"

"واہ بھئی۔ یہ تو سچ بڑا کمال کام کیا۔ اتنی جلدی میری بات پر عمل کرو گی۔ بالکل اندازہ نہیں تھا۔" وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔

"اس روز تم سے گاڑی کے متعلق ہی کچھ مشورہ مانگنے لگی تھی جب تم نے دوسروں سے امید لگانے سے منع کر دیا تھا۔"

"اوہ!" عازم نے یاد آنے پر افسوس جتایا۔ "یار! اب مشورہ مانگنے سے تو منع نہیں کیا تھا۔ تم بھی بہت ڈیپ لے لیتی ہو باتوں کو۔"

"مجھے صرف مشورہ نہیں' بلکہ تمہاری مدد بھی چاہیے تھی۔ گاڑیوں کے ماڈل' قیمتوں اور کارکردگی وغیرہ کے متعلق میری معلومات صفر ہیں۔ پھر بینک کا جھنجھٹ بھی لمبا چوڑا ہوتا ہے۔ سوچا تم ان معاملات میں بہت ہوشیار ہو۔ سارا کام تمہارے ہی ذمے لگا دوں گی۔" اس بار خزران نے تفصیلی جواب دیا۔

"تو پھر۔ بنا میری مدد کے کیسے کر لیا۔" اس نے ایک نظر خزران کو دیکھا۔

"بھیا نے اپنے کسی دوست سے بات کی' اس نے سارا کام کروایا۔"

"چلو' شکر ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اب تم بہت خود مختار اور پُراعتماد نظر آنے لگی ہو۔ ایسی رہا کرو۔ تم میں دم ہے کچھ بھی کر لینے کا۔" وہ کھل کر اس کی تعریف کرنے لگا۔ خزران چپ ہی رہی۔

"یہ ڈرائیونگ میں اتنی مہارت کہاں سے حاصل کی۔ مجھ سے تو روز ڈانٹ کھاتی تھیں۔" عازم کچھ یاد آنے پر مسکرانے لگا۔

"لائسنس ہولڈر ہوں۔ مہارت کیسے نہیں آئے گی۔" اس نے ابرو چڑھائے۔

"اف۔ لائسنس ہولڈر تو یہاں ہر دوسرا بندہ ہے' بنا کسی ٹریننگ کے' پاکستان میں یہ کون سا بڑا کمال ہے۔"

"آج کل بڑی یہاں' وہاں کرنے لگے ہو۔ چند سال باہر کیا گزار لیے تم میں تو پاکستانیت ہی نظر نہیں آتی۔" وہ خفا سی ہو گئی۔

"ایسی بات نہیں ہے۔ باہر والوں میں پاکستانیت تم لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ بس یہاں کے سسٹم دیکھ کر دل دکھتا ہے۔ شکوہ سسٹم سے ہے' پاکستان سے نہیں۔"

"بھیا بتا رہے تھے' تم ہمیشہ کے لیے آ گئے ہو' خیریت؟" خزران نے موڑ کاٹا۔

"ہاں..... کچھ ضروری کام نپٹانے ہیں۔" وہ سیٹ سے پشت ٹکاتے ہوئے عجیب افسردہ سے لہجے میں بولا۔ خزران اس کے انداز پر چونکی' لیکن پوچھا کچھ نہیں۔ عازم کا گھر آگیا تھا۔ وہ باہر نکل کر تیزی سے دوسری طرف پہنچی۔ عازم اپنی طرف کا دروازہ پہلے ہی کھول چکا تھا اور نیچے اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اسے خاصی مشکل پیش آرہی تھی۔ خزران نے خود ہی اس کا بازو تھام لیا۔ اس کے سہارے وہ قدرے سہولت سے باہر آگیا۔ اس نے بغلی جیب سے چابیاں نکال کر خزران کی طرف بڑھائیں۔" ذرا لاک کھول دو۔"

"سارہ نہیں ہے گھر پہ؟" خزران چابیاں لیتے ہوئے تعجب سے اسے دیکھنے لگی۔

"وہ آج صبح ہی اپنی بہن کے گھر گئی ہے۔ تم بس مجھے دروازے تک چھوڑ دو۔ ویسے بھی تم بینک کے کام سے لیٹ ہو رہی ہو۔" وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس نے گیٹ کھول کر اسے اندر آنے میں مدد دی۔

"بینک کا کام تو اب کل ہی ہو سکے گا۔ یہاں سے سیدھا گھر جاؤں گی۔ آؤ۔ تمہیں کسی آرام دہ جگہ پر بٹھا دوں۔" وہ اسے سہارا دیے کوریڈور سے گزر کر لاؤنج میں آئی۔

"بس یہیں صوفے پر بیٹھوں گا۔"

"بیڈ پر لیٹ جاؤ معلوم نہیں زخم کتنا شدید ہے۔"

"نہیں..... فی الحال ادھر ہی ٹھیک ہوں۔ گھٹنے کی کچھ ٹریٹ منٹ کرتے ہیں۔ بعد میں ضرورت محسوس ہوئی تو صوفے پر لیٹ جاؤں گا۔" وہ آگے بڑھ کر خود ہی صوفے میں دھنس گیا اور ٹانگ سامنے ٹیبل پر لمبی کی۔ "وہاں ٹی وی کے ساتھ الماری کے نچلے خانے میں دیکھو فرسٹ ایڈ باکس ملے گا۔" وہ کہنے لگا۔ خزران نے باکس لاکر سامنے ٹیبل پر رکھا۔

"اب ذرا فریج سے کچھ برف نکال دو۔" وہ آگے بڑھ کر باکس کھولنے لگا۔ خزران کچن کی طرف بڑھ گئی۔ فریج سے کیوبز نکال کر واش بیسن کے پاس رکھیں۔ پھر ریک سے ایک بڑا پیالہ نکالا اور اب یہاں سے وہاں جانے اور کیا ڈھونڈ رہی تھی۔ کچن کی بڑی سی کھڑکی لاؤنج میں کھل رہی تھی۔ عازم نے ایک نظر اس کی مصروفیت پر ڈالی اور مسکرا کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"حق تو صرف تمہارا تھا یہاں کی ہر چیز پر..... لیکن یہ تقدیر کا پنجہ بہت ظالم ہے۔" اس نے افسردگی سے سوچا۔ خزران کچھ ہی دیر میں برف کے ٹکڑے پیالے میں لیے واپس آگئی۔

"ابھی تک ایسے ہی بیٹھے ہو۔؟" وہ ماتھے پہ بل ڈال کر اسے دیکھنے لگی۔ عازم کو خزران کی ڈانٹ کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔

"پینٹ گھٹنے سے چپک گئی ہے عازم۔ اب کیا جادو سے اس پر دوا لگے گی۔"

"بعد میں کرلوں گا۔ تم جاؤ..... یہ پینٹ پائنچوں سے تنگ لگ رہی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ گھٹنے تک اونچی ہوگی۔" عازم اس کی بات سمجھ کر وضاحت دینے لگا۔

"تمہاری پینٹ کا کپڑا نرم اور لچک دار ہے اگر جینز ہوتی تو واقعی بہت مشکل ہو جاتی۔ تم آہستہ آہستہ گھٹنے تک اٹھاؤ۔ پائنچہ بھی زیادہ تنگ نہیں ہے۔" وہ بالکل اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تھی۔ عازم نے آرام آرام سے پائنچہ اوپر اٹھایا۔

"اف.....!" خزران دل پہ ہاتھ رکھے وہیں نیچے بیٹھ گئی۔ وہ سمجھ رہی تھی عازم کا صرف گھٹنا چھلا ہے' لیکن اس کی تو پوری ٹانگ ہرٹ ہوئی تھی۔ جگہ جگہ سرخ دھبے نظر آرہے تھے جو یقیناً" پولیس کے ڈنڈوں کا نتیجہ تھے۔ گھٹنے کا حال سب سے برا تھا۔ اوپر جلد اس بری طرح اتری تھی کہ اب سرخ اور سفید حصہ نکل آیا تھا۔

"گھٹنے پہ برف مت لگانا۔ جلن بھی ہوگی اور پانی لگانا ٹھیک بھی نہیں ہے۔ میں کریم لگاتی ہوں۔ تم بعد میں ان باقی سرخ دھبوں پر لگاتے رہنا۔" خزران نے کریم اپنی انگلیوں پہ نکال کر لیپ لگانا شروع کیا۔

نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے وہ درد برداشت کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ خزراں نے پوری ٹیوب اس کے زخم پر خالی کر دی۔ عازم نے کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں۔ وہ کریم لگانے کے ساتھ ساتھ زخموں پر پھونکیں بھی مار رہی تھی۔ اس کی پانیوں سے جھلملاتی آنکھیں دیکھ کر عازم حیرت زدہ رہ گیا۔

"تم رو رہی ہو؟" وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔ خزران نے چونک کر اوپر دیکھا تو بے شمار آنسو چھلک کر گال پہ اترے۔ وہ گھبرا کر چہرہ صاف کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میرے لیے درد محسوس مت کیا کرو۔" وہ صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

"پھر تم بھی چھوڑ دو ایسا کرنا۔" وہ آہستہ سے کہہ کر باہر نکل گئی۔ عازم اس کی پشت دیکھتے ہوئے گم صم بیٹھا رہا۔

☼ ☼ ☼

"آپ بھی ناں آپی۔۔۔ آپ کو لگتا ہے میرے مسائل کا حل نفسیاتی معالج کے پاس ہے۔" سارہ کلینک کی سیڑھیاں اتر کر پارکنگ کی طرف بڑھنے لگی۔ سیما آپی پھولی سانسوں کے ساتھ اس کے مقابل آئیں۔

"مجھے تو تمہاری صحت کی فکر ہے۔ ٹینشن لے لے کے تم نے اپنا کیا حال بنالیا ہے۔۔۔ پانچ سال بڑی ہوں تم سے اور لوگ تمہیں میری بڑی بہن سمجھتے ہیں۔ یہی حال رہا تو عازم تمہاری طرف دیکھنا بھی چھوڑ دے گا۔" سیما نے پارکنگ کا رخ کیا تو وہ بھی ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

"اچھا اور آپ کی سائیکاٹرسٹ نے کون سا تیر مار لیا۔" سارہ نے طنزیہ ان کو دیکھا۔ "سکون آور گولیاں۔۔۔ اور بس یعنی یہی حل ہے میرے مسئلے کا۔۔۔!"

"ارے بھئی! گولیاں لوگی تو نیند اچھی آئے گی' پرسکون نیند سے صحت بھی بہتر ہوگی اور بلاوجہ ہر وقت سوچتے رہنے سے بھی نجات ملے گی۔ یہ ڈاکٹر بہت لائق ہے۔ اس نے تمہارا مسئلہ جان کر دوائیں تجویز کی ہیں۔ اب تم یقیناً" بہت ذہنی سکون محسوس کرو گی۔"

ملائشیا سے آنے کے بعد سارہ نے کافی وقت سیما کے ساتھ گزارا تھا۔ سیما نے محسوس کیا کہ وہ اولاد کے معاملے میں حد سے زیادہ حساس ہو چکی ہے۔ اس کا دن رات ایک ہی معاملے کو لے کر پریشان رہنا' سیما سے دیکھا نہیں گیا۔ تب ہی سائیکاٹرسٹ وقت لے کر اسے دکھانے لے آئی۔

"میرا ذہنی سکون تو۔۔۔" گاڑی کا دروازہ کھولتے کھولتے وہ رک گئی۔ تھوڑے فاصلے پر ایک اسکول بس آکر رکی تھی۔ دو نرسری کی بچیاں بیگ سنبھالتی نیچے اتر کر اسی کی طرف چل کر آنے لگیں۔ آگے والی چھوٹی بچی دو چٹیاں باندھے اپنے ماتھے کے بالوں کو پیچھے کرتی بیگ سنبھالتی آگے بڑھنے لگی۔ چہرے پر آئے پسینے کو اس نے اپنی ننھی انگلیوں سے صاف کرنے کی کوشش کی تو میلے ہاتھوں کے دھبے اس کے سفید چہرے پر نظر آنے لگے۔ سارہ نے بے ساختہ اپنے دوپٹے کا پلو ہاتھ میں لیا۔ بچی کافی قریب آچکی تھی۔ اس کا شدت سے دل چاہا کہ بچی کو روک کر اس کا چہرہ اپنے پلو سے صاف کرے اور اس کے سفید گال چوم لے۔ لیکن وہ مستی میں مگن قریب سے گزر کر چلی گئی اور سارہ مٹھی بھینچ کر اپنے درد کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"اس پلو کے نصیب میں کہاں' کسی بچے کا ناک منہ صاف کرنا۔۔۔" وہ دوپٹا چھوڑ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ سیما نے اسے گھر کے دروازے پر چھوڑا۔ سارہ نے اندر بلایا' لیکن اس کے بچے اسکول سے آنے والے تھے۔ اس لیے باہر سے ہی گاڑی بڑھا لے گئی۔ سارہ اندر آئی تو عازم اپنی زخمی ٹانگ ٹیبل پہ رکھے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔

"ارے۔۔۔ کیا ہوا آپ کو؟" ٹانگ کے سرخ دھبے اور گھٹنے پر کریم کا لیپ دیکھ کر وہ پریشانی سے آگے بڑھی۔

"پولیس والوں کی مہمانی کا شکار ہوا ہوں۔" عازم ہنسا۔

"پولیس... کہاں گئے تھے آپ؟" وہ مزید حیران ہو گئی۔ عازم نے تفصیل بتانا شروع کی۔ وہ سننے کے ساتھ ساتھ ٹیبل کا سامان سمیٹنے لگی۔

"خزران وہاں کیسے آئی...؟"

"وہ چھوڑو اور یہ سوچو اگر خزران وہاں نہ آتی تو اس وقت میں لاک اپ میں ہوتا۔"

"یہاں بہت احتیاط سے رہا کریں عازم! ادھر حالات مختلف ہیں۔" سارہ نے خزران والے انداز میں تنبیہہ کی تو عازم نے مسکرا کر سر ہلانے پہ اکتفا کیا۔

"آپ کو کچھ چاہیے...؟" ٹیبل صاف کر کے وہ سیدھی ہوئی۔

"گرم دودھ کا ایک گلاس دے دو... تھوڑی سی ہلدی بھی ڈال دینا۔"

"ہوں..." وہ کچن کی طرف چل پڑی۔ عازم دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پچھلے کچھ سالوں سے ازدواجی زندگی کچھ ایسے ہی روٹین کے جملوں کے گرد گھومنے لگی تھی۔ نہایت رسمی اور بہت حد تک روکھی پھیکی سی... عازم نے بہت مرتبہ اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ قدرت کے ہر کام میں مصلحت ہے۔ عازم نے بارہا اسے کہا کہ وہ خود کو مصروف رکھا کرے۔ لیکن وہ اس قدر حساس ہو چکی تھی کہ کسی وقتی مصروفیت سے بہل جانا اس کے بس میں نہیں تھا... ہر وقت ایک ہی سوچ، ایک ہی خیال... حالانکہ اسے تو ساس کے روایتی طعن و تشنیع کا سامنا بھی نہیں تھا، سنجیدہ تو بلکہ نرمی اور پیار سے اسے سمجھاتیں لیکن اس پر کوئی تسلی اثر نہیں کرتی تھی۔ پاکستان آ کر البتہ اتنی بہتری ضرور آئی تھی کہ دن کا وقت وہ اپنے بہن بھائیوں کے ہاں گزار آتی تھی۔

اب پچھلے کچھ دنوں سے مصروفیت قدرے اور بھی بڑھ گئی تھی۔ کیونکہ عازم کی خالہ کی بیٹی کی شادی تھی۔ وہ دونوں کافی سالوں کے بعد کسی خاندانی فنکشن میں شریک ہو رہے تھے، اس لیے سارہ زور و شور سے تیاریوں میں مصروف تھی۔ عازم خوش تھا کہ سارہ کی ذہنی رو نے رخ تبدیل کیا تھا۔ البتہ یہ بھی جانتا تھا کہ شادی ختم ہوتے ہی وہ پھر سے افسردہ اور بیمار نظر آنے لگے گی۔

☆ ☆ ☆

"سکینہ پھپھو کا تین مرتبہ فون آ چکا ہے اور آج تو تم معمول سے بھی لیٹ آئی ہو۔" خزران گھر میں داخل ہوئی تو سمیعہ بھابھی اور بچے تیار بیٹھے تھے۔

"ہاں بھابھی! جانتی ہوں، بس چھٹی ہوتے ہی پرنسپل صاحبہ نے چھوٹی سی میٹنگ بلوالی۔ اچھا میں تیار ہو کر بس ابھی آئی۔" وہ فوراً ہی کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ آج سویرا کی مہندی تھی۔

مہندی کا فنکشن کافی اچھا رہا تھا۔ وہ لوگ رات کو ایک بجے کے قریب گھر پہنچے... خزران خوش تھی کہ اگلے روز اتوار ہے، کم از کم بچوں کی تھکاوٹ تو اتر جائے گی۔

سکینہ پھپھو بیوہ تھیں اور یہ ان کے گھر کا پہلا فنکشن تھا۔ اس لیے عین بارات کے وقت پہنچنا ان سب کے لیے مناسب نہیں تھا۔ خزران نے گلی میں ہی گاڑی پارک کی۔ سامنے عرفان بھائی کی کار کھڑی تھی۔ یعنی وہ بھی آ چکے تھے۔ آج سویرا نے تیار ہونے پارلر جانا تھا۔ چار بجے کے قریب وہ سمیعہ بھابھی اور سویرا کو پارلر چھوڑ آئی۔ ان کو وہاں سے واپس لانے کی ذمہ داری بھی خزران کی تھی۔ گھر واپس آتے ہی اس نے بچوں کی تیاری شروع کروا دی۔ سمیعہ بھابھی، یسریٰ اور سندس کو تیار کرنے کا کام بھی اسے دے گئی تھیں۔

اپنے لیے اس نے سبز اور سرمئی امتزاج کا ہلکے کام والا سوٹ نکال کر پہنا۔ لمبے بالوں کی ڈھیلی چٹیا بنا کر بائیں کندھے پر آگے ڈالی۔ اور کانوں میں چھوٹے بندے پہن کر خود کو آئینے میں دیکھنے لگی۔

"بس... یہی...؟" اچانک پیچھے فضہ بھابھی کی آواز آئی تو وہ چونک کر پلٹی۔

"جی...؟"

"میک اپ، کیوں نہیں کیا خزران۔۔۔ کل بھی میں نے دیکھا تم نے لباس بھی نہایت سادہ پہن رکھا تھا اور دھلے منہ کے ساتھ پورا فنکشن اٹینڈ کیا۔ ایسا کیوں کر رہی ہو۔" انہوں نے خزران کو سامنے کھڑا کر کے بغور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ جواباً "بالکل چپ رہی۔

"یاسر نے تمہیں طلاق دی ہے خزران! تم اس کی بیوہ نہیں ہو جو ایسا سوگ والا انداز اپنا رکھا ہے۔ خود کو آزاد سمجھنا کب شروع کرو گی۔ تم اس طرح سادگی سے رہتی ہو تو لوگ کہتے ہیں۔ اسے یاسر سے طلاق کا ابھی تک غم ہے۔ میری مانو اور خوب بن ٹھن کے رہا کرو۔ زیادہ سے زیادہ سب یہی کہیں گے کہ دیکھو اسے تو طلاق کی کوئی پروا ہی نہیں۔۔۔ ہاں بھئی ٹھیک ہے۔۔۔ جیسا سلوک یاسر نے تمہارے ساتھ روا رکھا 'پروا ہونی بھی نہیں چاہیے۔"

"اب مجھے واقعی پروا نہیں ہے بھابھی۔۔۔ میں تو۔"

"جانتی ہوں۔۔۔" فضہ نے اس کی بات کاٹی۔

"لیکن اس لاپروائی کو ظاہر تو کرو۔ اس نے تمہیں ٹھوکر ماری ہے تو تم بھی بتا دو دنیا کو کہ ٹھوکر مارنے والے کو تم بھی جوتی کی نوک پر رکھتی ہو' چلو میں خود تمہیں تیار کرتی ہوں۔"

وہ زبردستی اسے ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بٹھا کر تیار کرنے لگیں۔ ان کے اپنائیت بھرے انداز پر خزران مسکرا کر سامنے بیٹھ گئی۔

"اچھا ٹھیک ہے' لیکن پلیز لائٹ میک اپ کیجیے گا۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں ٹھیک ہے۔ اب چپ بیٹھو۔" وہ اسے لائنر لگانے لگیں۔ سمیعہ بھابی کا پارلر سے فون آیا کہ سویرا تیار ہو چکی ہے۔ خزران خود بھی تیار ہو چکی تھی۔ فضہ بھابھی کو بتا کر اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور اکیلی ہی باہر آ گئی۔

گاڑی اسٹارٹ کر کے جونہی گلی سے نکال کر سیدھی کی۔ اچانک ساتھ والا دروازہ کھلا اور عازم اندر آ بیٹھا۔

"تم۔۔۔؟" وہ یک دم بوکھلا گئی۔

"پلیز' مجھے ذرا آگے تک ڈراپ کر دو۔ سارہ کسی پارلر میں کھڑی میرا ویٹ کر رہی ہے۔" وہ عجلت میں بولنے لگا۔ خزران نے منہ پھلا کر بنا کچھ کہے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"بنا سوچے کہیں بھی کود پڑتے ہو۔ پھپھو کے دروازے پر کتنے لوگوں نے تمہیں دیکھا ہوگا۔ پتا نہیں اب کیا کیا باتیں بنائیں گے۔" وہ غصے سے بڑبڑانے لگی۔

"ارے ایک' دو محلے کے لڑکے کھڑے تھے۔ اب انہیں کیا پتا ہمارے معاملے کا۔"

"نہ تمہیں لوگوں کی پروا ہے' نہ میری عزت کی' لیکن میں بہت ڈرتی ہوں عازم۔۔۔!"

"ڈر کی وجہ؟" عازم نے اس کے پچھلے جملے کو نظر انداز کیا حالانکہ غصہ بہت آیا تھا۔

"طلاق یافتہ عورت کی زندگی ایک جوان کنواری لڑکی کی زندگی سے زیادہ حساس ہوتی ہے۔ ہمیں کیسی کیسی نظروں کا سامنا ہوتا ہے۔ تم نا سمجھ نہیں ہو کہ ہر بات کھول کھول کر بتانی پڑے۔"

"ڈر کی وجہ پھر بھی سمجھ نہیں آئی۔" وہ ایک دم رکھائی سے بولا۔

"تم جانتے ہو۔"

"یعنی میرے بجائے اگر عرفان بھائی' رضوان یا حیدر میں سے کوئی آ بیٹھتا تو تمہیں پرابلم نہیں تھی۔"

"ہاں صحیح سمجھے ہو۔" خزران نے بلا جھجک کہہ دیا۔

بہت دنوں سے وہ اسی نہج پر سوچ رہی تھی کہ اس کے اور عازم کے بیچ اچانک ہی حد فاصلہ کچھ کم ہونے لگا تھا۔ اگرچہ اس کی وجہ صرف اتنی تھی کہ اب وہ ملائشیا سے واپس آ گیا تھا اور خاندان کا فرد ہونے کی حیثیت سے آمنا سامنا بھی ہو جاتا تھا اور بات چیت بھی۔

"ڈرتا انسان تب ہے جب وہ کچھ غلط کر رہا ہو اور تم صرف اس لیے ڈرے جا رہی ہو کہ لوگ تم پر جھوٹا الزام لگا دیں گے۔"

"میں صرف یہ جانتی ہوں کہ مجھے احتیاط سے اور سنبھل کر رہنا ہے۔ پھر لوگوں کی زبانیں کہاں بولتی

ہیں۔ ان کی تو نظریں بولتی ہیں۔ ایسے میں ہم ایک ایک کو صفائی بھی نہیں دے سکتے۔" اس نے اپنا موقف وضاحت سے بتایا۔

"چلو' ٹھیک ہے' جب کبھی "ڈیٹ" پر جائیں گے' تو چوری چھپے نکلیں گے۔" وہ ڈھٹائی سے ہنسا۔

"بہت بکواس کرتے ہو۔" خزران نے ایک غصے کی نظر اس پہ ڈال کر سامنے دیکھا۔

"تو... میں تو قسم سے بہت سنجیدہ ہوں... پھر تم بھی آزاد ہو اب تو... مسئلہ ہی کوئی نہیں۔" وہ مزے سے سیٹ سے ٹیک لگا کر اسے چھیڑنے لگا۔

"ہاں ٹھیک ہے' میں آزاد ہوں... اور تم؟" اس نے ابرو چڑھائے۔

"میں مرد ہوں اور مرد تو ہے ہی آزاد..."

"بڑا اترا رہے ہو... بتاؤں گی سارہ کو۔" اسے ہنسی آگئی۔

"ایک سنجیدہ بات کہوں۔" وہ سیدھا ہو کر اچانک اسے دیکھنے لگا۔ خزران کے دل کو کچھ ہوا۔ عازم کے ایسے انداز جانے کیوں اسے سالوں پیچھے لے جانے لگتے تھے۔

"کہو... تم کون سا چپ رہو گے؟"

"بڑا اعتراض ہے میرے بولنے پر... حالانکہ میں جب بھی بولا ہوں دوسرے کا بھلا ہی ہوا ہے... خیر اب میری بات دھیان سے سننا اور اس پر مثبت انداز میں غور کرنا۔"

"ایسی کیا بات ہے؟" خزران نے اس بار رویہ نرم رکھا۔

"تم جانتی ہو خزران! یاسر سے تمہاری شادی کے بعد میں نے خود کو پوری طرح اپنے آپ تک محدود کر لیا تھا۔ تمہاری ازدواجی زندگی پر اپنا سایہ بھی نہیں پڑنے دیا۔ بھلے تم سے بہت دور رہتا تھا لیکن رابطے میں رہنے کے بے شمار طریقے تھے پھر بھی میں نے کبھی ایسی کوشش نہیں کی اور وہ زندگی جو میرے نصیب میں لکھ دی گئی تھی' اسے ہنسی خوشی جینے لگا۔ لیکن اس سب کے باوجود میں نے ہمیشہ اپنی ایک عزیز دوست کو بہت مس کیا۔ تم سے دوستی کا رشتہ بہت مضبوط رہا تھا۔ اتنا مضبوط محبت کا رشتہ بھی ہوتا تو شاید تقدیر ہم سے جیت نہ پاتی... کیا اب زندگی کے اس موڑ پر میری دوست مجھے واپس مل سکتی ہے؟"

وہ اب اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا۔ انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے اس نے بات مکمل کی۔ خزران نے اس کا ایک ایک لفظ دل میں اترتا محسوس کیا تھا۔ لیکن جواب دینے میں شدید مشکل محسوس کی۔ لب چباتے ہوئے وہ مسلسل گاڑی چلاتی رہی۔

"بس یہاں آگے روک دو..." اس نے باہر دیکھتے ہوئے اچانک کہا۔ خزران نے گاڑی روک دی۔

"مجھے جواب کی جلدی نہیں ہے... تم ہر پہلو پر غور کر لو... لیکن دیکھو میری نیت پہ شک مت کرنا۔"

"تمہاری نیت پر مجھے شک نہیں ہے عازم... لیکن۔" وہ قدرے رکی۔ "دوستی سے آغاز لینے والے رشتے کا انجام معلوم نہیں کیسا ہو... میں تمہیں الزام نہیں دے رہی... اپنی کمزوریوں سے خوف زدہ ہوں۔ اپنی ٹوٹی بکھری زندگی کو خشک مزاجی کی ڈھال سے سہارا دیے ہوئے ہوں۔ میری ڈھال مجھ سے مت چھینو... میں تم سے ہر بات کہہ سکتی ہوں' اس لیے بہانے کا سہارا لینے کے بجائے صاف بات کی ہے... امید ہے میری مجبوری کو سمجھو گے۔"

وہ اسٹیرنگ کو مضبوطی سے تھامے آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ عازم نے توجہ سے اس کو سنا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔

"میں تمہاری طاقت سے بھی واقف ہوں رازی اور کمزوریوں سے بھی' بے فکر رہو' میرا کردار ہمیشہ ایک بھلا چاہنے والے دوست کا ہی پاؤ گی۔" وہ کہہ کر اس کے جواب کے لیے نہیں رکا اور گاڑی سے اتر گیا۔

☼ ☼ ☼

موسم کافی گرم ہو گیا تھا۔ جولائی کے آغاز کے دن تھے۔ اتوار کے دن اچانک آسمان بادلوں سے بھر گیا۔

بچے چڑیا گھر جانے کی ضد کرنے لگے۔ جنید بھائی بھی گھر پر تھے۔ خزران نے بچوں کو تیار کیا۔ خود بھی تیار ہوئی البتہ ڈرائیونگ کی ذمہ داری بھیا پر ڈال دی۔

بچے چڑیا گھر جا کر بہت خوش ہوئے۔ واپسی پر بارش شروع ہو گئی۔ خزران کا موڈ بھی خوشگوار ہو گیا۔ اس نے شکر کیا کہ بچوں کو لے آئی' جب تک سسرال میں تھی۔ بچوں کے لیے بالکل وقت نہیں نکلتا تھا۔ شکر ہے قدرت نے بروقت اسے یہ موقع فراہم کر دیا تھا۔ کم از کم اس معاملے میں عازم واقعی رحمت کا فرشتہ بن کر نازل ہوا تھا۔ اگر وہ اسے جنید بھائی کے گھر آنے پر نہ اکساتا تو وہ اب بھی یاسر کے گھر سڑ رہی ہوتی۔ جہاں بچوں کی شخصیت' نری مسخ ہو رہی تھی۔ خزران نے مناہل کے سر کے نیچے سے اپنا بازو نکال کر سرہانے پر آہستہ سے اسے سلایا۔ سیدھا ہو کر لیٹتے ہوئے اس نے عازم کے لیے دل سے اولاد کی دعا کی۔ تقریباً" سات سال ہونے والے تھے اس کی شادی کو۔۔۔ اللہ نے اب تک اسے اولاد کی نعمت سے محروم رکھا تھا۔ سارہ بھی کچھ اسی وجہ سے الجھی الجھی اور پریشان نظر آتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آج میں اپنی امی کے گھر جاؤں گی خزران! رات کو بھی وہیں رہوں گی۔ پنڈی سے باجی آئی ہوئی ہیں۔" وہ کالج سے لوٹی تو بھابی تیاری میں مصروف تھیں۔

"ہوں۔" وہ سر ہلا کر اپنے لیے کھانا نکالنے لگی۔

بھابھی کے جانے کے بعد اس نے کچھ دیر آرام کیا' پھر رات کا کھانا بنا لیا۔ بچوں کا آج ویک اینڈ تھا۔ وہ رات کے کھانے کے بعد فوراً" سونے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھے۔ اس لیے جنید ماموں کے ساتھ پلے اسٹیشن کھیلنے لگے۔ خزران انہیں ان کے حال پہ چھوڑ کر کمرے میں آ گئی۔

اتوار کا دن وہ کام والی کے ساتھ دوپہر تک کاموں میں لگی رہی۔ بھیا دوپہر کے کھانے کے بعد بھابھی اور بچوں کو لینے چلے گئے۔ رافع بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔

مناہل کو اس نے کارٹون چینل لگا کر ٹی وی کے سامنے بٹھا دیا۔ اور اپنے لیے چائے بنانے کچن میں آ گئی۔ چائے بنا کر اس نے جوں ہی کپ میں ڈالی' ڈور بیل بجنے لگی۔ وہ بال سمیٹتی دروازے تک آئی۔

"کون۔۔۔؟"

"میں۔۔۔ عازم۔۔۔!"

"عاز۔۔۔ زی!" وہ ٹھٹھک کر ذرا دیر کو رکی پھر دروازہ کھول دیا۔

"اسلام علیکم۔۔۔!" اس نے راستہ چھوڑا۔

"وعلیکم اسلام۔۔۔ جنید ہے؟" وہ ایک قدم اندر آ کر رک گیا۔

"نہیں۔۔۔ وہ سمیعہ بھابھی کو لینے گئے ہیں۔"

"اوہ۔۔۔ تو تم اکیلی ہو۔" وہ چونکا۔

"ہاں۔۔۔ بس میں اور مناہل۔۔۔ جنید بھائی اور بھابھی آنے ہی والے ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے' میں بعد میں آ جاؤں گا۔" وہ واپسی کے لیے مڑا۔

"کوئی بات نہیں۔۔۔ آ جاؤ۔" وہ کمرے کی طرف بڑھی تو عازم بھی پیچھے آنے لگا۔

"ویسے بہتر تو یہ ہوتا ہے کہ بندہ آنے سے پہلے فون پر بتا دے۔" وہ طنز کرنے سے باز نہیں آئی۔

"بس یار! عادت نہیں ہے۔۔۔ اور جنید کی طرف تو اکثر ہی نکل آتا ہوں۔ اب تم آ گئی ہو تو آئندہ احتیاط کیا کروں گا۔"

"اچھا واہ۔۔۔ اچانک بڑی تابع داری والی حس جاگ گئی۔" وہ مسکرانے لگی۔

"ہاں۔۔۔ تم ہی نے احساس دلایا کہ جہاں کسی کے معاملے میں دل میں کوئی بات ہو' وہاں احتیاط کرنی چاہیے۔" وہ روانی میں بولتا اس کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ خزران نے گھور کر اسے دیکھا۔

"ایسا میں نے کب کہا۔۔۔؟"

"لو۔۔۔ صاف صاف تو کہا تھا کہ اگر میرے بجائے کوئی اور آ کر تمہاری گاڑی میں بیٹھتا تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اب اس کا اور کیا مطلب۔۔۔ ویسے

بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ اب دیکھو ناں... بہت مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ میں جنید سے ملنے یہاں آیا لیکن گھر پر صرف سمیعہ بھابھی ہوتیں... لیکن ایسا ٹھنڈا میٹھا دل گدگدانے والا احساس کبھی نہیں جاگا جو ابھی تمہاری موجودگی...."

الفاظ اس کے منہ میں رہ گئے تھے۔ خزراں نے بنا سوچے اس کے کندھے پہ مکا مارا۔ "بدتمیز...!" اور وہ بجائے برا ماننے کے قہقہہ مار کر صوفے پہ جا بیٹھا اور مناہل کو گود میں لے لیا۔

"ہوں' تو منو کو ڈورِیمان پسند ہیں۔"

"جی انکل... بہت اچھے ہوتے ہیں۔ آپ کو کون سے کارٹون پسند ہیں؟" مناہل بنا جھجکے اس کی گود میں سوار ہو کر سوال پوچھنے لگی۔ عازم کی شروع سے عادت تھی کہ وہ بچوں کے ساتھ بہت جلد گھل مل جاتا۔ رافع اور مناہل کے ساتھ اس نے سویرا کی شادی میں اچھی خاصی دوستی بنالی تھی۔

"مجھے تو کنگ فو پانڈا مسرف اور جنگل بک بہت پسند ہیں۔"

"تم کارٹون بھی دیکھتے ہو؟" عازم نے بڑی روانی میں بہت جلد جواب دیا تھا اس لیے وہ حیران ہوگئی۔

"ہاں اب تمہاری جدائی کا وقت کسی نہ کسی طرح تو کاٹنا تھا ناں۔" اس نے چائے کا کپ لیتے ہوئے مصنوعی آہ بھری۔ خزراں نے تنگ آکر ماتھا پیٹا۔

"تم سے بات کرنا فضول ہے عازم... ذرا بھی تمہیں اپنی زبان پر کنٹرول نہیں ہے۔ اب چائے پیو اور چلتے بنو۔"

"ارے ایسے کیسے۔ ابھی تم نے کہا جنید آنے والا ہے۔"

"ہاں لیکن اچھا نہیں لگے گا۔ بس تم جاؤ۔"

"کیوں جاؤں... مجھے تو جنید سے کام ہے۔"

"کیا کام ہے بھیا سے...؟" وہ زچ ہوگئی۔

"اس سے بائیک لینی تھی۔"

"تو اتنا سا کام تھا... وہ تو گاڑی لے گئے ہیں۔ بائیک پیچھے صحن میں کھڑی ہے' لے جاؤ۔"

"کیسی بے مروت ہو' کوئی ایسے بھی بھگاتا ہے۔ چائے تو پینے دو... جانے کتنے برسوں بعد تمہارے ہاتھ کی بدمزا چائے دوبارہ پی رہا ہوں۔"

وہ پھر تنگ کرنے لگا۔ خزراں نے بمشکل ہنسی ضبط کی۔ چائے کے معاملے میں عازم اور اس کا مزاج قطعاً الگ تھا۔ وہ گاڑھی' کم چینی والی چائے پیتی' جبکہ عازم کم دودھ' زیادہ شکر والی قدرے تیز چائے پسند کرتا تھا۔ ماضی میں عازم ہاتھ جوڑ کر منت کیا کرتا تھا کہ چائے بنانے وہ ہرگز کچن میں نہ جائے۔

"اب اچھی نہیں لگ رہی تو کیوں زبردستی پیے جا رہے ہو۔" وہ کھسیا گئی۔

"بتاؤں کیوں پی رہا تھا۔" وہ کپ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "تمہاری مخصوص بدمزا چائے مجھے ایک دم برسوں پیچھے لے گئی۔ ایک ایک گھونٹ مجھے کچھ نہ کچھ یاد دلا رہا تھا۔ خیر... میں بائیک لے جارہا ہوں۔ شام تک واپس لے آؤں گا۔" وہ باہر صحن میں نکل آیا۔

"دوسروں سے چیزیں مانگتے شرم نہیں آتی مہینوں گزر گئے تمہیں ملائشیا سے واپس آئے... اپنی بائیک یا گاڑی اب خرید ہی لو۔ سارہ بے چاری بھی تمہاری وجہ سے خوار ہوتی پھرتی ہے۔" خزراں ساتھ ساتھ چلتے اس کی کلاس لینے لگی۔

"فی الحال بائیک لے رہا ہوں... گاڑی ذرا ٹھہر کر۔" اس نے چابی گھما کر اسٹینڈ اٹھایا۔ "اچھا میں چلتا ہوں۔ سارہ کو اس کی امی کے گھر چھوڑنا ہے۔"

"ایک بات کہوں عازم! برا نہ ماننا۔"

"ہاں کہو... تمہاری بات کا کبھی برا نہیں مانا۔" وہ جاتے جاتے رکا۔

"مجھے محسوس ہوا ہے کہ سارہ اپنا زیادہ وقت میکے میں گزارتی ہے۔ کیا تم اسے خوش نہیں رکھتے؟"

"چلو... میکے وہ جاتی ہے اور بلیم تم مجھے کر رہی ہو۔ یعنی تمہیں لگتا ہے اس میں بھی میرا قصور ہے۔"

"عورت کی ازدواجی زندگی پرسکون ہو تو اسے اپنے گھر کے علاوہ کہیں سکون نہیں ملتا۔" خزراں نے وضاحت کی۔

"ہاں۔ وہ بے سکون تو ہے لیکن..." وہ لحظے بھر کو رکا۔ "چلو اسے، پھر کبھی ڈسکس کریں گے۔ ویسے بھی تم نے میری دوستی کی آفر پر غور نہیں کیا... اب کیا دروازے پہ کھڑے کھڑے اپنے پرسنلز تم سے شیئر کروں۔ کبھی فون پہ بات کرنے کا وقت نکالو۔"

وہ کہہ کر مزید نہیں رکا اور بائیک نکال لے گیا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے اپنی سی وی ایک پرائیویٹ اسکول میں بھیجی تھی۔ وہاں سے انٹرویو کی کال آئی ہے۔" لنچ کے دوران سارہ نے پرسکون انداز میں عازم کو اطلاع دی، لیکن اس کا کھانے کی طرف بڑھتا ہاتھ وہیں رک گیا۔ چند سیکنڈ اس نے کچھ سوچا، پھر ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

"کس کے مشورے سے سی وی بھیجی تھی۔" اس کا لہجہ ایک سنجیدہ تھا۔ سارہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ عازم سے ایسے جملے کی وہ ہرگز توقع نہیں کررہی تھی۔ سی وی بھیجنے کی اطلاع بھی یونہی دے دی کہ اگلی صبح انٹرویو کے لیے اسی کے ساتھ جانا تھا۔

"کیا مطلب... میں نے تو ملائشیا سے آتے ہی کافی جگہوں پر اپلائی کردیا تھا۔"

"لیکن کیوں... ملائشیا سے جاب چھوڑ کر تو میں آیا ہوں۔ یہاں بھی یہ کام میرے کرنے کا ہے۔ تم بلاوجہ کیوں فکرمند ہورہی ہو۔"

"میں تو یونہی وقت گزاری کے لیے جاب کرنا چاہتی ہوں۔ گھر کا بوجھ اٹھانا میرا مقصد نہیں ہے۔"

"وقت گزاری کے لیے تمہارا خاندان ہی کافی ہے۔ جہاں تم روز صبح ملنے نکل کھڑی ہوتی ہو۔" اس نے طنزیہ لہجے میں چوٹ کی تو سارہ نے بمشکل ضبط کیا۔

جانے اسے کیا ہوگیا تھا۔ عازم جیسا لبرل 'عورت کی آزادی کا حامی' بیوی کے معاملے میں اتنا تنگ نظر نکلے گا' اس نے سوچا نہیں تھا۔ تو کیا سات سال میں نے اسے سمجھنے میں غلطی کی۔ ملائشیا میں سارہ کے لیے نہ تو جاب کرنے کا ماحول تھا اور نہ اس نے ایسی کوشش کی تھی' اس لیے عازم کے خیالات جاننے کا موقع نہیں ملا تھا۔ البتہ خواتین کے متعلق اس کی عمومی رائے ہمیشہ سے یہی تھی کہ انہیں پڑھنا بھی چاہیے اور باہر بھی نکلنا چاہیے لیکن آج وہی عازم عجیب متضاد باتیں کررہا تھا۔

"آپ میری جاب کے خلاف کیوں ہیں۔ جبکہ آپ جانتے ہیں کہ گھر پر اکیلے وقت گزارنا میرے لیے کتنا مشکل ہے۔"

"تم نے خود ہی اپنے لیے زندگی مشکل بنالی ہے۔" عازم نے قدرے ناراض لہجے میں کہا۔ "فضہ بھابھی پچھلے سال اپنی دو دن کی اریبہ تمہاری گود میں ڈال رہی تھیں لیکن اسے ہاتھ لگاتے ہوئے تمہیں بچھو کاٹ رہے تھے۔ بچے تو معصوم فرشتے ہوتے ہیں کیا تھا اگر ہم اسے گود لے لیتے' ہمارا اپنا خون تھا وہ... کیا پتا اس کی برکت سے اللہ ہمیں حقیقی خوشی سے بھی نواز دیتا' بندہ اتنا ناشکرا بھی نہ ہو۔" وہ بدمزا سا ہوکر ٹیبل سے اٹھ گیا۔

"ایسی بے وقت کی بحث کو اس وقت بیچ میں لانے کا کیا مطلب عازم! سیدھے سیدھے کہہ دیں آپ کو میرے جاب کرنے سے پرابلم ہے۔ بچے کو بیچ میں کیوں لارہے ہیں۔ عرفان بھائی کی بیٹی کو میں نے اس لیے گود نہیں لیا تھا کیونکہ مجھے لگتا تھا بچہ لینے کے باوجود میری پریشانی جوں کی توں رہے گی۔ اب میں اپنا ذہن نہیں بنا پارہی تھی تو اس میں میرا کیا قصور۔"

وہ رودینے والی ہوگئی تو عازم نے مزید کچھ بھی کہنے کا ارادہ ترک کیا۔

"ٹھیک ہے... لیکن جاب کی بات بھول جاؤ... نہ تمہیں روپے پیسے کی کوئی کمی ہے اور نہ کہیں آنے جانے کی پابندی... ہمارے درمیان اس موضوع پر دوبارہ کوئی بحث نہیں ہوگی۔"

وہ قطعی انداز میں کہتا باہر نکل گیا اور سارہ نے زور سے چمچے کو پلیٹ پہ پٹخ کر اپنا غصہ نکالا۔

☼ ☼ ☼

لاہور کینال کے پاس بیٹھے عازم کو شاید ایک گھنٹے

سے زیادہ ٹائم ہو گیا تھا لیکن خاموشی سے لہروں کو تکتے وہ ابھی بھی وہاں سے اٹھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے قریب سے ایک کنکر اٹھا کر نہر میں پھینکا اور دور تک پھیلتے دائروں کو دیکھنے لگا۔ آج اس کا دل بہت افسردہ اور بے چین تھا۔ نوکری کے معاملے پر سارہ سے جھگڑا کرنے کے بعد اس کے اور سارہ کے بیچ تین اور معاملات کو لے کر مزید کئی لڑائیاں ہو چکی تھیں۔ نتیجتاً" وہ ناراض ہو کر میکے چلی گئی تھی۔ کتنا مشکل ہے ایک ایسی لڑائی لڑنا' جو غصے سے زیادہ کسی پلاننگ کا حصہ ہو۔ بے سر پیر کی ان لڑائیوں کا مقصد ایک ایسی جنگ جیتنا تھا جس میں ہار جانے کس کی تھی۔

موبائل کی گھنٹی بجی تو اس نے جیب سے موبائل نکالا۔ "خزران... ایک عجیب سی سرخوشی نے پورے وجود کا احاطہ کیا۔ اس نے یس کیا۔

"کیسی ہو مہربان دوست۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"بالکل ٹھیک الحمدللہ... تم سناؤ فارغ ہو؟"

"ارے ایسا ویسا... " وہ ہنسا "بس ایک کشتی اور چپو کی کمی ہے۔"

"کیا مطلب... کہاں ہو تم...؟" وہ حیران ہوئی۔

"نہر کنارے بیٹھا ہوں... تیراکی تو جانتا نہیں... سوچ رہا ہوں کشتی ہوتی تو سیر کا مزا آجاتا۔"

"عجیب سرپھرے آدمی ہو... سارہ بے چاری کو ناراض کر کے میکے بٹھا دیا اور یہاں نہر کنارے بیٹھے مزے اڑا رہے ہو۔ شرم آنی چاہیے۔" وہ غصہ ہو گئی۔

"او... تو تمہاری ہمدرد طبیعت نے سارہ کی خاطر جوش مارا ہے۔ وہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ فون میں پہل کرنے کی رگ تم میں کیسے پھڑکی۔" وہ باقاعدہ طنز کرنے لگا۔

"اچھا فضول نہ بولو... سچ کہو کیا معاملہ ہے؟"

"تمہارے ذرائع نے "معاملہ" بھی بتا دیا ہوتا۔" وہ اسے تنگ کرنے لگا۔

"میں صرف تمہاری بات پر یقین کرنا چاہتی ہوں۔ تمہارے معاملے میں' سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرتی۔"

"چلو تھینکس... تمہارا اتنا کہنا کافی ہے۔"

"ایسی کیا بات ہوئی عازم! کہ دس روز ہو گئے۔ نہ وہ واپس آ رہی ہے نہ تم اسے منانے جا رہے ہو۔ انا پرستی سے تو معاملہ اور بگڑے گا۔ تم اسے واپس لے آؤ۔"

"یہ انا کی جنگ نہیں ہے رازی... یہ تو فاصلوں کی دیوار ہے' جو روز بروز اونچی ہوتی جا رہی ہے۔"

"میں تمہارے ذاتی معاملات کے بارے میں تو زیادہ نہیں جانتی اور نہ اس میں پڑنا چاہتی ہوں۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ تم ان فاصلوں کو ختم کرنے کی کوشش ضرور کرو... مسائل بھی ہر گھر میں ہوتے ہیں اور چھوٹی موٹی غلط فہمیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں... بہتر ہوتا ہے کہ ہر معاملے کو ایک دوسرے سے ڈسکس کر کے آپس میں سلجھا لیا جائے۔" وہ بھرپور سنجیدگی سے سمجھانے لگی۔

"ہوں... ٹھیک کہہ رہی ہو۔" عازم نے ایک گہری سانس لی۔

"وعدہ کرو' سارہ کو آج ہی واپس لے آؤ گے۔"

"اچھا... وعدہ بھی کرنا ہے۔" عازم ہنس پڑا۔

"ہاں... پکا پرامس۔" خزران بھی مسکرانے لگی۔

"او کے آج ہی لے آؤں گا... خوش؟" وہ اسے تسلی دینے لگا۔

خزران نے تھینک یو کہہ کر فون رکھ دیا اور عازم فون کو تکتے ہوئے اس کے پُرخلوص جذبے کے بارے میں سوچنے لگا۔ جب وہاں سے اٹھا تو دل ایک دم بہت ہلکا پھلکا سا لگنے لگا۔ وہ جیسے اڑتا ہوا گھر پہنچا۔ جانے کیا تھا خزران کی آواز میں... وہ ہمیشہ یونہی مطمئن اور پرسکون سا ہو جاتا تھا۔ کوئی پریشانی' پریشانی نہیں لگتی تھی۔ اور نہ کوئی غم پہاڑ جیسا۔

"خوش رہو رازی... تمہارے ہوتے مجھے کسی اپنے کی ضرورت نہیں' تم قریب ہو' آس پاس ہو' تمہاری موجودگی کے احساس سے میری زندگی پھر سے بھر گئی ہے۔"

وہ اسی شام سارہ کو واپس لے آیا۔ محض اس لیے

کہ خزران نے وعدہ لیا تھا۔ سارہ بھی شاید واپس آنے پر آمادہ تھی اس لیے بنا حیل و حجت ساتھ چل پڑی۔

☼ ☼ ☼

عازم کو ملائشیا سے آئے چھ ماہ ہو گئے تھے۔ جاب کا سلسلہ تو ابھی تک نہیں بن پایا تھا۔ اس نے کاروبار کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ دوستوں سے مشورے کے بعد اور ذاتی شوق کو دیکھتے ہوئے اس نے موٹر سائیکلوں کا اپنا شوروم کھول لیا۔ ابا چونکہ آٹو اسپیئر پارٹس کے کاروبار سے منسلک تھے تو انہوں نے بھی بھرپور تعاون کیا۔ عازم کا وقت اچانک ہی بہت مصروف گزرنے لگا۔ تقریباً پورا دن شوروم کی نذر ہو جاتا۔ صحیح معنوں میں اس کے پاس سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ بہت دنوں یا شاید ہفتوں سے خزران کا بھی کچھ اتا پتا نہیں تھا۔ وہ روز ہی جنید کی طرف جانے کا ارادہ کرتا لیکن کوئی نہ کوئی مصروفیت قدم روک لیتی۔

ادھر خزران کی گجرات ٹرانسفر ہو گئی۔ فوری طور پر وہ کافی گھبرائی۔ اسے زیادہ پریشانی بچوں کی وجہ سے تھی۔ لیکن پھر عازم کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا جہاں بھی ٹرانسفر ہو خود بھی وہیں رہنا اور بچوں کو بھی ساتھ رکھنا۔

اس نے بچوں کو دو روز کے لیے بھیا، بھابھی کے حوالے کیا اور اللہ کا نام لے کر نئی جگہ روانگی اختیار کی۔ جگہ کے متعلق اسے پرانی کولیگز سے کافی ساری معلومات پہلے ہی مل گئی تھیں۔ باقی ماندہ پریشانیاں یہاں آ کر خود بخود حل ہو گئیں۔ بچوں کے لیے اسکول بھی قریب ہی مل گیا اور رہائش کے لیے گھر بھی بہت اچھا ملا۔ ضروری سامان وغیرہ سیٹ کر کے وہ بچے لے گئی۔

شروع شروع میں ہر ویک اینڈ پہ لاہور آتی لیکن رفتہ رفتہ دو سے تین ہفتے بعد کی روٹین بنالی۔ گجرات آئے اسے تیسرا مہینہ تھا۔ پچھلی اتوار کو جب وہ لاہور گئی تو معہ بھابھی سے سنجیدہ پھپھو کی خرابی طبیعت کا پتا چلا۔ وہ پھپھو کی عیادت کو چلی گئی۔ وہاں عازم بھی موجود تھا۔

خزران کی بڑے عرصے بعد اس سے ملاقات ہوئی۔ وہ تو حسب معمول بہت خوش ہوا تھا اسے دیکھ کر لیکن خزران نے اپنا رویہ جان بوجھ کر سرد رکھا اور زیادہ بات چیت نہیں کی کیونکہ فضہ بھابھی سے پتا چلا کہ سارہ ایک مرتبہ پھر روٹھ کر میکے جا چکی ہے۔ عازم نے فوراً سمجھ لیا کہ وہ کچھ کھنچی کھنچی سی ہے اس لیے رات کو ہی فون کر دیا۔ وہ جنید بھائی کے گھر تھی۔

"کیا بات ہے رازی.... کیوں ناراض ہو؟" وہ نہایت رسان سے پوچھنے لگا۔

"حیرت ہے۔ مجھ سے وجہ پوچھ رہے ہو؟" وہ الٹا خفا ہو گئی۔

"یار! اب میرا کیا قصور؟ اسے خود ہی شوق ہے میکے جا بیٹھنے کا۔" عازم نے بننے کی کوشش نہیں کی اور وضاحت دینے لگا۔

"ایسا نہیں ہوتا عازم.... اس سب میں کہیں نہ کہیں ضرور تمہاری کوتاہی ہے۔ تمہارے اندر تو لوگوں کو جانچنے پرکھنے کی زبردست کوالٹی ہے۔ ایک ہی نظر میں تم اندر تک ہو آتے ہو۔ کیوں تم اب تک یہ سمجھ نہیں پائے کہ سارہ کی تم سے کیا توقعات ہیں۔ کیوں تم اسے وہ اعتماد اور بھروسا نہیں دے پائے جو ایک بیوی کا حق ہوتا ہے۔" خزراں نے ساری خطائیں اس کے حصے میں ڈال دیں۔ عازم مسکرانے لگا۔

"شاید انڈر اسٹینڈنگ کی کمی...." اس نے اختصار سے کام لیا۔ غالباً اس موضوع پر بولنے کا موڈ نہیں تھا۔

"اچھا اب غصہ ختم ہو گیا ہو تو میں کچھ پوچھوں؟"

"ہاں کہو...."

"کچھ نئی جگہ کے متعلق بتاؤ.... بچے سیٹ ہو گئے۔ کیسا ماحول ہے کیا کرتی رہتی ہو؟"

"ہاں اچھی جگہ ہے۔" اس نے لہجہ نارمل کیا۔ "شروع شروع میں بہت گھبراتی تھی.... کیونکہ اتنی دور کا پہلا تجربہ ہے.... لیکن شکر ہے زیادہ کوئی مسئلہ نہیں

ہو اور بچے بھی سیٹ ہو گئے۔"

"اور تم۔۔۔؟"

"میں۔۔۔" وہ ہنسی۔ "میرا تو کام ہے ناں۔۔۔ مجھے تو ہر جگہ جیسے تیسے سیٹ ہونا ہی پڑے گا۔"

"وہاں وقت کیسے گزرتا ہے۔" وہ پوری توجہ اور دھیان سے، اس کے متعلق جاننا چاہ رہا تھا۔ حالانکہ سارے سوال بظاہر کافی فارمل سے تھے، لیکن اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ واقعی خزران کی ترجیحات' اس کے شب و روز کے متعلق سننا چاہتا ہے۔

"بس دن کا وقت کالج' دوپہر کے وقت سے رات گئے تک بچوں کے ساتھ مصروف' ماحول یہاں کا بہت پرسکون اور اچھا ہے۔ فارغ وقت کبھی ٹی وی دیکھتے' کبھی کتابیں پڑھتے گزر جاتا ہے۔" وہ تفصیل بتانے لگی۔

"اتنی فارغ رہتی ہو تو کبھی بات بھی کر لیا کرو۔" وہ بے ساختہ شکوہ کر بیٹھا۔

"میں اپنی عادتیں خراب نہیں کرنا چاہتی۔" وہ مسکرانے لگی۔

"بہت عجیب ہو۔" وہ سنجیدہ لہجے میں بولا تو خزران حیران ہو گئی۔

"کیا مطلب؟"

"مجھ سے جھگڑا کرنا ہو تو اتنے اپنوں کے سے انداز میں ہو کہ ایسے، تو سارہ بھی نہیں لڑتی۔ لیکن جب مجھے کسی معاملے میں تمہاری مدد چاہیے ہو' کچھ مشورہ کرنا ہو یا تم سے کچھ شیئر کرنا چاہوں' تم اتنی دور کھڑی دکھائی دیتی ہو جیسے دو اجنبی۔"

"ایسا ہمیشہ سے تو نہیں ہے عازم۔" اس نے فوراً کہا۔ "وقت اور حالات کے ساتھ تبدیل ہونا پڑتا ہے۔ اب وہ وقت نہیں ہے کہ تم گھنٹوں مجھ سے فون پر گپیں لڑاؤ۔"

"بنا سوچے کچھ بھی بول دیتی ہو۔ تمہارا مطلب ہے میں تمہیں بہکانا چاہتا ہوں یا ٹائم پاس کرنا چاہتا ہوں۔" وہ سخت برا مان گیا۔

"میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ لیکن تم سے فون پر لمبی لمبی باتیں کرنا بھی میں بالکل صحیح نہیں سمجھتی۔"

"مشکل میں کسی دوست کی مدد چاہنا اور بات ہے اور لمبی لمبی گپیں لگانا اور۔۔۔ لیکن خیر تم تو کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتیں۔ تمہاری اس ضد کی وجہ سے میرا بہت وقت ضائع ہوا لیکن آج کے بعد نہیں۔ آئندہ تمہاری پریشانیوں میں اضافے کا باعث کم از کم عازم حیدر کی ذات نہیں ہو گی۔ اپنا خیال رکھنا۔ اللہ حافظ۔"

عازم کا انداز اتنا قطعی اور ٹھوس تھا کہ خزران نے اپنا دل ڈوبتا محسوس کیا۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا۔۔۔ اور وہ جان ہی نہیں سکتا تھا کہ جب کسی عورت کو ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ اس کی محبتوں کے صلے میں صرف درد اس کی جھولی میں ڈال دیا جاتا ہے تو وہ تکلیف کی کیسی انتہاؤں پر پہنچ جاتی ہے۔ اندر کی توڑ پھوڑ جب لاوے کی صورت ابلتی ہے تو کوئی برائی' برائی نہیں لگتی' ہر انتقامی کارروائی جائز اور ہر منفی اقدام اپنا حق محسوس ہوتا ہے یاسر کی دھوکا دہی سے چوٹ کھائی خزران نے اب تک ہر مرحلے پر خود کو نارمل رکھا تھا۔ ہر وقت خود کو مصروف رکھتی۔ وہ چاہتی تھی کہ اب اپنی محرومیوں پر سوچ بچار کرنے کے بجائے وہ صرف اپنے بچوں پر دھیان دے۔ عازم کے دوستی کے لیے بڑھائے ہاتھ کو بھی اس لیے جھٹک دیا کہ اب وہ اپنے خیالات میں کسی قسم کی اکھاڑ پچھاڑ کی ہرگز متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ عازم تو پھر اس کی پہلی محبت تھا۔ اگر وہ اپنے دل کو اس کی طرف مائل ہونے سے نہ بچا سکی تو۔۔۔

عازم کی تو عادت تھی کہ اکثر آتے جاتے مذاق کے انداز میں کوئی شگفتہ جملہ کہہ جاتا یا ہلکا پھلکا اظہار کر جاتا تو وہ گھنٹوں خود کو اس جملے کے سحر میں جکڑا محسوس کرتی۔ عازم سے اپنا ذہن ہٹانے کے لیے گھنٹوں خود سے لڑتی' اپنے حالات اور بچوں کی طرف دیکھ کر اپنے ضمیر کو جگانے کی کوشش کرتی۔ عازم کے لیے بے اختیار لپکتے اپنے دل کو کوئی جتن کر کے مناتی۔ اور آج وہ اس سے ناراض ہو گیا تھا تو خزران کے دل کو ایک لمحے کے لیے قرار نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی اس نے زبردستی خود کو فون کرنے سے باز رکھا۔ اور ایسے وقت

میں جبکہ اس کی بیوی بھی گھر میں نہیں تھی۔ جو بھی ہو، وہ ایک مردِ تھا... خزران ایک حتمی فیصلے پر پہنچ کر عازم کی ناراضی کا بوجھ دل پہ لیے وہاں سے اٹھ گئی۔

✵ ✵ ✵

دو ماہ مزید گزر گئے۔ اس دوران وہ تقریباً" تین چار مرتبہ لاہور ہو آئی۔ لیکن عازم سے ایک بار بھی سامنا نہیں ہوا۔ ان ہی دنوں ایک دن سمیعہ بھابھی نے فون پر بتایا کہ عازم نے سارہ کو طلاق دے دی ہے۔
"کیا...؟" خزران کی حیرت سے چیخ نکل گئی۔
"طلاق" کا لفظ کتنا تکلیف دہ اور اذیت ناک ہوتا ہے... یہ اس سے بہتر کون جان سکتا تھا... پھر عازم اور سارہ کی طلاق... جانے بھابھی اور بھی کیا کچھ کہتی رہیں... وہ شدید صدمے سے دو چار کچھ بھی سن نہیں پائی۔
"تو تم بھی عام مرد نکلے عازم... کیا فرق رہا تم میں اور یاسر میں... اور کیا فرق ہے مجھ میں اور سارہ میں... اسے بھی ایک ایسے قصور کی سزا ملی جس میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ زندگی میں دو ہی مردوں پر بھروسا کیا اور انہی دو کو محبت کے قابل بھی جانا، لیکن یاسر کی بے وفائی کے بعد اس بات کا تو گمان بھی نہیں کیا تھا کہ ایک دن عازم بھی ویسا ہی کرے گا۔ شاید اس معاملے میں میرا نصیب ہی برا ہے یا شاید دنیا کا ہر مرد ہی برا ہے... مجھ سے لمبی بات کرنے کے لیے مہینوں سے وقت مانگ رہے تھے، تو یہ کہنا چاہتے تھے... طلاق کا مشورہ مانگ کر اپنے خیالات مجھ تک پہنچانا چاہتے تھے۔"
وہ خیالوں میں گم دیر تک ایسی ہی باتیں سوچے چلی گئی۔ البتہ ایک بات پر بار بار شکر ادا کیا کہ اچھا ہوا عازم سے دوستی پر آمادگی ظاہر نہیں کی تھی ورنہ ایسے حالات پیدا ہونے کی ذمہ دار خود کو ٹھہراتی رہتی۔

✵ ✵ ✵

بچوں کے اسکول اور اس کے کالج کی چھٹیاں ہو گئیں تو وہ سب لاہور آ گئے۔ خزران اور بچوں کو بھی دو ماہ کا آرام مل گیا تھا۔ ہفتہ بھر ہی گزرا تھا اسے آئے کہ ایک دن فضہ بھابھی اچانک اس سے ملنے کے لیے آ گئیں۔
"تم تو فون تک کرنے کی زحمت نہیں کرتیں۔ اماں نے کہا خود جا کر خزران کو لے آؤ۔"
"سوری بھابھی، میں بس ایک دو روز میں آنے ہی والی تھی۔ پھپھو کی طبیعت اب کیسی ہے؟" وہ انہیں ساتھ لیے کمرے میں آ گئی۔
"شکر ہے... اب تو بہت بہتر رہتی ہے... تم سناؤ فی الحال تو یہیں ہو ناں؟"
"جی بھابھی! دو مہینے یہیں ہوں۔"
"تو ٹھیک ہے، پھر اس خوشی میں جلد از جلد کوئی دن طے کرو۔ تمہیں کھانے پر انوائیٹ کرنے آئی ہوں۔"
فضہ جب عرفان کی دلہن بن کر سنجیدہ پھپھو کے گھر آئیں تو انہوں نے خزران کا تعارف یہ کہہ کر کروایا کہ یہ تمہاری دیورانی ہے۔ تب عازم اور اس کا رشتہ ہو چکا تھا۔ اس لیے فضہ بھی کبھی کبھار اسے دیورانی کہہ کر بلا لیا کرتیں... بہر حال وہ خطاب تو یاسر سے شادی کے بعد خود بخود چھن گیا... لیکن خزران کا فضہ بھابھی سے دوستی کا رشتہ جوں کا توں قائم تھا۔ بہت دیر بھابھی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے بالآخر خزران نے خود ہی عازم اور سارہ کی طلاق کا موضوع چھیڑ دیا۔
"ہاں اب تو بات پرانی بھی ہو گئی۔" فضہ نے ایک آہ بھری۔
"ایسا کیا ہوا تھا بھابھی کہ نوبت علیحدگی تک آ پہنچی؟"
"بس خزران! ہمیں تو خود سمجھ میں نہیں آیا کہ کب ان کے معمولی معمولی جھگڑے اتنی سنجیدہ نوعیت اختیار کر گئے۔"
"پھوپھو اور پھوپھا نے بھی معاملہ سلجھانے کے لیے کچھ نہیں کیا؟"
"جب میاں بیوی ہی آپس میں مصالحت کو تیار نہیں تھے، وہ بے چارے... کیا کرتے؟"
"اور عازم... وہ کہاں ہے آج کل؟" خزران پوچھے بنا نہ رہ سکی۔
"یہیں ہے... دن میں اپنے شوروم پر ہوتا ہے۔

رات کو کھانا ہماری طرف کھاتا ہے۔ بس سونے کے لیے اپنے گھر چلا جاتا ہے۔"

"کیا لگتا ہے بھابھی! اس معاملے میں کون قصوروار تھا۔" دل کے بہت اندر ایک من چاہی خواہش بکل مارے بیٹھی تھی کہ کاش کوئی کہہ دے عازم مظلوم تھا اور سارہ قصوروار۔۔۔

"میرا خیال ہے اگر عازم چاہتا تو اس رشتے کو قائم رکھ سکتا تھا۔" فضہ بھابھی نے بہت سوچ سوچ کر الفاظ کا چناؤ کیا۔ خزران کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ وہ چپ چاپ بیٹھی رہ گئی۔ اگلے روز الماری میں کپڑے رکھ رہی تھی جب وہ اچانک ہی اس کے کمرے میں چلا آیا۔

"تم۔۔۔؟" وہ بالکل گڑبڑا گئی۔ عازم ہنستے ہوئے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ڈر تو ایسے گئیں جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔"

"کیا مطلب، چوری پکڑی گئی؟" وہ خفا سی اپنے کام میں لگی رہی۔

"بھئی جب کوئی کسی کے بارے میں سوچ رہا ہو اور وہ اچانک سامنے آجائے تو کچھ ایسا ہی ردعمل ہوتا ہے۔" اس نے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھ کر مزے سے ٹیک لگائی۔

"تمہارے بارے میں سوچتی ہے میری جوتی۔" وہ ٹھیک ٹھاک غصہ کھا گئی۔ "اور یہ کیا تم سیدھے میرے کمرے میں گھس آئے۔ شرم نہیں آتی۔ سمیعہ بھابھی کیا سوچیں گی۔۔۔ چلو اٹھو یہاں سے۔۔۔"

"بہت ناراض ہو۔۔۔؟" وہ اسے بغور دیکھنے لگا۔

"میرا تم سے روٹھنے منانے کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ زیادہ سوچو مت۔۔۔" وہ سنجیدہ ہو گئی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ کزن کا رشتہ تو ہے۔ ماموں زاد کی حیثیت سے بات سن لو۔"

"کہو۔۔۔؟" خزران نے کمرے کی چوکھٹ سے کندھا ٹکاتے ہوئے بدستور روکھے لہجے میں کہا۔

"کیا تم نہیں جاننا چاہتیں کہ میں نے سارہ کو طلاق کیوں دی؟"

"تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔۔۔ میں کیا کروں گی جان کر۔۔۔ ویسے بھی اب کیا فائدہ۔۔۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔"

"ہاں، لیکن میرے حساب سے تمہارے لیے جاننا بہت ضروری ہے۔" وہ اب اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"کیوں۔۔۔؟" وہ چونکی۔

"کچھ دنوں تک خود ہی جان لوگی۔" اس نے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

"اب اس کا کیا مطلب۔۔۔؟" وہ الجھی الجھی چند قدم آگے آئی۔

"اگر تمہیں ہماری آخری گفتگو یاد ہو تو میں نے کہا تھا کہ تمہاری ضد کی وجہ سے میرا بہت وقت ضائع ہوا ہے۔ حیرت ہے تم نے اب تک غور نہیں کیا کہ میں نے ایسا کیوں کہا تھا؟" وہ جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ایڑیوں پہ گھوما تھا اور اب سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ "اب بھی یہی کہوں گا بے کار کی ضد چھوڑو۔۔۔ خود پر پابندیاں لگانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ذہنی مریضہ بن جاؤ گی۔ نارمل زندگی گزارنے کے بارے میں سوچو، آزاد ہو تو آزادی محسوس بھی کرو۔"

وہ کچھ مبہم، کچھ ظاہری سی گفتگو کر کے باہر نکل گیا۔ جبکہ وہ سوچوں کے گرداب میں پھنس گئی۔ "تو کیا اس دن وہ سارہ کو طلاق دینے کا فیصلہ کر چکا تھا اور وہ اس سلسلے میں مجھ سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ میں سختی سے اسے طلاق کے فیصلے سے روکتی تو ہو سکتا ہے وہ سارہ کو نہ چھوڑتا۔۔۔ تو کیا میں قصوروار ہوں؟"

وہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی اور کڑیاں ملانے لگی۔ "اور اس بات کا کیا مطلب ہے کہ میں خود پر پابندیاں لگانا چھوڑ دوں۔ اب اس بات کا کیا مطلب۔۔۔ اور۔۔۔" وہ چونکی۔۔۔ "اور اس نے کہا کہ نارمل زندگی گزارنے کے بارے میں سوچو۔۔۔ تو کیا اب وہ مجھ سے کوئی توقع باندھنے کی سوچ رہا ہے۔" اچانک الجھی گرہ سلجھنے پر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"ہرگز نہیں۔۔۔ میں اس جیسے خود غرض اور دوغلے انسان سے ہرگز رشتہ نہیں جوڑ سکتی۔ اب تو تمہارے

چہرے پر پڑا نقاب اُتر چکا ہے عازم۔۔۔ میں مسائل سے بھری زندگی کا یہ کوہ ہمالیہ اکیلے سر کرلوں گی' لیکن تمہارا ساتھ' تم بھیک میں بھی مانگو تو نہیں دوں گی۔ تم آج سے خود کو میری سوچوں سے بھی بے دخل سمجھو۔۔۔ تمہارے' نام سے جڑنا مجھے موت تک قبول نہیں۔ کبھی نہیں۔۔۔" وہ جذباتی ہو کر رو پڑی' لیکن پھر خود ہی سختی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

☼ ☼ ☼

آج وہ دو ماہ بعد گجرات کے سفر پر رواں دواں تھی۔ عازم اس دن کے بعد دوبارہ جنید بھائی کے گھر نہیں آیا۔ اتنی کم مدت میں کیسے کیسے روپ دیکھ لیے تھے لوگوں کے۔۔۔ اعتماد' بھروسا اور خلوص جیسے الفاظ اپنے معنی کھو چکے تھے۔ اپنی احمقانہ سوچوں پر اس کا دل چاہتا خود کو بے وقوفی کا میڈل دے۔۔۔ رافع اور مناہل کو ان کے ددھیال سے دور نہ کرنے کی خاطر ان کے گھر سے چپکی رہی۔ جبکہ سال بھر ہونے کو آیا تھا۔ وہاں سے کسی نے پلٹ کر خبر بھی نہیں لی کہ جیتی ہو یا مر گئی۔ جاننے والوں سے البتہ خزران کو یہ خبر ملی کہ اس کے گھر چھوڑنے کے ایک ماہ بعد ہی یاسر اپنی نئی بیوی کو پاکستان لایا تھا اور کافی دھوم دھام سے ولیمہ کیا گیا تھا اور اب اس کی بیوی امید سے تھی۔۔۔ اف۔۔۔ وہ ایک جھرجھری لے کر کھڑکی کے پار گزرتے مناظر کو دیکھنے لگی۔ کیسی کیسی تلخ حقیقتوں کا زہر اپنے اندر اتارنا پڑتا ہے۔

کیسی حساس اور نازک ہوا کرتی تھی اماں ابا کے گھر' لاڈلی' ضدی اور حاوی ہو جانے والی۔۔۔ اور اب۔۔۔ ہر خوشی ہر آسائش کو اس نے خود پر حرام کرلیا تھا۔ دل تھا کہ خواہشات سے خالی گھر بنتا جارہا تھا۔ جانے اللہ تعالیٰ کو اس کی کون سی نیکی پسند آئی تھی کہ اس نے حوصلے' ہمت اور صبر کی دولت عطا فرمادی تھی۔ ورنہ اسے وہ دن بھی یاد تھے جب یاسر سے نئی نئی علیحدگی ہوئی تھی تو اسے ہر وقت مرنے' مارنے کی باتیں سوجھا کرتی تھیں۔۔۔

اسے گجرات آئے ڈیڑھ سال گزر گیا تھا' لیکن اس تیزی میں بھی ایک سکون' ایک ٹھہراؤ تھا اسی لیے وہ خوش تھی۔ مناہل اور رافع ایک درجہ اوپر کی جماعت میں آگئے تھے۔

وہ اس وقت بچوں کو ہوم ورک کروا رہی تھی جب سمیعہ بھابھی کا فون آگیا۔

"کام تو نہیں کررہی تھیں۔" انہوں نے پوچھ لینا مناسب سمجھا۔

"جی نہیں۔۔۔ آپ بتائیں بھیا کیسے ہیں؟"

"ہاں' وہ ابھی گھر کا کچھ سامان وغیرہ لینے باہر گئے ہیں۔ انہوں نے میرے ذمے ایک کام لگایا تھا' سوچا فارغ بیٹھی ہوں تم سے' تسلی سے بات کرلوں۔"

"خیریت بھابھی! کون سا کام۔۔۔؟" وہ چونکی۔

"وہ۔۔۔ دراصل تمہارے لیے ایک رشتہ آیا ہے۔" سمیعہ نے جھجک کر بات کا آغاز کیا۔ خزران نے جواباً خاموش رہ کر انہیں بات جاری رکھنے دی۔

"سنجیدہ پھپھو نے جنید کو گھر بلایا تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ تمہیں اپنی بہو بنانا چاہتی ہیں اور عازم کی بھی یہی مرضی ہے۔۔۔ جنید نے مجھ سے کہا کہ پھپھو کے پیغام سے تمہیں آگاہ کردوں۔" وہ بات مکمل کرکے اس کے جواب کا انتظار کرنے لگیں لیکن خزران بالکل خاموش تھی۔

"ہیلو۔۔۔ خزران! سن رہی ہو۔۔۔؟"

"جی بھابھی!"

"کیا ہوا' ایسے چپ کیوں ہوگئیں۔۔۔ جنید کا خیال یہ ہے کہ تمہیں اس بارے میں سوچنا چاہیے کیوں کہ بچے ابھی ناسمجھ ہیں۔ اگر اس اسٹیج پر تم کسی اچھے بندے کو اپنی زندگی میں شامل کرلو تو زیادہ مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ پھر عازم ہمارا دیکھا بھالا اور اپنا ہے۔"

"بھابھی! میں فیصلہ کرچکی ہوں کہ میں دوسری شادی نہیں کروں گی۔ میں الحمد للہ کسی کی محتاج نہیں ہوں۔ باعزت روزگار سے وابستہ ہوں۔ بلاوجہ اپنی پرسکون زندگی میں ہلچل کیوں پیدا کروں؟"

"پلیز خزران! جلدی میں کوئی فیصلہ مت کرو۔ اپنی عمر دیکھو اور سوچو کہ اکیلے یہ زندگی کیسے بسر ہوگی۔ یہ رشتہ تو جیسے اپنے گھر کی بات ہے۔" سمیعہ نے اپنی طرف سے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں بھابھی! میرا فیصلہ قطعی ہے اور جہاں تک عازم کی بات ہے تو آپ جانتی ہیں' وہ میرا منگیتر تھا۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ آپ' بھیا یا اور کوئی بھی اس رشتے کے بارے میں سنے گا تو فوراً" اس کے حق میں ووٹ دے گا' لیکن اگر آپ میری رائے پوچھیں تو میں اس سے شادی کے لیے کبھی ہامی نہیں بھر سکتی' بلکہ عازم کے علاوہ اگر کسی اور کا رشتہ آیا ہوتا تو شاید میں سوچنے کے لیے وقت بھی لے لیتی' لیکن عازم کے لیے بالکل نہیں۔" اس نے کھل کر اپنی رائے ان تک پہنچادی۔

"اوہ!" سمیعہ نے ذرا دیر کو کچھ سوچا۔ "ٹھیک ہے میں تمہارا جواب جنید کو بتادوں گی۔ اوکے پھر بات کروں گی تم سے۔"

"جی۔ ٹھیک ہے۔" اس نے فون رکھ دیا۔ "عازم سے شادی" وہ جملہ تھا' جس پر ماضی میں وہ لال گلابی ہوجایا کرتی تھی' لیکن آج اسی عازم کا ایک بار پھر رشتہ آیا تو انکار کرتے ہوئے لمحہ نہیں لگایا تھا۔ اس نے ایک آہ بھر کر تصور میں عازم کو مخاطب کیا۔

"اگر تم نے میرا ساتھ پانے کے لیے سارہ کو طلاق دی ہے تو میں کیا' اللہ بھی تمہیں معاف نہیں کرے گا۔ سارہ کی محبت کے مزار پر میں اپنی خوشیوں کا محل ہرگز کھڑا نہیں کروں گی۔"

شام کو جنید بھائی کا فون آگیا۔ وہ اسے ہر طرح سے سمجھانے لگے' لیکن خزران نے ہتھیار نہیں ڈالے اور صاف کہہ دیا کہ پھپھو کو میرا جواب پہنچادیں۔ جنید نے مجبوراً" اس کا انکار عازم اور پھپھو تک پہنچا دیا۔

تقریباً" ایک مہینے سے وہ لاہور نہیں گئی تھی۔ بھیا' بھابھی نے بہت بلایا کہ ایک چکر لگا جاؤ' لیکن وہ کسی نہ کسی بہانے ٹالتی رہی۔

ان ہی دنوں ایک بار پھر سمیعہ بھابھی رشتہ لے آئیں۔ جنید بھائی کے جاننے والوں میں سے تھے۔ ثاقب حسن نام تھا اور محکمہ زراعت کا اعلا افسر تھا۔ اس کی پہلی بیوی کا کچھ سال پہلے روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا تھا اور ایک پانچ سال کا بیٹا تھا۔

جنید نے اپنی طرف سے تسلی کرلی تھی۔ لوگ بہت اچھے اور خاندانی تھے۔ ثاقب کے متعلق بھی عمومی رائے بہت اچھی تھی۔ جنید بھائی چاہتے تھے کہ خزران اس مرتبہ سوچ بچار سے کام لے۔ خزران نے انہیں تو ہاں کہہ دی' لیکن فون بند کرنے کے بعد ذرا برابر توجہ کے قابل نہیں سمجھا۔ جب طے کرلیا کہ شادی نہیں کرنی تو بلاوجہ کیوں دماغ پہ بوجھ ڈالوں۔۔۔

✡ ✡ ✡

وہ چھٹی لے کر لاہور آئی ہوئی تھی۔ پہلا دن تو اس نے خوب آرام کرتے گزارا۔ اگلے روز بھابھی کے ساتھ شاپنگ وغیرہ کے لیے نکلنے کا پروگرام تھا' لیکن وہ دونوں ہی بچوں کو ہرگز ساتھ لے جانے کے موڈ میں نہیں تھیں۔ بھیا نے بھی آفس جانا تھا۔ لہٰذا انہوں نے طے کیا کہ بچوں کو فضہ بھابھی کے پاس چھوڑا جائے۔ جاتے وقت تو دونوں نے کھڑے کھڑے ہی بچوں کو چھوڑا' لیکن واپسی پر آئے تو فضہ بھابھی نے زبردستی دوپہر کے کھانے پر روک لیا۔ بلکہ کھانا وہ تیار کرچکی تھیں۔ سیدھے انہیں دسترخوان پر لا بٹھایا۔

"ارے بھابھی! آپ نے تو اچھا خاصا اہتمام کر ڈالا۔" خزران بری طرح شرمندہ ہوگئی۔ انہوں نے بریانی' کباب' قیمہ' سبزی جانے کیا کچھ بنا ڈالا تھا۔

"تم کون سا روز روز آتی ہو۔ پھر ہمارے گھر تو اور بھی کم کم آنے لگی ہو۔" سنجیدہ پھپھو نے شکوہ کناں لہجے میں کہتے ہوئے اسے دیکھا۔

"اچھا۔۔۔ اور سکینہ پھپھو یہ شکوہ کرتی ہیں کہ میں آپ کی طرف زیادہ آتی ہوں۔ ویسے اب تو لاہور ہی کم آتی ہوں۔" وہ مسکرائی۔

"گجرات اتنی دور بھی نہیں کہ تم مہینوں بعد چکر لگاؤ۔ پتا نہیں کب یہ بوڑھا وجود ٹھنڈا ہوجائے۔"

صورت تو دکھا جایا کرو۔" پھپھو کے مایوس 'افسردہ لہجے پر خزران کا دل مٹھی میں آگیا۔

"ایسی باتیں کیوں کررہی ہیں پھپھو۔۔ اللہ آپ کو لمبی عمر دے۔ اماں کے بعد میں آپ میں اور سکینہ پھپھو میں اماں کو دیکھتی ہوں۔" اس نے جذباتی ہو کر ان کا ہاتھ تھاما۔

"ماں بھی کہتی ہو اور دل میں ناراضی بھی رکھتی ہو۔" پھپھو ہولے سے مسکرائیں تو خزران چونک گئی۔

"کیسی ناراضی پھپھو۔۔ میں تو۔۔"

"تمہارے اور عازم کے حق کے لیے برسوں پہلے اگر تمہارے پھوپھا کو منالیتی تو بھائی جان تمہارا رشتہ یاسر سے، تو نہ کرتے۔۔ لیکن سب میری کوتاہی ہے کہ محض ایک دکان کے لیے تمہارے پھوپھا کو راضی نہ کرسکی۔۔ تم تو دربدر ہوئیں ہی۔ آج میرا عازم بھی اپنا درد دل میں چھپائے اکیلے زندگی گزار رہا ہے۔" انہوں نے ایک آہ بھر کر کہہ ہی دیا۔ خزران خاموشی سے بچوں کے لیے کھانا نکالنے لگی۔

"سارہ کی شادی کے بعد تو عازم اور بھی ٹوٹا ہوا لگتا ہے۔"

"سارہ کی شا۔۔" خزران نے بے تحاشا چونک کر سر اٹھایا۔

"سارہ کی شادی ہوگئی۔۔؟" وہ آنکھیں پھیلائے ایک ایک کو دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں سمیعہ نے نہیں بتایا۔" فضہ بھابھی حیران ہو کر سمیعہ کو دیکھنے لگیں۔

"میں نے تو جان بوجھ کر نہیں بتایا۔ میں نے سوچا۔ کہیں یہ سمجھے کہ سارہ کی شادی کا بتا کر شاید اسے دوبارہ عازم کے لیے قائل کرنے کی کوشش کررہی ہوں۔"

"ہوں!" فضہ نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

"اس کی شادی کو تو دو ماہ ہوگئے ہیں۔ اس کی والدہ کا دور کا رشتہ دار ہے۔ آج کل ملتان میں ہوتی ہے۔ وہاں اس کا سسرال ہے۔ پچھلے دنوں ایک شادی کے فنکشن میں ملاقات ہوئی۔ خوش اور مطمئن لگ رہی تھی۔"

فضہ بھابھی خود ہی دھیرے دھیرے بتانے لگیں۔ سب خاموشی سے بنا کوئی تبصرہ کیے سنتے رہے۔ خزران کی حالت تو سوا تھی۔ ایسی دھماکا خیز خبر پر اس کی سوچیں عجیب بے ربط اور اوندھی سیدھی ہو رہی تھیں۔

"میرا عازم بہت بدنصیب ہے۔ بچپن میں جتنا میرا لاڈلا ہوا کرتا تھا۔ آج قسمت نے اسے اتنا ہی دور اور اکیلا کردیا ہے۔ پردیس کی سختیاں بھی اسی کے نصیب میں لکھی تھیں اور اب یہاں ہے تو دو گھڑی مہمانوں کی طرح بیٹھ کر چلا جاتا ہے۔ اس کی خاموشی سے میرا دل چھلنی ہوتا ہے۔ اتنا صابر شاکر تو وہ کبھی بھی نہیں تھا۔ ہمیشہ ضد اور غصے سے بات منوانے والا آج میرے سامنے اپنا دل کھولنے کو بھی تیار نہیں۔"

وہ بولتے بولتے روہانسی ہو گئیں۔ عجیب سی اداسی ماحول میں در آئی تھی۔ خزران نے خود کو بولنے سے باز رکھا۔ کہتی بھی کیا۔

وہ کافی بوجھل دل لیے پھپھو کے گھر سے واپس آئی۔ شام کو جنید بھیا یہی موضوع لے کر اس کے پاس آبیٹھے۔ وہ تو لاہور آنے سے پہلے ہی اس بات کی توقع کررہی تھی۔

"تمہارے بچے ابھی چھوٹے ہیں خزران۔۔ کوئی بڑی تبدیلی آئی تو زیادہ سوال جواب نہیں کریں گے۔"

"لیکن بھیا! ضرورت ہی کیا ہے کسی تبدیلی کی۔۔ لگی بندھی نوکری ہے۔ اچھی خاصی آمدنی ہے۔ خدانخواستہ کسی کی محتاج نہیں۔۔ کیوں میں بلاوجہ بچوں کو ذہنی بے سکونی کا شکار کروں۔" وہ کھل کر بولنے کے لیے تیار ہو گئی تو جان گئی کہ بھیا کافی سنجیدہ ہیں۔

"تمہارے لیے تمہارے بچے اہم ہیں' اس لیے مسلسل ان ہی کے حوالے سے سوچ رہی ہو۔ میرے لیے تم بھی اہم ہو۔ میں بچوں سے پہلے تمہیں دیکھتا ہوں۔ آج امی اور ابا زندہ ہوتے تو شاید تمہاری کہیں شادی بھی کروا چکے ہوتے۔ اگر تم نے یونہی زندگی گزار دی تو بہت بڑا خلا رہ جائے گا تمہاری زندگی میں۔ جس کا

ابھی تمہیں احساس نہیں ہے۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے، دیکھو تو شریعت کا بھی یہی حکم ہے کہ بیوہ اور مطلقہ کا فیصلہ جلد سے جلد کردو۔" وہ اسے رسان سے سمجھانے لگے۔

"سارہ کے والدین نے طلاق کے محض سات، آٹھ ماہ بعد اس کی دوسری شادی کردی، کون ماں، باپ چاہیں گے کہ ان کی اولاد دکھی رہے۔ اب دیکھو جونہی تبدیلی آئی ماشاء اللہ وہ خوش باش ہے اور عازم کو دیکھو، کیسا اکیلا اور خاموش سا ہو گیا ہے۔" بھیا جانے کیوں عازم کے موضوع پر آگئے۔ خزران سے چپ نہیں رہا گیا۔

"اچھا ہے، اسے تو سزا ملنی ہی چاہیے۔ بے قصور بے چاری سارہ کو اپنی زندگی سے نکال دیا۔ آج اگر سارہ نئی زندگی میں خوش ہے تو یہ اللہ کی کرم نوازی ہے۔ اس پر۔ بندے دلوں سے کھیل جاتے ہیں، اوپر والا تو شکر ہے انصاف کرتا ہے۔"

وہ ناراض لہجے میں بولنے لگی۔

"اچھا بابا۔۔۔" جنید ہنس پڑا۔ "اب تم سے کون بحث کرے۔ میں تو ویسے بھی تم سے ثاقب حسن کی بات کرنے آیا تھا۔ بہتر ہوگا کہ اپنے معاملے میں ہر پہلو پر غور کرو۔ خود ثاقب کی بہنوں بلکہ ثاقب سے بھی بات کرسکتی ہو۔ تم اب زندگی کی اس سنجیدہ اسٹیج پر ہو کہ ڈائریکٹ بات کرنے کو کوئی بھی تمہاری بولڈنیس سے تعبیر نہیں کرے گا۔ میں نے ثاقب کو تمہارا نمبر دے دیا ہے۔ وہ تمہیں فون کرے گا۔ کیوں سمیعہ۔" انہوں نے بھابھی کی طرف دیکھا۔

"جی بالکل۔۔۔ ویسے بھی سنا ہے کہ ثاقب بہت سلجھا ہوا بندہ ہے۔"

"میں سوچ کر بتاؤں گی۔" وہ سر جھکائے ان کی ہر بات سن رہی تھی۔ ہولے سے بس اتنا کہہ پائی۔

☆ ☆ ☆

"ماما! آپ کو میری کلاس ٹیچر نے بلایا ہے۔" مناہل نے جوتے اتارتے ہوئے کافی سکون سے اطلاع دی لیکن خزران کا تو دل دھک سے رہ گیا۔

"کیوں ایسا کیا کردیا؟"

"اس کی ٹیچر نے مجھے بلایا تھا کلاس میں۔" رافع نے غٹاغٹ پانی کا گلاس چڑھا کر اطلاع بہم پہنچائی تو خزران سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"میم تاجیہ کہہ رہی تھیں، مناہل لائق تو بہت ہے۔ لیکن اس میں کانفیڈنس نہیں ہے۔ اسمبلی کی ایکٹویٹیز میں حصہ نہیں لیتی، کلاس میں زیادہ بولتی بھی نہیں ہے۔ اور خود سے سوال بھی کبھی نہیں کرتی۔ بوندو کہیں کی۔" آخر میں وہ اسے چھیڑنے سے باز نہیں آیا اور اس کی چھوٹی سے چٹیا زور سے کھینچ ڈالی۔ مناہل بے چاری کی چیخ نکل گئی۔

"مت کرو رافع! کیا بد تمیزی ہے۔ جاؤ یونیفارم چینج کرو۔ چلو بھاگو۔" خزران نے زبردستی اسے اندر دھکیلا۔

"ادھر آؤ منو!" اس نے پیار سے مناہل کو گود میں بٹھایا۔ چھ سال کی معصوم سی اس کی بچی۔ پتا نہیں کیوں اتنی سہمی سہمی سی رہتی تھی۔

"ماما! میرے فادر کون ہیں؟" مناہل نے اچانک پوچھا تو وہ بری طرح چونکی۔

"کیا مطلب۔ کس نے پوچھا تم سے۔؟"

"میم کہہ رہی تھیں۔ آپ کی ماما اگر بزی رہتی ہیں، تو آپ اپنے فادر کو بھیج دیں۔ رافع نے انہیں بتایا کہ ہماری ماما کالج میں پڑھاتی ہیں۔ اور ہمارے فادر ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔" مناہل نے ہاتھ اٹھا کر باقاعدہ جانے کا اشارہ بھی کیا۔ خزران نے پریشانی سے لب کاٹے۔ اس دوران رافع کمرے میں واپس آچکا تھا۔

"تمہیں ایسا جواب نہیں دینا چاہیے تھا رافع!"

"ماما! یہ تو پاگل ہے۔" رافع نے سر پیٹنے کی اداکاری کی۔ "میں نے میم کو تھوڑی ایسا کہا۔ وہ تو گھر آتے ہوئے یہ مجھ سے پوچھنے لگی تو میں نے اس کو بتایا۔ میم سے تو میں نے صرف "جی اچھا" کہا اور بس۔" وہ سیانوں کے انداز میں بتانے لگا تو خزران کو ہنسی آگئی۔

"واہ۔ میرا بیٹا تو بہت سمجھ دار ہے۔ اچھا یہ بتاؤ، کس نے تم سے کہا کہ تمہارے فادر ہمیں چھوڑ گئے

ہیں۔"

"وہ تو مجھے کب سے پتا ہے۔ جب ہم دادی کے گھر رہتے تھے۔"

"ہوں!" خزران نے اسے قریب بٹھایا۔ "تمہیں اپنے فادر یاد ہیں۔"

"ہاں، تھوڑے سے۔ ان کی بڑی سی پکچر ہمارے کمرے میں لگی ہوئی تھی۔ اور ایک بار وہ آئے بھی تھے۔ میری واٹر گن لائے تھے اور ہم جلو پارک گئے تھے ان کے ساتھ۔"

وہ اپنی یادداشت میں سے جن باتوں کو نکال رہا تھا وہ یاسر کی اس آخری چھٹی کی تھیں، جب وہ طلاق دینے سے کوئی پانچ، چھ ماہ پہلے آیا تھا۔ تب رافع ساڑھے پانچ سال کا اور منال ساڑھے تین سال کی تھی۔ منال کو تو وہ یاد بھی نہیں تھا اور رافع کے ذہن پر بھی دھندلے دھندلے نقوش تھے۔ رات کو ان کے سوجانے کے بعد وہ ایک بار پھر بے سکون ہوگئی۔ نیند کہیں دور جا بھاگی تھی۔ آج پھر وہ تھی اور ان گنت سوچیں۔

"طلاق یافتہ عورت کے بچے دنیا والوں کو کیا جواب دیتے ہوں گے کہ ہمارا باپ کہاں ہے۔"

"کیا میرے بچوں کے لیے باپ کا ہونا بہت ضروری ہے۔ کیا بھیا صحیح کہتے ہیں کہ نا سمجھی کی اس عمر میں ان کے لیے کسی مرد کو باپ کے روپ میں اپنا لینا آسان ہوگا۔ یہاں کئی ایک کولیگز جواب بہت اچھی دوست بن چکی تھیں اور اس کی ذاتی زندگی کے متعلق جان چکی تھیں۔ سب کا یہی کہنا تھا کہ یہی مناسب وقت ہے وہ کسی اچھے اور بھروسے مند انسان کو اپنی زندگی میں شامل کرلے۔

"اچھا اور بھروسے مند۔" خزران نے ایک آہ بھری۔ "کبھی ان دو خصوصیات پر صرف عازم ہی پورا اترتا تھا۔ لیکن کیسی ہوا چلی تھی۔ اس نے تو جب قدم قدم چلنا سیکھا تب بھی عازم کی ہی انگلی تھامی۔ بچپن کی شرارتیں، لڑکپن کے لڑائی جھگڑے اور نوجوانی کا وہ نیا نیا محبت کا سفر، سب مرحلے اس کے ساتھ طے کیے تھے۔

اپنا مستقبل، بچوں کا مستقبل، کوئی مستقل ٹھکانا، کسی کا سہارا۔ عازم کا پریشان کردینے والا رویہ۔ سب گڈمڈ ہونے لگے۔

عازم نے سارہ کا دل توڑا تھا۔ اس نے سارہ کے ساتھ وہی کیا تھا جو یاسر نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ نہیں میں عازم کو قطعاً" معاف نہیں کروں گی۔ بتادوں گی اسے کہ خود غرض انسان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ اور تم میں خود غرضی بھی ہے، انسانیت کا فقدان بھی۔

اگلی صبح اس نے سمیعہ بھابھی کو فون کیا تھا اور ثاقب کے لیے ہاں کہہ دی تھی۔ ثاقب کے معاملے میں اس نے سب کچھ اللہ کے سپرد کردیا۔ اب وہی جانے، اس بار اس کے حصے میں خوشیاں ڈالنی ہیں یا پھر کوئی امتحان.....!

☼ ☼ ☼

شاور کی تیز آواز میں اسے ایک بار گیٹ بجنے کا وہم سا ہوا تھا۔ باہر آکر جب وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بال سلجھا رہی تھی، ایک مرتبہ پھر بیل بجی۔ وہ برش ہاتھ میں لیے دوپٹا کندھوں پر پھیلاتی باہر آگئی۔

"کون؟" اس نے پوچھنے کے ساتھ ہی تھوڑا سا گیٹ کھولا۔

"عازم حیدر!" خزران کا ہاتھ وہیں رہ گیا اور عازم گیٹ کے بیچوں بیچ آکر ٹھہر گیا۔

"اندر آسکتا ہوں؟"

عازم بنا جواب کا انتظار کیے اندر آگیا۔

"تم یہاں کیسے آئے؟" وہ گھبرا کر اس کے پیچھے آئی۔

"اندر چل کر بتاؤں گا۔ کافی لمبا سفر کرکے آیا ہوں۔ بری طرح تھک چکا ہوں۔ بھوکا بھی ہوں۔" وہ آرام سے برآمدہ عبور کرکے بڑے کمرے میں آگیا۔ خزران تیز قدموں سے اس کے پیچھے پہنچی۔ اس نے کچن میں آکر پانی کا گلاس بھرا اور خاموشی سے عازم کو تھما دیا۔ وہ اس دوران صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔

"تھینکس۔" اس نے گلاس لے کر ایک ہی

سانس میں چڑھا لیا اور تھکے تھکے انداز میں ہاتھوں سے پیشانی ملنے لگا۔

"کھانا لاؤں؟"

"نہیں۔ یونہی کہہ رہا تھا۔" وہ ایک دم سنجیدہ سا فرش کو گھورے جا رہا تھا۔

"چائے بناتی ہوں۔"

"مجھے نہیں۔" عازم نے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ جانے نظریں کیوں نہیں اٹھا رہا تھا۔ ایک بار بھی خزران کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ صوفے پر ہلکا سا ٹک کر بیٹھ گئی۔ کئی لمحے خاموشی سے بیت گئے۔ خزران نے کچھ بھی خود سے نہ پوچھنے کی جیسے قسم کھالی۔

"بہت خوش ہو نئے رشتے سے؟" عازم نے اپنی سرخ سرخ شکوہ بھری نگاہ سے لمحے بھر کو اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ خزران کا دل تو بڑی زور سے دھڑکا لیکن بنا کوئی جواب دیے نیچے دیکھتی رہی۔

"بتا کر کے چھوڑو گی مجھے؟" صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے وہ اپنی نظریں اس پر گاڑے بیٹھا تھا۔ خزران گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ نہ ایسی صورت حال کا تصور کیا تھا نہ اس کے سوالوں کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار۔ کیا کہتی۔

"مزید برباد ہونے کی سکت نہیں ہے مجھ میں۔ جان سے مار دو' پھر کر لو مزے سے شادی۔ جہاں دل چاہے۔"

وہ اچانک ہی عین اس کے پیچھے آکھڑا ہوا تھا۔ نہایت قریب سے اس کی زبان نے شعلے اگلے تو خزران کا دل چڑیا کی طرح سہما۔ گھبرا کر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ عازم نے اپنا مضبوط ہاتھ اس کے کندھے پہ رکھ کر پوری طرح اس کا رخ اپنی جانب موڑا۔ خزران نے کانپتی پلکیں اوپر اٹھائیں۔ وہ آگ برساتی آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہوئی لیکن دیوار سے ٹکرا گئی۔

"مجھ سے شادی کے لیے انکار کیا تو میں سمجھا شاید بچوں کی خاطر عمر بھر اکیلے گزارنے کا تہیہ کرلیا ہے۔ اس ثاقب حسن میں کون سے ہیرے جڑے ہیں جو شادی کے لیے رضامند ہو گئیں۔ کون لگتا ہے وہ تمہارا۔ کب سے جانتی ہو اسے۔؟" وہ اس وقت بالکل جنونی سا ہو رہا تھا۔

"نن۔ نہیں جانتی اسے۔ کبھی دیکھا تک نہیں۔ تت۔ تم بات تو سنو عازم!" وہ ایک دم رو دینے والی ہو گئی۔ موٹی موٹی آنکھیں پانی سے لبریز تھیں۔

"بکو۔ کیا کہنا ہے۔" وہ تھوڑا سا پیچھے ہٹا۔ سمجھ گیا کہ خزران اس کے غصے کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں پا رہی۔

"میں اسے بالکل نہیں جانتی۔ جنید بھیا کے توسط سے رشتہ آیا تھا۔ بھیا کی خواہش ہے کہ میں شادی کرلوں۔ وہ نہیں چاہتے کہ میں ساری زندگی اکیلے گزار دوں۔" خزران نے خود کو نارمل کر کے جواب دینے کے قابل بنایا۔

"ہاں تو سب یہی چاہتے ہیں اسٹوپڈ! کہ تم شادی کرلو۔ پھر مجھے چھوڑ کرنا ثاقب کیوں؟" وہ زچ ہو کر پھر سے اونچا بولنے لگا۔

"نہیں کرنی تم سے شادی۔" وہ بھی جھنجلا گئی۔ "تم سب جانتے ہو' پھر کیوں انجان بن رہے ہو۔"

"کیا خاک جانتا ہوں میں۔ سعیدہ بھابھی اور جنید کے ذریعے انکار اماں تک پہنچا دیا۔ وجہ کیا تمہارے فرشتے آکر بتا گئے مجھے؟" وہ برس پڑا۔

"جانتی ہوں عازم! کہ تم مجھے بہت بے وقوف سمجھتے ہو۔" وہ ایک دم طیش میں آگئی۔ "لیکن اس بھول میں مت رہنا کہ میں تمہارے دل کی بات نہیں جان سکتی۔ مجھ سے کچھ چھپا نہیں ہے۔" وہ سب بھول بھال جیسے جنگ پہ آمادہ ہو گئی۔ "تم نے سوچ بھی کیسے لیا کہ سارہ کو طلاق دے کر تم میرا رشتہ مانگو گے اور میں ہامی بھرلوں گی۔ یاسر نے مجھے ایک عورت کی وجہ سے چھوڑ دیا اور تم نے .... تم نے مجھے حاصل کرنے کے لیے سارہ کو طلاق دے دی۔ کیا تماشا سمجھ رکھا ہے ہم عورتوں کی زندگی کو۔" وہ پوری شدت سے چلائی لیکن اس سے بھی زیادہ شدت سے عازم کا طمانچہ اس کے گال پر پڑا۔

"شٹ اپ!" وہ آگ بگولا اسے دیکھ رہا تھا۔
خزران حیرت اور صدمے سے گنگ دیوار سے لگ گئی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ عازم پلٹ کے گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اپنی حرکت پر سخت پشیمانی محسوس کرتے ہوئے وہ اب لب چبا رہا تھا۔ بالکل ہی بے ساختہ ہاتھ اٹھ گیا تھا۔

عازم نے ایک نظر خزران کو دیکھا۔ وہ چہرا ہاتھوں میں دیئے ابھی بھی رو رہی تھی۔ اس نے کچھ دیر رک کر سوچا پھر کچن میں آکر پانی کا گلاس بھرا اور واپس آیا۔ اس کے قریب اکڑوں بیٹھ کر نرمی سے اس کے ہاتھ اس کے چہرے سے ہٹائے اور گلاس آگے بڑھایا۔

"آئی۔ ایم سوری رازی! ویری سوری۔ پانی پی لو۔" اس نے خود ہی گلاس خزران کے منہ سے لگایا۔ اس نے ایک گھونٹ پی کر رخ پھیر لیا۔

"چلو اٹھو یہاں سے۔" وہ اسے بازو سے پکڑ کر اٹھانے لگا تو خزران خود ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

عازم اب اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

"ملائیشیا سے آنے کے بعد میں نے کئی مرتبہ تم سے کہا کہ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اپنے پرسنل شیئر کرنا چاہتا ہوں لیکن تم۔" وہ ذرا دیر کو رکا "بس یہی تھی ہماری انڈر اسٹینڈنگ اور ایک دوسرے کو جان لینے کے دعوے کہ میں نے تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو تم نے اسے گمراہ کرنے اور بہکانے سے تعبیر کیا۔ بس اتنا ہی جانتی ہو مجھے۔ لیکن اب۔" اس نے انگلی اٹھا کر حتمی لہجے میں سیدھا خزران کی آنکھوں میں دیکھا۔ "اب میں جو کہوں۔ چپ چاپ اپنے کان کھول کر سنو۔ بیٹھو یہاں۔" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا تو وہ کسی معمول کی طرح خاموشی سے جا کر بیٹھ گئی اور عازم بھی عین اس کے سامنے کرسی گھسیٹ کر ٹک گیا۔

"اب شروع سے سنو احمق لڑکی! کہ میں تم سے کیا کہنا چاہتا تھا۔ کچھ ایسا جسے تم تک پہنچانے میں مجھے دو سال لگ گئے۔ بلکہ تب جب میرے پاس کچھ باقی نہیں رہا۔ بہت سے کام جو میں تم جیسی مخلص اور ہمدرد کے مشورے سے کرنا چاہتا تھا جو مجھے اکیلے اپنے بل پر بے پناہ رسک لے کر کرنا پڑ گئے۔ جہاں تک تمہاری بات ہے تو بھول جاؤ کہ اب تم میرے علاوہ کسی اور کی ہو سکتی ہو۔" وہ کچھ اور کہتے کہتے اچانک رکا۔ "خیر! اس پر بعد میں بات کریں گے۔" وہ شاید ایک بار پھر جذباتی ہونے لگا تھا لیکن خود ہی اپنے آپ کو روکا۔ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اس نے خود کو بولنے کے لیے تیار کیا۔

"سارہ کو طلاق دینے کا فیصلہ میں نے ملائیشیا میں ہی کر لیا تھا۔ بہت پہلے۔" اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا اور خزران پہلے ہی جملے پر چونک گئی۔

"بہت پہلے کیوں؟"

"میں ہمیشہ کے لیے ملائیشیا چھوڑ کر دوبارہ پاکستان آیا' صرف اسی منصوبے پر عمل درآمد کرنے کے لیے۔ میں نے اپنی لگی بندھی بہت عمدہ جاب چھوڑ دی۔ کیونکہ پاکستان آنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ البتہ سارہ میرے ایسے کسی منصوبے سے قطعاً لاعلم تھی بلکہ اسے اب تک نہیں پتا تھا کہ ہماری علیحدگی کے پیچھے اصل وجہ کچھ اور تھی۔ مجھے تم سے یہ سب شیئر کرتے ہوئے بہت ہمت درکار ہے خزران! شاید کچھ معاملات میں مرد ہوتے ہی تنگ نظر اور روایتی ہیں۔ میں بھی عام مردوں سے مختلف تو نہیں ہوں۔" وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسائے بہت کچھ کہنے کو تیار لگا۔

"جب تمہاری یاسر سے شادی ہوئی' میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھ پر غم کا کیسا پہاڑ ٹوٹا تھا۔ وہ ایک سال میں موت اور زندگی کی کشمکش میں جھولتا رہا۔ تمہاری جدائی کے صدمے کو جھیلتے جانے کب دمے کا مریض بن گیا' پتا ہی نہیں چلا۔ کھانستے کھانستے سینہ چھلنی ہو جاتا اور میں بے دم ہو کر گر پڑتا۔ کبھی کبھی یہ حالت ہو جاتی کہ مصنوعی آکسیجن دلانے کے لیے آدھی رات کو دوست ایمرجنسی میں لیے پھرتے۔ جیسے تیسے ایک سال گزرا اور میں پہلی چھٹی پر پاکستان آیا۔ اماں اور ابا کو پہلا شک یہی گزرا کہ شاید میں نشے کا عادی ہو چکا ہوں۔ لیکن جب میں نے طبیعت کا بتایا تو انہوں

نے میرے۔ مسئلے کا حل شادی نکالا اور دونوں دنوں میں
نہ صرف سارہ سے رشتہ بلکہ شادی بھی انجام پا گئی۔
میں یہ تو نہیں کہتا کہ پہلے دن سے ہی میں نے سارہ کو
اپنی پلکوں پہ بٹھالیا تھا یا پہلی ہی نظر میں وہ میرے دل
میں سما گئی تھی۔ مجھے اس کا عادی ہونے میں کچھ وقت
لگا تھا لیکن میں نے اس پر کبھی یہ بات ظاہر نہیں ہونے
دی اور وقت گزرنے کے ساتھ وہ اپنی اچھائیوں کی
بدولت میرے دل میں جگہ بناتی گئی۔ بظاہر تو سب کچھ
بہت نارمل انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ لیکن میری
بدنصیبی نے شاید میرا پیچھا نہ چھوڑنے کی قسم کھالی
تھی۔

ہماری شادی کو تین برس گزر گئے تھے لیکن ابھی
تک اولاد کی خوشی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ مجھے تو
حالانکہ ابھی یہ معاملہ زیادہ سنجیدہ نوعیت کا نہیں لگا
لیکن سارہ کو کافی تشویش لاحق تھی۔ میں اس سے کہتا
ابھی وقت ہی کتنا گزرا ہے لیکن وہ میری ایک نہیں
سنتی اور ڈاکٹروں کے پاس جانا شروع کردیا۔ تقریباً
سب ہی ڈاکٹرز نے ہم دونوں کے ٹیسٹس تجویز کیے
لیکن میں اپنی آفس ٹائمنگ اور کچھ سستی یا لاپروائی
کہہ لو کہ اس کام کے لیے وقت نہیں نکال پایا اور وہ
اپنی ٹریٹ منٹ وغیرہ میں مگن رہی۔

پانچویں سال کہیں جاکر سارہ کے انتہائی فورس
کرنے پر بالآخر میں نے اپنا ٹیسٹ کروایا تو یہ بری خبر بم
بن کر ہم دونوں پہ پھٹی کہ پرابلم مجھ میں ہے۔ شروع
شروع میں میں نے علاج وغیرہ کو کافی سنجیدگی سے لیا،
اور متواتر کئی ٹیسٹ کروانے کے بعد رپورٹ میں
بہتری کے آثار بھی دکھائی دیے لیکن اولاد کی خوشی
پھر بھی نصیب نہیں ہو رہی تھی۔ سارہ اب بہت
مایوس اور ناامید رہنے لگی تھی۔ اسے تو کسی علاج کی
ضرورت تھی نہیں اس نے بس عبادت اور وظائف
وغیرہ کا سہارا لے لیا۔ لیکن علاج اور دعاؤں کا بھی کوئی
نتیجہ نہ پاکر وہ پھر مایوسی میں ڈوبنے لگی۔

وہ اس معاملے کو اتنی سنجیدگی سے لینے لگی تھی کہ
شاید اب یہ اس کے لیے زندگی اور موت کا سوال بن گیا
تھا۔ سر درد اور ہائی بلڈ پریشر جیسے اسے چپک ہی گئے
تھے۔ وہ فرسٹریٹڈ ہو کر مجھ پر بھی چلانے لگی تھی۔ کبھی
گھنٹوں ــــ روتی۔ اسے بہلانے کے لیے میں نے
ہر سہولت گھر میں مہیا کی لیکن اس کا دل ہر چیز سے
اچاٹ ہو چکا تھا۔ میں اس کا ذہن بٹانے کے لیے
ہوٹلوں اور تفریحی مقامات پر لے جاتا، فلمیں دکھاتا
لیکن وہ ہر جگہ غائب دماغ ہی رہتی۔ نہ اسے کسی اور
چیز میں دلچسپی تھی نہ کسی قسم کا شوق اور لگن دکھائی
دیتا۔ میں سخت پریشان تھا۔ اسے نارمل رکھنے کی ہر
تدبیر بے کار گئی تھی۔ وہ زندہ تھی لیکن زندگی کی رنگینی
و رعنائی سے قطعاً عاری۔

ہاں یہ میں مانتا ہوں کہ مجھ سے وہ پیار بھی کرتی تھی،
میرا خیال بھی رکھتی تھی اور کبھی کبھی اس بات پر حد
سے زیادہ پشیمان بھی ہوتی تھی کہ وہ اپنے رویے سے
میرا دل دکھا رہی ہے۔ کبھی وہ بچے کے لیے روتی تو کبھی
میرے لیے۔ کوشش تو کرتی تھی کہ اپنا دکھ مجھ سے
چھپالے لیکن ناکام رہتی کیونکہ بے اولادی کا دکھ اکثر
ہی میری محبت پہ حاوی ہو جاتا۔ میں نے ایک آخری
کوشش کے طور پر ایک مرتبہ پھر سنجیدگی سے اپنا علاج
شروع کروایا لیکن ڈاکٹرز سے تفصیلی ڈسکشن کے بعد
یہی سمجھ میں آیا کہ کامیابی کے چانسز بیس یا پچیس
فیصد ہیں۔ یعنی ایک موہوم سی امید پر ہم مزید کئی سال
بچے کی راہ دیکھیں اور اس کے نتیجے میں بھی معلوم
نہیں کامیابی نصیب ہوتی یا نہیں۔

ادھر سارہ کے لیے "انتظار" ایک تکلیف دہ لفظ
بن گیا تھا۔ میں نے سارہ سے کہا کہ ہم بچہ گود لے لیتے
ہیں۔ فضہ بھابھی ان دنوں امید سے تھیں اور میں نے
عرفان بھائی اور بھابھی سے بات بھی کرلی تھی۔ دونوں
اپنا تیسرا بچہ ہمیں دینے کے لیے تیار تھے۔ لیکن سارہ
نے صاف کہہ دیا کہ وہ کسی قیمت پر کسی اور کا بچہ نہیں
پالے گی۔

اس وقت پہلی بار میں سوچ میں پڑ گیا کہ جب ہماری
اپنی اولاد ہونے کے چانسز انتہائی کم ہیں اور سارا کسی
اور کا بچہ بھی گود لینے کو تیار نہیں تو پھر سارا کی بیماری اور

پریشانی کا تیسرا حل کیا ہے۔ کبھی کبھی مجھے روایتی انسانی رویوں پر بہت حیرت ہوتی ہے یا شاید میں ہی دنیا سے انوکھا ہوں۔ سارہ سے مجھے ویسے کوئی شکایت نہیں تھی لیکن بچہ گود لینے کے معاملے پر اس کا جو رویہ تھا، اس نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔ اگر عیب سارہ میں ہوتا تو بچہ گود لینے کا یہی مشورہ اس کی طرف سے آتا۔ تب بے اولادی کے دکھ پر شوہر کی دوسری شادی کی پریشانی جاری ہوجاتی اور عدم تحفظ کا احساس سب سے پہلے اسے بچہ گود لینے پر اکساتا، لیکن خیر۔" عازم نے ایک گہرا سانس لیا۔ "اس کی سوچ پر میں نے اسے معاف کیا۔

کچھ دن بعد کی بات ہے۔ میں آفس میں تھا اور سارہ گھر پر اکیلی۔ اس کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک ہائی ہوگیا۔ میں گھر آیا تو اس کی حالت بہت خراب تھی۔ میں فوری طور پر اسے اسپتال لے گیا۔ اس دن میں یہ سوچ کر بہت پریشان ہوا کہ اگر اکیلے میں خدانخواستہ اسے کچھ ہوجاتا تو میں شاید زندگی بھر خود کو معاف نہیں کرپاتا۔ اس کے بعد اگرچہ اس نے بلڈ پریشر کی دواؤں کا ریگولر استعمال شروع کردیا تھا۔ جس سے خطرے کا امکان کم ہوگیا لیکن اس کی ذہنی پریشانی جوں کی توں تھی۔ میں نے پاکستان واپسی کے متعلق سنجیدگی سے سوچنا شروع کردیا۔

میری پہلی کوشش یہ تھی کہ سارہ کو اکیلے پن سے نجات دلائی جائے۔ بھائی بہنوں' ملنے جلنے والوں میں وقت گزار کر یقیناً" وہ نارمل لائف گزارنے کے قابل ہوسکتی تھی۔ اور وقتی طور پر وہ بہل بھی گئی' لیکن افسوس کہ یہ سلسلہ ڈیڑھ' دو ماہ ہی کامیابی سے چلا اور میں سمجھ گیا کہ سارہ کی زندگی کا خلا اس حقیقی خوشی سے ہی پورا ہوسکتا ہے، جو میں اسے نہیں دے سکتا۔ تب جی کڑا کرکے دوسرے مرحلے پر میں نے اپنا رویہ اس کے ساتھ تبدیل کیا۔ میرا ارادہ روز کے لڑائی جھگڑوں سے آغاز کرکے نوبت علیحدگی تک لانا تھا۔

دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ سارہ کو حقیقت بتا کر پلان کرکے طلاق دوں۔ اس طرح وہ عمر بھر اپنے ضمیر کی مجرم رہتی۔ وہ دوسرے گھر خوش رہ پاتی اور نہ اولاد پاکر سچی خوشی حاصل کرسکتی۔ ساری عمر یہ سوچ کر نادم رہتی کہ اس نے میرا دل توڑ کر اولاد پائی ہے۔ اب بھلا کسی کو ادھوری خوشی دینے کا کیا فائدہ۔ بہتر تھا کہ وہ پوری طرح مجھ سے بدظن ہوجاتی۔ اس لیے میں نے سنگ دل شوہروں جیسا رویہ اپنالیا۔ جس پر وہ دن رات یہ سوچنے لگی کہ ایک تو کمی بھی عازم میں ہے اوپر سے رویہ بھی اسی کا برا ہے۔ میں آخر کس بنیاد پر اس کے ساتھ رہوں۔ اس نے مجھ سے بلاتردد علیحدگی کا مطالبہ کردیا۔ اس طرح میرا منصوبہ کامیاب رہا۔

جہاں تک تمہارا معاملہ ہے تو مجھے ملائیشیا میں صرف اتنا پتا چلا کہ یاسر نے دوسری شادی کرلی ہے' وہ بھی لبنیٰ بھابھی کے بھائی حمزہ سے۔ سارہ نے مجھ سے یہ بات شیئر نہیں کی' حالانکہ اس کا یہاں سب سے رابطہ تھا۔ اسے یقیناً" پتا چلا ہوگا' لیکن مجھے اس نے نہیں بتایا۔ مجھے یہاں آکر فضہ بھابھی اور اماں سے یہ بات پتا چلی کہ یاسر نے تمہیں طلاق دے کر دوسری شادی کی ہے اور یہ بھی کہ تم ابھی تک سسرال میں رہتی ہو۔ بلکہ عین اسی دن پتا چلا جب میں لبنیٰ بھابھی کا پارسل لے کر تمہارے ہاں آیا تھا۔"

خزران نے کافی غائب دماغی سے عازم کے آخری جملے سنے۔ ذہن ایک ہی نہج پر سوچے جارہا تھا۔ عازم کے انکشافات نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ اتنی بڑی قربانی کوئی کیسے دے سکتا ہے۔

"سارہ کی دوسری شادی کا سن کر تمہیں کیسا لگا؟"

اس نے بے ساختہ سوال کیا تو عازم مسکرانے لگا۔

"خوشی ہوئی تھی سن کر۔ بس اللہ سے ایک ہی دعا ہے، کہ اس نے سارہ کے نصیب میں اولاد کا سکھ لکھا ہو۔"

"کس کس کو پتا ہے عازم؟"

"کسی کو نہیں۔ میں نے کہا نا' مرد کچھ معاملوں میں بڑے تنگ نظر ہوتے ہیں۔ اپنے گھر' خاندان سے اسی لیے تو لعن طعن سن رہا ہوں۔ سب ہی کو لگتا ہے سارہ پر ظلم ہوا ہے۔ البتہ جب سے، اس کی شادی کا سنا

ہے قدرے خاموش ہوگئے ہیں۔ اور ایک دن بھول بھال جائیں گے اور کیا۔"

وہ لاپرائی سے ہنسا تو خزران بغور اسے دیکھنے لگی۔ وہ جب کھل کر ہنستا تھا تو اس کی آنکھوں کے بیرونی سروں پر کنپٹی کے قریب تین تین لائنیں ابھر آتی تھیں۔ خزران ہمیشہ اسے کہتی عازم جب تم ہنستے ہو تو تمہاری آنکھیں بھی ہنستی ہیں۔ آج بڑے دنوں بعد اس نے عازم کو غور سے دیکھا۔

"خود کو تنگ نظر مت کہو عازم! میں جانتی ہوں' تم نے سب سے یہ بات کیوں چھپائی ہوگی۔" خزران نے قدرے توقف کے بعد لب کشائی کی۔

"اچھا!" وہ ہنسا۔ "تو مجھے جاننے والی حسینیں بیدار ہونا شروع ہوگئیں؟"

"تمہیں پتا تھا کہ اگر تم نے عرفان بھائی یا پھپھو وغیرہ سے یہ بات شیئر کی تو وہ سب تمہیں اس اقدام سے روکیں گے۔ جبکہ تم تو سارہ کو ایک عظیم خوشی دینے کی ٹھان چکے تھے۔ یہ تمہاری تنگ نظری نہیں بلکہ اعلا ظرفی ہے کہ تم نے اس معاملے کو دنیا میں نہیں اچھالا۔ ورنہ احسان کر کے ڈھنڈورا پیٹنا تو عام رواج ہے یہاں کا۔"

"نہیں رازی!" عازم ایک آہ بھر کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "اس معاملے کو خود تک رکھنا اس لیے بھی بہت ضروری تھا کہ ہر کسی کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ میرا اور سارہ کا معاملہ قدرے الگ تھا' ورنہ طلاق ایسے مسئلے کا حل ہونا نہیں چاہیے۔ کئی بے اولاد جوڑے پوری زندگی ایک دوسرے کے ساتھ پورے اطمینان اور صبر و شکر سے گزار رہے ہیں۔ جو میرے ساتھ ہوا وہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ طلاق میاں بیوی کے کسی بھی معاملے کا آخری سے بھی اگلا آپشن ہونا چاہیے۔ طلاق جیسے ناپسندیدہ عمل کے متعلق یہ میری ہمیشہ سے رائے تھی' لیکن افسوس کہ میری اپنی ہی زندگی اس حادثے سے دوچار ہوگئی۔"

"سارہ نے بھی رپورٹس وغیرہ کے معاملات بھی کسی سے ڈسکس نہیں کیے۔ اس معاملے میں وہ بھی تعریف کی حق دار ہے۔" خزران ابھی تک معاملے کی باریکیوں میں کھوئی تھی۔

"ہاں۔ ہماری فیملی کی حد تک مانتا ہوں' اس نے کبھی کسی سے یہ بات شیئر نہیں کی۔ لیکن اس کی اپنی فیملی یقیناً" اس سے لاعلم نہیں تھی۔"

"تمہارا اندازہ ہے یا؟"

"ایکچوئلی۔ میرے طلاق کے فیصلے کے بعد میرا خیال تھا کہ میرے سسرال کی طرف سے کافی شور ہنگامہ ہوگا لیکن جب اس طرف سے کوئی خاص منفی ردعمل سامنے نہیں آیا تو میں سمجھ گیا کہ وہ اس حقیقت سے یقیناً" واقف تھے۔ اللہ جلد سارہ کی گود ہری کردے۔ تب تو ساری دنیا خود بخود جان جائے گی کہ پرابلم کہاں تھی۔"

وہ آخری جملے پر ہنسا تو خزران نے بہت اندر کہیں درد اٹھتا محسوس کیا۔ آنکھوں میں اچانک نمی سی تیر گئی۔ اس نے بمشکل اپنے آنسو ضبط کیے۔

"کتنا بدگمان ہوگئی تھی میں عازم سے۔ یہ تو آج بھی وہی عازم ہے۔ ساری دنیا کا درد اپنے اندر محسوس کرنے والا۔ دوسروں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے' سوائے اپنے سب کے لیے جلنے کڑھنے والا۔ میرا عازم۔۔۔" وہ جذباتی سی ہو کر چند قدم آگے بڑھ کر اور اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

"سوری عازم! میں سچ مچ تم سے بہت بدگمان ہوگئی تھی۔"

"ہاں اتنی کہ کسی اور کا ہاتھ تھامنے کو بھی تیار ہوگئیں۔" اس نے ہلکا سا طنز کیا۔

"مجھے دوسری شادی کی قطعاً" کوئی خواہش نہیں ہے عازم!" وہ ایک دم رونے والی ہوگئی۔ "بھیا بہت پریشر ڈال رہے تھے' ہر بار ایک ہی بات' مجھے لگا شاید دوسری شادی ناگزیر ہے۔" اس کا لہجہ بھیگا بھیگا سا تھا۔

عازم نے بھرپور دلچسپی سے اس کی حالت پر نظر ڈالی۔

"دوسری شادی تو ناگزیر ہے محترمہ! یاد ہے میری آخری بات جو میں کہتے کہتے اس وقت رک گیا تھا۔" عازم نے کچھ دیر پہلے کا اپنا جملہ یاد دلایا' لیکن وہ حیران

حیران اسے دیکھنے لگی۔

"ثاقب صاحب کی تو کسی سے بھی شادی ہو سکتی ہے لیکن اگر تم نے میرا ہاتھ نہ تھاما تو سوچ لو کہ عمر بھر کے لیے اکیلا رہ جاؤں گا۔ سارہ نے میرے ساتھ سات سال کی اذیت اس لیے کاٹی کیونکہ میں اپنی پرابلم سے لاعلم تھا۔ لیکن اب جانتے بوجھتے کسی لڑکی کی زندگی کسی قیمت پر تباہ نہیں کر سکتا۔ اس وقت صرف تم ہو' جس کا ساتھ میں قبول کر سکتا ہوں۔ اللہ تمہارے بچوں کو سلامت رکھے' تم اس دولت سے محروم نہیں ہو۔ بلکہ تمہاری بدولت میرا گھر بھی ہرا بھرا ہو جائے گا۔" عازم نے وضاحت کی تو خزران نے سر جھکا لیا۔

"اور ہاں!" دو قدم مزید آگے آکر عازم نے انگلی سے اس کا چہرہ اوپر کیا۔ "ایک وجہ اور بھی تو ہے تمہارا ساتھ چاہنے کی۔ جو ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔ اس دنیا کے ہر جھنجٹ' ہر مسئلے سے اوپر' ہر شے پر حاوی اور مقدم۔ صرف میرے اور تمہارے درمیان۔"

وہ دھیمے لہجے میں نہایت رسان سے اس کے کانوں میں رس گھول رہا تھا۔ خزران کی سانسیں تھمنے لگیں۔ وہ سامنے کہاں تھا وہ تو اس کے اندر بول رہا تھا۔ وہ دوسری وجہ جو عازم کے لبوں پہ تھی۔ صدیوں سے خزران کی نس نس میں بسی تھی۔ نہ اسے اظہار کی ضرورت تھی نہ ہی الفاظ کی محتاج تھی۔

"وقت کے ظالم ہاتھوں نے تمہیں بہت دور جا کر کھڑا کر دیا تھا رازی! میں بس مرا نہیں تھا تمہاری جدائی میں۔" وہ درد سے چور لہجے میں بولنے لگا۔ "تم سے دوری میں درد کی کن انتہاؤں کا چھوا ہے' لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ یاسر نے تمہیں چھوڑا تو اپنے زندہ بچ جانے کا راز سمجھ میں آیا۔ اور ابھی میں قدرت کے رازوں کو معنی پہنانے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ تم نے مجھے ٹھکرا دیا۔ مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے مرتا دیکھ سکتی ہو رازی! تو چلی جاؤ اس بار بھی منہ موڑ کر۔ تمہارے ہاتھوں آئی موت میں۔"

"بس کرو عازم!" خزران نے بے ساختہ اس کے ہونٹوں پہ اپنا کانپتا ہاتھ رکھا اور پھر اس کے شانے سے لگ کر بے تحاشا روئے چلی گئی۔

عازم کی اپنی آنکھوں میں بھی نمی تیر گئی۔ اماں سے خزران اور ثاقب کے رشتے کا پتا چلا تو کیفیت ہی کچھ مرنے جیسی ہو گئی تھی۔

عازم نے نرمی سے خزران کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر اسے خود سے تھوڑا سا الگ کیا۔

"ایک بات بتاؤ۔" عازم نے سینے پہ ہاتھ باندھ کر سہولت سے دیوار سے ٹیک لگائی۔

"کہو۔"

"میرا پروپوزل تمہیں قبول ہے نا۔۔؟"

"تمہارا پروپوزل۔۔!" خزران نے ناخن کھرچتے ہوئے پرسوچ انداز اپنایا اور لہجے کو سنجیدہ بنایا۔

"ایک ساتھ دو لوگوں کا پروپوزل کیسے قبول کر سکتی ہوں۔ میرا رشتہ تو ثاقب سے ہو چکا۔۔" وہ اب چڑانے کے موڈ میں آگئی تھی اور عازم بھی سچ مچ غصہ کھا گیا۔

"تم ابھی تک اس ثاقب کی بات کر رہی ہو۔"

"میرا اس سے رشتہ طے ہوا ہے۔ ایسے کیسے کمٹمنٹ توڑ دوں۔" وہ مسکرانے لگی۔

"شرم تو نہیں آتی' بار بار اس کا نام لے رہی ہو۔۔ اور کمٹمنٹ کیسے توڑتی ہے' ابھی بتاتا ہوں۔" عازم نے آگے بڑھ کر مضبوطی سے اس کی کلائی پکڑی۔

"اف' چھوڑو عازم۔۔!" خزران نے کلائی چھڑوائی۔ "بالکل جنگلی ہو قسم سے۔"

"اب لو گی اس کا نام۔۔" وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔

"توبہ میری۔۔" خزران بھی مسکراہٹ نہ روک سکی۔ "اس کا معاملہ اب تمہاری دردسری ہے۔۔ میرا کیا لینا دینا۔" وہ سرخ چہرہ لیے نیچے دیکھ رہی تھی۔ عازم نے اندر تک سکون اترتا محسوس کیا تھا۔

"یو آر سو سوئیٹ۔۔!" وہ دیوار سے ہٹ کر ایک جذب سے آگے بڑھا کہ عین اسی وقت شور مچاتے رافع اور منال کمرے میں وارد ہوئے۔ عازم نے اپنے قدم وہیں روکے اور بچے بھی ٹھٹک کر رک گئے۔

"ارے انکل! آپ ۔۔۔!" رافع نے پہچان کر نعرہ لگایا۔

"ہیلو باس۔۔۔!" عازم نے آگے بڑھ کر اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مارا۔

"کہاں غائب ہوگئے تھے آپ لوگ۔ سنجیدہ دادی کتنا یاد کررہی ہیں آپ دونوں کو۔" عازم نے مناہل کو پیار کیا۔

"آپ ہمیں لینے آئے ہیں۔۔۔؟" مناہل نے بیگ صوفے پر پھینکا اور تجسس سے سوال کیا۔

"جی بیٹا! ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔" اس نے مناہل کو گود میں اٹھالیا۔ "تم سے تو بچے بھی سمجھ دار ہیں۔" عازم نے ایک نظر مسکرا کر خزران کو دیکھا تو وہ اسے گھور کر بچوں کی طرف متوجہ ہوگئی۔

عازم اپنی جیپ پر گجرات آیا تھا۔ خزران نے دو روز کی چھٹی کی درخواست دی اور دوپہر کا کھانا کھا کر لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔

"انکل! ہماری مما سے کہیں ناں۔۔۔ پورے ہفتے کے لیے وہاں ٹھہریں۔ تین دن سے کیا ہوگا۔" رافع نے گاڑی میں پرجوش انداز میں فرمائش کی تو عازم ہنسنے لگا۔

"بہت جلد آپ لوگوں کو پورے ایک ماہ کی چھٹی کرائیں گے۔ فکر کیوں کرتے ہو۔"

"اچھا انکل۔۔۔ وہ کب۔۔۔؟ رافع نے خوش گوار حیرت سے سوال کیا۔

"بتاؤ ناں کب کی ڈیٹ فکس کریں۔۔۔؟" عازم نے ذرا سی گردن موڑ کر خزران کو دیکھا تو وہ تنبیہہ کے انداز میں اسے گھورنے لگی۔

"عازم! ہم کوئی اور بات نہیں کرسکتے۔" وہ ہلکی آواز میں سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔

"ضروری ہے ڈیئر۔ ہر کام سے بڑھ کر اہم۔ انہیں بچہ سمجھ کر ان سے کچھ شیئر نہ کرنا اور کوئی بڑا قدم اٹھا لینے کے بعد خود ہی فرض کرلینا کہ یہ ابھی بچے ہیں، انہیں کچھ سمجھ نہیں' انتہائی خطرناک بات ہے۔ بچے بڑوں سے کہیں زیادہ پر تجسس اور ارد گرد پر نگاہ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کرلو۔ میرے تمہارے معاملے میں پوری دنیا ایک طرف اور یہ دو ایک طرف۔۔۔ بھلے پوری دنیا کی نفی کرکے میرا ہاتھ تھام لو پروا نہیں' لیکن ان دو کی۔ ہرگز ہرگز نہیں۔" اس نے بھرپور سنجیدگی سے انگلش میں کہا تھا اور جواباً" خزران بھی قائل ہوتے ہوئے باہر دیکھنے لگی۔

"ہاں بھئی' کہاں بزی ہوگئے؟" عازم نے دوبارہ رافع کی طرف دھیان دیا۔

"جی انکل۔۔۔!"

"آپ کو لاہور اچھا لگتا ہے یا گجرات۔۔۔؟"

"لاہور زیادہ اچھا لگتا ہے۔ لاہور میں میرے بہت سے فرینڈز ہیں۔" خزران نے محسوس کیا کہ وہ عازم کے توجہ دینے پر بہت خوش ہورہا تھا۔

"اچھا اور اپنی فیملی میں کس کس سے دوستی ہے۔" عازم نے گفتگو جاری رکھی۔

"فیملی میں۔۔۔" رافع نے پرسوچ انداز میں انگلی بجائی۔ "یسریٰ اور سندس تو گرلز والے گیم کھیلتی رہتی ہیں۔ عرفان انکل کے سنی اور شان سے میری بہت فرینڈ شپ ہے' لیکن ہم وہاں بہت کم جاتے ہیں۔"

"آپ کو پتا ہے' میں سنی اور شان کے گھر میں رہتا ہوں۔"

"اچھا۔۔۔؟" رافع حیران ہوا۔ "مجھے پتا ہے آپ سنی اور شان کے چاچو ہیں۔ لیکن آپ کا گھر تو الگ تھا نا؟"

"آپ کی سنجیدہ دادی نے بلالیا۔ وہ بیمار رہنے لگی ہیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ میں آپ سب کو بھی ان ہی کے پاس لے آؤں۔" عازم نے اصل مدعے کی تمہید باندھی۔ خزران نے گھبرا کر تھوک نگلا۔

"آپ کے گھر؟" رافع نے اپنی چمک دار آنکھیں پھیلائیں۔ "لیکن ہم تو ہمیشہ جنید ماموں کے گھر جاتے ہیں۔"

"آپ کے جنید ماموں کا گھر کافی چھوٹا سا ہے۔ ماموں کے لیے کافی پرابلم ہے۔ دادی کا گھر بڑا بھی ہے۔

پھر وہاں آپ کے دوست بھی ہیں۔ عرفان انکل اور فضہ آنٹی بھی آپ کا بہت خیال رکھیں گی۔ دادی کا پیار بھی ملے گا اور۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اور کچھ سوچنے کے لیے لب چبائے۔

"دراصل! آپ کی سنجیدہ دادی کو لگتا ہے کہ منو اور رافع کو اپنے فادر کی کمی محسوس ہوتی ہے۔"

بالآخر اس نے کہہ دیا۔ خزران نے بے ساختہ آگے ہو کر رافع کے تاثرات دیکھے، لیکن وہ چپ تھا۔ عازم نے ایک نظر اسے دیکھا۔

"آپ کے فرینڈز جب اپنے فادر کا ذکر کرتے ہیں تو آپ کا دل بھی چاہتا ہے نا کہ آپ انہیں اپنے فادر کے متعلق بتائیں۔"

"جی۔۔۔!" اس نے پھر مختصر جواب کا سہارا لیا۔

"آپ نے اپنے فادر کے متعلق دوستوں کو کیا بتایا ہے!؟"

"میں نے کہا کہ وہ باہر رہتے ہیں اور کچھ نہیں بتایا۔" رافع کے ایک ہی جملے نے اس کے دل و دماغ کی ترجمانی کر دی تھی۔

اس کا مطلب تھا کہ وہ جانتا بھی ہے اور یہ بھی سمجھتا ہے کہ ایسی باتیں ہر کسی کو بتانے والی نہیں ہوتیں۔ گھر میں سب اس بات پر متفق تھے کہ بچوں کا کوئی ایشو نہیں ہے، لیکن عازم کی سوچ، لوگوں کی اسٹینڈرڈ سوچ سے ہمیشہ کچھ اوپر سوچتی۔ وہ بچے جن پر انجانے میں نئی نئی تبدیلیاں مسلط کر دی جاتی ہیں اور خود ہی فرض کر لیا جاتا ہے کہ آہستہ آہستہ وہ انہیں قبول کر لیں گے، درحقیقت کتنی منتشر ذہنیت کے مالک ہو جاتے ہیں۔ عازم نے ہمیشہ پیش آنے والے مسائل کو ایک نفسیاتی معالج کی نظر سے دیکھ کر سلجھایا تھا اور بیشتر کا نتیجہ مثبت نکلا تھا۔

"اچھا ایک بات بتائیں۔" عازم نے قدرے ٹھہر کر دوبارہ سلسلہ کلام جوڑا۔ "آپ کو جنید ماموں کتنے اچھے لگتے ہیں؟"

"بہت اچھے۔ وہ کبھی غصہ نہیں کرتے اور ہمارے ساتھ پلے اسٹیشن بھی کھیلتے ہیں۔"

"اور میں۔۔۔؟"

"آپ بھی بہت اچھے ہیں۔۔۔ آپ بھی جنید ماموں کی طرح خیال رکھتے ہیں لیکن آپ ماموں کی طرح ہمارے ساتھ گیمز نہیں کھیلتے۔" اس نے منہ بنایا تو خزران کو ہنسی آگئی، لیکن ضبط کر لی۔

"اس کی وجہ ہے نا۔" عازم نے تدبر سے جواب دیا۔

"وجہ۔۔۔" رافع نے بے ساختہ اسے دیکھا۔ خزران بھی حیرت سے سننے لگی۔

"ایکچوئیلی آپ کے جنید ماموں بہت خوش رہتے ہیں کیوں کہ ان کی فیملی کمپلیٹ ہے، لیکن میری کوئی فیملی نہیں ہے، میں بالکل اکیلا رہتا ہوں نا اس لیے کبھی کبھی بہت اداس ہو جاتا ہوں۔"

"اوہ۔۔۔!" رافع نے ازحد رنج سے اس کی طرف دیکھا۔

"لیکن آپ کی سنجیدہ دادی۔۔۔ نے میرے اس مسئلے کا ایک حل ڈھونڈا ہے۔" عازم نے بات آگے بڑھائی۔

"اچھا۔۔۔ وہ کیا۔۔۔؟" رافع اسے دیکھنے لگا۔

"وہ چاہتی ہیں کہ آپ مجھے انکل کے بجائے بابا کہیں، تاکہ آپ کی فیملی بھی کمپلیٹ ہو جائے اور میری بھی۔۔۔" وہ ذرا دیر کو رکا۔ "لیکن یہاں بھی ایک پرابلم ہے۔" اس نے جی کڑا کر کے کہہ ہی دیا اور رافع جو بغور اس کی بات سن رہا تھا ایک دم چونکا۔

"کیا پرابلم انکل۔۔۔؟"

"پرابلم یہ ہے کہ آپ کی ماما اس سے ایگری نہیں کرتیں۔ وہ کہتی ہیں کہ رافع اور منال کو فادر کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔ یا شاید انہیں آپ کے عازم انکل پسند نہیں۔"

"لیکن ماما نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی؟" وہ ایک دم خزران کی طرف مڑا، جو سانس روکے عازم کے لفظوں کے ہیر پھیر جانچ رہی تھی۔

"ماما! آپ کو انکل اچھے نہیں لگتے۔۔۔؟" اس نے حیرت بھری آنکھوں سے خزران کو دیکھا۔

"وہ بیٹا۔۔۔!" خزران نروس ہو کر عازم کو دیکھنے

لگی۔ تو ابا" اس نے غصے سے گھورا کہ کم از کم اتنا تو تیار رہنا چاہیے۔ لیکن وہ پھر بھی کچھ نہیں بول پائی۔

"آپ ماما کو چھوڑیں رافع! اپنی بات کریں۔ آپ کو دادی کے سجیشن پر کوئی اعتراض تو نہیں؟؟"

"و انکل۔۔۔ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ آپ کی فیملی نہیں ہے اور آپ اکیلے ہیں۔ آپ ہمارے پاس آجائیں پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ماما کو بھی منالوں گا۔" وہ عازم کو ایسے تسلی دے رہا تھا جیسے وہ کوئی چھوٹا بچہ ہو اور اکیلے میں ڈر جاتا ہو۔

"تھینک یو بیٹا۔۔۔!" اس نے مسکراہٹ چھپا کر ایک چور نظر خزران پر ڈالی جو اسی کو دیکھ رہی تھی۔ بے ساختہ نظریں ملیں تو وہ گھبرا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ وہ لوگ لاہور پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔

بچے بھاگ کر گھر میں چلے گئے۔ وہ گاڑی سے اتری۔ عازم نے گاڑی بڑھانی چاہی تو اس نے روکا۔ اور کھڑکی سے جھانک کر بولی۔

"تھینکس عازم۔۔۔ تم نے رافع کے معاملے کو بہت اچھے انداز میں سلجھایا۔ سوچ سوچ کر میری نیندیں اڑ جاتی تھیں۔ تم سچ مچ جادوگر ہو۔" اس کی تشکر سے آنکھیں بھیگ گئیں۔ عازم ایک گہرا سانس لے کر اس کے نزدیک ہوا۔

"میرے لیے ایک عام انسان بھی میری اپنی ذات سے بڑھ کر اہم ہوتا ہے رازی! تم جانتی ہو یہ بات۔۔۔ رافع تو پھر بہت اپنا بہت خاص ہے میرے لیے۔ تھینکس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"ہمیشہ ایسے ہی رہنا میرے بچوں کے لیے۔" وہ چہرہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ عازم نے سر نفی میں ہلایا تو حیران ہو گئی۔

"صرف اپنے بچے سمجھو گی تو بہت مشکل ہے۔" وہ مسکرایا تو خزران ایک دم ڈھیلی ہو کر ہنسی۔ "سوری۔۔۔!"

☆ ☆ ☆

خزران جب سلمیٰ بھابھی کے بطن سے سنجیدہ کے ہاتھوں پر آئی تو ایک معصوم سا گلابی پھول تھی۔ سنجیدہ نے اسی لمحے خزران کو اپنے تین سالہ عازم کے لیے پسند کر لیا حتیٰ کہ اسپتال میں ہی نڈھال پڑی سلمیٰ بھابھی سے کہہ دیا کہ وہ اس پھول کو میرے عازم کی امانت سمجھ کر پالیں گی۔ سلمیٰ مسکرا دیں پھر پندرہ برس بعد دونوں کی رضا مندی کے ساتھ باقاعدہ رشتہ بھی کر دیا۔

اور آج۔۔۔ اس کی آمد کئی کڑے امتحانوں کے بعد اس گھر میں ہوپائی تھی۔ تشکر سے بھیگی آنکھوں کو پلو سے صاف کر کے وہ خزران کو لینے آگے بڑھیں۔ آج بھی وہ گلابی رنگ کے لباس میں ایک گلابی پھول ہی لگ رہی تھی۔

"بہت پیاری لگ رہی ہو خزران۔۔۔" فضہ بھابھی نے اس کے کان میں آہستہ سے کہا تو اس نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔ عازم نے ہلکا سرمئی تھری پیس سوٹ پہنا تھا۔ بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔ نکاح کی رسم جنید کے گھر چند قریبی رشتہ داروں کی موجودگی میں نہایت سادگی سے ادا کی گئی تھی۔

رخصتی کے وقت سمیعہ نے اسے بہت کہا کہ وہ رافع اور منائل کو ان کے پاس چھوڑ جائے لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ وعدہ تو کیا تھا ان کی زندگی میں باپ کا خلا پورا کرنے کا اور یہاں ماں ہی غائب ہو جاتی۔ تو وہ کیا سوچتے۔۔۔

رافع کو تو یہ بھی پتا تھا کہ آج اس کی ماما کی شادی ہے۔ خزران نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کیا تھا کہ عازم کو ان کا بابا بنانے کے لیے اسے ان سے شادی کرنی پڑے گی۔ رافع نے سیانوں کے انداز میں سر ہلا کر رضا مندی ظاہر کر دی تھی۔

فضہ بھابھی اور سنجیدہ پھپھو نے اسے عازم کے کمرے میں لا بٹھایا تو بچے بھی اس کے ساتھ تھے۔ خزران نے بھابھی کو سختی سے منع کیا تھا کہ کمرے کو دلہنوں کی طرح نہ سجایا جائے۔ سادہ سا فرنیچر سلیقے سے رکھا تھا۔ رافع اور منائل پانچ دس منٹ ہی ٹک کر بیٹھے پھر کھیلنے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے۔ خزران

نے کمرے کے در و دیوار پر ایک فرصت کی نگاہ ڈالی۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں برسوں پہلے عازم نے پندرہ سالہ خزران سے اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔

وہ ایک گہری سانس لے کر ڈریسنگ ٹیبل کے قریب آئی۔ زیور تو اس نے بہت کم ہی پہن رکھے تھے۔ پھر بھی الجھن محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے اتار کر سامنے رکھ دیے۔ کمرے کے کونے میں اپنا سوٹ کیس پڑا نظر آیا۔ تھوڑی دیر پہلے شاید عرفان بھائی رکھ گئے تھے۔ اس نے اپنے لیے ایک نسبتاً "آرام دہ سوٹ نکالا اور واش روم چلی آئی۔ بالوں میں پنوں کی بھرمار تھی۔ اس نے بالوں کو ہر چیز سے آزاد کر کے کنگھی کی اور کیچ لگا لیا۔ اور ہاتھ منہ دھو کر باہر آگئی۔

عازم اس دوران کمرے میں آچکا تھا۔ گھڑی ڈریسنگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے ذرا سی گردن گھمائی اور پھر حیرت سے پورا گھوم گیا۔

"تم نے ڈریس تبدیل کر لیا۔۔۔؟"

"ہاں۔ کیا مطلب۔۔۔؟" وہ اس کے لہجے پر گھبرا گئی۔

"میں نے تو ٹھیک سے تمہیں دیکھا بھی نہیں تھا۔" اس کا موڈ ایک دم آف ہو گیا۔

"تصویروں میں دیکھ لینا عازم! مجھے بہت الجھن ہو رہی تھی۔"

"عجیب ہو یار۔۔۔!" وہ سخت بدمزا سا ہو کر کوٹ اتارنے لگا۔ "دلہن کے روپ کا تو اپنا ایک حسن ہوتا ہے۔ اس کی تمام تیاری اپنے شوہر کے لیے ہوتی ہے۔ ایسے کیسے تم میرے آنے سے پہلے منہ تک دھو کر بیٹھ گئیں۔" اس کا موڈ بری طرح بگڑا ہوا تھا۔ خزران کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ کچھ دیر اور انتظار کر لیتی تو کیا جاتا۔ وہ اپنے آپ کو کوسنے لگی۔ معذرت کے لیے الفاظ ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن اسی وقت دروازہ بجا۔ عازم نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو فضہ بھابھی اس سے معذرت کرتی اندر آگئیں۔

"خزران! میں نے بچوں کے بستر بیٹھک میں لگا دیے ہیں۔ وہ سونے کے لیے چلے گئے ہیں۔ مناہل تمہیں بلا رہی تھی۔ چاہو تو پارہ دس منٹ کے لیے ہو آؤ۔ تم جاؤ گی تو جلدی سو جائیں گے۔" وہ اس کے قریب آکر بتانے لگیں۔ خزران ان کے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہاں میں ابھی چلتی ہوں۔ منو میرے بغیر نہیں سوئے گی۔" وہ بنا عازم کی طرف دیکھے باہر آگئی۔

"بھابھی! یہ بیٹھک میں اکیلے کیسے سوئیں گے؟" وہ قدرے پریشان ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔

"درمیان میں دروازہ ہے نا۔ تم فکر نہ کرو، میں آکر دیکھتی رہوں گی۔" انہوں نے کہا تو خزران نے اطمینان سے سر ہلا دیا۔ دونوں ہی اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ لائٹ آف کر کے ان کے ساتھ لیٹ گئی۔

مناہل تو فوراً ہی اس کے بازو پر سر رکھ کر اس سے چپک گئی۔ خزران سمجھ گئی کہ خوب تھکی ہوئی ہے، لیکن رافع صاحب کی کہانیاں ہی الگ تھیں۔ اس کی کسی سے کسی بات پر لڑائی ہو گئی تھی۔ اب وہ لمبی چوڑی لڑائی کے آغاز سے مع ایک ایک ڈائیلاگ پورا معاملہ بتانے لگا۔

خزران کی پلکیں بھاری ہونے لگیں۔ لمبی لمبی جمائیاں لیتے اس نے جانے کتنی مرتبہ رافع کو ٹوکا کہ اب سو جاؤ، لیکن وہ تو جانے کب سویا، خود خزران کو گہری نیند آگئی۔

عازم کا گھڑی دیکھ دیکھ کر برا حال ہو گیا تو ٹی وی آن کر لیا، لیکن اب تو ٹی وی دیکھتے بھی گھنٹہ بھر ہو چکا تھا۔ گھڑی نے دو بجائے تو وہ مجبور ہو کر بیٹھک تک آیا۔ لائٹ آف تھی، لیکن کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا وہ تھوڑا سا اندر آیا۔ رافع قدرے دور سویا تھا اور وہ۔۔۔ مناہل کو اپنے بازوؤں میں لپیٹے بے خبر سوئی تھی۔ عازم نے مسکرا کر بے ساختہ ایک آہ بھری۔ اس کی میٹھی نیند میں خلل ڈالنا سراسر تہذیب کے خلاف لگا۔ وہ دروازے کو آہستہ سے بند کر کے واپس آگیا۔

پانچ بجے کے آس پاس اذان کی آواز اسپیکر میں گونجی تو خزران ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ پھپھو کا گھر مسجد

سے کافی قریب تھا۔ اس لیے آواز نہایت قریب سے سنائی دیتی تھی۔ اس کے لیے چونکہ نئی بات تھی تب ہی گھبرا کر اٹھی تھی۔ اتنی گہری نیند آجانے پر دل میں سخت پشیمانی محسوس کی۔

عازم کا خیال آتے ہی دل ایک دم اپ سیٹ ہو گیا۔ وہ تو رات بھی خفا سا تھا اور اب تو... وہ پریشانی سے ہونٹ کاٹتی باہر نکلی۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ وہ عازم کے کمرے تک آئی ہلکا سا دباؤ ڈالا تو دروازہ کھل گیا۔ نائٹ بلب کی روشنی میں اس نے دیکھا عازم بیڈ پر اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ وہ نظریں چرا کر باتھ روم چلی گئی۔ وضو کر کے کمرے میں واپس آئی۔ عازم کا انداز جنوز تھا۔

اسے بے تحاشا ترس اور پیار آیا۔ پتا نہیں بے چارہ کتنی دیر جاگتا رہا تھا۔ اس نے جائے نماز کی تلاش کی۔ کہیں نظر نہیں آئی تو چادر بچھا کر ہی نماز ادا کر لی اور نماز پڑھنے کے بعد بھی وہیں بیٹھی رہی۔ دل و دماغ پر ایک ہی سوچ حاوی تھی کہ عازم جب جاگے گا تو اس کا ردعمل کیا ہو گا۔ جانے کتنا ناراض ہو...

باہر ہلکی کھٹ پٹ شروع ہوئی تو وہ باہر آگئی۔ پھپھو اور فضہ بھابھی اٹھ چکی تھیں۔ اب تو روشنی بھی اچھی خاصی ہو گئی تھی۔ وہ ایک نظر بچوں کو دیکھ کر واپس آئی۔ پھپھو باہر صحن میں چارپائی ڈالے بیٹھی تھیں۔ وہ ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ فضہ بھابھی اپنی تین سالہ اریبہ کو سامنے بٹھا گئیں تو وہ اس سے کھیلنے لگی۔

"رات تو آرام سے گزری خزران!" انہوں نے پیچھے ہو کر اس کے لیے جگہ بنائی۔

"جی پھپھو..."

"اصل میں عازم کی تو یہی خواہش تھی کہ تمہیں اپنے گھر لے جائے۔ یہ تو میں نے ضد کر کے اپنی بات منوائی۔ برسوں پرانی خواہش تھی کہ تم یہاں میرے گھر دلہن بن کر آؤ۔ شکر ہے اس نے میری بات کا مان رکھا۔ ورنہ کہاں کسی کو خاطر میں لاتا ہے۔" وہ ہنسیں تو خزران نے مسکرا کر سر ہلایا۔

"میں بھی خوش ہوں یہاں آکر۔"

"اچھا ہاں خزران... آج دوپہر کے کھانے پہ تمہارے پھوپھا نے کچھ مہمانوں کو بلایا ہے۔ بلکہ سب ہی مہمان وہی رات والے ہیں۔ تم نے اور عازم نے تقریب کی سادگی پر اتنا زور دیا تو ہم نے باقاعدہ ولیمہ کا اہتمام ہی نہیں کیا، لیکن ولیمہ کی دعوت سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ تم ناشتے وغیرہ سے فراغت پا کر ذرا تیار ہو جانا... بھاری کپڑے تو تم نے بنوانے ہی نہیں ویسے پھر بھی دیکھ لینا۔"

"آپ فکر نہ کریں... آپ کے لیے کوئی سوٹ نکالنا ہے بتائیے پریس کر لیتی ہوں۔"

"ارے رہنے دو، فضہ نے کر لیا ہو گا۔" وہ مسکرا دی۔

"خزران! ناشتا بن گیا ہے۔" فضہ بھابھی نے کچن سے آواز لگائی تو وہ ان ہی کے پاس چلی آئی۔

"پھپھو کا ناشتا مجھے دیں، میں تو ابھی..."

"اوہ ہاں... تم تو عازم کے ساتھ ناشتا کرو گی۔ سوری۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا۔" وہ شوخی سے ہنس پڑیں۔ خزران نے ناشتے کی ٹرے پھپھو کے سامنے رکھی اور خود کمرے میں آگئی۔ عازم کو بے خبر سوتے دیکھ کر خزران کے دل کو کچھ ہوا۔ "شاید پوری رات نہیں سویا تھا۔"

وہ آہستہ سے سوٹ کیس باہر نکال لائی اور بیٹھک والے کمرے میں آگئی۔ یہاں بھی اٹیچ باتھ تھا۔ وہ نہا کر نکلی تو رافع اور منال جاگ چکے تھے۔ اس نے باری باری دونوں کو تیار کیا اور ناشتا بھی کروا دیا۔ سوائے عازم کے سب ہی جاگ چکے تھے۔ سکینہ پھپھو کی فیملی بھی آئی تھی۔ اس وقت سارے بڑے کمرے میں جمع تھے۔ خزران نے جا کر سلام کیا اور باہر آگئی۔

صحن میں اچھی خاصی دھوپ آگئی تھی۔ سارا بچپن جس گھر کے آنگن میں کھیلتے گزرا تھا، آج اس کے بچے وہاں بھاگ دوڑ رہے تھے۔ اگرچہ ہونا تو یہی تھا۔ اس نے بیاہ کر اسی گھر میں آنا تھا اور ظاہر ہے اس کے اور عازم کے بچے اسی آنگن میں کھیلتے، لیکن یہ اس نے کب سوچا تھا کہ یاسر کے بچے ایک دن عازم

کے گھر پلے بڑھے ہیں گے۔ وہ قدرت کے نرالے کھیل پر بے ساختہ مسکرائی۔

کمرے سے نکلتا عازم دروازے میں ہی ٹھٹک کر رک گیا۔ سامنے برآمدے میں چارپائی کے کونے پر بیٹھی خزران سچ مچ کوئی آسمان سے اتری حور معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا اورنج اور براؤن سوٹ اور کھلتا ہوا خوب صورت چہرہ پورے ماحول میں جان ڈال رہے تھے۔ گیلے بال شانوں پر پھیلے تھے۔ سیاہ آنکھیں عجیب بھیگی بھیگی اور نشیلی سی لگ رہی تھیں۔ آج تو لپ اسٹک بھی خوب شوخ سی لگا رکھی تھی۔ عازم نے عرصے بعد خزران کا یہ روپ دیکھا تھا۔ دل و دماغ سے ایک دم ساری تھکان اتر گئی۔

"کیا کہنے زوجہ محترمہ کے... صرف نکاح نامے پر دستخط اور عازم حیدر کے نام سے جڑنے کے بعد حسن کا یہ عالم ہے۔ ابھی تو محبت کے دو بول بھی کہنے کا موقع نصیب نہیں ہوا۔ تب کیا رنگ لائے گا یہ حسن... الٰہی خیر۔" وہ خوب ترنگ میں اس کے سامنے آیا۔

"کہاں کھوئی ہو ظالم حسینہ!" عازم کی اچانک ہی آواز سنائی دی تو وہ بوکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ عازم نہا دھو کر نئے کپڑے بھی پہن چکا تھا۔ "یہ کب اٹھا...؟" وہ اسے دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔

"کیا اتنا پیارا لگ رہا ہوں کہ نظر نہیں ہٹ رہی۔" وہ ہنسا تو خزران جھینپ گئی۔ "تم کب اٹھے...؟"

"بس آدھا گھنٹہ ہوا... ناشتا کر لیا تم نے...؟" وہ اسے بھرپور توجہ سے دیکھ رہا تھا۔

"نہیں... تت... تمہارے جاگنے کا انتظار کر رہی تھی۔" نئے رشتے کا بہت ہی ٹھنڈا میٹھا احساس اندر کہیں جاگا تو نظریں بے ساختہ جھک گئیں۔

"بھابھی سے کہوں پھر...؟"

"نہیں۔ میں خود لے آتی ہوں۔ تم اندر جاؤ۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں ساتھ آؤں...؟" وہ شوخ ہو کر آگے بڑھا۔ خزران نے گھبرا کر آس پاس دیکھا۔

"توبہ! کتنا ڈرتی ہو... بوائے فرینڈ تو نہیں ہوں تمہارا۔" وہ ہنستے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ مسکراہٹ دبا کر کچن چلی گئی۔

"چائے تم نے تو نہیں بنائی۔" اس نے ناشتے کی ٹرے سامنے رکھی تو عازم نے پہلا سوال یہی کیا۔

"آج تو میں نے نہیں بنائی، لیکن آگے کیا کرو گے، پھر تو روز مجھے ہی بنانی ہے۔" وہ پہلی مرتبہ اس کے ساتھ مسکرائی۔

"یعنی سیکھنے کا بھی کوئی ارادہ نہیں...؟"

"اپنی چائے خود بنا لینا۔" وہ مسکرا کر اس کے لیے ناشتا نکالنے لگی۔ عازم نے نظریں اس کے چہرے پر جمائیں۔ پورے حق سے خزران کو دیکھنے کی یہ پہلی صبح... بہت حسین تھی۔ وہ اس کا ایک بھی پل ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"ایسے ہی شوخ رنگ پہنا کرو۔ آج سالوں بعد پھر سے فلمی ہیروئن لگ رہی ہو۔ پتا نہیں کیسے گھسے پٹے حلیے میں رہنا شروع کر دیا تھا۔"

"مجھے شوخ رنگ اچھے نہیں لگتے... یہ کچھ ڈریسز تو بھابھی نے خریدے تھے تب ہی..."

"تو بس... ایسے ہی ڈریسز پہنا کرو۔ میری پسند ایسی ہے۔" وہ ہنوز مسکرا رہا تھا۔

"تم تو ہو ہی..." روانی میں کچھ کہتے کہتے اس نے اپنی زبان کو بریک لگائی۔ عازم نے قہقہہ لگایا۔

"رنگین مزاج...؟" عازم نے جملہ پورا کیا تو وہ جھینپ گئی۔

"پر اب تو تم آگئی ہو رنگین مزاجی کا ستیاناس کرنے۔" جانے کیا تھا عازم کے لہجے میں۔ اس نے چونک کر نظر اٹھائی۔ بظاہر تو نارمل رویہ تھا، لیکن جانے کیوں خزران کو لگا اس کا جملہ کچھ خاص معنی لیے ہوئے ہے۔ اس نے سوچنے کے لیے تھوڑا سا وقت لیا، پھر نظر اٹھائی۔

"سوری عازم! رات مجھے پتا نہیں کیسے بچوں کے پاس نیند آگئی۔ آنکھ اذان کے وقت کھلی۔ تم بہت گہری نیند سوئے تھے۔" خزران بات کے دوران اسی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ صرف ہلکا سا مسکرایا تھا۔ ہونٹوں

پہ تنی مبہم سی مسکراہٹ پہ "نو کمنٹس" کی تحریر بہت واضح تھی۔

دوپہر کو ولیمہ کی سادہ سی تقریب تھی۔ سمیعہ اور فضہ نے اس کے لیے فیروزی سوٹ پسند کیا جو باقیوں سے قدرے بھاری تھا۔ عازم سفید کاٹن کے سوٹ میں بلا کا جاذب نظر دکھائی دے رہا تھا۔ سارا دن اسی کی نذر ہو گیا۔ شام تک وہ بری طرح تھک گئی۔ مہمان رخصت ہوئے تو اس نے کمرے میں آکر پہلا سکون کا سانس لیا۔

عازم کے دوستوں نے ریسٹورنٹ میں پارٹی مانگی تھی' وہ انہیں ڈنر کرانے باہر چلا گیا تھا۔ خزران نے کپڑے تبدیل کرنے کے لیے سوٹ کیس کھولا تو عازم کی بات یاد آئی۔ لائٹ براؤن سوٹ کی طرف اس کا بڑھتا ہاتھ وہیں رک گیا۔ جانے کیا جادو اور کیسی تاثیر ہوتی ہے شوہر کی بات میں' عورت جی جان سے اس کے رنگ میں رنگنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ خزران نے آتشی گلابی سوٹ کو عازم کی نظروں سے دیکھا اور مسکراتے ہوئے وہی نکال لیا۔

"ماما! یہ سارے پیارے پیارے ڈریسز آپ کے ہیں؟" مناہل تیاری کے دوران اس کے ساتھ ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ خزران نے گود میں بٹھا کر خوب زور سے اس کا گال چوما۔

"جی میری جان۔۔۔ اچھا جاؤ رافع کو بلا لاؤ' کہاں غائب ہے وہ؟"

"سنی اور شان کے روم میں ہے۔ ابھی بلا لاتی ہوں۔" وہ باہر دوڑ گئی۔

"جی ماما! آپ نے بلایا۔" رافع فوراً" ہی آگیا۔

"ہاں بیٹا! کہاں غائب ہو صبح سے؟" اس نے رافع کو پاس بٹھایا۔

"آپ بزی تھیں تو اس لیے سنی وغیرہ کے کمرے میں بیٹھا رہا۔"

"ارے۔۔۔!" وہ حیران ہو گئی۔ "میں تو سمجھ رہی تھی تم سب کھیل رہے ہو' اچھا کھانا کھایا تم نے؟"

"کھانا بہت اسپائسی تھا۔ مجھ سے کھایا نہیں جا رہا تھا۔"

"اوہ۔۔۔" خزران نے سیٹی کے انداز میں ہونٹ سکیڑے۔ قورمہ شاید باہر سے پکوایا تھا' واقعی تیز مسالے دار تھا اور پلاؤ تو رافع کو پسند ہی نہیں تھا۔ اسے شدت سے اپنی لاپروائی کا احساس ہوا۔

"اچھا بیٹھو' میں تم دونوں کے لیے کھانا لاتی ہوں۔"

اس نے کچن میں آکر بھابھی کے بنے سالن میں سے پلیٹ نکالی اور نان اٹھائے۔

"ماما! یہ کمرا کس کا ہے؟" رافع کھانے کے دوران بھی غور سے عازم کے کمرے کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ۔۔۔" وہ رکی۔ "یہ بھی ہمارا روم ہے۔"

"آج ہم یہاں سوئیں۔ یہاں بیڈ بھی ہے۔ کل تو میں بالکل ایزی نہیں سویا تھا۔"

"ہاں۔ ہاں۔ سو سکتے ہو۔" وہ اب اور کیا کہتی۔ گھڑی پر نگاہ کی۔ دس بج چکے تھے' عازم تو شاید لیٹ آتا۔ بچوں کو ابھی سے نیند آرہی تھی۔ اس نے لائٹ آف کر کے بچوں کو وہیں سلا دیا۔ پتا نہیں بے چارے کتنے تھکے ہوئے تھے۔ خلاف توقع رافع کو آدھے گھنٹے میں ہی نیند آگئی اور مناہل تو ویسے بھی لائٹ آف ہوتے ہی دبک جاتی تھی۔

بچوں کو یہاں سوتے دیکھ کر عازم کیا سوچے گا۔ وہ پریشانی سے لب کاٹتے اٹھ بیٹھی۔ "اب کیا کروں' کیا سوئے ہوئے بچوں کو بیٹھک میں سلا آؤں۔ نہیں۔ نہیں۔ پورا صحن عبور کر کے انہیں وہاں تک لے جانا۔۔۔ توبہ کتنی عجیب لگوں گی۔ فضہ بھابھی سے بات کروں یا سب کے سونے کا انتظار۔۔۔ اچھا عازم کا ویٹ کر لیتی ہوں۔ وہ آئے تو مل کر کچھ سوچتے ہیں۔ وہ تو آئیڈیاز کی مشین ہے۔"

خزران مطمئن سی اٹھ کھڑی ہوئی۔ لائٹ دوبارہ آن کر کے کمرے کو تھوڑا سیٹ کیا۔ کپڑوں کا پھیلاوا سمیٹا' ہر چیز جگہ پر رکھی ڈریسنگ ٹیبل کی اشیا کو ترتیب دی۔ بک شیلف کو کپڑے سے صاف کرتے کچھ اچھی کتابوں پر نظر پڑی۔ عازم کے آنے تک ٹائم تو پاس کرنا تھا۔ وہ ایک کتاب لے کر بیڈ کے کنارے پر ٹک

گئی۔ کافی سارے صفحے یونہی بیٹھے بیٹھے پڑھ لیے۔ پھر کمر کو ذرا آرام دینے کے لیے لیٹ کر پڑھنا شروع کیا۔ کتاب بہت ہی دلچسپ تھی' وہ پوری توجہ سے حرف حرف پڑھ رہی تھی۔ لیکن اب نیند کے جھونکے آنا شروع ہوگئے تھے۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ اب تو یقیناً "وہ آنے والا تھا۔ خزران نے دوبارہ دھیان کتاب کی طرف لگایا اور پھر... صبح کی اذان... ایک بار پھر وہ گزشتہ روز کی طرح ہڑبڑا کر اٹھی۔

"اف میرے اللہ۔" اس نے سر ہاتھوں پہ گرایا... کتاب گود میں دھری تھی اور کمرے کی لائٹ... وہ چونکی۔ لائٹ آف تھی اور نائٹ بلب جل رہا تھا' جو اس بات کی دلیل تھا کہ وہ کمرے میں آیا تھا۔ خزران ست روی سے واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

ناشتا اس وقت دونوں کے سامنے رکھا تھا لیکن پچھلی صبح والی شوخی اور شرارت کا کہیں نام نہیں تھا۔ عازم جلدی سے چائے ختم کرکے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آج تو ہم جنید کی طرف انوائٹڈ ہیں نا... وہ کیا کہتے ہیں مکلاوا..." اس نے یاد آنے پر دہرایا۔ "تم اور بچے تیار ہو کر باہر آجاؤ' میں اماں کے کمرے میں ہوں۔"

وہ جیب کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔ خزران نے ایک گہری سانس لے کر برتن اٹھائے۔

وہ چاروں دس بجے جنید کے گھر پہنچ گئے۔ عازم دوپہر کے کھانے تک وہیں رکا۔ زیادہ وقت جنید کے ساتھ گپ شپ میں گزرا۔ کھانے کے بعد اس نے اجازت چاہی۔

"تمہیں لینے کب آنا ہے؟" اس نے خزران کی طرف دیکھا۔

"ابھی کہاں عازم! لے جانے کی باتیں کل کرنا۔ آج تو خزران اور بچے ہمارے ہاں رہیں گے۔" سمیعہ نے شوخی سے اطلاع دی' عازم حقیقتاً حیران ہوگیا۔

"اچھا۔ مجھے واقعی نہیں پتا تھا۔"

"ہاں بھئی۔ ہمارے ہاں مکلاوے کی دلہن اگلے روز واپس جاتی ہے اور تم نے رات کے کھانے پر بھی آنا ہے۔"

"اوہ۔" وہ قدرے رکا۔ "دراصل بھابھی! مجھے تو آج بھی باہر جانا ہے۔ آج کچھ دوست مجھے پارٹی دے رہے ہیں اس لیے ایڈوانس معذرت... کل پھر جس وقت واپسی ہو مجھے بتا دینا۔"

آخری جملہ اس نے خزران کو مخاطب کرکے کہا اور باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

فوڈ اسٹریٹ کی ہلکی روشنیوں میں گرما گرم کھانوں اور دوستوں کی خوش گپیوں سے محظوظ ہوتے بھی عازم نے بے شمار مرتبہ موبائل جیب سے نکال کر چیک کیا۔

وہ دوپہر کے دو بجے جنید کے گھر سے آیا تھا اور اب رات کے دس بج رہے تھے۔ اس دوران خزران سے ایک بار بھی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ کال تو وہ خود بھی اسے کرسکتا تھا' لیکن دل سے اٹھتی خواہشوں کا کیا کرتا۔ جہاں سے لگاتار ایک ہی پکار آرہی تھی کہ وہ اسے فون کرے۔ اس کا حال دریافت کرے۔ وہ اسے بری طرح مس کررہا تھا۔ جانے کیوں دوستوں کی محفل بھی بے رنگ اور پھیکی لگ رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا سب مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر اسے جنید کے گھر سے لے آئے۔ ایک غصہ خود پر بھی آیا کہ سمیعہ کی ڈنر کی دعوت منع کیوں کردی۔ دوستوں کو کوئی مجبوری بتا کر اگلے روز کے لیے ٹال دیتا۔ کم از کم شام کا وقت اس ظالم کے ساتھ تو گزار لیتا۔

☆ ☆ ☆

خزران نے گھڑی کی طرف دیکھا' گیارہ بجنے والے تھے۔ بچے پلے اسٹیشن کھیلنے میں مصروف تھے۔ بھابھی تھک کر سونے چلی گئی تھیں اور جنید بھیا بچوں کے کمرے میں کمپیوٹر پر کچھ کام کررہے تھے۔ خزران بے چین سی کمرے میں آئی تاکہ عازم کو کال کرے۔ لیکن گھڑی دیکھ کر رک گئی۔ "اس وقت تو دوستوں کے ساتھ ہوگا۔ میسج کرلوں۔ پر کیا لکھوں؟ وہ بھی تو

کال کر سکتا تھا۔ اتنی دیر پہلے ہمیں چھوڑ کر گیا۔ حال احوال تو دریافت کر لیتا۔" وہ جھنجلائی ہوئی ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئی۔ لیکن دل بے زار اور اچاٹ سا ہو رہا تھا۔ اپنا ہی کمرا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بے دلی سے لیٹ گئی۔

عازم نے اگلی صبح سے شوروم جانا پھر سے اسٹارٹ کرایا۔ جنید سے فون پر پوچھا کہ خزران اور بچوں کو لینے کب آئے۔ جنید نے کہہ دیا کہ وہ فکر نہ کرے میں خود انہیں چھوڑ آؤں گا۔ خزران بچوں کے ساتھ چار بجے کے قریب پھپھو کے گھر پہنچی۔ عازم ابھی شو روم سے واپس نہیں آیا تھا۔ پھپھو کے ساتھ کچھ دیر حال احوال بانٹنے کے بعد وہ فضہ بھابھی کی مدد کرنے کچن میں آگئی۔ فضہ نے بہت منع کیا، لیکن وہ نہیں مانی تو مجبور ہو کر اسے میٹھے میں کھیر بنانے کی ذمہ داری سونپ دی۔

سات بجے عازم واپس آیا تو وہ کچن میں ہی تھی۔ وہ کسی کام سے اندر آیا تو سرخ اور سیاہ سوٹ میں میک اپ بھرپور اہتمام کیے وہ سیدھی دل میں گھس گئی۔

"کچن میں کام کرنے کا ہی ٹائم ملا تھا؟" وہ سر کھجاتے ہوئے اس کے قریب آیا۔ خزران مسکراتے ہوئے کام میں مصروف رہی۔

"مجھے گھر میں پہننے کے لیے کپڑے چاہئیں۔ کوئی ایزی سا ٹراوزر وغیرہ۔"

"میرا کام ہو گیا۔ تم جاؤ، میں آکر دیتی ہوں۔"

"مجھے بھگانے کے علاوہ کوئی کام ہے تمہیں، اچھا جلدی آنا۔" وہ باہر نکل گیا۔ خزران دس منٹ بعد ہی پیچھے آگئی، لیکن عازم کپڑے تبدیل کر چکا تھا۔

"ارے! میں آ ہی رہی تھی۔ ایسی کیا جلدی تھی۔" وہ حیران ہو گئی۔

"کپڑوں کا تو بہانہ تھا۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھا تو خزران دروازے میں ہی رک گئی۔ عازم نے اس کی کلائی پکڑ کر آگے کو کھینچا اور پیچھے دروازہ بند کر دیا۔

"گھر کے ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے بیوی کو آواز دینا مجھے پسند نہیں۔ میں اپنے اکثر کام خود کرنے کا عادی ہوں۔" دروازے کے دائیں بائیں ہاتھ جما کر اس نے خزران کے نکلنے کا راستہ بند کر دیا۔

"جانے دو عازم! باہر سب کھانے پر ویٹ کر رہے ہیں۔" وہ منمنائی۔

"جا کر دکھاؤ۔" لہجے میں بھرپور شرارت سموئے وہ اور نزدیک ہوا۔

"ابھی کوئی... بلانے آجائے گا، پلیز عازم!" جملہ اس کے منہ میں رہ گیا اور عازم نے اسے کھینچ کر گلے سے لگا لیا۔ بس چند لمحے ہی وہ اس قربت کی گرمی محسوس کر سکے۔

"کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے خزران، عازم... جلدی سے آجاؤ۔" فضہ بھابھی کی آواز نے طلسم توڑا تو دونوں ہی گھبرا کر دور ہوئے۔ خزران نے بے ترتیب دھڑکنوں اور کانپتی انگلیوں سے دروازہ کھولا۔

کھانے کے دوران بھی وہ معنی خیز مسکراہٹ لبوں پہ سجائے مسلسل اسی کو دیکھ رہا تھا۔ خزران نے بمشکل چند نوالے حلق سے اتارے۔ بدتمیز کہیں کا... دوسروں کی موجودگی کا بھی کچھ احساس نہیں۔ وہ اسے دل ہی دل میں سنانے لگی۔

عرفان بھائی نے کھانے کے بعد عازم کو بیٹھک والے کمرے میں بلا لیا۔ ڈیجیٹل کیمرے کی تصویروں کو کمپیوٹر میں ٹرانسفر کرنے کے لیے انہیں عازم کی مدد درکار تھی۔ خزران کمرے میں آئی تو رافع اور منو بھی ساتھ ہی آگئے۔ رافع جس معصومیت سے تھک کر بیڈ پر گرا، خزران کو ٹوٹ کے اس پہ پیار آیا۔ بچے واقعی معصوم فرشتے ہوتے ہیں۔ اس نے پیار سے رافع کے بال سہلائے اور جرابیں اتار کر اسے ٹھیک سے سلایا۔ مناہل بھی اس کی بغل میں گھس آئی۔ خزران نے اٹھ کر نائٹ بلب جلایا اور لائٹ آف کر دی۔ عازم کوئی ایک گھنٹے بعد کمرے میں آیا تو وہ جاگ رہی تھی۔ اس نے ایک نظر بیڈ پہ سوئے بچوں پر ڈالی۔ پھر ڈریسنگ ٹیبل سے کچھ ضروری سامان اٹھا کر خزران کی طرف دیکھا۔

"میں بیٹھک میں سوؤں گا۔ تم کمرا بند کر لو۔"
عجلت میں جملہ پھینک کر وہ پل میں غائب ہو گیا۔ خزران لمحطلے کو تو کچھ سمجھ ہی نہیں پائی۔ وہ تو سوچ رہی تھی کہ عازم کے ساتھ مل کر اس مسئلے کا کوئی حل ڈھونڈے گی لیکن وہ تو بنا کوئی موقع دیے چلا گیا تھا۔ اب وہ اس کے پیچھے جا کر کیا کہتی۔ بیٹھی رہ گئی اور یہ ہی کیا 'آنے والی تین' چار راتیں مزید یہ ہی کچھ ہوا۔ وہ ان کی شادی کا آٹھواں روز تھا۔ خزران اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی' جب فضہ بھابھی ہاتھوں پہ کمبل اٹھائے اس کے کمرے میں آئیں۔

"یہ عازم کا کمبل ہے۔ پچھلی دو' تین راتوں سے ٹھنڈ ذرا زیادہ ہو گئی ہے۔ وہ اپنا کمبل اماں کے کمرے میں ڈھونڈ رہا تھا۔ شکر ہے اماں باتھ روم میں تھیں۔ ورنہ پوچھتیں اس سے کہ یہ ایکسٹرا کمبل وہ کیوں ڈھونڈ رہا ہے۔" بھابھی نے شاید تمہید باندھی۔ خزران نے خاموشی سے کمبل ایک طرف رکھا اور بھابھی کے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔

"تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں خزران... امید ہے برا نہیں مانو گی؟"

"کچھ بھی پوچھیں بھابھی! برا ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"تین' چار راتوں سے دیکھ رہی ہوں۔ عازم بیٹھک میں سوتا ہے۔ شکر ہے یہاں اور کسی کو نہیں پتا چلا۔ اماں کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزرتا ہے۔ اور عرفان کو لگتا ہے کہ عازم شاید کمپیوٹر استعمال کرنے کے لیے دیر تک بیٹھک میں رہتا ہے۔ پھر سونے کے لیے کمرے میں آجاتا ہے۔ میں نے بھی انہیں کچھ نہیں بتایا۔ لیکن تم سے ضرور پوچھنا چاہتی ہوں کہ ایسا کیوں ہے۔ کوئی بات ہے تم دونوں کے بیچ؟" بھابھی نے بہت نرمی اور آرام سے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"نہیں بھابھی! بات تو کوئی نہیں ہے۔" وہ بس اتنا ہی کہہ پائی۔ "مجھے یہ بھی پتا ہے کہ بات ان تین' چار دنوں کی نہیں ہے۔ تم دونوں پہلی رات سے دور ہو۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بنا کسی بات یا اختلاف کے ایسا ہو رہا ہے۔"

"سچ بھابھی... بس اتفاقاً" ہی پہلی رات مجھے بچوں کے پاس نیند آگئی تو..."

"تو کیا وہ ناراض ہو گیا اس بات پہ..."

"نہیں بھابھی... اس کا رویہ تو بالکل ٹھیک تھا اور بعد میں جب بچوں نے میرے کمرے میں سونے کی ضد کی تو میں نے سوچا تھا عازم کے ساتھ مل کر اس معاملے کا کوئی حل نکالوں گی' لیکن وہ بنا بات کا موقع دیے' بیٹھک میں جا کر سونے لگا۔"

"شاید وہ مروت میں ایسا کر رہا ہو کہ بچوں کا معاملہ ہے' کہیں تم مائنڈ نہ کر جاؤ۔ میرا مطلب ہے وہ چاہتا ہو گا کہ اس معاملے کو تم خود اچھے طریقے سے سلجھاؤ۔"

"لیکن بھابھی! اب یہ ہمارے بچے ہیں۔ ہمیں ان کے سب ہی معاملات مل کر سلجھانے ہیں۔"

"وہ سب ٹھیک ہے خزران! لیکن تم اول روز سے ایسی توقع مت کرو' سب کچھ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو گا۔"

"نہیں بھابھی!" خزران نے فوراً" اس کے خیال کی نفی کی۔" میرا خیال ہے ایسے نازک ایشوز اول روز سے ہی توجہ کے محتاج ہوتے ہیں۔ بلکہ عازم کا بھی یہی خیال ہے۔ عازم نے کہا تھا کہ بھلے پوری دنیا کی نفی کر لو' لیکن میرے اور اپنے معاملے میں ان دو کی نفی ہرگز مت کرنا۔ بھابھی! میرے کچھ خدشات اور وہم ہیں۔ آپ میری دوست بھی ہیں۔ میں کھل کر آپ سے بات کر سکتی ہوں۔" خزران نے فضہ کا ہاتھ پکڑ کر آرام آرام سے وہ ساری باتیں بتانا شروع کیں جو عازم نے گجرات سے لاہور کے راستے میں رافع سے کی تھیں۔

"بھابھی... عازم کا سارا فوکس ہی اس بات پر تھا کہ رافع اپنے دل کی رضامندی سے اسے باپ کے روپ میں خود ہی قبول کرے اور یہ عازم کی سمجھ داری کا ثبوت ہے کہ لاہور پہنچتے پہنچتے وہ رافع کے منہ سے اقرار کروا چکا تھا۔ لیکن بھابھی! بچے بہت سیدھے اور

سچے ہوتے ہیں۔ وہ صرف وہی زبان سمجھتے ہیں، جو ان سے بولی جارہی ہوتی ہے۔ اب ان جملوں کے پیچھے کچھ اور مقاصد بھی ہوتے ہیں۔ یہ بات ان کا معصوم ذہن نہیں سمجھ سکتا۔ رافع اور مناہل کا ذہن یہ بات تسلیم کرچکا ہے کہ میں نے عازم کو اپنی زندگی میں صرف ان کا باپ بنانے کے لیے شامل کیا ہے۔ تو کیا چند دن اپنی خواہشات کی چھوٹی موٹی قربانیاں دے کر ہم یہ بات ان پر ثابت نہیں کرسکتے۔ عازم نے خود ہی مجھ سے کہا تھا کہ بچوں کا ناپختہ دماغ سوالات کا کارخانہ ہوتا ہے' انہیں مطمئن کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔"

"وہ سب ٹھیک ہے خزران... بچوں کو مطمئن کرنا بہت ضروری ہے' میں مانتی ہوں۔ لیکن ایسا کب تک چلے گا۔ مجھے لگتا ہے تم نے انہیں غیر ضروری طور پر خود سے چپکا رکھا ہے۔ سنی اور شان تقریباً" رافع کے ہم عمر ہیں لیکن میں نے دو سال پہلے ہی ان کا کمرا الگ کردیا تھا۔ کچھ دھیان ان باریکیوں کی طرف بھی دو۔" وہ بھی نرمی سے سمجھانے لگیں۔

"ہاں... میں نے انہیں غیر ضروری طور پر خود سے چپکا رکھا ہے' میں جانتی ہوں۔ لیکن میرے حالات ہمیشہ ہی دوسروں سے مختلف رہے ہیں۔ یاسر چونکہ باہر رہتا تھا تو میری زندگی تب بھی صرف بچوں کے ساتھ گزر رہی تھی۔ وہ سال میں ایک مرتبہ ملنے آتا' نہ بچوں کے ساتھ اس کی کوئی اٹیچ منٹ تھی' نہ لگاؤ' وہ صرف میرے قریب تھے اور جب یاسر نے دھوکا دیا تو میں بچوں کے اور قریب آگئی۔ میری مجبوریاں الگ ہیں بھابھی!" وہ کچھ افسردہ سی ہوگئی۔ فضہ نے اسے ساتھ لگایا۔

"اللہ نے تمہارے صبر اور حوصلے کا صلہ دیا ہے خزران!"

"نہیں بھابھی! میرے ڈر خوف ابھی ختم نہیں ہوتے۔" اس نے اپنی آنکھوں کی نمی پینے کی کوشش کی۔

"ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟" وہ پریشان ہوگئیں۔

"عازم کے رویے نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کردیا ہے کہ شاید میں نے بچوں کی زندگی میں سوتیلا باپ لا کھڑا کیا ہے۔"

"ایسا نہیں ہے خزران! عازم کے لیے اپنا دل برا مت کرو۔"

"ہماری شادی کو آٹھ دن ہوگئے ہیں بھابھی... رافع سے کرکٹ کھیلنے اور اس کی زندگی میں باپ کی کمی کو پورا کرنے کے دعوے کرنے والے عازم نے اسے پوچھا تک نہیں۔ نہ پاس بلایا' نہ بٹھایا' نہ بات کی۔ اس نے تو مجھے یہ احساس دلایا تھا کہ بچوں کو بچہ سمجھ کر ہرگز یہ فرض نہیں کرنا چاہیے کہ انہیں کسی بات کی سمجھ نہیں آتی اور اب وہی عازم یہ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ میں بھی بچوں کے جذبات کی پروا کرنا چھوڑ دوں۔ انہیں ان کے حال پر اکیلا چھوڑ دوں۔ اگر وہ ایسی اجنبیت سے پیش آئے گا تو زندگی کیسے کٹے گی بھابھی؟" خزران باقاعدہ رو دی۔ فضہ کے دل کو کچھ ہوا۔ خزران بھی ٹھیک تھی اپنی جگہ۔

"روؤ... مت خزران... اچھا میں اماں سے بات کرتی ہوں۔ اب تم لوگوں کو اپنے گھر چلے جانا چاہیے۔ کچھ دن اکیلے گزارو گے تو یقیناً" خاموشی کی یہ دیوار گر جائے گی۔ ایک دوسرے سے کھل کر بات کرنا بہت ضروری ہے۔ بنا کچھ کہے سنے ہر بات دل میں رکھتے گئے تو آپس کے فاصلے بہت بڑھ جائیں گے۔ بس میری ایک بات یاد رکھنا۔" فضہ نے محبت سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "بچوں کو باپ سے قریب کرتے کرتے کہیں خود سے دور نہ کر بیٹھنا۔" وہ اس کا کندھا تھپک کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اب تم آرام کرو' کل اپنے نئے گھر میں اچھی سوچوں اور خوش گوار دل و دماغ کے ساتھ قدم رکھنا۔" وہ مسکرا کر باہر نکل گئیں۔

☆ ☆ ☆

"آپ بھی ہمارے ساتھ چلتیں پھپھو!" خزران تیاری مکمل کر کے سنجیدہ کے کمرے میں آئی تو کچھ دیر وہیں بیٹھ گئی۔ فضہ بھابھی نے شاید رات ہی ان سے

بات کرلی تھی' کیونکہ صبح ناشتے کے بعد انہوں نے خود عازم سے کہا تھا کہ آج وہ لوگ اپنے گھر چلے جائیں' تاکہ خزران گھر کو اپنی مرضی کے مطابق تھوڑا سیٹ کرلے۔

"اب تم آئی ہو تو ان شاء اللہ ضرور آیا کروں گی' جیتی رہو۔" انہوں نے پیار سے خزران کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ "جاؤ پیکنگ وغیرہ مکمل کرلو اور ہاں دوپہر کا کھانا کھا کر جانا۔ عازم کا گھر تو ہفتوں بلکہ مہینوں سے بے توجہی کا شکار ہے۔ جاتے ہی بے شمار کام پڑے ہوں گے۔"

"جی پھپھو!" وہ واپس کمرے میں آگئی۔ عازم گھر جانے کا سن کر بہت خوش نظر آرہا تھا۔ شوروم گیا تو سہی' لیکن لڑکوں کو کام سمجھا کر جلدی ہی واپس آگیا۔ اس کا پرجوش انداز دیکھ کر خزران کے دل میں دبی دبی خوشی کی لہر اٹھی۔ لیکن شاید ابھی اس کا امتحان ختم نہیں ہوا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ لوگ اپنے گھر کے لیے نکلے۔ یہاں کام تو زیادہ نہیں تھا۔ موٹی موٹی بنیادی صفائی عازم نے کروالی تھی۔ البتہ گھر میں کچھ خالی خالی پن کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ فوری طور پر خزران کی سمجھ میں نہیں آئی' لیکن کچن اور وارڈروب وغیرہ کا جائزہ لینے کے بعد یہ عقدہ بھی حل ہوگیا۔

پہلے جب وہ یہاں آئی تھی تو گھر سارہ کے جہیز کے سامان سے بھرا تھا جو طلاق کے بعد یقیناً" اسی کے ساتھ چلا گیا تھا۔ کچن میں برتنوں کی شدید قلت تھی۔ فریج شاید عازم نے نیا لیا تھا۔ لاؤنج سامان سے خالی تھا اور بیڈ روم میں صرف بیڈ اور ٹی وی رکھا تھا۔ عازم نے اسے اور جنید کو جہیز کے لیے سختی سے منع کیا تھا اور کہا تھا ضرورت کا سامان وہ بعد میں مل کر خرید لیں گے۔

عازم نے گھر واقعی بہت خوب صورتی اور محنت سے بنوایا تھا۔ خزران نے پہلی مرتبہ "اپنی" چھت کے احساس کو دل میں اترتا محسوس کیا۔

عازم انہیں اندر چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا۔ کیونکہ دوران ڈرائیونگ اسے مسلسل شوروم سے کالز آرہی تھیں۔ اب یقیناً" اس نے شام کو ہی واپس آنا تھا۔

خزران نے سب سے پہلے الماری کی صفائی کرکے اپنے بچوں اور عازم کے کپڑے سیٹ کرکے رکھے۔ بچوں کو نہلا کر زبردستی ٹی وی کے سامنے بٹھا کر کچن میں آئی اور راشن وغیرہ کا جائزہ لیا۔ وہاں چاول اور دال ہی ایسا آئٹم دکھائی دیے جنہیں وہ رات کے لیے پکا سکتی تھی۔ شام بھی ہونے والی تھی۔ ابھی تو اس نے خود بھی تیار ہونا تھا۔ عازم کی لمبی ناراضی کو اس کی مرضی کے مطابق تیار ہو کر مٹانا تھا۔ وہ اپنے آپ میں مسکراتے ہوئے کچن کے کام نپٹانے لگی۔

پھپھو کی طرف سے دیے گئے کپڑوں میں اس نے ایک میرون سوٹ دیکھا تھا۔ جس پر سفید موتیوں کا کام کیا ہوا تھا۔ خزران نے نہا کر وہی پہنا اور ہلکا سا میک اپ بھی کرلیا۔ عازم سات بجے کے قریب کئی قسم کے بے شمار چھوٹے بڑے شاپر لیے' گھر میں داخل ہوا تو وہ حیران رہ گئی۔

"ارے... یہ اتنا سامان!" وہ سنبھالنے کے لیے آگے بڑھی۔

"میرے خیال میں تو سب ہی ضرورت کا لایا ہوں۔ گھر میں رکھا ہی کیا تھا۔"

"اور یہ کھانے کے ڈبے۔" خزران نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ وہ تو ہوٹل سے تیار کھانا بھی ساتھ لایا تھا۔

"ہاں تو آج رات کیا بھوکے سوئیں گے؟" وہ مسکرا کر کچن کی طرف بڑھ گیا۔ خزران بھی سامان لیے پیچھے آگئی۔

"میں نے دال' چاول بنائے تھے۔" اس نے خاصی شرمندگی محسوس کی بتاتے ہوئے۔

"واہ..." عازم نے ڈھکن اٹھا کر دال کی خوشبو اپنے اندر اتاری۔ "لو یو مائی سوئٹ وائف! میں تو یہی کھاؤں گا۔"

وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگا تو خزران نے مسکرا کر سر ہلایا۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو عازم سے محلے کے کچھ دوست ملنے آگئے۔ اس نے واپس آکر خزران کو بتایا اور ان کے ساتھ ہی چلا گیا۔ کہہ کر یہی گیا کہ جلدی

واپس آرہی ہوں۔ خزران نے کچھ دیر تو بچوں کو ٹی وی دیکھنے دیا۔۔ پھر سلانے کے لیے گیسٹ روم میں لے آئی۔ یہ کمرا بیڈ روم سے کافی دور تھا۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ دو سنگل بیڈ اسی کمرے میں رکھے تھے۔ ان کے علاوہ پورے گھر میں کوئی مناسب جگہ نہیں تھی۔ خزران کو پریشانی تو لاحق ہوئی، لیکن اس نے بچوں پر ظاہر نہیں کیا کہ انہیں یہاں اکیلے سونا ہے۔

وہ ایک بیڈ پر رافع کو سلا کر خود مناہل کے ساتھ دوسرے بیڈ پر لیٹ گئی۔ دونوں کو جلدی ہی نیند آگئی۔ شاید یہاں کے پرسکون ماحول کا اثر تھا۔ اوپر سے ہفتے بھر کی تھکاوٹ خزران دونوں پر کمبل درست کر کے باہر آگئی۔ بیڈ روم میں آکر ٹی وی آن کیا۔

خزران کا سارا دھیان دروازے اور گھر کی طرف تھا۔ بے چینی سے انگلیاں چٹخاتے کبھی وہ بیٹھ جاتی کبھی چلنے لگتی۔۔ بچوں کی الگ فکر لگی تھی۔

وہ ایسی ہی سوچوں میں گم تھی جب بیل بجی۔۔۔ دل ایک دم زور سے دھڑکا۔ وہ تیز قدموں سے دروازے پر آئی۔ عازم نے اندر آکر لاک لگایا۔ خزران نے اس دوران احتیاطاً بچوں کے کمرے میں جھانکا۔

"اوہ۔۔۔" منو بالکل بیڈ کے کنارے پر آگئی تھی۔ اگلی جنبش پر یقیناً نیچے گر جاتی۔ وہ فوراً اندر چلی گئی۔ جبکہ عازم آگے بڑھ گیا تھا۔ خزران نے مناہل کو ٹھیک طریقے سے دیوار کی طرف کر کے سلایا تو وہ آنکھیں کھول کر خزران کو دیکھنے لگی۔ وہ اسے سلانے کے خیال سے ساتھ لیٹ گئی اور تھپکیاں دینے لگی۔

عازم اسے اپنے پیچھے آتے نہ پا کر واپس پلٹا۔ گیسٹ روم میں جھانکا تو ہلکی روشنی میں وہ اسے مناہل کے پہلو میں لیٹی نظر آئی۔ وہ بنا کچھ بولے واپس چلا گیا۔

"دھاڑ۔۔۔" کر کے کہیں کوئی دروازہ بند ہوا تو خزراں پریشانی سے اٹھ بیٹھی۔ آواز تو گھر کے اندر سے ہی آئی تھی۔ اس نے ایک نظر مناہل کو دیکھا وہ دوبارہ سو چکی تھی۔ خزران بیڈ روم کے دروازے تک آئی۔ دروازے کا ہینڈل آہستہ سے نیچے کیا، لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ عازم نے اندر سے چٹخنی چڑھا دی تھی۔

خزران حیرت اور صدمے سے جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔ "تو دروازہ عازم نے غصے سے بند کیا تھا۔" وہ چاہتی تو دروازہ بجا سکتی تھی، لیکن عازم کی جلد بازی اور غصے پر قابو نہ رکھنے پر اس کا بھی خون کھول اٹھا۔ ایک بار پھر وہ بنا کچھ کہے سنے غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔ خزران چپ کر کے مناہل کے پاس آکر لیٹ گئی۔

نیند تو بھلے سے پوری رات نہیں آئی۔ وہ اپنا غصہ اور آنسو پینے کی کوشش کرتی رہی۔ اذانوں سے شاید کچھ دیر پہلے اسے نیند نے آلیا۔ آنکھ کھلی تو صحن والی کھڑکی سے اچھی خاصی روشنی آرہی تھی۔ صبح کی نماز بھی گئی اور جب باہر آکر دیکھا تو عازم بھی شوروم جا چکا تھا۔ اس نے صحن کا گیٹ اور اندر کا داخلی دروازہ بند کیا۔

آج بہت سارے کام کرنے تھے۔ اس نے ذہنی اکھاڑ پچھاڑ دور پھینک کام پہ کمر کس لی۔ بچے ناشتے کے بعد خود ہی ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئے اور خزران نے کچن سے کام کا آغاز کرتے ہوئے آہستہ آہستہ سارے گھر کی صفائی شروع کر دی۔ دھونے والے کپڑوں کا اچھا خاصا ڈھیر اکٹھا ہو گیا تھا۔ کچھ پہلے سے عازم کے پڑے تھے اور کچھ ایک دو روز میں اس کے اور بچوں کے جمع ہو گئے تھے۔ لیکن واشنگ مشین پورے گھر میں کہیں دکھائی نہیں دی۔ اس نے کپڑوں کی گٹھڑی بنا کر اسٹور میں رکھی اور برش لے کر کمروں اور لاؤنج کی صفائی شروع کر دی۔ رافع اور مناہل آدھا گھنٹہ بھی ٹک کر نہیں بیٹھے اور پورے گھر میں بھاگنا دوڑنا شروع کر دیا۔

"ماما! ہم چھت پر جائیں۔"

"چھت پر۔۔۔" وہ چونک کر رکی۔ سیڑھیاں لاؤنج کے اندر ہی تھیں۔ اوپر ایک دروازہ بھی تھا، لیکن پتا نہیں دوسری جانب کیا صورت حال تھی۔

"نہیں بیٹا! پہلے میں خود چھت پر جاؤں گی۔ اگر وہاں کھیلنے کی جگہ ہوئی تب تم لوگوں کو اجازت دوں گی۔ ابھی مجھے کام کرنے دو۔"

"او کے ماما!" رافع جو اوپر والی آخری سیڑھی پر پہنچ گیا تھا۔ ریلنگ سے پھسل کر نیچے آنے لگا۔

"مست کرو بیٹا! پلیز میرے آنے تک کہیں آرام سے بیٹھ جاؤ۔"

اس نے جالی والا دروازہ کھول کر لاؤنج اور کوریڈور کا کچرا باہر صحن میں نکالا اور باہر کی صفائی مکمل کرنے کے لیے خود بھی باہر آگئی۔ پکی اینٹوں والے چھوٹے سے صحن میں ساتھ والے گھر کے درخت کے خشک پتے بکھرے پڑے تھے۔ خزران نے وہاں بھی برش سے صفائی شروع کردی۔ اچانک اندر سے رافع کی زوردار چیخ بلند ہوئی' وہ بری طرح چونکی' پھر پاگلوں کی طرح اندر بھاگی۔ ریلنگ کے نیچے فرش پر رافع بے سدھ پڑا تھا۔ سر سے خون بہہ رہا تھا۔ خزران کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ خون شاید کان سے آرہا تھا۔ شاید کنپٹی سے... کچھ ٹھیک سے سمجھ نہیں آرہا تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں پر قابو پاتے ہوئے اپنے دوپٹے کو اس کے سر پر باندھا۔ اس کی ناک کے آگے ہاتھ کرکے سانس چیک کی۔ دل جیسے ڈوب کر ابھرا۔

"خدایا شکر..." بھاگ کر اس نے پہلے اپنا سیل فون اٹھایا۔ پھر وارڈروب سے بڑا دوپٹا اوڑھ کر واپس آئی۔

"بھائی کے پاس رہو منو!" وہ موبائل پر نمبر ڈائل کرتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل آئی۔

"بھیا! رافع کے سر پر چوٹ لگی ہے۔ خون بہہ رہا ہے۔ پلیز بھیا! جلدی سے آجائیں۔" اس نے پہلا نمبر جنید کا ملایا۔ ساتھ ساتھ رکشوں کو ہاتھ دے کر روکتی رہی۔

"میں آتا ہوں خزران..." اس نے فون رکھ دیا۔ اتنے میں ایک رکشہ قریب آکر رکا۔

وہ الٹے پیروں واپس بھاگی۔ رافع کو بازوؤں میں اٹھایا اور مناہل کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ دروازے کو کھینچ کر جالی گھمائی اور باہر والا گیٹ یوں ہی کھلا چھوڑ کر رکشہ میں بیٹھ گئی۔

اسپتال قریب ہی تھا۔ پانچ سات منٹ میں ہی ڈرائیور نے نہ صرف وہاں تک پہنچایا' بلکہ رافع کو خزران سے لے کر اندر تک پہنچایا۔ وہ وارڈ بوائے فوراً" اسے ایمرجنسی وارڈ لے گئے۔ تب ہی فضہ بھابھی کا فون آگیا۔ انہیں شاید جنید بھائی نے بتایا تھا۔ وہ عرفان بھائی کے ساتھ گھر سے نکل پڑی تھیں۔ خزران نے اسپتال کا ایڈریس اور نام بتایا۔ بھابھی کے فوراً" بعد عازم کا فون آگیا۔ خزران نے اسے بھی بتا دیا۔ مناہل کو ایک کرسی پہ بٹھا کر وہ ایمرجنسی وارڈ کی طرف بڑھ گئی۔

ڈاکٹر نے تسلی آمیز رپورٹ دی تو وہ شکر پڑھتی مناہل کو لینے کوریڈور میں آئی۔ عین اسی وقت عازم سامنے سے آتا دکھائی دیا۔

"رافع کیسا ہے؟" وہ تقریباً" دوڑ کر اس کے قریب آیا۔

"ٹھیک ہے۔" خزران نے تسلی بھرے انداز میں سر ہلایا۔

"اف شکر ہے۔" اس نے اطمینان کی سانس لی۔

"ہوا کیا تھا؟"

"سیڑھیوں پر کھیل رہے تھے دونوں۔ شاید ریلنگ سے پھسلا ہے۔" وہ اسے بتانے لگی۔ تب ہی جنید' فضہ اور عرفان بھی آگئے۔ وہ ان کو لیے کمرے میں آگئی۔ رافع کو سہارے سے اٹھا کر بٹھایا۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا اسے گھر لے جاسکتے ہیں۔ وہ گھر لے آئے تھے۔

عازم بازوؤں پہ اٹھا کر رافع کو اندر لایا اور اپنے بیڈ پہ لا سلایا۔ خزران نے فوراً" دودھ گرم کرکے پلایا۔ خون بہنے کی وجہ سے اسے کافی نقاہت ہوگئی تھی۔ عازم نے اس کے لیے ٹی وی آن کیا۔ جنید بھائی وغیرہ تقریباً" گھنٹہ بھر بیٹھے رہے۔ سنجیدہ پھپھو اور سمعیہ بھابھی نے فون پر اس کی خیریت دریافت کی۔ عرفان بھائی نے گھر جانے کی اجازت لی تو عازم بھی ان کے ساتھ کہیں چلا گیا۔ پتا نہیں کہاں گیا تھا۔ خزران پریشان ہوئی کہ بتا کر نہیں نکلا تھا۔ لیکن اس کی واپسی جلد ہی ہوگئی۔ رافع اور مناہل کے لیے آئس کریم' چاکلیٹ' جوس'

بسکٹ اور جانے کیا کیا اٹھا لایا تھا۔ رافع اپنی من پسند چیزیں دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔ عازم نے مسکرا کر ساری چیزیں اسے تھمائیں اور خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"ساری چیزیں میرے بیٹے کی ہیں۔ بس یہ چھوٹا شاپر بہنا کو دے دیں۔" اس نے مناہل کو پاس بلایا اور باقاعدہ گود میں بٹھا کر آئس کریم کھلانے لگا۔ خزران مطمئن سی باہر چلی آئی۔

عصر کا وقت ہو رہا تھا۔

اس نے اپنے حلیے پر ایک نظر ڈالی۔ صبح سے گھر کے کام کرتے حشر خراب ہو چکا تھا۔ ان ہی کپڑوں میں سارے گھر حتیٰ کہ باتھ روم کی صفائی بھی کی تھی۔ نماز کے لیے، تو ہرگز مناسب نہیں تھے۔ اس نے وارڈروب سے اپنا ایک سوٹ نکالا اور باتھ لینے چلی گئی۔

عصر کی نماز سے پہلے صبح اور ظہر کی قضا ادا کی اور عصر کی نماز کے بعد شکرانے کے دو نفل ادا کرنے کی نیت کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن اللہ اکبر کے لیے اٹھے ہاتھ فضا میں ہی رہ گئے۔ ہفتوں پیچھے کی ایک بات یک دم ایسے جھماکے سے یاد آئی کہ وہ نیت توڑنے پر مجبور ہو گئی۔ ثاقب حسن سے رشتہ طے پایا تھا تو اس نے حاجت کے دو نفل ادا کیے تھے۔ دل میں یہ ارادہ کرتے ہوئے کہ اللہ اس کی ازدواجی زندگی کو خوشیوں سے بھر دے تو وہ شادی کے بعد وہ نفل شکرانہ ادا کرے گی۔ بھلے ثاقب سے رشتہ ٹوٹ گیا تھا اور وہ آج عازم کی بیوی تھی۔ لیکن اس کی دو رکعت حاجت میں کہیں ثاقب کا ذکر نہیں تھا۔ صرف خلوص دل سے اس نے اپنی اور بچوں کی خوشیوں کی بھیک مانگی تھی اور اس کی صاف نیت کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے خوشیوں کی راہیں خود بخود ہموار کی تھیں۔ اسے ثاقب نہیں ملا۔ بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر ملا۔

شکرانے کے دو نفل ادا کرنا تو بنتا تھا جو اس نے اب تک نہیں پڑھے تھے اور جس کا شاخسانہ وہ ہفتے بھر سے بھگت رہی تھی۔ اس نے رافع کی صحت کے لیے دو نفل شکرانہ پڑھنے سے پہلے وہ دو نوافل ادا کیے، جو اس کی دائمی خوشیوں سے مشروط تھے اور اس کے بعد رافع کی حفاظت اور سلامتی پر اللہ کا شکر دو نفل ادا کر کے کیا۔ دل ایک دم مطمئن سا ہو گیا۔

شام بلکہ رات تک کا سارا وقت ان چاروں کا ایک ساتھ بیڈ روم میں گزرا۔ عازم نے اسے کچن کے کام سنبھالنے سے منع کر دیا اور رات کا کھانا باہر سے لے آیا۔ رافع بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا اور اب سونا چاہتا تھا۔

"تم بچوں کے ساتھ اسی روم میں رہو۔ میں ادھر گیسٹ روم میں سو جاتا ہوں۔ دروازہ کھلا رہے گا۔ اگر خدانخواستہ کوئی پرابلم ہو تو فوراً بلا لینا۔" اس نے رافع کی پیشانی چومی، مناہل کو پیار کیا اور کمرے سے چلا گیا۔

خزران کی آنکھ دیر سے کھلی۔ اس کا خیال تھا شاید آج عازم چلا گیا ہو گا۔ لیکن وہ دروازے تک آئی تو لاک بھی لگا ہوا تھا اور کمرے میں جھانکا تو وہ بھی بے خبر سویا ملا۔ خزران نے گھڑی دیکھی تو نو بجنے والے تھے اور اس کا جاگنے کا کوئی ارادہ نہیں لگ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے کچن میں آ کر کام میں مصروف ہو گئی۔

"ماما! رافع بلا رہا ہے۔" مناہل آنکھیں ملتی کچن میں داخل ہوئی تو خزران تیزی سے اندر بھاگی۔

"کیا ہوا بیٹا۔ ٹھیک تو ہو؟" رافع تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔

"ماما! واش روم جانا ہے۔"

"آؤ۔ میں لے جاتی ہوں۔" وہ آگے بڑھ کر اسے بازو سے سہارا دے کر نیچے اتارنے لگی تو رافع ہنسنے لگا۔ خزران نے حیرت سے دیکھا۔

"ماما! میں خود جا سکتا ہوں۔ میں نے تو اس لیے بلایا تھا کہ یہ والا باتھ روم میں یوز کر سکتا ہوں، یہ انکل کا ہے نا۔" اس نے وضاحت کی تو خزران بھی مسکرانے لگی۔

"ہاں شیور۔" اس نے دور ہو کر رافع کو جانے کا راستہ دیا۔

"ایسے نہیں۔" پیچھے سے عازم کی آواز آئی تو دونوں نے ایک ساتھ مڑ کر دیکھا۔

"ایک شرط پر تم اس باتھ روم جاسکتے ہو۔" وہ اندر آگیا۔ رافع حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"اب میں انکل نہیں بابا ہوں تمہارا اور یہ پورا گھر ہم سب کا ہے۔ اس لیے آئندہ پرمیشن کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے پاس آکر انگلی سے رافع کا گال چھوا تو وہ مسکرانے لگا۔

"تھینک یو۔ ان... بابا۔" وہ اٹک کر بولا تو خزران بھی ہنسنے لگی۔

"اوکے... اب تم جاؤ، لیکن اندر سے لاک نہ لگانا۔ ابھی تمہاری طبیعت پوری طرح نہیں سنبھلی۔ کوئی پرابلم نہ ہو خدانخواستہ۔" عازم نے نرمی سے سمجھایا۔

"جی بابا!" وہ سرہلا کر باتھ روم میں گھس گیا۔

"مجھے کپڑے چاہئیں۔ تم نے شاید جگہ تبدیل کی ہے، چیزوں کی۔" عازم نے سنجیدگی سے خزران کو مخاطب کیا۔ وہ شاید باہر والے باتھ روم سے نہا کر آیا تھا۔ اس وقت ٹراوزر اور بنیان میں تھا اور بال بھی گیلے تھے۔ خزران نے الماری کھول کر اس کے سامنے کی۔

"تمہارے، سب ہی کپڑے یہاں رکھے ہیں، جو چاہیے لے لو۔ میں ذرا ناشتا بنالوں۔"

"ہوں..." وہ آگے بڑھ کر خود ہی کپڑے دیکھنے لگا۔ خزران کچن میں چلی آئی۔ عازم کا آج شاید کہیں جانے کا پروگرام نہیں تھا۔ اس لیے سادہ سی شلوار قمیص پہن لی۔ خزران نے کچھ نہیں پوچھا۔ وہ بھی جانے کیوں سنجیدہ سا تھا۔ خصوصاً" خزران سے کافی رسمی انداز میں بات کی تھی۔

گیارہ بجے کے قریب وہ رافع کو پٹی تبدیل کرانے لے گیا۔ خزران نے ساتھ جانے کی کوشش کی، لیکن اس نے منع کردیا۔ وہ دونوں گھنٹے بھر میں ہی واپس آگئے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اگلی پٹی کے لیے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک، دو روز میں زخم ٹھیک ہوجائے گا۔

دوپہر کو سنجیدہ پھپھو رافع کی طبیعت پوچھنے آگئیں۔ شام تک وہ یہیں رہیں۔ واپسی پر عازم انہیں خود گھر چھوڑنے گیا۔ خزران نے کچن کا پھیلاوا سمیٹا اور کچھ دیر آرام کرنے کے لیے اندر آبیٹھی۔ تب ہی عازم بھی واپس آگیا۔

"تم بزی ہو ابھی؟"

"نہیں... بس رات کا کھانا دینا ہے۔ کہو تو لے آؤں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں۔ میں نے دوپہر کو اماں کے ساتھ خوب ڈٹ کر لنچ کیا تھا۔ فی الحال بالکل بھوک نہیں ہے۔ دراصل مجھے تم سے ضروری کام تھا۔ اس لیے پوچھا۔" وہ کافی سنجیدہ سا تھا۔ یہ لہجہ، یہ انداز عازم کی طبیعت کا حصہ نہیں تھا۔ خزران کچھ پریشان سی ہوگئی۔ رافع والے واقعے کے بعد بچوں کے ساتھ تو رویہ بالکل تبدیل ہوگیا تھا۔ لیکن اس سے شاید وہ ابھی بھی خفا تھا۔

"کیا بات ہے عازم؟" وہ اس کے پیچھے لاؤنج میں آئی۔

"گھر کی سیٹنگ تبدیل کرنی ہے، تمہاری ہیلپ چاہیے۔"

"ہاں... کہو۔" وہ بغور اسے سننے لگی۔

"گیسٹ روم کے دو سنگل بیڈ یہاں بیڈ روم کے ساتھ والے کمرے میں لاتے ہیں اور یہاں کا سامان ادھر لاؤنج میں شفٹ کرکے ٹی وی یہاں دوبارہ سیٹ کردیتے ہیں اور گیسٹ روم کو فی الحال خالی رہنے دیتے ہیں۔ بعد میں وہاں کے لیے نیا فرنیچر خرید کر اسے ڈرائنگ روم بنادیں گے۔" عازم نے تفصیل سے اپنا خیال اس سے شیئر کرکے تائید طلب نظروں سے دیکھا۔

"اوہ... ہاں..." بات سمجھ آجانے پر خزران کے محسوسات ایک دم خوش گوار ہوئے اور اپنی موٹی عقل میں ایسا آئیڈیا نہ آنے پر خود کو کوسا بھی۔ وہ تو کل سے یہ سوچ کر پریشان ہوئی جارہی تھی کہ بچے اس سے اتنی دور کیسے رہیں گے۔

"تمہارے ذہن میں کوئی اور اچھا آئیڈیا ہے تو بولو؟"

"نہیں... یہ ہی ٹھیک ہے۔"

"تو آؤ پھر۔" اسے اشارہ کر کے عازم ڈرائنگ روم میں آگیا۔

"کہو ٹھیک ہے۔" عازم نے کچھ تبدیلیاں کر کے اسے مخاطب کیا تو وہ چونکی اور سیٹنگ پر توجہ دی۔ کھٹ پٹ کی آواز سے منال اور رافع بھی بھاگ آئے تھے۔

"ارے۔" رافع نے آنکھیں پھیلائیں۔ "یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟"

"آپ کے لیے کمرا سیٹ کر رہے ہیں۔ بابا کے بالکل پاس والا۔" خزران نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"واؤ۔ تو اب ہمیں الگ کمرا ملے گا سنی اور شان کی طرح۔" اس نے کافی جوش اور خوشی کا مظاہرہ کیا۔

"بالکل۔" عازم اس کے قریب آیا۔ "الگ کمرا ملے گا، لیکن فی الحال نہیں۔ ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ فی الحال کچھ دن تم بابا کے بیڈ پہ آرام کرو گے۔"

عازم نے پیار سے رافع کو اپنے ساتھ لگایا تو خزران نے آنکھوں کی نمی چھپانے کے لیے منہ پھیر لیا۔

"بچوں کے ساتھ کتنا مہربان ہو گیا ہے اور میرے ساتھ۔" اس نے زور سے لب بھینچے۔

"کچھ دن کہاں بابا!" رافع نے منہ بسورا تو خزران اس کی طرف مڑی۔ "کل تو ہم گجرات واپس جا رہے ہیں۔"

"کل۔" عازم نے بے ساختہ خزراں کو دیکھا تو اس کا سر جھک گیا۔

"ہاں پرسوں میری حاضری ہے۔ وہ ایکچویلی میں شادی سے تین دن پہلے ہی آگئی تھی تو اس حساب سے کل پندرہ دن ہو جائیں گے۔"

"نہیں۔" اس نے کسی قسم کے تبصرے سے خود کو باز رکھا۔ "کوئی بات نہیں، اب تو ان شاء اللہ ہر ویک اینڈ آنا جانا لگا رہے گا۔ ہفتے بعد بالکل ٹھیک ہو کر آنا، پھر اپنے الگ روم میں سونا، بلکہ اسے مزید خوب صورت بنانے کے لیے اپنی مرضی کا نیا سامان بھی خریدنا، اوکے۔" اس نے شوخی سے رافع کے بال بکھیرے۔

"چلو بچو۔ کل سفر کرنا ہے۔ اس لیے آج جلدی سونا پڑے گا۔ اب اور کوئی شور ہنگامہ نہیں۔" وہ عازم سے نظریں چرا کر بیڈ روم میں آگئی۔

☼ ☼ ☼

"میری کچھ مدد چاہیے؟" وہ کچن میں تھی، جب عازم پیچھے آگیا۔

"نہیں۔ شکریہ۔ برتن رہ گئے تھے۔ اب وہ بھی دھل گئے۔" وہ ہاتھ صاف کرتی اس کی طرف مڑی، لیکن نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔

"بچے سو گئے۔" بہت ہی عام سا انداز تھا۔ خزران نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہاں ابھی سوئے ہیں۔"

"سچ سچ۔" انداز ایک دم بدلا تو خزران نے بے ساختہ نظر اٹھائی۔ وہ چمکتی آنکھوں میں بے پناہ محبت لیے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ لبوں پر بہت غیر محسوس لیکن دل کے اندر تک پیغام پہنچاتی مسکراہٹ سجی تھی۔ خزراں کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔ عازم نے آگے بڑھ کر اس کی دونوں کلائیاں اپنے ہاتھوں میں لیں۔

"کتنی ناراض ہے میری سوہنی کڑی؟"

"نہیں تو۔" اس نے گھبرا کر کلائیاں چھڑوائیں۔

"لڑتی کیوں نہیں ہو مجھ سے۔ بس خاموشی سے ہر بات دل میں رکھتی جا رہی ہو۔ دل ہے یا عمرو عیار کی زنبیل۔" وہ ہنسا۔ "غصہ ہے میری جان! تو باہر بھی نکالو ہم حق رکھتی ہو کچھ بھی کہنے کا۔"

"کوئی غصہ نہیں ہے۔" اس نے بمشکل خود کو بولنے کے قابل بنایا۔ عازم کی قربت حواس چھین رہی تھی۔

"روئی کیوں تھیں اس وقت۔" عازم نے چہرے پر آئے اس کے بالوں کو ایک طرف کر کے اس کا چہرہ اوپر کیا۔ خزران نے جھلمل کرتی آنکھوں کا پانی پینے کی کوشش کی۔

"تم جھگڑا کرو گی تو میرے لیے آسانی ہو جائے گی۔ ورنہ تو اپنے قصور مجھے خود ہی گنوانے پڑیں گے۔" عازم نے خاص ہی بے چارگی سے اپنی مجبوری بیان کی۔

"اچھا ے۔۔۔ اب یہ ہی تمہاری سزا ہے۔" خزران کو ہنسی آگئی لیکن ساتھ ہی رونا بھی۔ جو وہ بہت دیر سے روکے کھڑی تھی۔ عازم نے بے ساختہ کھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگایا۔

"سوری رازی۔۔۔ میں نے تمہیں بہت پریشان کیا۔ پلیز اب، اور نہ رونا۔ تمہارا ایک ایک آنسو میرے ضمیر پر بوجھ ہے۔ دس' بارہ دن کی دلہن کا تو آنسوؤں سے رشتہ ہی ٹوٹ جاتا ہے اور میں نے اپنی جان کو اتنا رلا دیا۔ بس اب اور نہیں۔"

اس نے خزران کو اپنے بازوؤں پر اٹھالیا۔ "ناراض بیوی کو منانے کے لیے کچن شاید سب سے نامعقول مقام ہے۔" خزران کو بازوؤں پر لیے اس نے باہر کا رخ کیا۔ "جگہ ایسی ہو جہاں کچھ چاندنی چٹکی ہو' ٹھنڈی ہوائیں سرسرا رہی ہوں۔ آسمان سرمئی بادلوں سے بھرا ہو' پیروں تلے پھولوں کی نرم پتیاں بکھری ہوں یا۔۔۔" وہ اس کے چہرے کو بغور تکتے ہوئے کچھ کہتے کہتے رکا۔

"یا کم از کم بیٹھنے کے لیے بچوں کا یہ بیڈ سہی۔" عازم نے اسے ابھی ابھی سیٹ کیے سنگل بیڈ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ خزران ۔۔۔۔ سرخ چہرہ لیے دوپٹا درست کرنے لگی۔

"یہاں کا ماحول زیادہ رومانٹک تو نہیں ہے لیکن بنایا جاسکتا ہے۔" عازم نے سر کھجایا۔ وہ ہنس پڑی۔ عازم مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔

"بہت ظالم ہو' اللہ کی قسم۔" وہ اس کے عین سامنے بہت قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ "میری کوتاہیوں میں سارا قصور تمہارا ہے۔ اس بری طرح پھنسالیا ہے واللہ' سوائے تمہارے اور کچھ نظر ہی نہیں آرہا تھا۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کے دھیمے دھیمے بول رہا تھا۔

"مجھ جیسا محبت کا مارا نہ تم نے دیکھا ہو گا' نہ سنا۔ تمہیں پانے کا نشہ ایسے حواسوں پر چھایا کہ سارے عہد و پیمان بھول بیٹھا۔ بعض دفعہ بہت زیادہ خوشی بھی ہمارے حواس مختل کردیتی ہے۔ تمہیں اپنا بنا لینے کی خوشی شاید میری اوقات سے بڑھ کر تھی۔ تب ہی سنبھال نہیں پایا۔"

"کیا میں خوش نہیں ہوں عازم؟" خزران نے جھکی پلکوں سے اقرار کیا۔ "لیکن مجھے اس خوشی نے استحکام بخشا ہے۔ یہ سوچ ہی پرسکون کردینے کے لیے کافی ہے کہ اب ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔ تمہاری طرف بے چینی سے بڑھتے قدموں کو یہ سوچ کر روکتی رہی' صرف ہمیشہ کے بھلے کے لیے۔ میرے مدنظر صرف مناہل اور رافع کے جذبات کا خیال رکھنا نہیں ہے۔ اللہ گواہ ہے عازم! مجھے ان سے پہلے تمہاری پروا ہے' جانتے ہو کیسے۔" خزران نے پہلی مرتبہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس نے جواباً" بھرپور توجہ سے سرہلایا۔

"میں نہیں چاہتی کہ فی الحال بچوں کو ہم دونوں کی محبت اور نزدیکی کا ادراک ہو۔ تمہیں میرے قریب دیکھ کر کہیں وہ تم سے حسد نہ کرنے لگیں۔ آغاز میں میری کوشش تھی کہ ان کے سامنے ڈائریکٹ تمہیں مخاطب بھی نہ کروں' تاکہ انہیں ماں کے چھن جانے کا احساس نہ ہو۔ تم نے ہی یہ احساس دلایا تھا کہ بچوں کے جذبات کو اگنور نہیں کرنا چاہیے۔ بس ایک بار وہ تمہیں اپنا دوست اور ہمدرد مان لیں اور دل سے تمہیں اپنا باپ تسلیم کرلیں' پھر انہیں ہماری قربت' ہمارا ہنسنا بولنا نہیں کھٹکے گا۔ لیکن اگر خدانخواستہ کسی وجہ سے تمہارے کسی منفی عمل نے تمہیں ان کی نظر میں ولن بنادیا تو میں عمر بھر کے لیے چکی کے دو پاٹوں میں پس کر رہ جاؤں گی۔ نہ مکمل تمہاری ہو پاؤں گی' نہ ان کی۔ نہ تمہیں چھوڑ پاؤں گی' نہ ان کو۔ ایک دوسرے کو کھونے کا درد ہم دونوں ہی سہہ چکے ہیں اور تم جانتے ہو کہ یہ درد ہماری برداشت سے بہت بڑا تھا۔ اب دوبارہ نہیں عازم۔۔۔ ہرگز نہیں۔"

خزران نے جذباتی ہو کر دونوں ہاتھوں سے اس کا بازو تھاما۔ عازم نے لب بھینچ کر تائید میں سرہلایا۔ اس

کا حرف حرف سچ تھا۔ عازم نے اس کے ہاتھوں پر تھپکی دی۔

"تمہارے سب وہم' سب ہی خدشے جائز ہیں رازی... لیکن خدارا میری چند دن کی لاپروائی کو میرے سوتیلے پن پہ محمول مت کرنا۔ میرا کوئی سگا ہوتا تو شاید میں ان کے لیے سوتیلا بن بھی جاتا' لیکن میرا تو کل سرمایہ یہ ہی ہیں۔ اللہ گواہ ہے' میں نے اس عہد کے ساتھ نکاح نامے پر دستخط کیے کہ اب مجھ پر تین لوگوں کی ذمہ داری ہے جسے مرتے دم تک بہ حسن و خوبی نبھانا ہے۔ جانتی ہو رازی..." عازم نے خزران کے نرم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "پچھلی رات ایک خوف نے مجھے سوتے سے جگا دیا۔ شدید عدم تحفظ کا ایک احساس' شاید زندگی بھر جس سے نجات ممکن نہیں۔"

وہ اچانک ہی بہت آزردہ اور مضمحل دکھائی دیا۔ خزران کا دل بند ہونے لگا۔

"کک... کیسا خوف عازم؟"

"رافع کے ساتھ حادثہ پیش آیا تو تم نے فوری طور پر پہلا فون جنید کو کیا۔ میاں' بیوی کے آپس کے تعلقات جتنے برے جتنے خراب ہوں' بچوں پر تکلیف آئے تو اں پہلی مدد بچوں کے باپ سے مانگتی ہے نہ کہ اپنے بھائیوں سے۔ لیکن میرے رویے کے سوتیلے پن نے شاید تمہیں ایسا کرنے سے باز رکھا۔ یہ تو تم تھیں جس نے آج بچوں کے معاملے میں مجھے بھروسے کے قابل نہیں سمجھا' کل کو اگر زندگی کے کسی موڑ پر یاسر اپنی سگی اولاد پر اپنا حق جتانے آ کھڑا ہوا تو کیا بچوں کے دل میں میری محبت کا بخشا وہ مان' وہ بھروسا ہوگا' جو انہیں سگے باپ کی سمت کھنچنے سے باز رکھ سکے... تہی دامن شخص نسبتاً" زیادہ بے فکرا اور بہادر ہوتا ہے' کیونکہ اس کے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ کل تک میں بھی اسی مقام پر تھا۔ بالکل اکیلا' تہی دست و داماں... لیکن آج میری جھولی بھری ہے... خوف اور ڈر کا سایہ کچھ اچانک ہی سر پر منڈلانے لگا ہے۔ تمہارا ساتھ اور تمہاری مدد میرے لیے سانس لینے جتنی اہم ہو گئی ہے رازی... مجھے اکیلا مت چھوڑنا۔" اس نے بے ساختہ خزران کو خود سے قریب کیا۔ اس نے مسکرا کر آنکھوں کی نمی پینے کی کوشش کی۔

"میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں عازم... خود کو کبھی اکیلا مت سمجھنا۔"

"اور وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی کوئی بات دل میں نہیں رکھو گی۔" اس نے گویا تنبیہہ کی۔

"یہ وعدہ تو تمہیں مجھ سے کرنا چاہیے۔" وہ مسکرائی۔ "بنا کہے سنے تو تم ناراض ہو گئے تھے۔"

"یعنی..." عازم کو فوری طور پر بات سمجھ نہیں آئی۔

"یعنی یہ کہ پچھلی چار' پانچ راتوں سے میں اس بات کی منتظر رہی کہ جب تم کمرے میں آؤ تو میں تم سے بچوں کے سونے' ان کی حالت وغیرہ سے متعلق ڈسکس کروں۔ لیکن تم تو پھپھو کے گھر سے ہی بنا کچھ کہے سنے کمرا چھوڑ جاتے تھے اور ہاں پرسوں رات جب تم دوستوں سے ملنے باہر گئے' میں تمہارے بیڈ روم میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ وہ تو منال کو پلنگ سے گرتے دیکھ کر پانچ دس منٹ کے لیے اس کے پاس لیٹ گئی اور تم نے ٹھاہ کر کے دروازہ بند کر دیا۔" خزران نے اس کے جذباتی اقدامات پر تفصیل سے روشنی ڈالی تو وہ بری طرح شرمندہ ہو گیا۔

"یعنی یہاں بھی قصور میرا نکلا۔" وہ کھسیا گیا۔ "اور میں پتا نہیں کیا سوچ رہا تھا۔" آخری جملہ اس نے دھیرے سے زیر لب دہرایا' لیکن خزران نے سن لیا۔

"تم کیا سوچ رہے تھے؟" اس نے بھنویں سکیڑیں۔ عازم کا انداز ہی اتنا مشکوک تھا کہ خزران کو دال میں کچھ کالا نظر آیا۔

"کچھ نہیں یار... ایسے ہی..."

"بتاؤ نا عازم! اور کیا بات تھی۔ جتنا میں تمہیں جانتی ہوں' تمہارا پچھلے کچھ دنوں کا غصہ اور ناراضی بچوں کی وجہ سے تو نہیں ہو سکتے۔" اس کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔ عازم نے قائل ہوتے ہوئے سر ہلایا۔

"ہاں... تمہارا بچوں کی طرف زیادہ جھکاؤ' ان سے

انچجمنٹ بھی میرے لیے پرابلم کا باعث نہیں بن سکتی۔ ماں کی اولاد کے لیے محبت فطری امر ہے' میں کوئی حدبندی لگانے والا کون ہوتا ہوں۔ ان کے معاملے میں تم کسی بھی حد سے گزر جاؤ جائز ہے۔ بلکہ ہاں... ایک اور بات بھی یاد رکھو۔" اس نے بھرپور متانت سے خزران کی آنکھوں میں دیکھا۔ "میں خود بھی یہ بات سمجھ گیا ہوں کہ اللہ نے مجھے اولاد کی خوشی اسی صورت میں دینا تھی۔ اللہ کی مصلحتیں واقعی ہمارے دائرہ عقل سے بہت بالا ہیں۔ سوچو! اگر سارہ کی جگہ تم میری پہلی شریک سفر ہوتیں تو کیسے اتنی بڑی قربانی دیتا' کیسے، تمہیں خود سے جدا کرپاتا۔ سوچوں بھی تو لرز اٹھتا ہوں۔ تم جس طریقے سے میری زندگی میں شامل ہوئیں۔ یہی سب سے خوب صورت راستہ تھا' اور یہ ہی میری اصل منزل ہے' میں ناشکری نہیں کرسکتا۔" وہ بہت رسان اور پیار سے وضاحت دے رہا تھا۔ خزران اس کے خوب صورت الفاظ کی سچائی میں کھوسی گئی۔

"اور پھر دوسری وجہ کیا تھی عازم!"

"وہ..." وہ شرمندہ سا ہنس پڑا۔ "میں نے کہا نا تمہاری محبت کا مارا ہوں' کبھی کبھی جوش میں ہوش کھو جاتا ہوں۔"

"اب بتائیں دو عازم 'کیا فالتو میں الجھائے جارہے ہو۔" وہ منہ پھلا کر باقاعدہ ناراض ہوگئی۔ عازم لحظے کو چونکا پھر بے ساختہ ہنس پڑا' خزران کا فطری انداز جانے کیا کچھ یاد دلا گیا۔

"سچ آج تو قسم سے وہی منگیتر منگیتر سی لگ رہی ہو۔" اسے خزران کی ناراضی پر بے تحاشا پیار آیا۔

"پاگل ہو بالکل... منگیتر کے تصور سے خوش ہورہے ہو' جبکہ اب تو میں..." اس نے بیوی کہتے کہتے اچانک زبان کو بریک لگائی۔ بھلے وہ دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے اور بہت فری ہوکر بات کرتے تھے' لیکن اس نئے حسین رشتے کا ریشمی سنہری احساس ابھی اپنی پوری تابناکی اور رعنائی اپنے اندر چھپائے بیٹھا تھا۔ جس کے تجلیلے انوکھے رنگوں نے

ورق ورق اپنی خوب صورتی کی جھلک دکھاتا تھی۔ تب دوستی اور محبت کا یہ رشتہ مزید بامعنی مزید مضبوط ہونے والا تھا۔

"ہاں کہو... اب تو میں کیا؟" آنچ دیتا لہجہ تھا عازم کا' لفظوں کے زیر و بم سے خزران کا وجود سلگنے لگا۔ اس نے بمشکل خود کو اس سحر سے نکالا۔

"میں ہار رہی ہوں۔" وہ اپنی بے قابو دھڑکنوں کی آواز اپنے کانوں میں سن رہی تھی۔

"اچھا، کو بابا!" وہ ہار مان گیا اور باقاعدہ بازو سے پکڑ کر دوبارہ بٹھایا۔ "یار بندہ ہے نا' غلط فہمی ہو جاتی ہے کبھی کبھی۔ تمہارے دور رہنے سے بلاوجہ میرے دماغ میں یہ شک بیٹھ گیا کہ شاید تمہارے لیے یاسر کی یادوں سے الگ ہونا اور مجھے شوہر کے روپ میں قبول کرنا ذرا مشکل ہو رہا ہے۔ بس کچھ اسی وجہ سے پوزیسو ہو گیا۔ میں نے سارہ سے شادی کے باوجود اپنے دل کو کبھی تم سے خالی نہیں پایا۔ تم سے اپنائیت اور محبت برسوں بعد بھی جوں کی توں تھی' لیکن تمہارے معاملے میں مجھے لگا کہ شاید یاسر کی بیوی بننے کے بعد تم اب وہ پرانی خزران نہیں رہیں۔ میرا غصہ' جھلاہٹ اور ناراضی صرف اس لیے تھے کہ میری توقعات بہت زیادہ تھیں۔ اور تمہارا ریسپانس تقریباً "مائنس" حالانکہ مجھے سوچنا چاہیے تھا کہ میں مرد ہوں' جس کے ہاں گنجائش نکلنا فطری امر ہے۔ بہ نسبت اس کے عورت وفادار اور کمٹڈ ہوتی ہے۔ شاید مجھے اسپیس دینا چاہیے تھا۔"

وہ اب کھلے دل سے اپنی کوتاہیوں' شکوک اور غلط فہمیوں پر بولنے لگا تھا۔ خزران نے اسے آرام سے بات مکمل کرنے دی۔

"تو پھر تم نے کیسے جانا کہ یہ صرف تمہاری غلط فہمی تھی؟"

"کل میں اماں کو چھوڑنے گھر گیا تو فضہ بھابھی نے مجھے روک لیا۔ انہوں نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر تمہارے خدشات سے آگاہ کیا۔ شاید یہاں آنے سے پہلے تمہاری ان سے تفصیلی بات ہوئی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ تم صرف بچوں کی وجہ سے تھوڑا احتیاط سے پیش آ رہی ہو اور ابھی جب میں نے رافع کو پیار کیا تو تم نے آنسو چھپانے کے لیے چہرہ دوسری جانب کر لیا۔ میں جان گیا کہ میری سختی تمہاری برداشت سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔ کیا میں ٹھیک سمجھا؟"

آخری جملہ پھر کچھ کچھ خدشات سے بھرا تھا۔ خزران قدر دانی سے مسکرا پڑی۔ وہ تشکر سے اسے دیکھنے لگی' وہ ابھی بھی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ خزران کی پلکیں جھک گئیں۔

"اپنا مقابلہ ایک ناقدرے اور دھوکے باز شخص سے مت کرو عازم... جس نے مجھے طلاق دی ہے' اسے میں اپنی یادوں میں کیسے بسا سکتی ہوں۔ یاسر ایک مہمان کی طرح زندگی میں آیا اور سوائے میرے دل کے سب لوٹ کر لے گیا۔ ایسے بے مہر کو نہ دل کی ضرورت تھی' نہ قدر' اس کے معاملے میں میری ایموشنل لائف اسی روز پتھر ہو گئی تھی جب اس کی دھوکا دہی کا پول مجھ پر کھلا۔ راتوں کو جاگنا اور پریشان رہنا تو صرف بچوں کے فیوچر اور اچانک سر پر آ پڑنے والی ذمہ داریوں کی وجہ سے تھا۔ ابھی تم نے خود کہا کہ عورت کمٹڈ اور وفادار ہوتی ہے۔ تو بھلا تم سے نکاح ہو جانے کے بعد میں کیسے کسی غیر مرد کی وجہ سے تمہارے ساتھ زیادتی کر سکتی ہوں؟"

"سوری رازی! میں اپنی بدگمانی پر معافی چاہتا ہوں۔" عازم نے کھلے دل سے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے خزران کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو وہ مسکرانے لگی۔

"کبھی کبھی بالکل بچے بن جاتے ہو عازم!"

"تمہارے معاملے میں تو ایسا ہی ہوں۔" وہ بھی مسکرانے لگا۔

"تو کیا ایسے ہی رہو گے' وہموں میں گھرے' شکی مزاج؟" وہ گھبرائی۔

"نہیں... نہیں' تم چاہو تو میرے وہم اور گمان دور ہو سکتے ہیں۔" وہ معنی خیز شوخی سے اسے دیکھنے لگا۔

"ویسے تو ہر معاملے میں بڑے سمجھ دار بنتے ہو۔

اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی۔"

"اور یہ اتنی سی بات تم خود کیوں نہیں سمجھا دیتیں۔" وہ اصرار کرنے لگا۔ خزران کو مزید تنگ کرنا اچھا نہیں لگا۔ عازم بے چارے کی آزمائش تو یوں بھی خاصی طویل ہوگئی تھی۔

"دس' بارہ روز پہلے ہم جس رشتے کی بنیاد پر ایک دوسرے کی زندگی میں شامل ہوئے' اس میں اپنائیت اور محبت پیدا ہونا بھلے بہت فطری بات ہے' لیکن تم سے اپنا پن محسوس کرتے مجھے تو اب بہت عرصہ ہو لیا ہے۔" اس نے نیچے دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ اس کا شرمایا' شرمایا اقرار سن کر عازم کے لبوں پر بہت خوب صورت مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

"یعنی جب سے میں وطن واپس آیا ہوں۔" اس نے تائید چاہی تو خزران نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔

"اچھا۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔ تنہائی میں ایک دوسرے کا قرب کچھ اچانک ہی ابھر کر محسوس ہوا۔ عازم کی خوب صورت ہنسی میں جھرنوں کی روانی تھی۔ خزران کو اپنا دل لہروں پر بہتا سا محسوس ہوا۔ عازم نے دائیں ہتھیلی پلنگ پہ جما کر بائیں ہاتھ سے خزران کی ٹھوڑی اونچی کی۔

"عازم۔۔۔ میں نے جنید بھائی کو پہلا فون اس لیے کیا تھا' کیونکہ جلدی میں' میں ڈائل کیے ہوئے نمبرز ہی نکال پائی' وہاں پہلا نمبر بھیا کا ہی تھا۔" خزران نے ماحول کا جادو کم کرنے کے لیے جلدی سے موضوع بدلا۔ لیکن عازم نے محض بے دھیانی میں سر ہلایا۔

"ورنہ تم جانتے ہو' میں نے ہمیشہ ہر مشکل میں سب سے پہلے تمہیں آواز دی ہے۔"

"ہوں۔۔۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں کہتا اپنا چہرہ اس کے مزید قریب لایا۔ خزران کی سٹی گم ہوگئی۔ رہے سہے اوسان عازم کے انداز خطا کیے جا رہے تھے۔ اس نے گھبرا کر سلیپر پیروں میں ڈالے۔

"کیا ہوا؟" اس کی عجلت پر وہ مسکراہٹ دبا کر سوال کرنے لگا۔

"اب جانے دو' کل مجھے سفر بھی کرنا ہے۔" وہ نظریں چرا کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔

"محترمہ! صرف آپ کو نہیں' مجھے بھی سفر کرنا ہے۔"

"تمہیں۔۔۔؟" وہ حیران ہو کر مڑی۔

"کیا کہنے اس ادا کے۔" عازم نے بازو سے تھام کر اسے اپنے قریب بٹھایا۔ "بارہ روزہ قید تنہائی کے بعد اب یہ ہفتے بھر کا نیا داغ جدائی کم از کم اس دولہا کی برداشت سے تو باہر کی بات ہے۔ کچھ تو شرم کرو حسینہ چار سو بیس۔" وہ اپنے مخصوص طرز گفتگو سے اس کے دل کے تار چھیڑنے لگا۔ خزران کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

بہت دیر سے دل پہ پڑا بوجھ سرکنے لگا۔ یہ احساس ہی خاصا تکلیف دہ تھا کہ وہ عازم کو یہاں اکیلا چھوڑ کر جا رہی ہے۔ خصوصاً" ایسی صورت حال کے بعد۔

"خوش ہو؟" عازم نے بے یقینی سے اس کے کھلے چہرے کو دیکھا تو اس نے شرما کر اثبات میں سر ہلایا۔

"ہاں۔۔۔ بہت زیادہ۔۔۔ بس اب اس خوشی میں سونے دو۔" اس نے لاڈ سے عازم کو پرے کیا۔

"یہ تو پرابلم ہوگئی ڈیئر۔" عازم نے ہونٹوں پر انگلی بجائی۔

"کیا مطلب۔۔۔" خزران ٹھٹکی۔

"بھئی مجھے تو خوشی میں نیند نہیں آتی اور۔۔۔" وہ اور کو لمبا کرتے ہوئے اس کے بہت پاس آیا۔ "جب مجھے نیند نہیں آتی تو میں اگلوں کی نیند بھی بھگا دیا کرتا ہوں۔ کیا سمجھیں؟" عازم نے خوشی کے لمحات کو طویل کرنے کا پختہ ارادہ کیا۔ خزران نے شدید بے بسی محسوس کرتے ہوئے راہ فرار کا ارادہ ترک کیا۔

نہ چاندنی چٹک رہی تھی' نہ ہوائیں سرسرا رہی تھیں' نہ بادل تھے' نہ پتیاں۔۔۔ لیکن برسوں کے بچھڑے دو دلوں کے ملن کے طلسمی پل کائنات کے ہر حسن پر حاوی ہونے لگے۔

سمیرا حمید

آٹھویں قسط

شعلہ زن غاروں سے چمگادڑیں کسی سام (زہر دینے والے) کی طرح اڑ کر اس کے وجود کے گرد منڈلانے لگیں اور پاتال نے اپنے وجود میں اس کی موجودگی کا بگل بجایا۔

"عالیان مارگریٹ۔"

اس نے آنکھیں کھولیں اور جانا کہ اندھیرے کا سفر ابھی ختم نہیں ہوا۔ جس سفر کی چاہ نہیں تھی۔ وہ سفر بہت شوق سے اسے اپنے ساتھ گھسیٹ رہا تھا۔

اس کا کمرہ اندھیرے میں ڈوبا تھا یا اندھیرا اس کے وجود سے نکل کر کمرے میں پھیلا تھا۔ اس کا فیصلہ کرنے والا وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔ وہ اپنے زندہ اور مردہ ہونے کی تصدیق کر رہا تھا۔ اپنے زندہ ہونے کا صدمہ اس نے بڑے صدمے سے جھیلا۔ وہ اس احساس سے گزرا جو زندہ لوگوں کا شیوہ نہیں ہوتا۔

اسی رات لیڈی مہر اسے اپنے ساتھ امریکہ

مکمل ناول

شارلٹ کے گھر لے آئی تھیں۔ اسے سکون آور ادویات اور نیند کی گولیاں دی گئی تھیں۔ پھر بھی وہ ایک اچھی نیند حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ وہ غنودگی میں بڑبڑاتا رہا اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا۔ لیڈی مہر نے اس کا سر اپنی گود میں رکھا ہوا تھا اور وہ مسلسل اس پر پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں۔ انہیں ڈر تھا کہ اس کا نروس بریک ڈاؤن نہ ہو جائے۔ اس کی آنکھوں کے گرد ویسے ہی گہرے گڑھے بن گئے تھے جو اس کی ماں کی آنکھوں پر قابض رہے تھے۔

مارگریٹ کو وہ اس اسپتال سے جانتی تھیں، جہاں وہ اپنے چیک اپ کے لیے جایا کرتی تھیں۔ مارگریٹ اکثر ان سے عالیان کا ذکر کرتی۔ اس کے مرنے کی خبر معلوم ہونے کے بعد انہوں نے بہت مشکل سے عالیان کو ڈھونڈا تھا۔ انہیں مارگریٹ جیسی معصوم دل لڑکی کی موت پر اتنا دکھ تھا کہ وہ کئی راتیں روتی رہی تھیں۔

عالیان کو پہلی بار دیکھنا کسی صدمے جیسا تھا۔ اتنے سے بچے کی صورت میں مارگریٹ کے آخری ایام رچے بسے تھے۔ اس کے مجسمہ وجود میں مارگریٹ کے رنگ اتنے گہرے تھے کہ انہیں خوف محسوس ہوا کہ یہ بچہ نارمل زندگی نہیں گزار سکے گا۔ وہ دنیا میں رہ کر دنیا سے الگ ہونے میں وقت نہیں لے گا اور اسی خوف کے سہارے انہوں نے پھونک پھونک کر قدم رکھے تھے۔ اسے ریزہ ریزہ جوڑا تھا۔ اسے دعاؤں اور محبت سے تعمیر کیا تھا۔ اس میں "انسان" لقب کند کیا تھا۔

اور ان کے شاہکار کو ولید ایک دھکے سے پاش پاش کر گیا تھا۔ انہیں اس سب کا ڈر تھا۔ اسی لیے ولید کو اس سے دور رکھ رہی تھیں۔ جن بچوں کے والدین کے ساتھ سانحات گزرے ہوں، وہ بچے اس سانحے کی پرچھائیں بن جاتے ہیں۔ وہ نارمل ہو کر ابنارمل ہونے میں وقت نہیں لیتے۔ انہیں سوئی بھی چبھے تو وہ اپنے پرانے دردوں پر رونے بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسے بچے جنہوں نے معمول سے ہٹ کر بچپن گزارا ہو وہ کرب کی ساری سرحدوں کو چھو کر آئے لگتے ہیں، وہ رونے کے لیے کسی جلد باز کی طرح تیار رہتے ہیں اور خوش ہونے پر وہ خود کو خود ہی حیرت سے دیکھتے ہیں۔

بمشکل دو گھنٹے کی نیند لے کر وہ اٹھ بیٹھا اور گھنٹوں ہی پانی سے کھیلتا رہا۔ پانی کی بوندوں کو دیکھ کر اس نے سوچا، وہ پانی ہی ہوتا... بہہ جاتا... نشان چھوڑ جاتا اور مٹ جاتا۔ واش روم میں موجود ایک ایک چیز کو اس نے خوش قسمت جانا، وہ ایک چیز پر نظر رکھتا، سوچتا اور اگلی کی طرف ٹھہر جاتا... خود کو بے وقعت کرنے میں اس نے دقت نہ لیا اور وضاحت سے جان لیا کہ بدقسمتی "زندہ ہونا ہے۔" اور خوش قسمتی بے جان ہونا۔

اس نے گرم پانی کا استعمال نہیں کیا تھا اور ٹھنڈے پانی کے استعمال نے بھی اسے ٹھنڈا نہیں کیا تھا۔

اس کی شکست وریخت کے ذرے سال خوردہ ہو چکے لمحوں کی سطح پر تیرتے اسے ترس کھائے دیکھ رہے تھے۔ وہ ابھی یہ طے نہیں کر سکا تھا کہ اسے سب سے زیادہ ماتم کس کا منانا ہے۔ اپنی ماں کا... ماں کے شوہر کا یا ان دونوں کی اولاد یعنی اپنا... اور سب سے زیادہ نوحہ کناں اسے کس احساس پر ہونا چاہیے، اپنی محبت پر... مارگریٹ کی محبت پر یا "تھو" سے بھی کمتر اپنی حیثیت پر...

"جورڈن اور شارلٹ کسی فلمی پارٹی میں جا رہے ہیں، تمہیں بھی لے جانا چاہتے ہیں۔" آخر کار جب وہ واش روم سے باہر آچکا تو بہت صبر سے اس کا انتظار کرتی۔ ماما مہر نے انداز میں شوق بسا کر اسے لالچ سا دیا۔

"میں کیا کروں گا جا کر؟" تولیے سے وہ اپنے گیلے بال رگڑ رہا تھا اور اپنی آنکھوں کی سرخی چھپا رہا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسنے کے سفر میں مبتلا لگتی تھیں اور ان پر تنی کمانیں زخمی گھڑسوار کی طرح بس زمین پر آ گرنے کو تھیں اور اس کی خوب صورتی وہ بازگشت لگنے لگی تھی جو صحراؤں میں پیاسے جانور ریت میں

ریٹ ہونے سے پہلے سنتے ہیں۔
"فلمی ستاروں کو دیکھنا۔۔۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو فوراً" چیخ جاتی۔" انہوں نے آواز میں اتنا جوش بھر لیا کہ بس وہ ضرور ہی چلا جائے۔
"خدا نہ کرے کہ آپ میری جگہ ہوتیں۔۔۔"
قد آدم کھڑکی کے پاس بیٹھ کر وہ شارلٹ کے گھر کے وسیع باغ کو دیکھنے لگا۔ شارلٹ پودوں کی کانٹ چھانٹ میں مصروف تھی۔
"میں عالیان ہوتی تو دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان ہوتی۔" وہ بھی کھڑکی کے پاس اس کے سامنے ذرا سے فاصلے پر بیٹھی تھیں۔ شارلٹ نے کٹر سے ایک غیر ضروری شاخ کو کاٹا۔ اسے لگا اس کٹر سے کٹی غیر ضروری شاخ وہ ہے۔
"آپ مجھ سے اتنا پیار کیوں کرتی ہیں؟" وہ باپ کا ڈسا تھا۔ اب اسے ہر محبت پر شک تھا۔
"میں تم سے اس سے بھی زیادہ پیار کیوں نہ کروں۔ میری محبت پر تمہیں شک نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے محبت کو ہمیشہ باوضو رکھا ہے، میں ایک مکمل انسان نہیں ہوں۔ لیکن اپنی محبت کو میں نے نامکمل نہیں رہنے دیا۔"

"مجھ میں ایسا کیا ہے ماما جو آپ۔۔۔ آپ مجھ سے۔۔۔" اس کی آنکھیں نم ہو کر اور اندر کو دھنسنے لگیں، جس نے خود پر محبت کو فرض کر لیا تھا۔ وہ اب "محبت" پر سوال اٹھا رہا تھا۔ وہ محبت پر اپنے ایمان سے جا رہا تھا۔
"تم میں ایسا کیا نہیں ہے جو تمہیں سینے سے لگا کر نہ رکھا جائے۔ تم ایک شخص کے پیمانے سے دوسروں کے پیمانے نہیں ناپ سکتے۔"
شارلٹ غیر ضروری شاخیں کاٹتی ہی جا رہی تھی۔ اس نے خود کو قریب الوقت کٹ جانے والی شاخ پایا اور وہ اپنے ہی اندر سہم گیا۔
"آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ وہ مجھے ڈھونڈ رہا ہے؟"

"کیونکہ میں یہ جانتی تھی کہ وہ تمہیں کیوں ڈھونڈ رہا ہے، اس کے پاس وہ وجہ نہ ہوتی تو میں فوراً" اسے تمہارے پاس لے آتی۔ عالیان میں نے بہت محنت سے سب بچوں کو ان کے دکھوں سے نکالا تھا اور تمہیں خاص طور پر۔۔۔ تم بہت حساس رہے ہو، میری گود میں سوتے تم ان باتوں کو دہرایا کرتے تھے جو مارگریٹ کیا کرتی تھی، میں نے اینٹ اینٹ تمہیں جوڑا ہے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ آکر تمہیں مسمار کر جائے اور میں نہیں چاہتی کہ یہ کام تم اپنے ساتھ اب کرو۔۔۔ اگر میری محبت کی کچھ قدر کرتے ہو تو پھر سے میرے عالیان بن جاؤ۔"
"آپ جانتی تھیں سب۔۔۔؟"
شارلٹ کے کٹر میں تیزی آگئی تھی۔ شاید وہ سارا باغ کاٹ ڈالے۔۔۔ کوئی پھول باقی نہ رہے۔۔۔ سارے باغ کی بہار اجڑ جائے۔
"ہاں! دو سال پہلے اس کا ایک آدمی آیا تھا۔ اس وقت اسے صرف شک تھا کہ تم میرے پاس ہو، خوش قسمتی سے ایک خاتون جو اسی سینٹر سے بچہ گود لے گئی تھی۔ اس بچے کی ماں کا نام مارگریٹ تھا۔ وہ عورت برطانیہ چھوڑ کر کسی دوسرے ملک چلی گئی۔ یہ لوگ اسے ڈھونڈتے رہے۔ کڈز سینٹر نے کسی بھی طرح کی

غیر ضروری معلومات کسی کو بھی نہیں دی تھی، لیکن یہ تھوڑا بہت معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے وہ سارے والدین کھنگال لیے جنہوں نے بچے گود لیے تھے۔ آخر میں ان کا شک پھر مجھ پر ٹھہر گیا۔ ڈینس کو ناروے بھیج کر میں نے سب معلوم کروالیا تھا اور اس نے مجھے بتایا کہ ولید کو عالیان یوں چاہیے مجھے اس کی کم ظرفی پر دکھ ہوا اور میں جانتی تھی کہ تمہیں حقیقت معلوم ہو گئی تو تم بھی اچھا محسوس نہیں کرو گے۔ مجھے تمہاری تعلیم کی فکر تھی۔ لیکن ایک وقت میں، میں یہ بھی چاہتی تھی کہ تم خود اس سے مل لو۔۔۔ ایک بار۔۔۔ سب جان کر، اس طرح تمہیں تکلیف نہ ہوتی۔ اگر ڈینس، مارک اور باقی سب دوسرے ملکوں میں نہ ہوتے

تو وہ تم تک جلدی پہنچ جاتا۔ انہیں یہ ہی شک رہا کہ تم دنیا میں کہیں اور موجود ہو۔"

عالیان کی آنکھیں سرخ ہوتی جارہی تھیں۔ اس کے سامنے ہارٹ راک کا وہ ہال گھوم رہا تھا جس کی زمین پر ولید کھڑا تھا۔ اس کی انگلی اس کی طرف اٹھی ہوئی تھی اور تمسخرانہ قہقہے لگانے کے لیے اس کا ذہن بے تاب لگتا تھا۔

"تم اسے معاف کردو عالیان تم میرے بیٹے ہونا؟"

"میں اس کے پاس جاؤں گا... اور تمام شیئرز اپنے نام لگاؤں گا۔"

"تم مجھے دکھ دے رہے ہو... تم میرے عالیان کو گم کر رہے ہو۔"

"میری ماں کی زندگی کے نقصان کے ہرجانے میں اس کا کچھ تو نقصان ہونا چاہیے ناماما۔" کہتے اس کا انداز سخت تھا۔

"نقصان اس کا نہیں تمہارا ہوگا۔ اپنی زندگی کے قیمتی وقت کو تمہیں اس شخص کے لیے برباد نہیں کرنا چاہیے۔ میں جانتی ہوں کہ تم اس کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو۔ تم ان شیئرز کو کوڑیوں کے مول بیچ دو گے لیکن..."

"نہیں میں چیرٹی کردوں گا۔"

"تمہیں خود کو تھکانے کی ضرورت نہیں...

تمہیں بدلہ لینے کے لیے نہیں پیدا کیا گیا۔ انصاف کا ترازو اللہ کے ہاتھ میں ہی رہنے دو... تم بس آگے بڑھو۔"

"میں تو بہت پیچھے چلا گیا ہوں۔"

"شارلٹ کچھ دیر ستا کیوں نہیں لیتی۔" کہہ کر اس نے شارلٹ کے بارے میں سوچا جس کا کنٹرولا ہاتھ تیزی سے چل رہا تھا۔

آج سے بہار ختم ہونے کو ہے... ستم ظریفی قسمت پر راج کرنے کو ہے... مقاصد زندگی پر نظرثانی کی جائے اور متاع جان کی تعریف بدلی جائے گی۔

"تو آؤ پھر بھاگ کر واپس اپنی جگہ پر... کیا میرے ہوتے تمہیں کہیں لاپتا بھٹکنے کی ضرورت ہے۔ میں جانتی ہوں تم اس وقت کیا سوچ رہے ہو گے، لیکن عالیان! انسان کے پاس دو آنکھیں ہوتی ہیں جو وہ دیکھتی ہیں جو اس کے سامنے ہوتا ہے۔ قدرت کی ہر ساعت آنکھ ہے۔ ہر ساعت انصاف ہے۔ ہر ساعت حساب ہے۔ تم مارگریٹ کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہو اس سے بڑھ کر اس کے لیے کیا انعام ہوگا۔ تم ولید کا نام بھی لینا پسند نہیں کرتے۔ اس سے بڑھ کر اس کے لیے کیا سزا ہوگی۔ عالیان ہم چاہتے ہیں کہ جو برا کرے جو برا ہو اس کے ساتھ اس سے بھی زیادہ برا ہو۔ بس اسی ایک خواہش سے ہم بھی اس برے انسان جیسے برے بن جاتے ہیں۔ تم اسے فراموش کردو اور یہ ہی سزا کافی ہے اس کے لیے۔ اگر تم بدلے کے پلڑے میں جا بیٹھے تو میری محبت کا پلڑا کبھی نہیں جھکے گا۔ تم سوچ لو، تمہیں ولید اور مہر میں سے کس کے پلڑے کو وزنی کرنا ہے۔" آنسو بڑی روانی سے لیڈی مہر کی آنکھوں سے نکلے۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی ان کی عمر بھر کی کمائی لے جا کر کنویں میں پھینکنے والا تھا۔

عالیان ان کے قریب زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر آنکھوں سے لگا لیے۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم نے میری پرورش کی لاج رکھ لی اور تم وہاں سے آگئے... تم میرے بیٹے ہو۔ تم نے یہ

ثابت کردیا۔ تمہیں اللہ کے انصاف پر ایمان رکھنا چاہیے۔" اس کی نظریں پھر سے شارلٹ پر جا ٹھہریں۔

"اسے فراموش کردینے کی سزا دوں؟" اس نے خود سے پوچھا۔

"اسے معاف نہیں کرسکتے تو اس کے خیال کو ترک کردو۔ دنیا میں اس انسان سے بڑھ کر کوئی بدنصیب نہیں ہوتا، جس کے وجود کو لاوجود مان لیا جائے۔ اس کے ہونے کو نہ ہونا کردیا جائے۔"

شارلٹ نے ایک طائرانہ نظر باغ پر ڈالی اس نے

بہت دل لگا کر کانٹ چھانٹ کی تھی۔

"اور امرحہ کو بھی معاف کردو۔" ان کی آواز نرم ہوگئی۔

"کردیا معاف اور ترک بھی کردیا۔" اس نے ٹھنڈے انداز میں کہا اور اس پھول کو گرتے ہوئے دیکھا جو شارلٹ کے کٹر سے حادثاتی طور پر کٹ کر نیچے ہی نیچے گزر رہا تھا۔ شارلٹ کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ جیسے اس نے کسی زندہ انسان کا خون کرڈالا ہو۔

"میں ژکار عالم... میں سنگ آستاں"

"میں لوح نگینہ ساز... میں لوح شعلہ بیاں"

عفونت میری گزرگاہیں

میں جمال... میں کمال... میں ابہام...

میں گہینت ہوں

"میں قسمت ہوں۔"

☼ ☼ ☼

ویرا ایلکسی اور پاپا کے ساتھ اسکیٹنگ کررہی تھی۔ ایک راؤنڈ میں اس نے ان دونوں کو ہرا دیا تھا۔ اب وہ دوسرے راؤنڈ کی طرف بڑھ رہی تھی اور کافی آگے نکل آئی تھی کہ اس کی جینز کی جیب میں رکھا فون فل وائبریشن کے ساتھ بجنے لگا۔ سوائے ایک کال کے اس نے سب کالز کو "سائلنٹ" پر رکھا تھا اور وہ ایک کال عالیان کی تھی۔ اپنی رفتار ذرا آہستہ کرکے اس نے فون نکال کر سنا۔

"کہاں تھے فرش میرا فون کیوں نہیں اٹھا رہے تھے؟"

جواب میں خاموشی ملی، پھر یہ سوال "کیا برننگ مین نائٹ پر پوچھا گیا اپنا سوال تمہیں یاد ہے ویرا؟"

"ہاں!" اپنی رفتار کو اس نے بالکل روک لیا اور سڑک کے کنارے لگے لیمپ پوسٹ کے ساتھ ٹک کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے چہرے پر جا بجا خون کی لہریں دوڑ گئیں اور اس نے اپنے دل کی دھڑکن کسی ساز کی طرح سنی، جسے سنتے ہی ایڑیاں بل کھانے لگتی ہیں۔

"مجھے تم جیسی لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کرکے بہت خوشی ہوگی ویرا۔"

ایلکسی جوش سے نعرے لگاتا ہوا ویرا کے پاس سے گزرا۔ "ویرا! تمہارا یہ پرانا ٹرک اب نہیں چلے گا۔" وہ چلاتا دور ہوتا گیا۔

وہ مسکرانے لگی۔ "اور..."

"میں مانچسٹر میں تمہاری واپسی کا انتظار کروں گا۔"

کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔

ویرا اور زیادہ مسکرانے لگی۔

"تم ہار جاؤ گی ویرا۔" اس کے پاپا بھی چلاتے ہوئے اس کے قریب سے گزر کر آگے نکل گئے۔

ویرا نے موبائل واپس جیب میں رکھا اور اپنے جوتوں تلے لگے پہیوں کو اس نے اس زور سے سڑک پر رگڑا جیسے وہ کسی جہاز کے پہیے ہوں اور اڑان بھرنے سے پہلے رفتار پکڑ رہے ہوں۔

پہلے اس نے پاپا کو پیچھے چھوڑا اور پھر وہ ایلکسی کے پیچھے لپکی۔

دوسری طرف امرحہ اپنی کلاس لے کر نکل رہی تھی کہ کارل اس کے پاس آیا۔ دو دن اسے بخار رہا تھا۔ وہ آج ہی یونی آئی تھی۔

"کیسی طبیعت ہے تمہاری امرحہ؟"

"میں ٹھیک ہوں شکریہ۔" وہ الفاظ ضائع نہ کرتی تو اس کی شکل بتا رہی تھی کہ وہ کتنی ٹھیک ہے۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے۔"

"مجھے معلوم تھا تم آؤ گے... حساب لینے۔"

"نہیں، اس بار تم نے غلط سمجھا مجھے، میں حساب لینے نہیں بات کرنے آیا ہوں۔"

دونوں ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔

"میں گھر گیا تھا تم سے ملنے۔ تم کافی بیمار تھیں، میں واپس آگیا۔"

"مجھے سادھنا نے بتایا تھا اور مجھے خوف آیا تھا تم سے۔"

"اور میں تمہارے بیمار ہوجانے سے ڈر گیا۔"

"کہیں جلدی نہ مرجاؤں؟"

"تمہیں مرنے کی بات نہیں کرنی چاہیے امرحہ... زندگی کی روشنی کو ایسی باتوں سے مدھم نہ کرو۔"

امرحہ نے اپنی دونوں ہتھیلیاں مسلیں۔

کارل گردن اس کی طرف موڑے اسے دیکھ رہا تھا اور اسے لگ رہا تھا کہ وہ دوسرے عالیان کو ہی دیکھ رہا ہے۔ اس کی خاموشی بھی اس کی خاموشی جیسی تھی۔

"عالیان امریکہ میں ہے۔" اس نے یہاں سے بات شروع کرنا مناسب سمجھا۔

"میں جانتی ہوں۔" امرحہ کی ایک دوسرے میں پیوست ہتھیلیاں لرزنے لگیں۔

"تم ایک اچھی لڑکی ہو امرحہ!" وہ نرمی سے بولا۔

"اب اس پر مجھے یقین نہیں رہا۔" وہ تلخی سے بولی۔

"میں یہ دعوا کرتا ہوں کہ تم عالیان کو سمجھیں ہی نہیں۔ تمہیں کچھ وقت لگا کر اور کچھ عقل استعمال کرکے اسے سمجھنا چاہیے تھا امرحہ! جب اس نے تمہیں پرپوز کیا تھا تو میرے لیے یہ عام سی بات تھی۔ عالیان نے میرے کتنے بریک اپ کروائے۔ وہ صرف اتنا کرتا کہ میری فرینڈز کے ساتھ اچھی طرح سے بات کرلیتا اور ان کے ساتھ کچھ وقت گزار لیتا اور ان کے لیے یہ ہی کافی ہوتا۔ یہ سب میرے لیے عام باتیں تھیں۔ مجھے معلوم ہوتا کہ وہ تم سے بریک اپ کے بعد اس حالت میں آجائے گا تو میں کبھی ایسا نہ کرتا۔ میرے لیے وہ ایک مذاق تھا اور اب اندازہ ہوا کہ وہ کافی بے ہودہ مذاق تھا۔ مجھے بعد میں یہ احساس ہوا کہ اسے

کس قدر برا لگا کہ اس کی مدر پر سوال اٹھے۔ میں اپنی ماما سے نہیں ملا لیکن اگر کوئی میرے والدین پر سوال اٹھاتا تو میں اسے سبق سکھا دیتا۔ لیکن عالیان نے کچھ نہیں کیا۔ اس نے میرے پوچھنے پر کہا کہ اگر انسان درگزر نہ کرسکے تو اسے صبر کرنا چاہیے۔ ورنہ خاموش رہنا چاہیے۔ اس نے درگزر بھی کیا اور وہ خاموش بھی رہا۔ اس کی ڈائری جو کہ میں اسے بتائے بغیر بہت آرام

سے پڑھ لیتا ہوں۔ میں اس نے ایک جگہ لکھا۔ "میرا یہ افسوس جاتا ہی نہیں کہ مجھ سے کسی کھلونے کی طرح کھیلا گیا۔ میرا یہ دکھ کم ہونے میں نہیں آرہا کہ جو مجھے سب سے سچا لگا تھا وہ میرے ہی منہ پر مجھ سے جھوٹ بول گیا۔"

اور اس نے ایک جگہ لکھا کہ "جو لڑکی میرے لیے پہلی تھی اس کے لیے میں آخری بھی نہیں تھا۔"

اور اس نے یہ لکھا کہ "بہت دکھ ہوتا ہے اس وقت کہ جس کے لیے ہم ساری دنیا کو پیچھے چھوڑ دیں اور وہ خود دنیا میں آگے نکل کر ہمیں پیچھے اکیلا چھوڑ دے۔"

کہہ کر کارل خاموش ہوا اور پھر بولا۔

"پھر بھی مجھے یقین تھا کہ تم عالیان کو منا لوگی' فاصلہ کم کرلوگی اور ساتھ ہی مجھے یہ خوف بھی تھا کہ تم یہ سب نہیں کرسکوگی' کیونکہ تم بند بند لڑکی ہو... تم نے کبھی اپنی صلاحیتیں آزمائیں ہی نہیں... اور امرحہ! میں سوچتا ہوں کہ تم نے "بہت کچھ کرسکتی ہوں میں" میں سب کچھ خراب کیسے کردیا... اور میں تو یہ بھی اب تک نہیں سمجھ سکا کہ تم چاہتی کیا ہو...؟ تم نے عالیان کو انکار کردیا اور عالیان کے آس پاس بھی رہیں... سیف روم کی دیواروں کو تم نے پیغامات سے بھر دیا۔ یہ سب کیا تھا امرحہ...؟"

"پاگل پن..." وہ رودینے کو ہوگئی۔

"ویرا نے اسے پرپوز کیا تو وہ ایسے خوش نہیں تھا جیسے تمہیں کرنے سے پہلے تھا۔ امرحہ ہماری زندگی میں شامل ہونے والے شخص میں اتنی ہمت تو ہونی چاہیے کہ وہ جاکر ہمیں جیت لائے اور وہ تمہیں جیت لاتا اگر تم نے سوال اس کی جان کے پیارے پر نہ

اٹھائے ہوتے۔ عالیان کے فادر اسے ڈھونڈ رہے تھے اور یہ بھی ٹھیک رہتا اگر تم انہیں بتا دیتیں' لیکن جس وجہ کے لیے تم نے انہیں عالیان کا بتایا وہ وجہ ٹھیک نہیں تھی کہ تمہیں اس کے فادر کی موجودگی کی ضرورت ہے۔ ایک ایسے انسان کی موجودگی کی ضرورت جو اس کے نزدیک اس کی مدر کا قاتل ہے۔"

کارل رکا۔ کر اسے دیکھنے لگا کہ آگے بولے یا نہ بولے۔

امرحہ بس ایک کوشش کر رہی تھی کہ وہ اس کے سامنے رو نہ پڑے۔ اس کی پور پور سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ ایک آنکھوں کو سنبھالنا زیادہ مشکل نہیں لگا اسے۔ وہ عام انسانوں کی طرح سیڑھیوں پر بیٹھی تھی' پھر بھی عام انسان نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے دکھ نے اسے نمایاں کر دیا تھا اور اس کے پاس رک کر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اسے تسلی دینے کو دل چاہتا تھا' لیکن اتنا حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔

کیا وہ قسمت کا وہی الہام تھی جس کا ڈھنڈورا قسمت اپنی بنیاد سے پیٹتی ہے۔

"عالیان نے ویرا کو شادی کے لیے ہاں کہہ دیا ہے۔" کارل نے اس کے لیے اپنے انداز کو ہر حد سے زیادہ نرم بنالیا۔

سائی کے ذریعے اسے یہ بات معلوم ہو چکی تھی' لیکن دوبارہ یہ سن کر اسے ایسا لگا' جیسے یونیورسٹی نے اپنا رخ آتش فشاں کے دہن کی طرف موڑ لیا ہو۔

"اس نے یہ فیصلہ کسی بھی ذہنی حالت میں کیا ہو... لیکن امرحہ! اب کوئی نیا رد عمل اسے نئی تکلیف دے گا... تم سمجھ رہی ہو نا امرحہ؟"

"میں پہلے سے ہی سمجھ چکی ہوں... میں یونیورسٹی چھوڑنے کے لیے بھی تیار ہوں۔"

کارل کو اس بات سے صدمہ ہوا "ایسے نہ کہو پلیز... میں صرف یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ جس حالت میں وہ مجھ سے باتیں کر رہا تھا' وہ ایک ایسی حالت تھی جو اس کی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اب کوئی نئی تکلیف اس پر کیا کر گزرے گی میں یہ اندازہ لگا سکتا ہوں... تو امرحہ!

میں تم سے صرف یہ درخواست کرتا ہوں کہ اس سے دور رہنا... اب تم نے کچھ اور کرنے کی کوشش کی تو..."

"مجھے کچھ نہیں کرنا... میں یہ یقین رکھتی ہوں کہ ویرا ایک اچھی لڑکی ہے' عالیان نے ٹھیک فیصلہ کیا...

میرے سارے عمل جذباتی اور بے وقوفانہ تھے... مجھے اپنے ایک ایک عمل پر دکھ اور شرمندگی ہے... میں نے تمہارے دوست کو بہت تکلیف دی... پاکستان میں میرے بارے میں کہا جاتا ہے کہ میں سب کچھ تباہ کر دینے والوں میں سے ہوں... میں وہ سیاہی ہوں جو ساری روشنیاں نگل لیتی ہے... میں دوسروں کی خوشیوں پر بجلی بن کر گرتی ہوں۔"

"کیا پاکستان والوں کے پاس وہ آنکھیں نہیں ہیں جو میرے' ویرا' سائی اور عالیان کے پاس ہیں...؟" کارل نے بہت سنجیدگی سے پوچھا۔

امرحہ نے سر جھکا دیا وہ بالکل پھوٹ پھوٹ کر رو دینے کو تھی بس اب۔

کارل نے بہت غور سے اسے دیکھا "میں جانتا ہوں کہ میں نے میس کیا' اگر وہ ریکارڈنگ عالیان نہ سنتا تو تمہیں لے کر اتنا تلخ نہ ہوتا۔"

"یہ سب ایسے ہی ہونا تھا' یہی میری قسمت تھی۔"

"میں قسمت کے بارے میں نہیں سوچتا... سب ہمارے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے۔"

"لیکن میں اس کے بارے میں سوچتی ہوں' بہت کچھ اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔"

"تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو... میں تمہاری طرف سے ملامت کے لیے تیار ہوں۔"

"ملامت کی حق دار صرف میں ہوں... صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ مجھ سے دور رہنا..."

"ہم دوست ہیں امرحہ..." کارل دکھی سا ہو گیا۔

"نہیں... اب ہم کچھ بھی نہیں ہیں... ہم اس پر عمل کریں گے تو اچھا رہے گا۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور کارل کو دیکھے بنا تیزی سے آگے بڑھ گئی اور کسی ایسے کونے کو ڈھونڈنے لگی جہاں چھپ کر وہ بیٹھ جائے۔

کچھ اس کے ذریعے' کچھ سادہ سنا کے ذریعے دادا کو سب معلوم ہو گیا تھا۔ وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ جوڑ کر روتے رہے کہ وہ ان کی جان پر رحم کھائے اور اپنی

جان کے ساتھ کچھ نہ کرے۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ اڑ کر مانچسٹر آجائیں۔

ان کے رونے اور ان کی منت سماجت نے امرحہ کو شرمندگی سے زمین میں دھنسا دیا۔ اپنے دل کو وہ کفن میں لپیٹ چکی تھی' دادا کو اذیت میں مبتلا رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ دو دن وہ بستر پر پڑی رہی اور دو دن دادا اس کے بستر کے سامنے رکھے لیپ ٹاپ پر ساکت اسے دیکھتے رہے۔ اس کی آنکھ کھلتی تو وہ سامنے موجود ہوتے جیسے انہوں نے اس دوران پلکیں بھی نہیں جھپکیں۔ ایک بوڑھے شخص کے لیے یہ بہت جان لیوا مشقت تھی۔ غنودگی اور بے ہوشی میں وہ جو بڑبڑاتی رہی وہ وہ سب سنتے رہے۔ بار بار دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے اور روتے رہتے۔۔۔ انہیں یقین تھا کہ جو پھونکیں وہ اسے مار رہے ہیں وہ اس پر کارگر ثابت ہوں گی۔۔۔ امرحہ سے زیادہ وہ جان کنی میں لگنے لگے۔۔۔ تو امرحہ اس پیارے انسان کی بے مثال محبت میں بستر سے اٹھ بیٹھی' انہیں کھا کر دکھایا' بول کر دکھایا' چل کر دکھایا' ہنس کر دکھایا۔۔۔ وہ ایک اچھی اداکارہ بن گئی۔ اس نے ایک محبت کے نقصان پر دوسری محبت کو نقصان میں نہیں جانے دیا۔۔۔ وہ نہا دھو کر یونی آگئی اور ساتھ ساتھ دادا کو دکھاتی رہی کہ وہ کلاس لینے جارہی ہے۔۔۔ اب وہ لائبریری جارہی ہے۔۔۔ اب کینٹین۔۔۔ اب جاب پر۔۔۔

اور فون کو جیب میں رکھتے ہی وہ ایسی ہوجاتی جیسے چار اطراف سے کوئی اس کا خون نچوڑ رہا ہے اور اس کے جسم میں خون سے بھری نالیاں خالی ہوتی جارہی ہیں۔

دادا اسے یہ سمجھانا بھی نہیں بھولے کہ وہ وہاں پڑھنے کے لیے گئی ہے اور اسے اپنے مقصد حیات کو پانے پر توجہ دینی چاہیے۔۔۔ وہ دادا کو کہہ نہ سکی کہ جب حیات ہی نہ رہے تو "مقصد حیات" کہاں رہ پاتے ہیں۔

دادا ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد اسے فون کرتے تھے۔۔۔ "محبت ایسے ہی کمزور کردیتی ہے دادا اور لاچار بھی۔"

وہ ان کی آواز جو کسی انہونی کے ڈر سے لرز رہی ہوتی سنتی تو سوچنے لگتی۔ شاید آپ کو معلوم ہوجائے کہ بے بسی کسے کہتے ہیں اور اپنے کسی پیارے کے بغیر رہنا کیسا لگتا ہے۔ میرے لیے آپ وہاں سو نہیں پاتے' کسی کے لیے میں یہاں سو نہیں پائی۔ میں ہار بھی گئی اور آپ کو جتوا بھی ڈالا۔۔۔ ایسے کھلاڑی آپ کو صرف "محبت" میں ہی ملیں گے۔۔۔ میں کسی کے لیے مر بھی گئی اور آپ کے لیے زندہ بھی ہوں۔۔۔ ہاں میں صرف آپ کے لیے زندہ ہوں۔

☼ ☼ ☼

"ایک لڑکا ہے عالیان۔۔۔
عرب کے سلطان سا۔۔۔
داستان کے جمال سا۔۔۔
آسمانی فرمان سا۔۔۔"

وہ شارلٹ کے ساتھ آگیا تھا صرف اور صرف ماما کے لیے۔ وہ اس پر سے اپنی نظریں نہیں ہٹا رہی تھیں اور وہ ٹھیک سے سو بھی نہیں پائی تھیں۔ وہ چاہتا تھا وہ کچھ دیر آرام کرلیں۔ ماما نے اس کے لیے بہترین سوٹ آرڈر پر منگوایا تھا' اپنے ہاتھوں سے اس کی ٹائی باندھی تھی' جورڈن نے اس کا ہیر اسٹائل بنوایا تھا اور اس کی دونوں بھوری آنکھوں کو باری باری چوم لیا تھا۔

"حسن کی تعریف کے لیے تمہارا خیال پیش کردینا ہی کافی ہے۔۔۔ شاید تمہیں کوئی ڈائریکٹر دیکھ لے اور اپنی فلم میں سائن کرلے۔۔۔ میں تمہیں پہلے ہی بتادوں تمہیں پہلے ایک ایکشن فلم کرنی ہے۔" وہ چاہتی تھیں کہ وہ مسکرادے۔

"اگر ایسا ہوا تو میں ضرور فلم کروں گا یونی چھوڑ دوں گا۔" وہ اپنی ماما کے لیے مسکرادیا۔

"تم چاہو تو ابھی یونی چھوڑ دو۔۔۔ یہاں شارلٹ کے پاس رہو' ہوتی رہے گی پڑھائی۔۔۔ میں بھی یہیں رہ لوں گی تمہارے ساتھ' ہم اپنا گھر لے لیں گے پھر۔۔۔

ہم دنیا کھو میں گے ' مجھے سان مرینو جانا ہے ' سنا ہے سان مرینو کے لوگ بہت خوش اخلاق ہوتے ہیں ' ذرا ان سے مل کر آئیں کیا ایسا ہی ہے یا صرف افواہ ہی ہے۔"

وہ مسکرانے لگا۔ وہ سیاہ جرابیں پہن رہا تھا ان کے سامنے بیٹھ کر "آپ سچ میں چاہتی ہیں کہ میں ہیرو بن جاؤں؟"

"ہاں... لیکن اس سے پہلے میں یہ چاہتی ہوں کہ تم وہ کرو جو تم کرنا چاہتے ہو۔"

"میں خود کو ختم کر لینا چاہتا ہوں۔" وہ بڑبڑایا۔

وہ ایک گول سفید ستون کے ساتھ دایاں شانہ ٹکا کر کھڑا تھا۔ پہلے وہ مسکرا مسکرا کر سب سے ملتا رہا جیسے ان سب سے ملنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش رہی ہو ' پھر وہ چند خوب صورت لڑکیوں سے (جو اتنی خوب صورت تھیں جیسے انہیں بنانے کے بعد فرصت سے ان کے نقص نکالے جاتے رہے ہوں اور انہیں کامل کر کے ہی چھوڑا گیا ہو) سے باتیں کرتا رہا۔ پھر وہ صرف سنتا رہا تو بولنا بھول گیا پھر اسے سر جھٹک کر خود کو سننے کے لیے موجود کرنا پڑا پھر وہ خود کو الگ کر کے اس ستون کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

ہال بہت بڑا تھا اور چھت بہت اونچی... ہال کے کراؤن سے دو اطراف کھلی سیڑھیاں ہلکا سا بل کھاتیں کسی نخریلی حسینہ کی پوشاک میں اٹھتی لہر کی طرح لہراتی اوپر جا رہی تھیں اور ہال کی طرف نکلی گول بالکونیاں دور جدید کی پریوں سے سجی ' بنی ' بھری اپنی موجودگی کی اہمیت کا احساس ' اپنی شان و شوکت سے دلا رہی تھیں۔ ہنستے مسکراتے ' بے فکرے نظر آتے لوگ ٹولیوں کی صورت بکھرے کھڑے تھے۔ صرف ایک بالکنی تھی جس میں سیاہ گاؤن میں ملبوس کھڑی لڑکی اکیلی تھی اور اپنے ناخن کتر رہی تھی اور نیچے سر کر کر کے ایک مخصوص کونے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ کسی کے انتظار کی شدت اتنی بڑھ چکی ہے کہ وہ ناخن کھاتے کھاتے خود کو بھی ادھیڑ ڈالے گی۔

"ایسے کیوں کھڑے ہو مالیان؟" شارلٹ اس کے پاس آئی۔

"میں سب دیکھ رہا ہوں۔" اس کی نظر اوپر سیاہ گاؤن والی لڑکی پر اٹھ گئی... اف اس کے انتظار کی شدت۔

"تم دیکھو مت... ملو اور باتیں کرو۔"

"میں ان سب کو جانتا بھی نہیں..."

"یہ ضروری بھی نہیں... بہت سے لوگ پہلی بار آئے ہیں پارٹی میں اور میں تو تمہیں اپنی دوستوں کے ساتھ چھوڑ کر آئی تھی..."

"میں یہاں کھڑے رہنا چاہتا ہوں شارلٹ..."

"ٹھیک ہے لیکن زیادہ دیر کھڑے نہ رہنا۔" نرمی سے اس کا گال چھو کر شارلٹ چلی گئی اس کی نظریں چھت سے جھولتی لمبی لمبی کرسٹل لڑیوں پر جا ٹکیں جن سے ٹنگے قمقمے جل بجھ رہے تھے اور پھر وہ سارے قمقمے بجھ گئے اور اتنی بہت ساری لڑیاں دائرہ بنا کر چکرانے لگیں... اور پھر سیڑھیاں اس دائرے میں ایسے شامل ہو گئیں جیسے نخریلی حسینہ شدت سے اونچی ایڑیوں پر گھومنے لگی ہو اور اس کی پوشاک دنیا کی ہر چیز کو جا لینے کو ہو... یوں پوشاک کے کناروں نے بالکونیوں کو جا لیا اور انہیں اپنے دائرے میں گھسیٹ لیا پھر دیواروں کو اور چھت کو بھی اور پھر وہاں موجود ہر شے نے دائرے میں پناہ سمیٹ لی... اس نے سر کو جھٹکا...

دائرہ بڑھتا ہی جا رہا تھا اور اپنے اندر ہر چیز کو سمو رہا تھا... زمین سے فلک تک تن جانے کے قریب اس چکر کو اس نے خوف سے دیکھا۔

نزاکت بھرا ایک قہقہہ اس کے کانوں سے ٹکرایا ' اس نے گردن موڑ کر دیکھا ' وہاں کوئی نہیں تھا... قہقہہ پھر بلند ہوا اور پھر ہر طرف سے قہقہے بلند ہونے لگے... اتنے بلند قہقہوں کی آوازیں اسے پریشان کرنے لگیں... پھر ایک قہقہہ ان سب میں امتیازی ہو گیا۔

"ولید البشر کا"

"تم کتنی بھی اونچی ہواؤں میں اڑ لو۔۔۔ تمہارا نصیب پستی ہی رہے گا۔۔۔ جیسے مارگریٹ کا تھا۔۔۔ تم دونوں میرے بغیر کچھ بھی نہیں ہو۔"

پوشاک کے کناروں نے اسے آلیا۔۔۔ سب گھومنے لگا اور وہ بھی۔۔۔ ہال کی ساری روشنیاں گل ہو گئیں۔۔۔ اندھیرا چھا گیا۔۔۔ کائنات میں روشنی کا نشان نہ رہا۔

"مقام نامعلوم ہے۔"

"فشاری" وہ ایک باایمان مرد ہے۔ اس نے روشنی کی چاہ چھوڑ دی اور زندگی کی بھی۔ اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں اور منہ بھی اس نے ایک برگزیدہ دعا کی تیاری کی۔۔۔ اس نے سب پاکیزہ الفاظ سمیٹے اور انہیں اپنی روح کے مقام پر رکھا۔ اس نے شانوں میں شان اقدس بیان کرنے کی نوید خود کو دی اور اپنے جکڑے وجود اور آزاد روح کو اللہ لفظ کی ادائیگی کی عبادت پر مائل پایا۔

موت کی چاپ اسے اپنے بہت قریب سنائی دی جو اس کی عبادت میں مخل ہوتی' لیکن اس نے پھر بھی عبادت کے اس رتبے کو روح سے نکل جانے نہ دیا۔۔۔ اور پھر اسے اس شخص کا نام لے کر ایک خاص دعا کرنی تھی جس کے لیے موت اس کی طرف بڑھ رہی تھی اس کے ہاتھ پیر کاٹ دیے جائیں گے اور سر بھی۔۔۔ شاید۔۔۔ اور اسے اس کی پروا نہیں تھی۔۔۔ اسے موت کے پروانوں کی پھونکوں نے قطعاً" نہیں سہمایا۔۔۔ وہ فشاری ہے وہ "حقیقت" پا چکا ہے۔۔۔ اب وہ اسے جھٹلائے گا نہیں۔

اندھیرے کے ریوڑ پر چابک پڑے اور کبھی نہ بجھنے کے لیے اندھیرے جل اٹھے۔ اسے مارگریٹ نظر آئی۔۔۔ اس نے سر کو جھٹکا اور پھر سے دیکھا "ہاں یہ ماما ہی ہیں"

اس کا جی ان سے لپٹ جانے کو چاہا لیکن وہ دائرے میں چکراتے خود کو اور انہیں ایک مقام تک نہ لاسکا۔ اس نے خود کو بے بس اور لاچار پایا۔ اس نے دیکھا کہ مارگریٹ کے وجود میں جابجا کانٹے اگ آئے ہیں اور اس کا اپنا دل یہ دیکھ کر کرب سے لبالب ہو رہا ہے اور اس نے محسوس کیا کہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر قیامت آنا شروع ہو گئی ہے۔۔۔ ہر چیز اپنے نقطہ زوال کی طرف بھاگی جا رہی ہے۔

"تو کیا آپ نے جان لیا کہ آپ نے کیا پایا؟" اپنی ہی آواز اس نے بھی سنی۔

"ماما! آپ نے کیا پایا زندگی میں؟ اس سوال کا جواب مجھے نہ ملا تو میں اپنے سارے نشان کھو دوں گا۔۔۔ جب آپ مر رہی تھیں تو آپ نے کس طرح پرواز کی چاہ کی تھی۔۔۔ ولید البشر کی طرف۔۔۔ اگر آپ نے ایسا کیا ہو گا تو میں اپنے دل میں آپ کو رکھوں یا نہ رکھوں مجھے اس بارے میں سوچنا ہو گا۔ اگر آپ مرنے سے پہلے اسے اپنے اندر سے نکال دیتیں تو میرے زندہ ہونے پر وہ موت بن کر نازل نہ ہوتا۔۔۔ اب میں سوچتا ہوں کہ آپ کی موت پر زمین کو پھٹ جانا چاہیے تھا اور آسمان کو آگرنا چاہیے تھا۔ انسان کے لیے نہ کائنات کو اس کے دکھ پر اتنا تو ماتم کرنا ہی چاہیے۔"

وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا پھر بھی اس کا دم گھٹ رہا تھا۔

"میں ولید البشر کی قابلیت کا مداح ہو گیا ہوں اس نے میری محبت بھی نگل لی۔۔۔ وہ صرف ایک ہی۔۔۔ وہ صرف ایک ہی دل کو خالی کر کے صابر نہیں ہوا۔۔۔ اسے یہ غرور ہے کہ مجھے اس کی ضرورت ہے اور میں یہ گناہ ضرور کروں گا۔۔۔ میں اس کے ہونے کو نہ ہونا ضرور کروں گا۔۔۔ مجھے یہ اعلان بھی کرنا پڑے تو میں کروں گا میرا کوئی باپ نہیں۔۔۔ اور ماما!"

"عالیان۔۔۔" شارلٹ نے اس کا شانہ ہلایا۔

اس نے شارلٹ کو دیکھا وہ کچھ بول رہی تھی۔۔۔ کیا اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر شارلٹ نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پھر وہ دیکھ پایا کہ ویٹر اس کے پیروں کے قریب گری ٹرے اٹھا رہا ہے۔۔۔ وہاں کانچ ہی کانچ بکھرا تھا۔۔۔ کچھ گردنیں اس کے رخ مڑی ہوئی تھیں۔ بالکنی میں کھڑی لڑکی کی آنکھیں اس پر جمی تھیں اور

اس نے تانن کترنا بند کردیا تھا۔

چھت سے جھولتی لڑیاں جل اٹھیں۔۔۔ اور اس نے شارلٹ کو ایسے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو۔۔۔

کیا قیامت آنے کے آثار معدوم ہو چکے۔۔۔ یا بس قیامت آچکی؟

"تم ٹھیک ہو؟" شارلٹ نے شفقت سے پوچھا۔

وہ ہاں نہ کہہ سکا۔۔۔ اسے افسوس ہوا جب سب کچھ ختم کرنے کا فیصلہ کیا جا چکا تھا تو ارادہ بدلا کیوں گیا۔۔۔ اسے افسوس ہوا شمعیں پھر سے روشن کیوں کردی گئیں اندھیرے پر روشنی کو کیوں غالب آنے دیا گیا۔۔۔ ہاں اسے دکھ ہوا کائنات کے پھر سے آباد ہو جانے پر۔۔۔ نقطہ زوال کے مٹ جانے پر۔۔۔

شارلٹ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں ہی رکھا اور اسے اپنے ساتھ لے کر چلنے لگی اور وہ اس کے پیچھے ایسے چلنے لگا جیسے اسے کچھ اور کرنے پر اختیار ہی نہ ہو۔

"ایک لڑکا ہے عالیان۔۔۔
بھلا دی گئی دعا سا۔۔۔
بجھ چکے چراغ سا۔۔۔
عروج سے زوال سا۔۔۔"

☆ ☆ ☆

سارا مانچسٹر اس کے آنسوؤں میں نہ بہا اور وہ خود ہی ان میں غرقاب ہو گئی۔ چھپ کر رونے کے مشغلے کو اس نے ایسے اپنا لیا جیسے فرض عبادت ہو، جو بعد از توبہ کی جاتی ہے۔ راتیں وہ کھڑکی میں کھڑے تمام کردیتی اور دن کو اس نے دھوکا دینے کا ذریعہ بنا لیا۔ اس کی گیلی آنکھوں نے دھند کے پردوں میں فنا ہونا شروع کردیا کہ شاید وہ اس عکس کو جالیں جو وہاں تھا ہی نہیں۔۔۔ شاید کسی معجزے نے خود پر اس کا نام لکھوا لیا ہو اور شاید کسی تارک الدنیا کی صدیوں پہلے مانگی گئی دعا کی خیر اسے بھی آلینے کو ہو۔۔۔ اور کہیں کسی فراق زدہ کی تڑپ آسمان تک جا کر واپس پلٹتے ہوئے اس کے لیے بھی رحمت اکٹھی کرائی ہو۔۔۔ شاید۔

اسے ہر طرف سے "عالیان" نام کا جاپ سنائی دینے لگا۔۔۔ وہ اس جاپ کو سنتی رہتی اور اپنے دل کے مقام کو مسلتی رہتی۔۔۔ ہر ساعت اس کے نام کی پکار بن گئی۔۔۔ ہر شبیہہ اس کی صورت میں ڈھل گئی۔۔۔ اس نے اس نام کی تسبیح پڑھنی شروع کردی جس کے ثواب میں وہ اسے ملنے والا تھا انا انعام میں۔۔۔

لیڈی مہر کے واپس آنے سے پہلے وہ کسی اور جگہ اپنی رہائش کا انتظام کر چکی تھی اور جا بھی رہی تھی لیکن سادھنا نے جانے نہیں دیا۔

"ایسی بے مروت نہ بنو انہوں نے کتنا خیال رکھا تمہارا' ان کے آنے تک انتظار تو کرو۔"

"ان کا سامنا نہیں کرنا چاہتی میں۔۔۔ بہت شرمندہ ہوں میں۔"

"تم ان کے سامنے شرمندہ ہونا' میں تمہیں نہیں جانے دوں گی' تم نے مشورہ کیے بغیر فیصلے کر کے دیکھ لیا کیا ہوتا ہے۔۔۔ دوسروں کی مان لینے میں کبھی ہماری بھلائی بھی ہوتی ہے۔۔۔"

"اب مجھے کہاں بھلائی زیب ہو گی" وہ دونوں سادھنا کے کمرے میں موجود تھیں۔

"ایک غلطی کی ہے دوسری غلطی نہ کرو' ہو سکتا ہے کچھ بہتر ہو جائے۔"

وہ تلخی سے ہنس دی اور یہ سوچ کر رک گئی کہ کوئی دوسری غلطی نہ ہو جائے۔

"میں نے تم سے ایک لفظ نہیں کہا اور تم گھر چھوڑ کر جا رہی تھیں؟"

اگلے دن لیڈی مہر نے آنے کے بعد رات کو اسے اپنے کمرے میں اپنے سامنے بٹھا کر پوچھا۔

"ایک لفظ نہیں کہا یہی تو برا کیا۔۔۔" اس کا سر جھکا ہوا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کمرے کی کس چیز پر نظریں ٹکائے۔

"نہیں امرحہ! کچھ برا میں نے بھی کیا۔۔۔ جہاں کچھ غلط ہوتا ہے وہاں صرف ایک انسان کی وجہ سے ہی نہیں ہوتا' کہیں اس کے بڑوں کا بھی ہاتھ ہوتا ہے کہیں اس کے ماحول کا اور کہیں اس فضا کا جو

معاشرے میں رچی بسی ہوتی ہے۔"

"آپ ایسے نہ کہیں پلیز۔۔۔"

"تمہارے دادا نے بات کی تھی مجھ سے کہ وہ کون لڑکا ہے جسے امرحہ پسند کرتی ہے۔ جس کی ماں غیر مسلم ہے اور باپ کا اتا پتا نہیں۔ ان کا لہجہ اور انداز مجھے اچھا نہیں لگا۔ میرے بیٹے کے لیے کوئی ایسے بھی بات کر سکتا ہے، مجھے دکھ ہوا جان کر۔ میں نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا' صرف اتنا کہا کہ وہ تم سے ہی اس سلسلے میں رابطہ کریں۔ میں جانتی تھی کہ بات آگے بڑھی تو ساری تکلیف پھر سے عالیان کو ہی اٹھانی پڑے گی اور میں یہ نہیں چاہتی تھی اور یہ بھی نہیں چاہتی تھی جو اب ہوا ہے۔ امرحہ! عالیان اپنی ماں کے لیے بہت حساس ہے۔ سب ہی بچے ہوتے ہیں' پر جن کی ماؤں کے ساتھ وہ کچھ ہوا ہو' جو مارگریٹ کے ساتھ ہوا' وہ بچے بہت جذباتی ہو جاتے ہیں۔ تم نے مجھ سے اس کے ماضی کے بارے میں پوچھا اور میں نے صرف اس لیے کچھ نہیں بتایا کہ تم عالیان کی دوست ہو' کچھ بھی اس کے سامنے کہہ دیتیں یا کوئی اور بے وقوفی کر گزرتیں تو دکھ میرے بیٹے کو ہوتا۔ اس کا باپ ولید مسلمان ہے جس نے مارگریٹ سے شادی کی پھر اسے بتائے بغیر چھوڑ کر چلا گیا۔ دکھ اور تکلیف کو اکیلی سہتی مارگریٹ اس کے لیے مرگئی۔ میں نے اس کی وہ حالت دیکھی تھی جب وہ ولید کو ڈھونڈتی پھرتی تھی' بالکل دیوانوں جیسی' ولید نے عالیان کو اپنا بیٹا ماننے سے بھی انکار کر دیا تھا اور مارگریٹ کے ساتھ اپنی آخری ملاقات میں اس نے مارگریٹ کو بہت برا بھلا کہا تھا۔ اسے بدکردار کہا' اس کے مذہب پر سوال اٹھائے۔ ولید اب عالیان کو بھی اپنے فائدے کے لیے ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ اسے عالیان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ وہ ایک خود غرض انسان ہے' میرے پاس مارگریٹ کی ایک ڈائری ہے جس کی آخری سطروں میں لکھا ہے۔

"میں دعا کرتی ہوں کہ عالیان کبھی اپنے باپ سے نہ ملے۔۔۔ نجانے کیوں' لیکن مجھے خوف ہے وہ مجھ سے بدتر سلوک اس کے ساتھ کرے گا۔" اس سطر نے مجھے پریشان رکھا اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا عالیان بہت دکھی ہو گیا امرحہ۔"

امرحہ سے زیادہ اب کون جان سکتا تھا کہ وہ کتنا دکھی ہو گیا تھا اس نے اسے اس کرب میں بہت قریب سے دیکھا تھا۔

"اور اب عالیان ویرا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔۔۔ اس کی ذہنی حالت کے بارے میں اندازہ لگانا مشکل ہے۔۔۔"

"وہ ٹھیک کر رہا ہے۔" اس نے فوراً کہا۔

"ہاں! شاید ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا ہے' خود کو بہلا رہا ہے' بھٹکا رہا ہے' سب یہاں وہاں کر رہا ہے۔۔۔ دیکھو ایک انسان آیا اور میری ریاضت کو کھوٹا کر گیا۔" وہ اپنی آنکھیں پونچھنے لگیں۔

"میرا عالیان۔۔۔ میرا فرشتہ۔۔۔"

کچھ دیر کمرے میں سکوت رہا۔

"بہرحال یہ تمہارا گھر ہے تم رہو یہاں۔ میں کل کی طرح آج بھی ویسی ہی ہوں۔ ماں ہوں نا اپنے بیٹے کے لیے' تمہارے ساتھ تھوڑی سخت ہو گئی۔ ایک ماں کو معاف کر دو۔"

"اس بات سے آپ نے مجھے بے مول کر دیا۔"

"میں نے تمہارے لیے عالیان کو سمجھانا چاہا لیکن شاید اس کا دل بہت سخت ہو گیا ہے۔"

"دل تو میرا سخت تھا۔" سوچ کر وہ لیڈی مہر کا ہاتھ چوم کر اٹھ آئی۔

وہ چاہ کر بھی گھر نہ بدل سکی' لیکن ویرا کے آنے سے پہلے وہ اپنی ایک دوست کے فلیٹ میں چلی گئی۔ دو دن وہیں رہی۔۔۔ ویرا واپس آچکی تھی۔

"تم وہاں کیوں گئی ہو؟ آن لائن بھی نہیں آتیں' میں فون کرتی رہی تم نے فون پر بات بھی نہیں کی۔"

"مریم نے مجھے چند دن اپنے ساتھ رہنے کے لیے کہا تو میں انکار نہیں کر سکی۔"

"آجاؤ گھر' ایلکسی کی فلم دیکھیں گے۔"

"ٹھیک ہے میں چند دنوں تک آجاؤں گی۔"

"تم ناراض ہو کہ میں نے تمہیں عالیان کو پرپوز

کرنے کے بارے میں نہیں بتایا' میں نے سائی کے علاوہ کسی سے بات نہیں کی تھی۔"

"میں ناراض کیوں ہوں گی ویرا۔۔۔ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔"

"پھر بھی۔۔۔" ویرا بہت خوش لگ رہی تھی۔

"تمہیں ایسا نہیں سوچنا چاہیے' میں تمہارے لیے خوش ہوں۔ تم نے ایک اچھے انسان کا انتخاب کیا۔"

"بابا نے کہا میں عالیان کو لے کر روس آؤں اور تمہیں بھی۔"

"ٹھیک ہے۔"

"میں نے بابا کو تمہاری باتیں فل پرفارمنس کے ساتھ سنائیں اور وہ ہنس ہنس کر دیوانے ہو گئے۔ انہوں نے کہا یا امرحہ چند سال ہمارے پاس آ کر رہے یا ہمیں چند سال پاکستان میں اپنے ساتھ رکھے۔۔۔ انہوں نے کہا میرے دل میں حسرت جنم لینے لگی ہے کہ کاش امرحہ میری بیٹی ہوتی۔۔۔ معصوم اور فرشتہ سی۔۔۔ ہاہاہا! دیکھو' انہیں اپنی بیٹی اب بری لگنے لگی ہے۔ امرحہ مجھے شیطان کہہ رہے تھے اور تمہارے لیے ایک پیغام دیا ہے کہ ایک چھوٹا لوہے کا شکنجہ خرید لو جہاں تمہیں کارل نظر آئے اس کی ناک میں گاڑ دو۔"

ویرا شروع ہوئی تو بولتی ہی رہی اور وہ سنتی رہی۔ اچھا تھا کہ ساری گفتگو فون پر ہو رہی تھی' ورنہ فل پرفارمنس دینے پر بھی وہ صفر ہی رہتی۔

ایک بات امرحہ نے اپنے دل پر نقش کر لی تھی" اب وہ کسی کی بھی زندگی میں کوئی مسئلہ نہیں کرے گی۔" اس نے سارے حساب نکال لیے تھے۔۔۔ ویرا غلط تھی ہی نہیں۔۔۔ نہ ہی عالیان' غلط بس وہ تھی۔ اس نے عالیان کو اپنی محبت کے بارے میں بتایا نہ ویرا کو۔ اب اسے ان دونوں سے شکوہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ باب یہیں بند کر دیا گیا اور آخری سطر میں "سب ختم" لکھا رہ گیا۔

وہ یونی ایسے جاتی جیسے یونی جا کر بھی یونی میں موجود نہ ہو۔ آنے والے دنوں میں اس کی آواز بھولی بسری داستان کی مانند ہو گئی اور پھر وہ ایسے موجود ہونے لگی کہ اپنی غیر حاضری کے ثبوت دینے لگی۔

اس نے خود کو گم کر لیا۔۔۔ ایسے جیسے وہ قصہ پارینہ ہو۔ اسے دیکھ کر یہ یاد کرنا پڑتا کہ ہاں یہ وہی لڑکی ہے۔۔۔ وہی لڑکی جو کبھی امرحہ تھی۔۔۔ وہ امرحہ رہی بھی اور نہیں بھی۔

سائی اکثر اس کے پاس آ جاتا لیکن اسے زیادہ بولنے پر مائل نہ کر پاتا۔ اب سائی بولتا اور امرحہ سنتی۔

مانچسٹر یونیورسٹی میں سب ٹھیک ٹھاک تھا۔ اس کے اندر۔۔۔ اس کے باہر سب ٹھیک' ایک دن وہ اس کیفے گئی جہاں اسے پہلی جاب ملی تھی۔

"یعنی تم مجھے بھولیں نہیں' اس بار تم پورے دو مہینے بعد آئی ہو ملنے؟" وہ مسکرا دی۔

"کتنا بدل گئی ہو تم مس اخروٹ۔۔۔!"

"کیسے؟" وہ مسکرا رہی تھی پھر بھی وہ کہہ رہے تھے کہ وہ بدل گئی ہے۔

"جب تم جاب حاصل کرنے آئی تھیں اور تم نے اپنے یونی فیلوز کا استعمال کیا تھا تو میں نے سوچا تھا کہ تم دنیا کو اپنے آگے لگا لینے کی طاقت رکھتی ہو لیکن اب تمہیں دیکھ کر لگ رہا ہے کہ تم دنیا سے ہی بھاگنے کی تیاری کر رہی ہو۔"

"آپ کے شہر نے مجھے بدل دیا۔" کافی مگ کے کنارے پر انگلی پھیرتے اس نے کہا۔

"اگر یہ میرے شہر نے کیا ہے تو مجھے شکایت ہے مانچسٹر سے اور تمہیں مشورہ دوں گا کہ اپنے گھر لوٹ جاؤ اور پہلے جیسی بن کر آؤ۔"

"ایک بار گئی تو ہر چیز سے جاؤں گی' نہ پہلے سی نہ بعد سی۔"

انہوں نے غور سے اس کی شکل کو دیکھا "تمہارا مسئلہ شہر نہیں' تمہارا مسئلہ کوئی اور ہے اسے حل کرو مس اخروٹ۔۔۔! دوبارہ آنا تو خود کو پہلے جیسا بنا کر آنا۔"

***

کافی ختم کر کے وہ بے دلی سے اٹھ آئی۔ وہ سارے شہر میں تسلیاں ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ کوئی حکم' کوئی

حکمت کوئی خیر... کوئی تو... کچھ تو۔

اس نے دائم کو چیک دیا۔

"تم نے میری توقع سے جلدی پیسے اکٹھے کر کے دے دیے ہیں بلاشبہ تم نے کافی محنت کی ہم ایک اچھی اسٹوڈنٹ ثابت ہوئیں۔ تمہارے دونوں سمسٹرز کے رزلٹ بہت اچھے رہے۔ مجھے یقین ہے تم شاندار رزلٹ کی حامل ڈگری لے کر جاؤ گی۔ تم نے مایوس نہیں کیا ہمیں... ہمیں خوشی ہے کہ تم نے بہت کچھ کر دکھایا' ہمارا اسکالر شپ ضائع نہیں ہوا۔"

"شاید..." اس نے مسکرائے بنا اتنا ہی کہا۔ اپنی تعریف اسے زہر لگ رہی تھی۔

"تمہیں آگے بھی پڑھنا چاہیے... ایم فل کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ہاں میں اس بارے میں سوچ رہی ہوں۔" یہ واحد مقصد تھا جو اس نے گھڑ لیا تھا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے... تم چند سال اور یونی میں پڑھو گی تو ال کا ارادہ بھی ایم فل کا ہے۔"

"نہیں... اگر میں نے ایم فل کیا تو شاید کسی اور ملک سے کروں... شاید امریکہ سے..."

"مانچسٹر سے کیوں نہیں؟"

"کسی اور یونی سے کیوں نہیں؟ اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

دائم اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ اسے کہہ نہ سکا کہ پرانی امرحہ کو جہاں چھوڑ کر بھول آئی ہو۔ یاد کر کے اسے وہاں سے لے آؤ۔" اسے یہ ملال بھی ہوا کہ کاش اس نے اسے یہاں نہ بلوایا ہوتا۔

رات آتی... دن نکلتا... پھر رات آجاتی۔

ایک دوسرے کے دوست و دشمن بنے، دن رات ڈھلتے نکلتے رہے... زندگی اپنے تخت نشین بدلتی رہی۔

☼ ☼ ☼

وہ واپس آیا تو کارل اسے لنچ کے لیے لے گیا۔ اس نے مانچسٹر کے سب سے مہنگے ریسٹورنٹ کا انتخاب کیا اور سائی اور شاہ ویز کو بھی ساتھ لیا۔ یہ اس کی شاہ خرچی کی انتہا تھی۔ پھر کلب میں اس نے ان سب کو ناچ کر دکھایا۔ ہنس ہنس کر سب کا برا حال ہو گیا وہ ہر مشہور ڈانسر کی نقل اتار رہا تھا۔ وہ ہاتھ سے ڈی جے کو اشارہ کرتا اور ڈی جے اس کا اشارہ فوراً" سمجھ کر مطلوبہ میوزک لگا دیتا۔ اس رات اس نے ہر بڑے ڈانسر کو خراج نقل پیش کیا۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی وہاں موجود ہوتا تو ضرور کارل کو قتل کر کے قاتل بننا پسند کرتا۔

عالیان نے ایسے قہقہے لگائے جیسے اس سے زیادہ بے فکر انسان بھری دنیا میں اور کوئی نہیں' پھر وہ چاروں فلور پر کود پڑے اور کلب انتظامیہ نے جانا کہ انہیں یقیناً" اگلے دن ڈانس فلور کی مرمت کروانی پڑے گی۔

پھر کارل انہیں سلویا کی شیورلیٹ میں جو وہ اس سے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا مانچسٹر کی سڑکوں پر ایسے گھماتا رہا کہ ان کی پہچان ایسے ہو گئی کہ ایک روڈ سائیڈ پر بنے ریسٹورنٹ کے ملازم نے شیشے کے پار سڑک پر جھانک کر سوچا کہ ابھی ایک شیورلیٹ کار یہاں سے گزرے گی جس میں بیٹھے یونیورسٹی کے چار مسٹنڈے چیختے چلاتے ہوئے گزریں گے۔ کارل نے یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ کار کو بھی جہاز بنا کر اڑا سکتا ہے اور عالیان نے یہ ثابت کیا کہ ڈرائیونگ کرتے کرتے بھی وہ پائلٹ کے عہدے پر فائز ہو سکتا ہے۔

بس اخبارات اور ٹی وی میں خبر نہیں آئی باقی سب جان گئے "شیورلیٹ اور وہ چار۔"

شور دل پر حاوی نہیں ہوتا پھر بھی وہ شور کا حصہ بن گیا۔ میلے تنہائی نہیں مٹاتے پھر بھی وہ میلے سجا کر بیٹھ گیا... عالیان... وہ ادھر ادھر یہاں وہاں ہو گیا۔ اس نے اپنا کمرہ سجایا اور اپنی بچت سے پرانا سامان نکال کر نیا سامان خرید لایا۔ ہال کے ایک ایک اسٹوڈنٹ نے اس کا کمرہ دیکھ کر "واؤ" کہا۔ بیڈ کے سامنے کی دیوار پر اس نے شیطان کا پوسٹر لگایا جو پہلے نہیں لگایا تھا... کارل کا۔

ننھے فرشتے سائی کو اس نے دوسری دیوار پر جگہ دی اور بیڈ کی سائیڈ پر ماما مہر کا ایک نیا اسکیچ فریم کروا کر رکھا

۔۔۔ مارگریٹ ــ کے لیے وہ کوئی جگہ نہ ڈھونڈ سکا کہ وہ اسے کس حصے میں رکھے کہ اسے دیکھنے سے اسے خوشی ہوا کرے۔

وہ خود کو بدل رہا تھا۔۔۔ یہ اس کا ماننا تھا۔۔۔ ابتدا اس نے چیزوں سے کی اور وہ سب ایسے کرتا رہا جیسے کسی کو یہ سب دکھا رہا ہو۔۔۔ کس کو۔۔۔؟ اس نے یہ بیٹھ کر طے نہ کیا اور عالیان "ہارٹ بریکر" کے نام سے فریشرز میں مقبول ہو گیا۔ اس نے نئی آنے والی لڑکیوں کا جیسے دل ہی توڑ دیا کیونکہ وہ اور ویرا جگہ جگہ ساتھ ساتھ دیکھے جانے لگے۔ چہل قدمی کرتے ہوئے' ساتھ ساتھ سائیکل چلاتے ہوتے' لان میں بیٹھے باتیں کرتے ہوئے لائبریری میں ساتھ بیٹھ کر پڑھتے ہوئے اور کبھی کبھی ویرا اس کے کندھے پر سر رکھ دیتی تو کوئی نہ کوئی تصویر کھینچ کر سب کو ٹیگ کر دیتا اور پھر خوب گوسپ ہوتا۔ کبھی کوئی ایسی تصویر The Tab Manchester کا حصہ بھی بن جاتی' ایسے ہی کیمپس نیوز کے عنوان سے۔

اور ایک اور جوڑی فریشرز میں بہت مقبول ہونے لگی "عالیان اور کارل کی" ہفتے کی رات یا اتوار کے دن وہ کسی ایک یا زیادہ فریشر کو بھگتا لیتے۔ سائیکلنگ اور سوئمنگ میں جیت جیت کر انہوں نے اتنے پیسے کما لیے کہ کرسمس کی چھٹیوں میں آرام سے کسی بھی ملک میں دس دنوں تک دو وقت کا اچھا کھانا کھا سکتے تھے۔

کسی بھی مقابلے کے دوران عالیان کا رویہ اتنا تند خو ہو جاتا جیسے جیتنا اس کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکا ہو۔ وہ معمولی چیزوں اور اشاروں کو اہمیت دینے لگا۔ ہال میں کبھی کبھار کے ہونے والے خود ساختہ تھیٹر میں وہ ہنسا ہنسا کر سب کو لوٹ پوٹ کر دیتا۔۔۔ وہ کئی کام ایک ساتھ کرنے لگا تھا۔ جیسے اس کے پاس وقت کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ موجود ہو اور اپنی توانائیوں کو وہ کہیں بھی لگا دینا چاہتا ہو۔ پڑھائی کے علاوہ بھی اسے بہت کچھ سوجھنے لگا تھا۔ وہ بولتا تو خود کو روکنا نہ چاہتا۔۔۔ خاموش ہوتا تو کبھی بول پڑنے پر مائل نہ دکھتا' ہنستا تو اس کے قہقہے کانوں کو پریشان کرتے۔ کہیں کھڑا ہوتا تو اپنے گرد مجمع اکٹھا کر لیتا اور اس کے چلنے پھرنے کا انداز ایسا ہو گیا کہ شاید وہ غصے میں آیا جاتا ہے۔۔۔ اس میں تکبر نہ جھلکتا' لیکن وہ شان بے نیازی کا قائل نظر آنے لگا۔ اس پر نظر اٹھتی' ٹھہرتی اور یہ سوچ پیدا کرتی "کیا یہ عالیان ہے یا نہیں۔۔۔ تو پھر عالیان کہاں ہے؟"

کئی فریشرز کو اس نے کوڑے دان میں بند کیا اور کتنوں کو اسٹور میں لاک کیا کہ گمان گزرنے لگا کہ وہ سنگدل ہو گیا ہے۔ جب وہ چپ ہوتا تو یہ گمان بھی گزرتا کہ کسی کے بارے میں وہ بے حسی سے سوچ رہا ہے۔۔۔ کسی سے لڑ رہا ہے۔۔۔ دلائل دے رہا ہے۔۔۔ ثبوت مانگ رہا ہے' وہ جنگ کی حالت میں لگتا۔۔۔ دوبدو لڑتا ہوا بھی۔۔۔ ڈھیر صورت شکست خوردہ بھی۔۔۔ وہ اختتامیہ بھی لگتا اور شروعات بھی۔

کتنی ہی علامتیں اس میں سر اٹھا کر کھڑی ہو گئیں جس میں سب سے نمایاں "میں تکلیف میں ہوں" تھی کتنے ہی اشارے اس کی سمت ابھر کر معدوم ہو جاتے۔ جس میں سب سے نمایاں "مجھ سے دور رہا جائے" ہوتے۔

وہ ایک ایسے میدان کی صورت اختیار کر گیا جس میں جا بجا قبریں کھودی جا رہی ہوں' کہیں کسی گلستان کی آبیاری کی تیاری نہ کی جا رہی ہو' نہ اس کی اجازت ہی اور دی گئی ہو۔ ایک دور افتادہ عمارت کی چھت سے رسے سے کودنے کا ٹاسک اس نے ایسے جیت لیا کہ کوئی اسے ہرانے کے بارے میں سوچ نہ سکا۔

اس ایسے وقتوں میں وہ بے رحم لگنے لگتا جیسے وہ ایسا گوریلا کمانڈو ہو جو بغاوت کا ارادہ باندھ چکا ہو۔ اس کی سائیکل سڑک پر ایسے دوڑنے لگی جیسے وہ کوئی میزائل ہو جسے ہدف کی طرف داغ دیا گیا ہو۔

اونچائی سے پانی میں الٹی چھلانگیں لگاتے اس نے اپنے ساتھ بے دردی کا رویہ اپنا لیا کہ کارل نے اسے روک کر پوچھا۔

"تمہارا دماغ کام کر رہا ہے نا۔۔۔ بس کرو۔"

وہ ہنس کر کارل کو پرے کرتا اور پھر سے شروع ہو جاتا۔ سب دوست بس اسے دیکھتے ہی جاتے۔ سائی

زیرلب دعائیں دہراتا اور یہ دعائیں تب بھی دہرائی گئیں جب وہ دو اونچی پہاڑیوں پر تنی رسی پہ چل رہا تھا۔

کارل پہلے ہی اس بار جا چکا تھا۔ انہیں سب سے کم وقت اسکور کرنا تھا۔ اور جب وہ رسی پر چڑھا تو اس نے حفاظتی بیلٹ کھول دی... اور اونچائی سے نیچے جھانکا۔ کارل کے دماغ میں چھناکا ہوا اگر اس کے دو پر ہوتے تو وہ اڑ کر اسے منہ میں دبوچ کر اس طرف لے آتا۔

وہ رسی پر چل رہا تھا اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ بہت بلندی پر تھے اس کی مدد کے امکان صفر تھے۔ ان سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان سے اپنا سانس بحال رکھنا مشکل ہو گیا۔

"یہ پاگل کیا کرنے جا رہا ہے؟" کارل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر گزرے۔

"میرا خیال تھا یہ ٹھیک ہو گیا ہے؟" سائی بڑبڑایا۔

وہاں آٹھ لڑکوں کا گروپ موجود تھا' تین فریشرز اور باقی وہ سینئرز' فریشرز نے اسے ایک چیلنج جانا کہ وہ انہیں کہہ رہا ہے کہ ایسے کر کے دکھاؤ تو تمہیں جانیں اور ان کو کوئی ارادہ نہیں تھا اس کے چیلنج پر بھڑکنے کا... وہ کھیلنے آئے تھے' جان پر کھیلنے نہیں اور وہ جان پر کھیلنے ہی آیا تھا... سب سے معمولی چیز "عالیان" کو وہ کہیں بھی اٹھا کر پھینک دینا چاہتا تھا۔

کارل اور سائی کو اس کی ذہنی حالت کے بارے میں ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو گیا۔ وہ انہیں دھوکا دیتا رہا تھا اور... اس کے دھوکے میں آ گئے تھے... وہ اتنی اونچائی پر اکیلا کھڑا تھا اسے نیچے جا گرنے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔

اس نے سب سے کم وقت اسکور کیا تھا... کارل نے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔

"اگر تم مرنا چاہتے ہو تو مجھے بتاؤ' میں تمہیں گولی مارنے کا حوصلہ پیدا کر لوں گا... اس کے لیے تمہیں یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ اسے غصے کی زیادتی کی وجہ سے جھنجوڑ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے مار دو گولی۔" اس نے سنجیدگی سے کہا اور جھانک کر نیچے دیکھا اتنا اونچا آ کر بھی وہ کہیں بہت نیچے گرا ہوا ہی تھا۔

کارل نے اس کے جبڑے پر پوری قوت سے گھونسا مارا کہ اس کے منہ سے خون نکلنے لگا' وہ بھاگ کر رسی پر چڑھ گیا اور حفاظتی بیلٹ کھول دی۔

"اب دیکھو مجھے... اور یہ جانو کہ کیسے جان نکلتی ہے۔"

عالیان نے اپنے لب بھینچ لیے اور اسے افسوس ہوا... کارل بے دردی سے رسی پر چل رہا تھا جیسے اسے بھی اپنی جان کی پروا نہیں... لیکن عالیان کو اس کی پرواہ تھی... وہ محسوس کر رہا تھا کہ پہاڑ اس کے پیروں تلے سے کھسک رہا تھا۔

فریشرز کھڑے ان دونوں کی شکلیں دیکھ رہے تھے... سائی پھر سے زیرلب دعائیں پڑھنے لگا تھا اور عالیان کارل سے اپنی نظریں نہیں ہٹا پا رہا تھا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے' جان اس وقت نہیں نکلتی جب اپنی جان نکلتی ہے... جان اس وقت نکلتی ہے جب اپنے کسی جان سے پیارے کی جان نکلتی ہے۔ اور اس نے یہ جانا کہ ہم اپنے پیاروں کی جانوں کے حق دار ہیں اپنی نہیں۔" اس نے بے بسی سے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا کہ اتنا کچھ جان لینے پر بھی وہ جان لینے والوں جیسا کیوں نہیں ہو رہا...

اور یہ کہ زندگی کے سب ہی اجالے "شب گزیدہ" کیسے ہو گئے اور ارتکاز کے سناٹوں نے "عائشہ نیازی" کے کرب آمیز چنے کس دھاگے سے بن لیے۔

"سراب مسلسل" "داستان حیات" میں کس رخ سے داخل ہو کر پناہ گزیں ہوا اور قطرہ شبنم "بہ نوک خار می رقصم" ہونے پر راضی کیسے ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

عالیان اور ویرا کی جو تصویریں ادھر ادھر گھومتی تھیں وہ امرحہ کی نظروں سے بھی گزر ہی جاتی تھیں۔ شنزا تو خاص اسے وہ تصویریں موبائل پر بھیجتی تھی۔ وہ ان تصویروں کو دکھ سے دیکھتی نہ غصے اور حسد سے۔ وہ عالیان اور ویرا کی تصویریں ہوتیں اور وہ دونوں ہی

اسے پیارے تھے۔ ہاں کبھی کبھی ان تصویروں کو دیکھتے اسے سانس لینے میں مسئلہ ہوتا اور ایک بار اس نے محسوس کیا کہ جسے ہم سارے کا سارا اپنا سمجھتے ہیں وہ سارے کا سارا کسی اور کا ہو جائے تو ایسا لگتا ہے کوئی ہمارے ٹکڑے، کر کے چیل کوؤں کو کھلا رہا ہے اور ہمیں دکھا بھی رہا ہے کہ دیکھو کیسا لگتا ہے۔

اس نے عالیان کے پاس جانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ نہ اپنی غلطی کی معافی مانگنے کی وہ اسے اپنی صورت ہی نہیں دکھانا چاہتی تھی کہ اسے پھر سے تکلیف ہو۔ اس نے ایک خط لکھ کر سائی کو دے دیا تھا کہ وہ اس کے پاکستان جانے کے بعد عالیان کو دے دے۔ خط میں اس نے اپنی غلطیوں کی معافی مانگی تھی اور کچھ نہیں....

ان ہی خزاں رسیدہ دنوں میں اس کا سامنا پال سے ہوا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ خاص اس سے ملنے آیا ہو۔ اس سے پہلے بھی اس کا اس سے سامنا ہوتا رہا تھا لیکن وہ راستہ بدل لیتی تھی۔

"میں اب تم سے معذرت کرنے کے قابل ہو سکا ہوں۔" اس نے مسکرا کر دوستانہ انداز میں کہا۔ اس کے پہلے ہی جملے پر امرحہ حیران رہ گئی۔ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"مجھے حقیقتاً" اب افسوس ہوا ہے کہ میرا ردعمل کس قدر غلط تھا۔ میں نے تمہیں نقصان پہنچانا چاہا بدلے میں تم نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا۔ تم نے یہ ثابت کر دیا کہ تم بہرحال مجھ سے بہتر انسان ہو..... امرحہ! مجھے یہ جلد ہی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ پیغامات تم مجھے پوسٹ کرتی رہی ہو۔"

امرحہ ذرا سا چونکی۔ اس واقعے کے بعد امرحہ اسے پیغامات پوسٹ کرتی رہی تھی۔ وہ ہفتے میں دو بار ایسا کرتی وہ باقاعدگی سے لیٹر اسے ٹائپ کر کے بھیجتی رہی۔

"شروع کے پیغامات چھوڑ کر میں نے بعد میں آنے والوں کو ذرا توجہ سے پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ پھر میں نے ان پر سوچنا شروع کر دیا اور پھر میں ان سے متاثر ہونے لگا۔ ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہوتی تھی کہ عام سمجھ بوجھ والے انسان کو اچھی نہ لگے۔ چند ماہ پہلے میں نے مذاہب پر کچھ کتابیں لے کر پڑھیں اور مجھے معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک کتاب میں وہ لکھا تھا جو تم مجھے لکھ لکھ کر پوسٹ کرتی رہی تھی۔"

"میں تمہیں قرآن کی آیتیں لکھ کر بھیجتی رہی تھی۔"

"معلوم ہو گیا ہے مجھے تم نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیا کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ کیا تم مجھے برا انسان سمجھنا چھوڑ سکتی ہو، امرحہ۔"

امرحہ مسکرا دی اور کہا۔ "ہاں! تم نے لاعلمی کے باعث میرے مذہب کے بارے، میں جو کہا تو میں نے تمہیں معاف کر دیا مگر میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتے تو میں یا کوئی بھی مسلمان اسے برداشت نہ کرتا۔"

کچھ دیر اور باتیں کر کے جب پال چلا گیا تو امرحہ کو لگا جیسے وہ کسی امتحان میں پاس ہو گئی ہے۔ چلو اس کے ہاتھ کوئی تو کامیابی آئی۔ اس واقعے نے اس کے اندر یہ احساس پیدا کیا کہ عقل اور سوجھ بوجھ سے کیے گئے عمل بے کار نہیں جاتے، عقل کرشمہ ساز ہے اور یہ معجزوں کی رتھ کی سوار ہے۔

"سائیکل پر جایا کرو نا! یا تم تو سائیکل کو بھول ہی گئیں۔" سادھنا رات کو اس کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔

"دل نہیں چاہتا سائیکل چلانے کو۔" وہ پڑھ رہی تھی۔

"تمہارا تو اب زبان ہلانے کو بھی دل نہیں چاہتا۔" سادھنا نے اسے ہنسانا چاہا۔

"میری زبان نے بہت کمالات دکھائے ہیں نا اس لیے۔" اس نے ہنس کر کہا لیکن بات مذاق نہیں تھی۔

"اگر انسان سے غلطی نہ ہو تو وہ انسان نہ ہو۔"

"اگر غلطیاں ہی ہوتی رہیں تو بھی وہ انسان نہ ہو۔" اس نے سر اٹھا کر کہا۔

اس کے انداز پر سادھنا خاموش ہو گئی اور کچھ دیر

ٹھہر کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اگلے دن یونیورسٹی سے وہ ہسپتال آ گئی کارل کا معمولی سا ایکسیڈنٹ ہوا تھا ایک امیرزادے کی کار کے ساتھ اور کارل نے سڑک پر چلا چلا کر ایسے ہنگامہ کیا جیسے اس کی ساری ہڈیاں چور چور ہو چکی ہوں۔ وہ خود کو اس امیرزادے کے خرچ پر پرائیویٹ ہسپتال تک لے آیا تھا اور مزے کر رہا تھا ویسے اسے چلنے میں تھوڑا بہت مسئلہ تھا۔

امرحہ دو دن بعد اس کے پاس جانے کا فیصلہ کر سکی اور کاؤنٹر پر اس کے بارے میں پوچھا تو کاؤنٹر پر موجود دو لڑکیوں نے اسے ذرا گھور کر دیکھا اور پھر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

"تم دوست ہو اس کی۔" ایک نے منہ بنا کر پوچھا۔

امرحہ نے سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے۔ ویسے زیادہ دیر تک ہسپتال میں رہنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ کتنا اچھا ہو اگر وہ تم سب کے ساتھ یونیورسٹی جوائن کر لے۔ دو دن بہت زیادہ دن ہوتے ہیں ہاسپٹل میں قیام کے لیے۔" جس نے منہ بنایا تھا اس نے زبردستی مسکرا کر کہا۔ امرحہ اس کی بات سمجھ نہ سکی۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم اپنے دوست سے کہو کہ وہ جلد ہی ہسپتال سے ڈسچارج ہو جائے۔ یہ اس کی صحت کے لیے اچھا ہو گا۔" دوسری نے ذرا مسکرا کر کہا۔ "اور دوسروں کی صحت کے لیے بھی۔" پہلی کا منہ پھر سے بن گیا۔

امرحہ کارل کے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور اپنی پشت پر ان کی آواز سنی۔

"پتا نہیں ڈاکٹرز کب ڈسچارج کریں گے اسے؟"

"جب ہسپتال اسٹاف ہسپتال کے رومز میں شفٹ ہو جائے گا تب۔" دوسری فوراً بولی۔

امرحہ اس کے کمرے میں آئی تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس کا خیال تھا عالیان اپنی جاب پر ہو گا پر وہ سامنے ہی بیڈ کے ایک طرف بنی کھڑکی کی چوکھٹ میں بیٹھا نوٹ پیڈ پر کچھ بنا رہا تھا۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر سب نے سر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔ عالیان نے بھی۔

وقت جن پروں پر اڑ کر آیا تھا وہ پر اس نے وہیں جلا دیے۔

وہ وہیں کھڑی رہ گئی اور فیصلہ نہ کر سکی کہ اندر جائے یا باہر نکل آئے۔

"آہا۔ امرحہ۔ آجاؤ۔ پہلے یہ بتاؤ خالی ہاتھ تو نہیں آئی ہو نا؟" کارل بیڈ سے اچھل کر کھڑا ہوا اور لپک کر اس کے قریب آیا۔

سائی اور شاہ ویز مل کر دیوار پر ایک پوسٹر لگا رہے تھے جس پر لکھا تھا "جلدی ٹھیک ہو جاؤ کارل۔ اور وہ جلدی کبھی نہ آئے۔" پوسٹر پر لاتعداد دستخط موجود تھے جو یقیناً ہال میٹس اور یونی فیلوز نے کیے تھے۔

شاہ ویز اور سائی نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اور خیر مقدمی انداز سے مسکرا دیے تھے۔

"لاؤ اب یہ چاکلیٹس مجھے دے دو۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر اس سے چاکلیٹ کا ڈبا تقریباً چھین ہی لیا اور انہیں بیڈ کی سائیڈ پر رکھے ایک باکس میں ڈال کر اسے لاک کر دیا اور چھوٹی سی چابی منہ میں دبا لی۔ امرحہ کے تاثرات سے وہ سمجھ گیا کہ وہ اسے بیمار نہیں سمجھ رہی اور وہ اپنی لائی چاکلیٹس واپس ہی نہ مانگ لے۔ اس نے کراہنا شروع کر دیا اور اپنی زخمی کہنی اور پیر آگے کر کے دکھایا۔

"نہیں۔ نہیں میں بیمار ہوں یہ دیکھو۔"

عالیان نے ایسے ظاہر کیا جیسے کمرے میں کوئی آیا ہی نہیں اور وہ پنسل کے ساتھ نوٹ پیڈ پر مصروف رہا۔

"میں دو دن تکلیف سے تڑپتا رہا اور تم اب آ رہی ہو امرحہ؟" کارل نے دانت نکال کر کہا۔

"امرحہ! جاتے جاتے ہسپتال اسٹاف کی خبر گیری بھی کرتی جانا ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ وہ دو دن تکلیف سے تڑپتے رہے۔" شاہ ویز نے کہا۔

"تم کب تک رہو گے یہاں؟" امرحہ نے پوچھا۔

"جب تک ٹھیک نہیں ہو جاتا۔"

"لیکن تم تو مجھے ٹھیک ہی لگ رہے ہو۔۔۔"

"نہیں میں ٹھیک نہیں ہوں نا!" اس نے آنکھ مار کر کہا۔

تھوڑی دیر بیٹھ کر امرحہ اٹھ آئی۔ سائی امرحہ کے ساتھ باہر تک آیا اور اسے ہمدردی سے دیکھنے لگا جو کمرے سے باہر تک عجیب حالت میں چلتی آئی تھی۔

"تم بیٹھو۔ ہی نہیں' آجاؤ واپس چلتے ہیں۔ کارل اتنے مزے مزے کے لطیفے سنا رہا ہے نرسز کے بارے میں۔۔۔ اور تم نہیں پتا ہے ہسپتال کے رومز سے بھی کھانے پینے کی چیزیں غائب ہونا شروع ہو گئی ہیں اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ نرسز بھی ایسے چلا سکتی ہیں۔ میرے سامنے ایک نے چلا چلا کر ہسپتال سر پر اٹھا لیا۔ اس کی کلائی پر جو کیڑا چپکا تھا وہ اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ وہ بے چاری اسے ایک انجکشن لگانے آئی تھی رات کو۔۔۔ کون تھا جو اپنے اپنے روم سے نکل کر اس نرس کو نہیں دیکھ رہا تھا۔"

سائی نے اسے ہنسانے کے لیے یہ سب کہا تھا اور اس کا دل رکھنے کو وہ ہنس دی اور چلی آئی۔ اور اندر عالیان کارل کا لنگڑا اسکیچ بنا چکا تھا اور اس کے زخمی ہاتھ میں ایک عدد چاکلیٹ کا ڈبا بھی تھما دیا تھا۔۔۔ اور کارل کی آنکھیں۔۔۔ کوئی دیکھتا تو عالیان سے پوچھتا۔۔۔

یہ کون سا کارل ہے جس کی آنکھیں اتنی سیاہ ہیں۔۔۔ اتنی سیاہ کہ ان میں جھانک کر مشرق کی ساری رمزیں بوجھی جا سکتی ہیں۔۔۔ سارے قصے کہانیاں پڑھی جا سکتی ہیں اور جو اتنی محفوظ ہیں کہ ان میں اتر کر سارے دروازے بند کر کے قید ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ ایسی پناہ گاہیں جو ہر کسی کو میسر نہیں' ان کے مالک ہونے کا اعتراف صرف ایک انسان ہی پا سکتا ہے۔۔۔

ایسا انسان' جس کے ساتھ لفظ "محبت" جڑا ہو۔۔۔

عالیان کی پنسل آنکھوں کی پتلیوں کو اور سیاہ کر رہی تھی اور وہ یہ جانتا نہیں تھا کہ وہ یہ کر کیا رہا ہے۔

☆ ☆ ☆

فریشر میں سے ایک لڑکی ایما کے ساتھ کارل کی دوستی اتنی بڑھ گئی کہ لڑکی کو کارل کو پرپوز کرنا پڑا اور کارل نے یہ اعزاز آخر حاصل کر ہی لیا کہ کوئی اسے بھی پرپوز کر سکتا ہے۔ لڑکی کا تعلق لندن سے تھا اور وہ کسی ہال میں رہنے کے بجائے ایک بہت بڑے گھر میں رہ رہی تھی۔ یعنی وہ اتنی امیر تھی۔

یونی فیلوز کو کارل کی قسمت پر رشک آیا اور لڑکی کی قسمت پر افسوس ہوا' پھر انھی یونی فیلوز کو لڑکی کی قسمت پر رشک آیا اور کارل کی قسمت پر افسوس بھی نہ ہوا۔

کارل نے کوشش کی تھی کہ وہ ایک عام انسان بن کر رہے' لیکن صرف ایک دن وہ عام انسان بنے رہنے سے چوک گیا۔ ایمان کی برتھ ڈے پارٹی پر جس میں لندن سے آیا اس کا خاندان بھی شریک تھا۔ اس نے کچھ ایسے پرانک (مذاق) کر ڈالے کہ سب دنگ رہ گئے کہ پرانک اور دہشت گردی میں کوئی تمیز نہیں کیا۔۔۔؟ ان میں سب سے معمولی اور بے ضرر پرانک صرف اتنا سا تھا کہ اس نے سرخ کارپٹ پر نظر نہ آنے والی ڈوری کی بارودی سرنگ بچھا دی۔ جس سے پیر نہیں الجھتے۔۔۔ پھر اس نے ڈوری کے سرے کو آگ دکھا دی۔۔۔ اور وہ ڈوری کسی چھلاوے کی طرح سانپ بنی' پھلجھڑی کی طرح کارپٹ پر رقص کرنے لگی۔۔۔ مہمانوں کو سمجھ نہیں آئی کہ وہ بھاگ کر کہاں جائیں' ہر طرف اس پھلجھڑی کا جال بچھا بھڑک جاتا۔ یہ سب سے معمولی اور بے ضرر پرانک تھا۔۔۔ باقی کے معمولی اور غیر اہم پرانک۔۔۔ بقول مہمان "خدا کی پناہ۔"

بس اتنی سی بات تھی اور ایما نے اس کے منہ پر انگوٹھی دے ماری کہ وہ ایک دیوانہ انسان ہے۔۔۔ انگوٹھی سائی نے کیچ کی اور الفاظ عالیان نے یاد کر کے باقی کے ہال میٹس کو سنائے۔۔۔ شاہ ویز نے نیلا گاؤن پہن کر ایما بن کر۔۔۔ سانحے کی ہو بہو نقل اتار کر دکھائی اور ہال میں "ایما برتھ ڈے پارٹی" کے عنوان سے ڈرامہ تھیٹر کیا گیا۔ جس نے تھیٹر ڈراموں کی تاریخ کو بدل ڈالا اور سب کامیڈی ڈراموں کا "باپ ڈراما" ہونے کا خطاب حاصل کیا۔

ایما تو پاگل تھی کارل تو صرف اس کی برتھ ڈے پارٹی کو یادگار بنانا چاہ رہا تھا۔

"یادگار..."

ویرا کے لیے وہ یادگار لمحہ تھا۔ ان سب کے مشترکہ دوستوں کی برتھ ڈے پارٹی تھی جس میں ان دونوں نے گانا گایا تھا۔ اس نے عالیان کو روسی گیت کی مشق کروائی تھی اور وہاں موجود سب لوگوں کا ماننا تھا کہ اس سے بہترین گانا انہوں نے پہلے نہیں سنا' پھر ویرا جب اکیلی گٹار پر گانا گانے لگی تو دور کونے میں کھڑے ہو کر عالیان اسے دیکھنے لگا۔ اس کا عکس پانی کی طرح جھلمل کر رہا تھا۔ بن اور مٹ رہا تھا' ٹھہر نہیں رہا تھا۔

"ویرا ایک اچھی لڑکی ہے۔" اس نے خود سے کہا' خود کو یاد دلایا۔

اس کی صورت بن اور بگڑ رہی تھی جو اچھی بات نہیں تھی... اسے تو نقش ہو جانا چاہیے تھا۔

اس نے ویرا کے پاپا سے کئی بار بات کی تھی۔ وہ اس سے اس کی دلچسپیوں کے بارے میں پوچھتے اور اس سے بات کر کے بہت خوش ہوتے۔

ماما مہر ہفتے میں دو بار اس سے مل کر جاتیں۔ اور وہ کسی ریسٹورنٹ یا ہوٹل میں ڈنر کر لیتے۔ فلم دیکھنے چلے جاتے' پہلے ماما مہر نے اسے چھپا کر رکھا ہوا تھا کہ ولید کے آدمی اس تک نہ پہنچ جائیں اب اس احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔ ولید کے آدمی اب بھی اس کے پاس اسے مختلف بہانوں سے منانے آئے تھے اور وہ ان سے بہت اچھی طرح سے نبٹتا تھا۔

اور ایک بار وہ سیکرٹ روم بھی گیا۔ وہ سمجھ نہیں سکا کہ وہ وہاں کیوں آیا ہے۔ اس نے ایسے ہی دیواروں کو دیکھا اس کی نظروں نے کچھ ڈھونڈنا چاہا۔ امرحہ کی لکھائی پر اس کی نظریں ٹھہر گئیں اور اس نے نظریں پھیر بھی لیں۔ تو پھر وہ وہاں کیوں آیا تھا؟ اس نے کاغذ پر چند سطریں لکھیں۔

"ویرا ایک اچھی لڑکی ہے... بہت اچھی لڑکی۔" وہ کاغذ کو گھورتا رہا' کیا اسے یہ لکھنا تھا... ہاں... پر یہی کیوں... ؟

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میرے دل کی وسعت کہاں کھو گئی ہے... میں ظالم ہوں یا مظلوم... میں اچھا کر رہا ہوں یا میرے ساتھ برا ہو رہا ہے۔" دوسرے کاغذ پر لکھ کر اس نے دیوار کے ساتھ چپکا دیا اور مانچسٹر کی حدود سے دور نکل گیا۔

شام نے اپنا پیراہن رات کے حوالے کیا۔

رات تین بجے کے قریب وہ ایک دم سے اٹھی اور بستر ایسے چھوڑا جیسے قیامت آ گئی ہو۔ کوٹ اور جوتے اس نے کیسے پہنے اسے معلوم نہیں ہوا اور وہ کمرے سے باہر بھاگی اور بیرونی دروازے کو پار کیا جو ان لاک تھا۔ اور تیزی سے شیڈ کی طرف بڑھی اور اپنی سائیکل نکالی۔ ابھی وہ اس پر بیٹھ کر اسے اڑاتی کہ سادھنا کی آواز اس کے پیچھے سے آئی۔

"امرحہ... کہاں جا رہی ہو؟"

وہ پسینہ پسینہ ہو چکی تھی اور سانسیں قابو میں نہیں آ رہی تھیں... اس نے سادھنا کی طرف دیکھا۔ پھر خود کو اور سائیکل کو... "Anslm ہال میں آگ لگی ہے..." آنسو اس کی آنکھوں سے کسی سیلاب کی طرح نکل رہے تھے۔

"تمہیں کس نے بتایا؟" سادھنا اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور ہاتھ سے اس کے آنسو صاف کرنے لگی۔

"مجھے...؟" اب وہ چونکی اور یاد کرنے لگی۔

"ہاں... کس نے بتایا... سائی نے یا کارل نے؟"

وہ خاموش سادھنا کو دیکھتی رہی پھر سائیکل کو واپس رکھا اپنے گال رگڑے اور گھر کے اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اس نے خواب دیکھا تھا یا کچھ اور تھا' اس نے ہال میں آگ لگی دیکھی تھی۔ سادھنا کے سامنے وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"بتاؤ امرحہ تمہیں کس نے بتایا؟" سادھنا نے اس کا شانہ ہلایا۔

"کسی نے نہیں... میرا وہم تھا شاید۔"

سادھنا بہت دیر تک اسے دیکھتی رہی "امرحہ! ہال میں واقعی آگ لگی تھی' ابھی دس منٹ پہلے ویرا مجھے

بتا کر اس طرف گئی ہے۔ سب ٹھیک ہیں وہاں۔"
سادھنا نے اس کا گال چھو کر کہا۔

"تو ویرا جا چکی ہے۔" وہ واپس اپنے کمرے میں پلٹ آئی اور ان دعاؤں کو دہرانے لگی جو تا عمر اسے عالیان کے لیے دہراتے رہنی تھیں۔ پھر اس نے سائی کو فون کیا اور احوال پوچھا وہاں سب ٹھیک تھا' حادثاتی آگ تھی جس پر قابو پا لیا گیا تھا۔ امرحہ نے فون بند کر دیا تو سائی عالیان کے پاس آیا۔

"کسی نے امرحہ کو آگ کے بارے میں نہیں بتایا تھا لیکن اسے معلوم ہو گیا۔ اگر فون پر تم اس کی آواز سن لیتے تو کانپ جاتے' عالیان! تم اسے خود سے الگ ہی رکھو لیکن اسے ناپسند نہ کرو۔ اسے ایک ایسے شخص کا مشورہ مان کر اس پر عمل کر لو' جس نے اب تک کی عمر میں سب سے صرف بے لوث محبت کرنا ہی سیکھا اور سکھایا ہے۔" سائی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

عالیان کی آنکھوں کی پتلیاں جھلملا گئیں اور وہ سائی کے پاس سے اٹھ آیا۔ غصہ' انا' دکھ' پچھتاوا' بے رحمی' وہ ان سب کا ملغوبہ بن گیا تھا۔ وہ آج جو بن گیا اس نے ایسا بننے کے بارے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اب تک جو اس کے ساتھ ہو چکا تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کے ساتھ ہو گا۔ وہ بیک وقت ایک رحم دل اور بے رحم انسان بن گیا۔ ظالم اور معصوم' جلد باز اور صابر' ذہین اور سودائی۔۔۔ آسان اور مشکل۔ وہ اپنی ذات کی بھول بھلیوں اور اپنے فیصلوں کی گرداب میں پھنس چکا تھا' وہ اب ایک ایسے شخص کی کہانی بن گیا جس کے پاس سب ہوتا ہے بس اپنا آپ ہی نہیں ہوتا' جو سب کچھ ڈھونڈ نکالتا ہے سوائے اپنے۔۔۔

ہارٹ راک میں ایک رات اس کی نظر ایسی لڑکی پر ٹھہر گئی جس نے سرخ رنگ کی فراک پہن رکھی تھی اور بالوں کو کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ وہ ڈانس فلور پر ایسے ناچ رہی تھی' جیسے کوئی اور بھی اس کے ساتھ ناچ رہا ہے۔ کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا ہے' کوئی اسے بانہوں میں تھام کر گھما رہا ہے۔ آس پاس والوں نے اسے پہلے لڑکی کا ایک مذاق سمجھا پھر اس کی سنجیدگی اور کمال فن دیکھ کر انہوں نے مذاق کا پہلو ترک کر دیا۔

ڈانس فلور پر باقی سب رک کر پیچھے ہو گئے اور وہ اکیلی ویسے ہی محو رقص رہی جیسے اس کا محبوب اس کے ساتھ محو رقص ہے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر کمال معصومیت تھی۔ لڑکی کے انداز میں ایسی بے خودی تھی کہ گمان ہوتا تھا کہ وہ کسی نہ نظر میں آنے والے وجود کے ساتھ موجود ہے۔ سب اسے بہت فرصت سے دیکھ رہے تھے اور کوئی یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ رقص روک دے۔ ایسے رقص قسمت سے ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ سب نے اپنی حرکات کو جامد کر لیا کہ مبادا کوئی آواز ہو اور وہ چونک جائے۔

کچھ دیر گزری' اس نے آنکھیں کھولیں۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کیا کرتی رہی ہے' لیکن وہ شرمندہ نہیں ہوئی بلکہ وہ مسکرائی جیسے "ملاقات محبوب" تمام ہوئی۔۔۔ بخوشی گئی اور وہ ڈانس فلور سے ہٹ گئی۔

وہاں موجود ایک شخص اس کی کیفیت کو سمجھنے کا دعوا کر سکتا تھا۔ وہ شخص عالیان تھا۔ کچھ دن پہلے وہ کیفے کے اسٹور میں آیا تھا اور اسٹور میں آ کر باہر جانا بھول گیا تھا۔ وہ فرش پر بیٹھ گیا اور کتنا ہی وقت گزار دیا وہ تب چونکا جب اس کا فون بجا۔ ویرا نے اسے کچھ نوٹس کے بارے میں پوچھنے کے لیے فون کیا تھا۔

ویرا کی آواز اسے واپس لے آئی اور وہ اس سے خائف نہیں ہوا۔ ویرا سے زیادہ سمجھ دار لڑکی اس نے اب تک نہیں دیکھی تھی۔ اس کا دل بہت بڑا تھا۔ وہ جلد برا نہیں مانتی تھی۔ اس کی باتیں سننے میں مزا آتا تھا۔ اس کے ساتھ چلتے اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ دل دکھانے والوں میں سے ہرگز نہیں تھی' اس نے ایک بار اسے بادام کیک بنا کر کھلایا تھا اور وہ بے چاری خاموشی سے کھا گئی تھی۔ بچے ہوئے آخری ٹکڑے کو کھانے پر عالیان کو معلوم ہوا کہ اس نے اس سے بدمزہ کیک ساری زندگی نہیں بنایا ہو گا۔

اور امرحہ نے بادام کیک بنانا سیکھ لیا تھا۔ اس نے وہ کیک سادھنا کے لیے بنایا تھا اس کی سالگرہ کے لیے۔

سادھنا اس کا اتنا خیال رکھتی تھی اسے بھی کچھ اس کے لیے کرنا چاہیے تھا۔ ویرا نے اخبار کے دفتر با قاعدہ جاب کرلی تھی اور وہ کافی مصروف رہنے لگی تھی۔ امرحہ کا خیال تھا ویرا ایک بہت اچھی صحافی بن سکتی ہے۔ ویرا اسے اپنے آفس بھی لے کر گئی تھی اور وقت نکال کر وہ اسے اپنی سائیکل پر بٹھا کر مانچسٹر گھماتی رہتی تھی اور ایک بار وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چہل قدمی کرنے لگی۔

امرحہ کا دل افسوس سے بھر گیا۔ سائی ٹھیک کہتا ہے۔ سب اس کے ساتھ کتنے اچھے ہیں یہ وہ اندازہ بھی نہیں کر سکتی اور اگر وہ ویرا کو بتادے کہ عالیان اس کے لیے کیا ہے تو ویرا شاید بہت آرام سے عالیان کو پہچاننے سے ہی انکار کر دے۔ لیکن اب اس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی تھی۔

عالیان کے باپ کی آمد سے ویرا واقف ہو چکی تھی لیکن اسے کسی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ امرحہ نے وہ سب کیا تھا۔ اسے بہت اوپر اوپر کی عام سی باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ سادھنا، کارل، سائی، لیڈی مہر کسی نے دوبارہ کسی کے سامنے بھی اس واقعے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ عالیان امریکہ گیا تھا تو ویرا کو ہی معلوم تھا کہ وہ ماما مہر کو لے کر شارلٹ کے گھر گیا تھا۔

عالیان اور ولید البشو کی ملاقات کیسی رہی۔ اس نے یہ بھی معلوم کرنا نہیں چاہا تھا۔ لیڈی مہر نے بس اسے اتنا کہہ دیا تھا کہ وہ عالیان سے اس بارے میں کوئی بھی بات نہ کرے اور اس نے ایسا ہی کیا۔

☆ ☆ ☆

ویرا سے بہت کم ملاقات ہو پاتی تھی اس کی۔ رات کو وہ بہت دیر سے واپس آتی اور یونی میں وہ اس کے ڈیپارٹمنٹ جا نہیں سکتی تھی۔ ویرا کی اسٹڈی ٹف تھی تو اسے لائبریری سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔

امرحہ نے پہلی بار کے تجربے کے بعد وقت سے پہلے اپنی اسائنمنٹ بنانا سیکھ لیا تھا۔ ویسے بھی اس کے پاس پڑھنے کے علاوہ اور کام ہی کیا تھا۔ یونی میں اس کے بہت سے دوسرے ڈیپارٹمنٹس کے دوست اسے ڈھونڈتے اس کے پاس آتے کہ وہ کہاں گم ہے، نظر کیوں نہیں آتی اور اس کے ایشین فلیگ نے لہرانا کیوں چھوڑ دیا ہے۔ اور اس کی سائیکل کسی کو آج کل گرا کیوں نہیں رہی۔ اور اب ریس کب ہوگی کارل کے ساتھ۔ بلکہ اب تو فٹ بال میچ ہونا چاہیے۔

کارل کے ساتھ اس کی سائیکل ریس اتنی مقبول ہوئی تھی جیسے اس نے ورلڈ سائیکلسٹ کا میڈل جیت لیا ہو۔ بہت بڑی تعداد آئی تھی اسٹوڈنٹس کی ریس دیکھنے۔ وہ سب امرحہ کو سپورٹ کرنے آئے تھے۔ اتنی اہم تھی امرحہ ان کے لیے۔ اور اب بھی وہ اسے اپنی پارٹیز میں بلانا نہیں بھولتے تھے۔ دائم نے نوال کی برتھ ڈے پارٹی پر اسے بلایا، لیکن وہ بار بار کے اصرار پر بھی نہیں گئی۔

اخبارات میں ویرا کے آرٹیکلز دھڑا دھڑ آ رہے تھے۔ وہ ان آرٹیکلز کو پڑھتی اور ان کے تراشے کاٹ کر اس نے ایک فائل بنانی شروع کر دی۔ اسے یہ سب پاکستان اپنے ساتھ لے کر جانا تھا۔ اب حقیقت میں وہ ویرا کو اپنے دل کے بہت قریب محسوس کرتی تھی۔ ایک ایسی دوست جو اسے اب تک کی زندگی میں نہیں ملی تھی۔ اس نے کارل کو پھرا لگوایا کہ امرحہ ہر حال میں جیت جائے۔ ویرا کے لیے اس کی جیت اتنی خاص تھی۔ وہ فہرست بناتی تو تھک جاتی۔ جو جو کچھ ویرا نے اس کے لیے کیا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ روس لے جانا چاہتی تھی اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی۔ اور امرحہ واقعی میں اب اس کی مٹھی میں بند ہو جانا چاہتی تھی۔

"اختتام" وقت کا ہو یا کسی عمل کا۔ کتنا بھی خوشگوار ہو دکھی کر جاتا ہے۔ کسی بھی چیز کا ختم ہو جانا دل پر آری چلا جاتا ہے۔

سب ختم ہو رہا تھا۔ سب۔

فارغ وقت میں وہ البم بناتی رہتی۔ کارل، ویرا، سائی اور عالیان کی مختلف تصویریں کاٹ کاٹ کر چپکاتی

رہتی' ساتھ ان کی کہی باتیں لکھتی جاتی۔ ایما برتھ ڈے پارٹی کی جتنی تصویریں یونی میں پھیلی تھیں وہ سب اس نے حاصل کرلی تھیں۔ ہال میں ہونے والے "ایما برتھ ڈے پارٹی" ڈرامہ کی تصویریں بھی اسے مل گئی تھیں' جس میں عالیان ایما کا باپ بنا تھا' سائی ایما کی ماما اور شاہ ویز ایما اور وہ سب کارل پر قہر بن کر برس رہے تھے اور باقی ہال میٹس ہنس ہنس کر مرنے کے قریب ہو گئے تھے۔

اس نے اس البم میں اپنا سارا جہان سمیٹ لیا۔ وہ اسے دیکھ دیکھ کر ہنستی اور روتی رہتی۔ وہ ان سب کو اپنے سینے سے لگا کر رکھنا چاہتی تھی۔ اس کا دل ان سب سے آباد رہنے والا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہنے والے تھے۔

لیڈی مہر کو کہانیاں سنانا بھی اس نے بند نہیں کیا تھا۔ اسے آخر کار خود سے کہانی بنانا آ گیا تھا۔ اس نے اپنے خاندان کی پسند کی شادی کرنے والوں کے قصے کہانی بنا کر سنا دیے' جسے بہت پسند کیا گیا۔ این البتہ درمیان میں بہت سوال پوچھتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر لڑکا لڑکی شادی کرنا چاہتے ہیں تو فلاں ماموں کو کیوں مسئلہ ہے' یا فلاں تایا جی یا دادی جی یا ابا جی کو۔ اور آخر پھوپھو جی اپنی بیٹی کی شادی کسی اور لڑکے سے کیوں نہیں کر دیتیں اسی ایک لڑکے سے کیوں۔ اور خالہ جی نے شادی میں نہ آنے کی دھمکی کیوں دی اور آخر اس بات کا کیا مطلب ہے کہ "تم آج سے ہمارے لیے مر گئے۔"

نشست گاہ میں آتش دان کے پاس ویرا کے علاوہ وہ سب ہوتے۔ کرسمس آنے والی تھی تو وہ لیڈی مہر کے بچوں اور ان کے بچوں کے لیے تحائف بھی پیک کرتے جاتے۔ ایک پہاڑ تھا تحائف کا جو انہیں پیک کرنا تھا۔ وہ اور سادھنا مل کر ان تحائف کی خریداری بھی کرتے جو لیڈی مہر کو بہت پسند آئے۔

عالیان جاب پر جانے سے پہلے گول دائرے کی صورت سائیکل چلاتا ہی جاتا' چلاتا ہی جاتا' خود کو چکروں میں لے لیتا' اسے ایسا کرتے دیکھ کر چکر آنے لگتے لیکن وہ باز نہ آتا۔

کارل اور وہ ایک ساتھ واپس آتے اور کسی نہ کسی ہال میٹ کے کمرے میں گھس جاتے' پیزا منگواتے' فلم دیکھتے اور دو گھنٹے سو کر یونی آ جاتے اور کلاس میں اپنی آنکھیں بمشکل کھولتے پائے جاتے اور ایسے ہی وہ اونگھ رہے تھے کہ شاہ ویز نے دونوں کے ناک کے نتھنوں میں دو عدد پنسلیں اڑس دیں اور تصویر کھینچ کر The Tab Manchester میں بھجوا دیں۔

امرحہ نے وہ تصویر دیکھی تو بے اختیار ہنس دی اور تصویر کو محفوظ کر لیا۔

دوسری طرف عالیان نے خوب جم کر خریداری کی چھٹیوں میں ٹور پر جانے سے پہلے۔

"تم کتنا بدل گئے ہو' کتنی فضول چیزیں اٹھا لائے ہو؟" سائی نے اس کی خریداری دیکھ کر کہا۔

"ہاں۔ تاکہ اگلی بار اگر ولیر مجھے دیکھے تو اسے یہ نہیں لگنا چاہیے کہ میں بک سکتا ہوں کیونکہ شاید میں نے حسرت زدہ زندگی گزاری ہے۔"

"چیریٹی کے لیے فضول خرچی نہیں کرتے تھے۔ نیکی کرتے تھے' صرف ایک انسان کو دکھانے کے لیے فضول خریداری کر رہے ہو۔ پیسے ضائع کر رہے ہو۔" سائی نے تاسف سے کہا۔

نئی خریدی گئی شرٹس کو اپنے ساتھ لگا لگا کر دیکھتے عالیان کے ہاتھ رک سے گئے۔

"میں بہت برا ہو گیا ہوں۔ ولید البشو جیسا...؟" سنجیدگی سے وہ پوچھ رہا تھا۔

اس کے سوال پر سائی سہم کر اسے دیکھنے لگا۔ "تم کیا کیا سوچنے لگے ہو عالیان۔" اس نے نرمی سے کہا۔

کارل آیا ساری خریداری کو دیکھا' دو شرٹس اٹھائیں' ایک جوڑا جوتے' ایک ہڈ اور اپنے کمرے کی طرف یہ کہتے بھاگ گیا۔ "کرسمس کا گفٹ میں الگ سے لوں گا۔"

"کرسمس۔"

کرسمس کی چھٹیوں سے چند دن پہلے فٹ بال میچ کی دھوم مچی اور کافی زور و شور سے اس سے متعلق خبریں

سنی گئیں۔ فریشر اور عالیان‘ کارل کی دو ٹیموں کے درمیان میچ تھا آپس میں انہوں نے انعامی رقم بھی طے کی تھی۔

کارل امرحہ کے پاس آیا ”ہمارا میچ ہے۔ ٹیم کا حصہ بننا ہے تمہیں۔“

”مجھے کھیلنا آتا ہے نہ مجھے اس میں دلچسپی ہے۔“

”تمہیں صرف بھاگنا ہے... برف پر بھاگ تو لو گی نا... ورنہ گرتی رہنا... گول کرنے کی ضرورت نہیں نہ ہی ڈیفنس کی... تم بہت انجوائے کرو گی امرحہ... میرا خیال ہے تمہیں مجھے فوراً ”ہاں“ کہہ دینی چاہیے۔“

”میرا نہیں خیال۔“ وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کی دیوار کے ساتھ پشت ٹکا کر کھڑی تھی۔

”دیکھنے آؤ گی؟“ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”نہیں۔“ وہ بلاوجہ کتاب کا کونا مروڑنے لگی۔

”تمہیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہم کبھی دوست رہے ہیں۔“

”یاد ہے سب اور یہ بھی کہ وہ سب کبھی تھا۔“

”میں تمہیں برف میں دبانا چاہتا ہوں۔“

”مجھ میں برف میں دبنے کی اب طاقت نہیں رہی... تم مجھے زمین میں دفنا سکتے ہو۔“

”آخر یونیورسٹی کی ہر لڑکی مجھ سے دور کیوں بھاگتی ہے؟“ اس نے اس کی آخری بات کے اثر کو زائل کرنا چاہا۔

”آخر تم ہر لڑکی کو دور کیوں بھگا دیتے ہو؟“

”اتنا اچھا تو ہوں میں...“ اس نے منہ سے لٹکا لیا پھر ایک دم سے ہنس کر بولا۔

”اب تو آؤ گی نا؟“

امرحہ نے ناں میں سر ہلایا ”تمہاری آفر کا شکریہ لیکن میری طرف سے معذرت۔“

”تم ایک الجھا سوال لگنے لگی ہو... بالکل عالیان کی طرح۔“ چڑ کر کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

”عالیان!“ اس نے اس نام کی سرگوشی ایسے کی جیسے کوئی جرم کر رہی ہو۔ کارل کو جاتے دیکھ کر اس کا دل چاہا کہ اس کے پیچھے جائے‘ وزنی فائل اس کے سر پر دے مارے اور کہے ”ہاں بڈی میں ضرور کھیلوں گی ہم فریشر کو ہرا دیں گے۔“ لیکن وہ یہ نہ کر سکی۔

ویرا نے بھی اسے منانا چاہا میچ کے لیے‘ لیکن اس نے طریقے سے اسے منع کر دیا۔ این گئی تھی اور اپنے موبائل سے اسے میچ دکھا رہی تھی۔ اس میچ کی دھوم مچی تھی۔ وہ برف پر بھاگ رہے تھے‘ گر رہے تھے‘ لڑ رہے تھے‘ ایما بھی فریشر کی ٹیم کا حصہ تھی اور کارل نے اتنی بار اسے برف پر گرایا کہ بے چاری کے منہ سے خون نکلنے لگا اور وہ فرسٹ ہاف سے پہلے ہی میچ چھوڑ کر چلی گئی۔

تینوں گول عالیان نے کیے تھے اور وہ برف پر ایسے بھاگتا رہا جیسے زمین کو روند ڈالنا چاہتا ہو اور فٹ بال کو اس نے ایسے پیروں سے نشانے پر رکھ رکھ کر اچھالا جیسے سنگ باری کر کے کسی کو مار ڈالنا چاہتا ہو۔ عالیان‘ کارل کی ٹیم جیت گئی۔

اس رات اسے پھر نیند کی گولیاں کھا کر سونا پڑا۔ اسے عالیان‘ ویرا‘ کارل کے پرجوش نعرے رات بھر سنائی دیتے رہے۔ وہ اپنے دل کے مقام کو مسلتی رہی۔ نیند کی گولیاں بھی نیند لانے میں ناکام ہو گئیں تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اپنے بستر پر اور گہرے گہرے سانس لینے لگی اور میچ کی ریکارڈنگ نکال کر عالیان کو برف پر گرتے‘ اٹھتے‘ فٹ بال کی طرف لپکتے دیکھنے لگی۔ اور اس نے یہ بھی جان لیا کہ اسے اب صرف پڑھنے سے ہی سروکار نہیں رہا... ایک عالیان میں کتنے ہی نئے انسان گھس آئے ہیں۔

اور پھر کرسمس کی چھٹیاں شروع ہو گئیں اور سب جانے لگے۔ مانچسٹر راج ہنسوں سے خالی ہونے لگا۔

”ہمارے ساتھ چلو امرحہ!“ سائی نے اس کی منت کی۔

”مجھے نہیں جانا‘ دادا نے منع کیا ہے۔“

”تم جھوٹ بول رہی ہو...“

”ہاں... پھر سچ یہ ہے کہ مجھے نہیں جانا۔“ اس نے بے تاثر انداز میں کہا۔ جسے دیکھ کر سائی افسردہ سا ہو کر خاموشی سے چلا گیا۔

ویرا نے بھی اسے ساتھ چلنے کے لیے کہا کہ ان چھ لوگوں کا گروپ جا رہا ہے وہ بھی چلے 'لیکن اس نے بہت عام سے انداز میں پڑھائی کا بہانہ بنا کر ٹال دیا۔

"پھر تو یہ موقع نہیں ملے گا نا امرحہ 'ایک ساتھ ہونے کا شاید یہ آخری چانس ہے۔" اس نے ویرا کو مسکرا کر دکھا دیا لیکن ساتھ پھر بھی نہیں گئی۔

عالیان 'کارل 'سائی 'ویرا 'شاہ ویز اور ان کا کوئی دوسرا مشترکہ دوست مل کر جا رہے تھے لیڈی مہر نے سائی کو بلا کر ہدایات دی تھیں کہ ہر وقت عالیان کے ساتھ ساتھ ہی رہنا ہے۔

اسے ان سب کے جانے کا انتظار تھا۔ اسے ایک اہم کام کرنا تھا جس کا موقعہ پھر کبھی نہیں ملنا تھا اور جب وہ سب چلے گئے تو وہ یونی آگئی۔

☆ ☆ ☆

"برف جدائی کی پیامبر ہے یہ بہار کے درمیان حائل ہے۔

آسمان سے یہی پیامبر نازل ہو رہا ہے۔"

کسی دل گرفتہ پری کی فراق دیدہ انگلیوں سے نکلتے بربط کے ساز کی مانند دھند اپنی دلربائی کے قصے بیان کرنے سے زیادہ فراقیہ قصوں پر رونے پر قائل تھی۔

وہ جیسے ہی یونیورسٹی کی سڑک پر آئی۔ دھند نے درد مینا کی طرح اس سے لپٹ جانا ضروری سمجھا۔

وہ بزنس ڈیپارٹمنٹ نہیں جا سکی تھی 'وہ اس کی بیرونی دیواروں کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ اور ان دیواروں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے جن کے پاس 'جن کے ساتھ وہ لگ کر کھڑا ہوا کرتا تھا۔ اس نے ساری دیواریں چھوڑ ڈالیں اور وہ ان درختوں کے پاس آگئی جن کے قریب وہ کھڑے ہوئے تھے۔ اس حصے میں جہاں کبھی وہ بیٹھے تھے۔ ان کونوں میں جہاں بیٹھ کر وہ کتاب پڑھا کرتا تھا اور کافی پیتا تھا۔

وہ نگاہوں سے ان جگہوں کی نظریں اتار رہی تھی۔ اب اسے ڈر نہیں تھا کہ کوئی اسے دیکھ لے گا اس لیے اس نے اپنے گیلے گال صاف نہیں کیے۔ جب سے اس نے اسے تھپڑ مارا تھا اس نے اسے فاصلہ رکھ کر بھی نہیں دیکھا تھا' اس سے بات نہیں کی تھی۔ ہسپتال میں وہ سر جھکائے بیٹھی رہی تھی۔ یہ سب اس عہد کا حصہ تھا جو اس نے خود سے کیا تھا کہ وہ اسے اور تکلیف نہیں دے گی۔ لیکن اپنے لیے وہ اور تکلیف اکٹھی کرنے یہاں اس کے تصورات سے لپٹنے آگئی تھی۔

سفید مانچسٹر میں خون آلود یادیں اپنی بنیادوں سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور زندگی نے اس کے اشکوں پر ترس کھا کر پیچھے کی طرف اپنی سواری موڑلی۔

تان سین نے چراغاں کرنے کے لیے دیپک راگ کی چوکڑی جمائی۔

سفید دھند میں جگنو ٹمٹمانے لگے اور آسمانی مرغولوں کو چاک کرتا عالیان اس کی طرف بڑھنے لگا۔۔۔ دائیں سے۔۔۔ بائیں سے۔۔۔ آگے سے۔۔۔ پیچھے سے۔۔۔ ہر طرف سے 'لیکن اب اسے اس سے بھاگنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ تو چاہتی تھی وہ اس کی طرف آئے اور وہ آ رہا تھا۔

"جو حقیقت میں واقع نہ ہو سکے وہ قرب کی چاہ واقع کروا لیتی ہے۔"

وہ ایڑی کے بل گھوم گئی اور اس نے ہر طرف سے اسے اپنی طرف آنے دیا۔ اسے اس خواب کے سراب ہونے پر کوئی اعتراض نہ ہوا۔

"عالیان۔" اس نے سرگوشی کو جھٹکا اور آواز کو بلند ہو جانے دیا۔

وہ یونی محراب کے پاس تھی۔ اس محراب کے ساتھ وہ کمر ٹکا کر اس کا انتظار کیا کرتا تھا۔ اس نے اس مقام پر اپنے گال رکھ دیے اور دونوں ہاتھوں سے اس جگہ کو تھام لیا۔

بے اختیاری 'بے خودی کی ہم جولی ہے اور یہ دونوں ہم جولیاں "محبت" کی صفوں میں اول ہیں۔

اس کی بے اختیاری نے اس کی خوشبو کو جا لیا اور بے خودی اس خوشبو میں جھومنے لگی۔ ایک بچہ اپنی ماں کو نظم سناتا ہوا فٹ پاتھ سے اس کے پاس سے گزرا

اس نے اپنی حالت میں پھر بھی تبدیلی نہیں کی۔ کچھ وقت ایسا ہی گزر گیا۔

ارواح سے مبرا ہستیوں نے جانا کہ "محبت کی عبادت" کی جارہی ہے۔

پھر وہ اسی کے انداز میں کمر کو ٹکا کر ایک ٹانگ کو ترچھی کر کے کھڑی ہو گئی۔ زندگی کی سواری نے ان سب یادوں کو اس کے پاس اتارنا شروع کر دیا جو مطلق العنان بنی اس کی ذات پر حکمرانی کرنے پر نازاں تھیں۔

"تمہیں بات کرنے کی تمیز سیکھنی چاہیے۔"

"تمہیں تھکن اتارنے کی مشق کرنی چاہیے۔"

وہ اپنی مرضی سے ایک ایک منظر کو بار بار دہراتی رہی۔

"لاہور خالی ہو چکا ہے۔۔۔ اس کے پاس سب نہیں رہا۔۔۔ تم تو یہاں ہو۔"

"امرحہ! دیکھو میں تمہارا چیلنج قبول کرتا ہوں۔"

وہ قلابازیاں لگا رہا تھا۔ محراب کے ساتھ ٹکی کھڑی امرحہ اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

"میں سارا مانچسٹر اکٹھا کرلاؤں گا۔" وہ ہاتھ سینے پر باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

"جاؤ کر لاؤ۔" امرحہ اسے جواب دے رہی تھی۔

"ان کے ہاتھ میں بورڈز ہوں گے۔"

"ضرور ہونے چاہئیں۔" وہ پورے دل سے مسکرائی۔

ساری ڈریگن پریڈ محراب کے سامنے سجی کھڑی تھی اور اس میں وہ مسکراتی ہوئی کھڑی تھی۔

"ایک بورڈ تم بھی تیار رکھنا۔" اس نے اس کے گال چھو کر کہا۔

"وہ تو میں نے کب سے تیار کر لیا۔" کہہ کر وہ پریڈ میں بھاگ گئی اور وہ اس کا نام لیتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگنے لگا اور پیچھے سے اس کا بازو پکڑ کر اسے روک لیا۔

"مجھ سے شادی کرو گی امرحہ؟"

دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ساری پریڈ ان کے گرد اکٹھی ہونے لگی۔ سارا ہجوم ان دو کے گرد سمٹ آیا۔۔۔ چینی ساختہ ڈرموں کی قطاریں سجا دی گئیں اور سرخ لباس پہنے لڑکوں نے ڈرم اسٹک کو ہوا میں بلند کر لیا۔

"ہاں۔" اس نے وہ مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجا لی جو تاعمر نہیں بجھنے والی تھی شاید، سرخ لباس والوں نے اپنے اٹھے ہاتھوں کو ڈرموں پر بے قابو ہو جانے دیا۔ رنگ پھیل گئے۔۔۔ خوشبو بکھر گئی۔۔۔ چراغ جل اٹھے۔۔۔ دن سج گیا۔۔۔ بہار نکل آئی۔ ایک امرحہ اور ایک عالیان کے گرد ساری پریڈ دائرے میں چکرانے لگی۔۔۔ تو ان کی بہار کا ماخذ وہ تھے۔۔۔ ہاں اس بار ان کی بہار کا ماخذ وہ تھے۔۔۔ مشرق کی سندری اور عرب کا سلطان۔

امرحہ نے ہاتھ پھیلائے اور کچھ برف اس میں اکٹھی کی اور اس مٹتے بنتے ہیولے کی طرف اچھال دی جو وہاں نہیں تھا اور صرف وہاں ہی تو تھا۔

"تم اتنی دیر سے آئے عالیان۔۔۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ کھڑا کر لیا اور وہ کھڑا ہو گیا۔

"کیا تم میرا انتظار کر رہی تھیں؟" اس کی ٹھوڑی کو چھو کر اس نے شرارت سے پوچھا۔

"کیا نہ کرتی؟" ہونٹ کا کونا دانت میں دبا کر اس نے کہا۔

"میں ایک برا انسان ہوں میں نے تمہیں انتظار کروایا۔"

"دیکھو عالیان! تمہارا مانچسٹر برف میں ڈوب رہا ہے۔" اس سفید مانچسٹر کی طرف ہاتھ کیا۔

"دیکھوں ذرا۔۔۔ میرے مانچسٹر کو کون دیکھ رہا ہے۔" اس نے دو انگلیوں سے اس کی ناک پکڑ لی۔

"مجھے امرحہ کہتے ہیں۔ کون نہیں۔" اپنی ناک چھڑوا کر اس نے اس کی ناک موڑ کر کہا۔

"کیا میں تمہارے لیے برف اکٹھی کر دوں امرحہ؟" اس نے اس کے منہ کے سامنے آکر پوچھا۔ ان دونوں کی آنکھوں نے طویل سفر طے کیا جس کے کبھی نہ ختم ہونے کی دعائیں کی جاتی ہیں۔

"برف کیوں؟"

"تاکہ تم اس سے اپنی پسند کا گھر بنالو۔۔۔ بلکہ آؤ چلو یہاں بیٹھ کر گھر بناتے ہیں۔" اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ اسے برف کے ڈھیر کے پاس لے جانے لگا۔

"نہیں عالیان ' تم یہاں میرے پاس کھڑے رہو ' کہیں مت جاؤ ' وعدہ کرو۔ کہیں نہیں جاؤ گے۔۔۔؟
اس کی آواز میں سارا ایچا کھچا درد سمٹ آیا۔

دونوں ایک ساتھ جڑے محراب میں دبکے تھے۔
ان کے سر ایک دوسرے سے مس ہو رہے تھے اور دائیں ہاتھوں کی ہتھیلیاں اپنی لکیروں سمیت ایک دوسرے میں مدغم ہوئی تھیں۔

"نہیں جاؤں گا۔" اس نے اس کے گال پر پھونک ماری۔۔۔ اور۔۔۔

عرب کی ریت نے اڑ کر آمنہ کی پیشانی کا بوسہ لیا ۔۔۔ سیاہ چغے میں لپیٹے ' آنسوؤں سے بھیگے چہرے کو اس نے زمین پر سجدے کے لیے تیار کیا۔ وہ محمد بخش کے لیے خدا سے اس کی ساری رحمتیں مانگنے والی تھی۔۔۔ اور پھر وہ خود کو خدا کے حوالے کر دینے والی تھی۔۔۔ آمنہ ایک درویش صفت عورت۔۔۔ اس مرد سے دستبردار ہونے جا رہی تھی جس سے وہ وابستہ ہوئی تھی۔

اس نے آنکھیں بند کیں اور ان آنکھوں کے پردوں پر محمد بخش کو پایا اس نے آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔۔۔ عالیان نے امرحہ کی۔۔۔ "اگر میں برف ہوتی تو تمہارے قدموں پر گرتی۔۔۔"

"تم برف ہوتیں تو میں بھی برف ہوتا۔۔۔ مجھے وہی ہونا ہے جو تمہیں ہونا ہے امرحہ۔" اس نے دونوں ہتھیلیاں اس کے گالوں پر رکھ کر کہا۔

وہ ہنسنے لگی۔۔۔ "یارم۔۔۔ یارم۔" وہ گنگنانے لگی۔
"مجھ پر جو راز کھولا گیا ہے وہ تم ہو امرحہ۔" ناک پھر اس کے ہاتھ میں تھی۔

"کیسا راز؟"

"یہی کہ زندگی کیا ہے۔۔۔ زندگی امرحہ ہے۔"
وہ ہنسنے لگی اور اس نے اپنا سر دیوار کے ساتھ جڑ دیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرانے لگی۔۔۔ اور۔۔۔

پھر اسے آنکھیں کھول دینی پڑیں اور ان کی نمی کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرنا پڑا۔ وہاں کھڑے کھڑے اسے کئی پہر بیت چکے تھے پھر بھی وہ وہاں تا عمر کھڑی رہنے پر بضد تھی۔

اور یادوں کے ریوڑ پر ہنٹر مارے گئے اور وہ لاپتہ ہونے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے۔۔۔ زندگی اپنی سواریاں لیے آگے دوڑ گئی۔

دادا نے اس کی منت کی کہ وہ بھی کہیں گھومنے کے لیے چلی جائے ' اور خود کو مانچسٹر کے طلسم سے دور لے جانے کی ایک کوشش اس نے بھی کر دیکھی اور سامان باندھ کر این کے پیچھے فرانس چلی گئی۔ اس کے ساتھ گھومنے کی کوشش میں مصروف رہی اور نئے سال کے آغاز پر ایفل ٹاور سے جنم لیتے جشن کو غیر دلچسپی سے دیکھتی رہی۔

اسے وہاں موجود مجمع کے وہاں موجود ہونے کی قطعاً" سمجھ میں نہیں آئی اور نہ ہی اس بات کی کہ وہاں اتنا شور ہنگامہ کیوں تھا اور ساری دنیا کی آتش بازی جو ایفل کے جسم سے پھوٹ رہی تھی وہ کسے اور کیوں اچھی لگ رہی ہے۔۔۔ ایک دوسرے کو کندھوں پر اٹھائے وہ کیوں ناچ رہے ہیں۔۔۔ وہاں کیا تھا جو اتنا اچھا تھا کہ وہ سب اپنی نظریں ہٹانے کے لیے تیار تھے نہ مسکراہٹ کے لیے۔

امرحہ نے بے بسی سے اپنی ہتھیلیاں مسلیں "یہ سب اتنے خوش کیوں ہیں؟"

مبہوت کر دینے کو کوئی منظر تیار نہ ہوا۔۔۔ دیوانہ بنا ڈالنے پر کوئی عالم قادر نہ رہا۔۔۔ بے مثال عجائبات اپنی "مثال" کھونے لگے۔۔۔ فراق یار نے سب ماند کر ڈالا تھا ۔۔۔

عالیان نے میڈرڈ کے آسمان پر بنتے مٹتے آتشی رنگوں کے جلوؤں پر نظریں گاڑنی چاہیں اور وہ ایسا کرنے میں ناکام رہا۔ اس پر تھکن سی سوار ہو گئی جبکہ ابھی تو رات شروع ہوئی تھی۔ اس کے آگے کھڑے کارل ' ویرا اور سائی اچھل کود کر رہے تھے اور وہ بے بسی سے کھنڈر کھنڈر سا ادھر ادھر کچھ تلاش کر رہا تھا۔

سب سے نظریں بچا کر اس نے کہیں دور نکل جانا چاہا۔

"کہاں جا رہے ہو عالیان؟" ویرا نے پوچھا۔

"میں کچھ کھانے کے لیے لینے جا رہا ہوں۔۔۔ بس ابھی آیا۔" اس نے جھوٹ بولا اور تیزی سے ہجوم میں خود کو گم کر لیا کہ ویرا اسے لپک کر آنہ لے۔ وہ چلتا رہا چلتا رہا اور میڈرڈ کے ایک گم نام سے چھوٹے سے کیفے میں بیٹھ گیا۔

وہ کافی کی کتنی پیالیاں پی چکا تھا وہ گنتی بھول چکا تھا اس نے اپنا سر لکڑی کی میز پر رکھا تھا اور نظریں گلی میں ساز بجاتے اس نوجوان پر ٹکا دی تھیں، جس کے سامنے کئی بچے اور بوڑھے ناچ رہے تھے۔

"اتنے بھدے ساز اور آواز پر یہ سب کیسے ناچ سکتے ہیں اور آخر وہ کیا وجہ ہے جو انہیں ایسے ناچنے پر مجبور کر رہی ہے۔" وہ سوچنے لگا۔

ساز کا تار ٹوٹا اور اسے ایک تھپڑ کی گونج سنائی دی۔

"بہت محبت کرتی ہوں میں تم سے۔۔۔"

اچھا تو ساز اس لیے رکا۔۔۔ اور تار یوں ٹوٹا۔

اس نے میز پر پڑے اپنے سر کا رخ بدل لیا اور اس بار اس کی نظر ایک ٹوٹے ہوئے لیمپ پوسٹ پر جا ٹھہری۔۔۔ جو کبھی روشن ہوتا ہوگا۔

☼ ☼ ☼

ویرا کو جب اس کے فرانس جانے کا معلوم ہوا تو وہ بہت خفا ہوئی۔

"تم میرے ساتھ کیوں نہیں گئیں؟" وہ بہت سخت ناراض تھی۔

"تم نے فرانس نہیں جانا تھا اور مجھے فرانس دیکھنا تھا۔" وہ اپنے کپڑے الماری میں رکھ رہی تھی۔

"تم کہتیں تو ہم فرانس چلے جاتے، تم نے تو کہا کہ تمہیں جانا ہی نہیں ہے۔"

"تم تین چار بار فرانس جا چکی ہو، میرے ساتھ پھر سے جاتیں تو تمہارا ٹور خراب ہو جاتا۔"

"تمہارے ساتھ ہوتی تو اس بار فرانس دیکھنے کا مزا آجاتا۔" ویرا نے منہ پھلا لیا۔

سائی اس سے اتنا ناراض ہو گیا کہ خفگی کی زیادتی سے اس سے بات ہی نہیں کی۔

"امتحانات شروع ہو گئے۔"

امتحانات کی تیاری کے لیے وہ علی لرننگ نہیں گئی۔ اس نے گھر میں ہی تیاری کر لی اور دل لگا کر پڑھنے کی کوشش کی تاکہ اس کا رزلٹ اچھا رہے۔ سب کتابوں میں گم ہو گئے، کارل تک صرف لائبریری میں پایا جاتا البتہ ایما کو علی لرننگ میں زوردار کرنٹ کا جھٹکا دے کر اسے فلور پر لڑکھڑا کر اس نے اس کے دائیں ہاتھ میں فریکچر کروا دیا اور کوئی ایک بھی زندہ یا مردہ ثبوت نہ چھوڑا جو یہ ثابت کر سکتا کہ یہ سب اس نے کیا ہے۔ ایما نے انگوٹھی اس کے منہ پر دے ماری تھی۔ وہ اسے ہی اٹھا کر کہیں دے مارنا چاہتا تھا۔

عالیان کبھی کبھی علی لرننگ کے ہال میں ایسے ہی گشت کرتا پایا جاتا تو کارل اسے گھسیٹ کر اسٹڈی روم میں لے جاتا یا کبھی دور سے ہی چلاتا۔

"تمہارا دماغی توازن ٹھیک ہو جائے تو اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ جانا۔" امتحانات ہو گئے۔۔۔ رزلٹ بھی آ گیا۔

"چوتھا اور آخری سمسٹر شروع ہو گیا۔"

وقت نے اپنی طنابیں ڈھیلی چھوڑ دیں اور وہ خلاف توقع سست روی سے گزرنے لگا۔ زندگی ایسی اداکارہ بن گئی جو میک اپ اتارے اگلا سوانگ رچانے سے پہلے پرسکون بیٹھے رہنے کی کوشش کر رہی ہو۔۔۔ اس کے ہاتھ گود میں ہوں اور وہ بے بڑی بے دردی اور بے حسی سے اپنا دھلا چہرہ آئینے میں دیکھ رہی ہو۔

شٹل کاک میں لیڈی مہر کے ایک ساتھ چار بچے آ گئے تھے۔ ڈینس اور مارک دو دن رہ کر چلے گئے جبکہ شارلٹ اور مورگن رہ گئیں۔

"جورڈن آیا ہے؟" این نے شارلٹ سے ملتے ہی پوچھا۔

"نہیں۔" شارلٹ پوری جان سے قہقہہ لگا کر ہنسی۔

ویرا کو عالیان کی فیوچر وائف کی حیثیت سے لیڈی

مہر نے ان سے ملوایا۔ ہفتے کے دن شارلٹ اور مور گن عالیان کو ساتھ لے کر اپنی اپنی سائیکلوں پر مانچسٹر کی سڑکوں پر گھومتے رہے تھے اور ان دونوں نے عالیان کی جیب میں ایک پونڈ نہیں رہنے دیا۔ ان تینوں کی آپس میں اچھی دوستی تھی اور وہ رابطے میں رہتے تھے۔

"تم مانچسٹر میں شادی کرو گے یا روس میں؟" ریسٹورنٹ میں ڈنر کرتے شارلٹ نے آنکھ مار کر پوچھا۔

"مجھے ہمیشہ یہ شک کیوں رہا کہ ماما کے گھر میں ہی تمہاری دلہن موجود ہے۔" مور گن بولی۔

"تم کچھ نیا تو کرتے عالیان؟" شارلٹ کے دانت ہی اندر نہیں ہو رہے تھے۔

"نیا کیا؟"

"یہی کہ تم کودتے پھاندتے۔ چھلانگیں لگاتے' دلہن کے کارندوں کی فوج کو جل دیتے بڑے سے فانوس پر جھول جاتے۔ اور فانوس سے لہرا کر عین اپنی ہیروئن کے سامنے جا کھڑے ہوتے اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھگا لے جاتے۔ پلس اس کی لمبی سفید پوشاک جو اسے ٹھیک سے بھاگنے نہ دے رہی ہوتی تو تم اسے اٹھا لیتے۔"

"تم اتنی فلمیں دیکھنے لگی ہو شارلٹ؟" عالیان نے تاسف سے کہا۔

"تمہیں کیا پتا عالیان کہ ہر لڑکی کے دل میں ایک ایسے ہیرو کی کتنی خواہش ہوتی ہے جو ہر خطرے کو پھلانگتا اسے اڑا لے جائے.... اور دنیا بس دیکھتی رہ جائے۔"

"تو تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں ایک ہیرو مل گیا۔" عالیان ہنس دیا۔

"ہیرو پر فلم کا.... میرا تو وہ صرف شوہر ہے.... ایک گھونسا تک تو وہ کسی غنڈے کو مارنا نہیں چاہتا۔" کہہ کر شارلٹ اٹھی اور اجازت لے کر ہال کے مائیک کے سامنے کھڑی ہو گئی اور عالیان مور گن کو مسکرا کر دیکھا یعنی میں شروع ہونے جا رہی ہوں۔

اس نے مائیک پر کچھ ابتدائی کلمات کہے اور ہال میں بیٹھے ڈنر کرنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا.... اور پھر وہ شروع ہو گئی.... عالیان ویرا کی فرضی داستان عشق سنانے....

"ایک دن ایک لڑکی اپنی ہی دھن میں گنگناتی ہوئی سائیکل چلاتی جا رہی تھی کہ ایک جھلکڑ سے لڑکے کی سائیکل کے ساتھ اس کی ٹکر ہو گئی.... لڑکی ویرا اور لڑکا عالیان۔"

شارلٹ نے ہاتھ اس کی طرف اٹھا کر اشارہ کیا۔ سب گردنیں عالیان کی طرف مڑ گئیں۔ عالیان کو مسکرانا پڑا۔

"یہ ان دونوں کی پہلی ملاقات تھی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ دونوں کی سائیکلوں کی پہلی ٹکر تھی۔ ایک رات ویرا اپنے گھر جا رہی تھی کہ کچھ غنڈے اس کے پیچھے آئے اور انہوں نے اسے دبوچ لیا اور ٹھیک اسی دوران عالیان آیا' جیسا کہ فلموں میں ہوتا ہے۔ کہ ہیرو ٹھیک اسی سڑک اسی گلی سے گزر رہا ہوتا ہے جہاں ہیروئن مصیبت میں گھری ہوئی ہے اور ہیروئن وہ ننھی منی سی بچی سی بن جاتی ہے جو ایک تھپڑ یا گھونسا کسی غنڈے کو نہیں مار سکتی اور عام حالات میں وہ انسانوں کو اٹھا اٹھا کر پٹخا کرتی ہے۔ یعنی وہ جانتی ہے کہ اسے ہیرو کے ہوتے اپنی بہادری نہیں دکھانی ہے۔" آخری جملہ شارلٹ نے سرگوشی صورت ادا کیا' ہونٹوں کے کنارے پر ہاتھ رکھ کر اور ہال میں ہنسی گونج گئی۔

عالیان نے اپنا سر جھکا لیا اور ایک ہاتھ سے آنکھوں پر چھجا بنا لیا "یہ کیا کر رہی ہے شارلٹ۔"

"ماما کا اس کے بارے میں خیال بالکل ٹھیک ہے' جورڈن کی جگہ اسے فلموں میں کام کرنا چاہیے دوسری مسٹر بین آرام سے بن جائے گی۔"

مور گن کے انداز اور الفاظ پر عالیان بلند قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"خدا کے لیے ایسے ہی قہقہے لگاتے رہنا پتا نہیں کیا ہو گیا ہے تمہیں۔" مور گن نے محبت سے اس کی ٹھوڑی کو چھو کر کہا۔

"عالیان نے ویرا کو اٹھایا' اس کی ناک اور پیشانی سے نکلتے خون کو صاف کیا اور اسے گھر تک چھوڑنے اس کے ساتھ گیا۔ جبکہ وہ اسے ٹیکسی بھی کروا کر دے سکتا تھا۔" شارلٹ نے آخری بات پھر سرگوشی صورت کہی۔

"کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے لیکن میں آپ کو کچھ ہائی لائٹس سنا دوں تاکہ آپ کا تجسس برقرار رہے۔ ویرا کو ایک اور لڑکا بھی پسند کرتا ہے' جو اپنے کالج کا باکسر ہے.... جی ہاں باکسر۔ اور عالیان کو ایک امیر باپ کی بیٹی پسند کرتی ہے جو کرائے کے غنڈوں کے ذریعے لوگوں کا حلیہ بگاڑ دینے کو برا نہیں سمجھتی۔"

"تمہیں یاد ہے میری شادی کی پارٹی میں تم نے گانا گایا تھا اور کسی راک اسٹار کی طرح گٹار بجاتے رہے تھے۔ جوش نے میرے کان میں کہا تھا" عالیان پارٹی میں موجود کسی اور کے لیے یہ پرفارمنس دے رہا ہے' ہمارے لیے نہیں۔"

"لیکن میری شادی میں تو ویرا تھی ہی نہیں۔" مورگن نے گلاس کو منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

"باکسر کو معلوم ہو چکا ہے عالیان کے بارے میں اور وہ اپنے دوستوں کو لے کر یونیورسٹی سے گھر آتے عالیان پر ہلہ بول دیتا ہے.... اور یہاں ایک بھرپور ایکشن سین ہوتا ہے۔"

شارلٹ ساتھ اداکاری کر کے بھی دکھا رہی تھی۔

"اور شارلٹ کی شادی میں ویرا موجود تھی اور میری فرمائش پر بھی تم نے گانا نہیں گایا تھا.... سنو عالیان! کیا تم نے وہ چند فلمیں دیکھی ہیں جن میں عین شادی کے وقت دلہن کئی سو مہمانوں کی موجودگی میں اپنی لمبی سفید فراک سنبھالتی بھاگ جاتی ہے؟؟"

"ہاں.... ایک تو اسپائڈر مین ہی ہے نا" اس نے شارلٹ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"سنو' ہمارے اسپائڈر مین.... مجھے لگتا ہے اس بار دولہا بھاگے گا۔"

"کون...؟"

"تم۔" مورگن نے پورے وثوق سے کہا۔

وہ گردن موڑ کر شارلٹ کو دیکھنے لگا جس کی کہانی اختتامی مراحل میں داخل ہو چکی تھی اور وہ ویرا کو امیر زادی کے غنڈوں سے پٹوا کر ہسپتال میں "کوما" تک لے آئی تھی۔

اس کا انداز ایسا ہو گیا تھا کہ کھاتے کھاتے سب اسے بہت انہماک سے سن رہے تھے۔ چند ایک نے تو کھانا کھانا ہی چھوڑ دیا تھا" ویرا کومے میں تھی نا۔"

شارلٹ کے تو بائیں ہاتھ کا کام تھا بیٹھے بیٹھے کہانی بُن لینا۔ ماما مہر کو تو وہ ہنسا ہنسا کر دہرا کر دیا کرتی تھی۔ جھٹ پٹ کہانی بنا کر سنا دیا کرتی تھی انہیں' عالیان کو نہیں معلوم تھا لیکن اس نے عالیان اور امرحہ کی فرضی محبت کی کہانی بھی انہیں سنائی تھی جس میں وہ امرحہ کو پاکستان لے گئی تھی اور عالیان کو اسے تلاش کرنے کے پیچھے لگا دیا تھا۔ لیکن کیا سب اس نے مزاحیہ انداز میں تھا۔

ڈنر کے بعد وہ انہیں گھر تک چھوڑنے آیا اور ہال تک واپس آتے آتے اس کی ہمت جواب دے گئی۔

"مجھے لگتا ہے اس بار دولہا بھاگے گا۔"

ٹھنڈ میں اس کی پیشانی پر پسینہ آ گیا۔ دوسروں کے سامنے نارمل بنے رہنا آسان نہیں ہوتا' رات کے اندھیرے میں وہ ایک سنسان سڑک پر سائیکل کو گول دائرے میں چلانے لگا چلاتا رہا۔ چلاتا ہی رہا۔

ولید البشو کے ساتھ باقاعدہ قانونی جنگ شروع ہو چکی تھی.... ماما مہر کا وکیل کیس ہینڈل کر رہا تھا اس پر اور اس کے آدمیوں پر ہراساں کرنے کا دعوا کیا گیا تھا کیونکہ اتنا سب ہو جانے پر بھی ولید البشو باز آنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔

ٹھنڈی رات اس کی گرم سوچوں کی گواہ بنی۔

کیا اس کی سائیکل دائرے میں اس لیے چکرا رہی ہے۔ کہ ولید البشو اس کا پیچھا چھوڑنے کے لیے تیار نہیں یا اس لیے کہ ابھی کچھ دیر پہلے ڈنر ہال میں شارلٹ نے اس کی اور ویرا کی محبت بھری کہانی سنائی.... یا اس لیے کہ اس کہانی میں کرداروں کے نام بدل گئے....

سڑک پر لاتعداد گول دائرے بن گئے ہیں' ہر دائرہ اس سوچ کے گرد چکرا رہا ہے کہ کہانی میں ایک کردار کی جگہ جب دوسرا کردار لینے لگے تو پرانا کردار اپنی موت آپ مرجاتا ہے۔

"موت!"

کہانیوں میں ہو یا حقیقت میں اسے خوش آمدید نہیں کہا جاسکتا۔

"موت۔"

سایہ بن کر آئے یا سایہ بنا کر ساتھ لے جائے اس کی نحوست کم نہیں ہوتی۔

☆ ☆ ☆

"باہر جتنے بھی شور ہنگامے' میلے' سجا لیے جائیں عالم وجد میں جھومتے دل میں تخلیے نہیں ہوتے۔"

مہوک (ایک قسم کا پرندہ) اس کے ذہن سے آزاد کروالیا گیا۔ امرحہ کے لیے پرانی امرحہ کو آواز دے کر بلالینا بھی مشکل ہوگیا اور یہ بھی آسان نہیں رہا تھا کہ امرحہ دادا کے ساتھ پرانی امرحہ بن کر باتیں کرتی رہتی۔ دادا اس کے لیے پہلے جیسے ہی ہو گئے تھے' وہ دادا کے لیے پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ باتیں کرتے دادا کو اب درمیان میں کئی بار پوچھنا پڑتا۔

"سن رہی ہو امرحہ؟"

وہ سر ہلا دیتی۔

"واجد سارا گھر انٹیریر کروا رہا ہے... خاص کر تمہارے لیے حماد کا بڑا کمرہ خالی کروایا ہے۔ ڈیزائنر سے کہہ رہا تھا کہ میری بیٹی نے مانچسٹر سے آنا ہے اس کے مزاج کے مطابق کمرہ ڈیکوریٹ کرنا ہے' بہت پڑھی لکھی ہو گئی ہے اب وہ... جب تم واپس آؤ گی تو تمہیں سب بدلا ہوا ملے گا۔ سب بہت خوب صورت ہو گیا ہے یہاں... بہت سے پھول لگوائے ہیں تمہارے لیے لان میں... واجد کہہ رہا تھا تمہیں ایک کار بھی لے دے گا... اور ہاں میں تمہیں پارک لے جایا کروں گا تم وہاں سائیکل چلانا... خاندان والوں سے' تو سمجھو' واجد نے رابطہ ہی ختم کر دیا ہے بہت کم آنا جانا کر رہا ہے خاندان میں... ویسے بھی اب تو تم خود بہت سمجھ دار ہو گئی ہو... خود کو بدل لیا ہے اب معاشرے کو بدلنا... سن رہی ہو امرحہ...؟"

"جی دادا...!" اس نے سنا نہ ہوتا پر وہ کہہ دیتی اور گہرا سانس بھرتی۔

"اچھا بتاؤ... ابھی میں نے کیا کہا...؟"

"آپ نے؟" وہ یاد کرتی... "آپ نے کہا حماد نے ایک ہیوی بائیک لے لی ہے' اور جب وہ چلاتا ہے تو آپ کو بہت ڈر لگتا ہے..."

"امرحہ! یہ تو میں نے ایک گھنٹہ پہلے کہا تھا۔ یعنی اس کے بعد کی باتیں تم نے سنی ہی نہیں...؟"

"سنی ہیں دادا...!" وہ جھوٹ پر اصرار کرتی۔

دادا خاموشی سے اسے کچھ دیر دیکھتے اور پھر سے شروع ہو جاتے اپنی باتیں دہرانے۔ سائی کو بھی اس کے سامنے اپنی باتیں دہرانی پڑتیں۔

"میں تمہیں کل فون کر رہا تھا۔ تم نے بات کیوں نہیں کی؟"

"میں مصروف تھی سائی۔" وہ کینٹین میں بیٹھی تھی اور سائی اسے ڈھونڈتا وہاں آیا تھا۔

"جب مصروفیت ختم ہو گئی تھی تب فون کر لیتیں مجھے۔"

"تب بھول گئی تھی۔" اس نے جھوٹ بولا وہ سائی سے بات کرنا نہیں چاہتی تھی وہ اسے کئی بار انکار کر چکی تھی لیکن وہ بار بار اصرار کر رہا تھا۔

"میں نے تمہارے لیے بھی آن لائن ٹکٹ بک کروا دی ہے۔"

"سائی! میں کہہ چکی ہوں مجھے نہیں جانا۔" اسے غصہ سا آگیا۔

"ساری یونی جا رہی ہے۔ تم کیوں نہیں؟"

"بس نہیں... مجھے کوئی شوق نہیں فٹ بال میچ دیکھنے کا۔"

"میچ نہ دیکھنا ہمارے ساتھ بیٹھ جانا۔"

"سائی... نہیں تو نہیں..."

"امرحہ! میری دوستی میں کیا کمی رہ گئی جو تم ٹھیک

ہونے کے لیے تیار ہی نہیں۔۔۔ تمہارے لیے دنیا میں صرف ایک ہی انسان اہم ہے۔۔۔ باقی سب کی اہمیت صفر؟" سائی نے افسوس کا کھلا اظہار کیا۔

"میرے لیے تم بھی بہت اہم ہو سائی۔۔۔"

"تم ان کے ساتھ فرانس چلی گئیں، لیکن تم نے مجھے انکار کر دیا۔۔۔ اب تم خود کو ایسے محدود کر لو گی اور اب تم ہر انسان کو اپنا دشمن سمجھو گی؟ تم نے ایک چیک وائم کو ہی دے دیا ہے۔۔۔ اب تو تم تھوڑی بہت تفریح کر سکتی ہو نا۔۔۔ تم میرے گروپ کے ساتھ چلو۔۔۔"

"سائی! تم مجھے بے جا مجبور کر رہے ہو جبکہ میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا۔"

"چلو مجبور ہی سہی، ہر انسان مرا جا رہا ہے برازیل جانے کے لیے۔۔۔ سارا مانچسٹر خالی ہو جائے گا۔۔۔ انگلینڈ اور برازیل آمنے سامنے ہوں گے۔۔۔ تم دیکھنا اسٹیڈیم میں کیسا ماحول ہو گا، تمہیں اتنا مزا آئے گا کہ حیران رہ جاؤ گی۔۔۔"

"سائی! تم سب جا رہے ہو۔۔۔ تو اس خالی مانچسٹر کی حفاظت کے لیے مجھے یہیں چھوڑ دو۔"

"تم میری حفاظت کے لیے میرے ساتھ چلو۔۔۔ تمہیں بہت زیادہ مزا آئے گا۔۔۔"

"مجھے اب کہیں مزا نہیں آتا سائی۔۔۔"

"بہت بار کی طرح تم مجھے پھر انکار کر رہی ہو۔"

امرحہ اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ اس زمینی فرشتے کی طرف جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہا تھا۔۔۔ جس نے اسے اکیلا نہیں ہونے دیا تھا۔ جو رحمت تھا اس کے لیے۔ جو بہت مہربان رہتا تھا اس پر۔۔۔

"مہربان!"

کارل نے فریشرز پر صرف اتنی مہربانی کی کہ انہیں ترکیب سے بھڑکا کر، ان سے شرط لگا لگا کر، انہیں مختلف کھیلوں، کرتبوں میں ہرا کر فٹ بال میچ کی ٹکٹ کے لیے بہت زیادہ پیسے اکٹھے کر لیے۔ عالیان جانا نہیں چاہتا تھا، اور کارل اسے لے جائے بغیر چھوڑ نہیں رہا تھا۔

"مجھے پتا ہے ٹرافی انگلینڈ کی ہے۔۔۔ کوئی فائدہ نہیں وہاں جانے کا۔۔۔"

"اچھا تو تم نے کرسٹل بال میں پہلے سے ہی سارا میچ دیکھ لیا۔۔۔ اب بڑی یہ بھی بتا دے کہ کس کس کھلاڑی کو کس کس کھلاڑی سے پیٹ میں، منہ پہ، کمر پر لاتیں اور گھونسے پڑیں گے۔۔۔؟"

"ہی ہی۔۔۔" عالیان نے دانت نکالے۔

"جوانی میں تم بنا دانتوں کے کچھ اچھے نہیں لگو گے۔۔۔ ٹرافی ہماری ہے اور اسے لینے ہم برازیلا Brasila جا رہے ہیں بس۔۔۔" کارل نے دانت نکالے بغیر کہا۔

"برازیلا چلو گی امرحہ؟" کارل امرحہ کے پاس بھی آیا اسے منانے۔

"میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔" امرحہ نے بہانہ بنایا۔

"میرے پاس ہیں۔۔۔" وہ مسکرایا۔

جس کی وجہ سے اس نے لائبریری کی کتابوں پر بھاری فائن بھرا تھا۔ وہ اپنے پیسوں پر اسے برازیلا لے کر جا رہا تھا۔۔۔ امرحہ نے بہت نرمی سے اسے دیکھا۔

"شکریہ کارل۔۔۔ تم بہت اچھے ہو۔"

"میں برا بھی بن جاؤں گا اگر تم برازیلا نہیں آئیں۔"

وہ مسکرا دی اور ایک چاکلیٹ بیگ میں سے نکال کر اس کے آگے کی جو اس نے پکڑ لی۔

"تم ایک خوش قسمت انسان ہو۔۔۔ کیونکہ تم کارل ہو۔" کہہ کر وہ لائبریری سے نکل آئی۔

عالیان، کارل، ویرا اور شاہ ویز جمعے کی رات کو ہی برازیل چلے گئے۔ سائی نے ٹھیک کہا تھا ساری یونیورسٹی ہی برازیل لینڈ کر رہی تھی۔

اس نے دادا سے میچ کا ذکر بھی نہیں کیا تھا لیکن سادھنا نے بتا دیا۔

"تم جھوٹ بول رہی ہو کہ تمہیں میچ سے دلچسپی نہیں۔۔۔ تمہیں تو ویوز کا حصہ بننا تھا نا۔۔۔ یا تم مجھے معاف کرنے کے لیے تیار ہی نہیں امرحہ؟" دادا اسے عالیان نہیں دے سکے تھے۔ وہ اب اسے سب دے

رہے تھے۔

"ایسی بات نہیں، میرا دل نہیں چاہ رہا۔" اس کی آنکھیں نم ہوگئیں، جو مشکل سے ہی خشک رہتی تھیں اب۔

"تمہارا آخری سمسٹر ہے، پھر تم واپس آجاؤ گی، جاؤ گھوم آؤ۔" دادا نے ویرا کا نام نہیں لیا تھا۔ انہیں لگتا تھا کہ اسے ویرا کے نام سے تکلیف ہوتی ہوگی، جبکہ ایسا نہیں تھا۔ ویرا کی دوستی اور محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی، بس اس نے اپنے گرد دائرہ کھینچ لیا تھا۔ ویرا نے تو اسے ساتھ لے جانے کے لیے باقاعدہ منت کی تھی۔

"تم اتنا کیوں بدل گئی ہو امرحہ؟ کیا ہوگیا ہے تمہیں..... چلو ہمارے ساتھ....."

"میں کب بدلی ہوں ویرا؟"

"تم کتنی شدت سے مجھے انکار کررہی ہو، ہر بار کردیتی ہو..... تم آئس کیوب بن گئی ہو۔ ایسا لگتا ہے تمہارے بھیس میں کوئی اجنبی ہمارے درمیان گھس آیا ہے۔ اب تم عالیان کی بات بھی نہیں کرتیں، اسے تنگ کرنے بھی نہیں جاتیں اور بھی بہت کچھ ہے، جو میں محسوس کرتی ہوں، لیکن میری عقل اسے تسلیم نہیں کرتی، مجھے وہم لگتا ہے سب....."

"سب تمہارے وہم ہی ہیں ویرا..... میری پڑھائی بہت ٹف ہوگئی ہے، میرا زیادہ وقت اسائنمنٹ بنانے میں گزرتا ہے۔"

ویرا خاموشی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ "روس تو چلوگی نا؟"

"ہاں....." اس نے اسے ٹالنے کے لیے کہہ دیا۔

"جلدی نہیں آنے دوں گی وہاں سے۔" اس نے بھی انگلی اٹھا کر ہی دھمکایا۔

اور دونوں قہقہہ لگا کر ہنسنے لگیں..... ویرا نے اس کے دونوں گال پکڑ کر موڑے۔

"امرحہ دی لاسٹ ڈک۔" اپنا سر بھی دائیں بائیں ہلایا۔

"ویرا دی جیجز بیل۔" امرحہ نے دونوں ہاتھوں سے اس کے بال مٹھیوں میں بھر کر کھینچے۔

✡ ✡ ✡

گزر چکا وقت ریت پر نقش ہے اور وہ پھونکوں سے اس نقش کو مٹا رہا ہے۔

ماضی مٹ چکا ہے۔

اس نے قدم رکھا۔

گھنٹیوں نے فانوسی راگ، تخلیق کیا اور پھر بجا دیا۔

اس نے خود کو دھند میں گھرے، ہوئے پایا۔

ہوا کی گرہ پر ان گنت فانوسی ذرے مبتلائے رقص ہوئے۔ وہ کس طرف جائے اس کا فیصلہ اس نے اس کی خوشبو سے کیا اور وہ دھند کے لبادوں کو نرمی سے ہٹاتے اس کی خوشبو کی اور بڑھنے لگا۔

اب گھنٹیاں مہورز (عاشق) کے حکم کی بجا آوری کرتیں۔ "محرم" کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے کو لپکیں۔

اس کی چال میں تیزی تھی، پھر بھی فاصلہ سمٹ نہیں رہا تھا۔ البتہ خوشبو قریب آتی جارہی تھی۔ دور اسے موٹے تنے کا پھیلا ہوا درخت نظر آیا اور دھند کے سنگ پریم پریت کا سرگم بنتے گھنٹیوں کی آوازیں اللہ رکھا رحمان کی دھنیں بنیں، دل کو آلینے کو ہوئیں..... اور دل پر قابض ہوکر مئودب ہوگئیں۔

"احترام واجب ہے۔"

"مسان عشق ہے۔"

ہلکی ہوا اس کے بال اڑا رہی تھی۔ گھنٹیاں سرخ پیغامات کے ساتھ بندھی شاخوں سے ٹنگی جھول رہی تھیں۔ ایک ہاتھ ایک شاخ کے ساتھ ایک پیغام باندھ رہا تھا۔

"وہ امرحہ تھی۔"

"امرحہ..... کیا کررہی ہو؟"

آواز جادو کی طرح چھو منتر ہوئی۔

وہ خوشی سے پلٹی۔ "تم آگئے عالیان؟"

"ابو نواس....." کی روح میں سرایت ہوکر ساکت کردینے والی شاعری رحمان کے سروں سے ہم کلام

ہو کر "سماں یار" میں ڈھل گئی۔

"یہ سب کیا ہے؟" وہ اس سے زیادہ خوش ہوا۔

"تمہاری کہانی، تم نے یہ پیغامات مجھ سے نہیں لیے تو میں نے یہاں باندھ دیے۔" وہ چل کر ایک پیغام کے پاس گیا اور اسے پڑھنے لگا۔

"میں اپنی ابتدا پر تمہارا نام لکھتی ہوں اور میری انتہا تمہارے سوا کچھ نہیں۔" پڑھ کر وہ مسکرانے لگا۔

امرحہ اپنے دونوں ہاتھ پیچھے لے گئی اور دائیں بائیں جھول کر شرارت سے مسکرانے لگی۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر شاخوں سے جھولتیں گھنٹیوں کو ترنم سے ایسے بجا ڈالا جیسے "اسد اللہ خان غالب" کے کلام سے لبالب ہوئے، چاندی کے ظروف وادی کیلاش کی پریوں کی نازک انگلیوں تلے بج اٹھے۔

"ارتکاز واجب ہے۔"

"سماں یار ہے۔"

کشتی کی لمبی نوک جو پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ دھندلے اندھیرے پل کے نیچے سے نکلی اور اس نے پانی میں ہاتھ ڈال کر اس پر اچھال دیا۔

"عالیان!..."

اور ایک ایسی مسکراہٹ خود پر سجالی۔ جیسے وہ پرستان کی ملکہ ہو اور اپنے پری زاد کے ساتھ بگھی پر سوار گلستان کی پرواز پر جاری ہو۔

"مجھے تمہاری مسکراہٹ یاد آتی ہے اور میں خود مسکرانا بھول جاتا ہوں۔" عالیان نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور دن سے روشن اس کی آنکھوں کو پایا۔

"میری ساری مسکراہٹیں تم نے لے لیں، اب کہتے ہو مسکرانا بھول گئے ---- تم آنکھوں کی پتلیاں گول گول گھمایا کرتی تھیں؟"

"ہم کہا کرتے تھے تو کرنی تھی، اب تم کہتے ہی نہیں۔" وہ اٹھلا گئی۔

"امرحہ... چلو ہم پھر سے دوست بن جاتے ہیں۔" اس کے ہاتھ کی پشت کو اس نے باری باری اپنی آنکھوں سے لگایا۔

"نہیں۔ اب ہم دوست نہیں بن سکتے۔" اس نے اپنے ہاتھ کی پشت کو دیکھا۔

"کیوں؟ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو؟"

"نہیں... یہ نہیں کر سکتی۔"

"محبت کرتی ہو؟"

"محبت۔ یہ بھی نہیں۔"

"کوئی جذبہ تو ہوگا تمہارے پاس میرے لیے؟"

کشتی چمکیلی جھیل پر رواں دواں تھی اور پھر وہ ایک دوسرے پل کے اندھیرے میں جا چھپی۔ ابابیلوں کے جھنڈ پیچھے رہ گئے اور کوئلوں کی کوکوں نے اندھیرے کے سروں کا پیچھا کیا۔

دوب (عمدہ گھاس) مخمل کی طرح بچھ گئی... اندھیرے سے روشنی میں آتے اس نے اپنا ایک ہاتھ اس کی کمر میں پایا اور دوسرا اس کے ہاتھ میں پیوست۔

"شوق دید واجب ہے۔"

"سماں رقص ہے۔"

وہ سرخ پوشاک میں تھی اور اس کے بالوں میں لہریں تھیں۔ دوب اتنی ہموار زمین پر وہ محو رقص تھے۔ وہ شرما کر ایسے ہنس رہی تھی جیسے اسے اس پر اعتراض تھا۔

"نیلے سمندر میرے لیے سیاہ ہیں۔" گنگناہٹ صورت اس نے سرگوشی کی۔

"تمہاری آنکھوں کی سیاہی میں بس جانے کا خبط مجھے بہت پیارا ہے۔"

وہ مسکرانے لگی۔ "اور..."

"میرے پیروں تلے بچھی سب ہی راہیں تم تک آتی ہیں... تم یہ جان لو میری سانسیں تم سے ہو کر آتی ہیں۔"

اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ "اور..."

"امرحہ مجھے انتظار رہے گا کہ انتظار کب ختم ہوگا۔" کہتے وہ اداس ہو گیا۔

"مجھے انتظار رہے گا کہ انتظار ختم ہونے کا انتظار کیا جائے گا۔" کہہ کر وہ بیٹھ گئی۔ بے تحاشا پھول اگ آئے۔

"بتاؤ تم کس کے لیے جان دے سکتی ہو؟" وہ بھی اس کے پاس ہی نیچے بیٹھ گیا۔"

"جان تو کب کی دے دی۔

"ہم نے بہت گڑبڑ کردی نا امرحہ؟"

"ہاں بہت۔۔۔ اور اب سوچنے کا وقت نکل گیا۔"

"میں نے تمہیں بہت یاد کیا۔"

"میں تمہیں بھول ہی نہیں پائی۔"

"تمہیں مجھے یہ بتانا چاہیے تھا۔"

"تمہیں یاد رکھتے رکھتے میں سب بھول گئی، تمہیں بتانا بھی۔۔۔ تمہیں یاد رکھتے میں نے کچھ اور یاد رکھنا ضروری نہیں سمجھا۔"

"میں عالیان نہ ہوتا تو تمہارا خواب ہوتا جسے تم ہر رات دیکھتیں۔"

"میں امرحہ ہو کر بھی عالیان ہی ہوں، تم میرے اندر بس چکے ہو، میں نے اپنا آپ رخصت کردیا ہے، عالیان۔"

"تم ایک جادوگر ہو امرحہ۔" وہ خود کو اس کی آنکھوں کے اتنے قریب لے گیا کہ اس کی پلکیں امرحہ کے گلابی گالوں پر لرزنے لگیں۔

"تم میرا سحر ہو عالیان۔"

"تم سے محبت مجھ پر فرض ہے۔"

"میں نے اس فرض کو قضا نہیں ہونے دیا۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہاں جارہی ہو؟"

"پتا نہیں۔"

"رک جاؤ۔" وہ بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"روک لو۔۔۔" اس نے گردن موڑ کر کہا خود کو نہیں۔

تیز روشنی نیم اندھیرے میں بدل گئی۔ خوف اور درد کی تتلیاں مقام نامعلوم سے اڑاتی ہوئی آئیں۔ وہ سب سیاہ تھیں۔ انہونی کا بگل بجا۔

"دعا واجب ہے۔"

"دستمان ہے۔"

اس نے جھٹکے سے گردن کو اس کے گرتے ہوئے وجود کی طرف موڑ کر اسے دیکھا۔ اس کے آس پاس خون ہی خون تھا۔ وہ اپنی جگہ بت بنا کھڑا تھا۔ اور ذرا دور اس کی بند ہوجانے پر مائل آنکھیں اس پر ٹکی تھیں۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ لیکن وہ اس کی طرف نہیں بڑھ رہا تھا۔

وہ کھڑا تھا۔۔۔ وہ کھڑا ہی رہا۔

"اور اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔"

"یہ توبہ بافت ہیں۔"

اپنے لمبے لبادوں میں لپٹی وہ "چاہ توبہ" کے گرد دائرہ بنا کر بیٹھ گئیں۔ پیشانی سے کھینچ کر کناروں کو ناک تک لائیں اور ایک ساتھ اپنے ہاتھ دعا کے لیے اٹھالیے۔ اندھیری رات ان پر سایہ فگن تھی اور "آب توبہ" زمین کی تہوں میں جل تھل ہو رہا تھا۔

انہوں نے دعا کی ابتدا کی۔ "اے خدا۔۔۔"

اور آنکھیں بند کرلیں۔

عالیان نے آنکھیں کھول دیں۔

اس کے جسم میں خون کا ایک قطرہ نہیں رہا تھا اور اس کے دل نے کام کرنا بند کردیا تھا۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں بھٹک رہی تھیں۔ اسے بہت دیر میں یاد آیا کہ وہ کہاں ہے۔ اس نے اٹھنے کی ہمت کی لیکن اس کی ہمت جواب دے گئی۔

مارگریٹ کے مرنے کے بعد اس کے ساتھ یہ ہوتا رہا تھا۔ وہ اپنی من پسند جگہوں پر اس کے ساتھ پایا جاتا رہا تھا۔۔۔ اب پھر یوں۔۔۔ امرحہ کے ساتھ۔۔۔

جسم کی گرمی سے اس کا منہ جل رہا تھا۔ اٹھ کر وہ واش روم میں گیا اور منہ دھو کر بیج پانی پیا۔ وہ برازیل میں تھا۔ ہوٹل کے کمرے میں دوسرے سنگل بیڈ پر موجود کارل بے خبر سو رہا تھا۔ وہ ٹیرس پر آگیا اور بہت دیر تک شہر کی ٹمٹماتی روشنیوں کو دیکھتا رہا۔ اس کی کیفیت واپس مانچسٹر کی طرف بھاگ جانے کی سی ہوگئی تھی۔ شٹل کاک کی طرف۔۔۔ کھڑکی کے نیچے۔

اس پر ہلکی سی کپکپی طاری تھی اور اس کے ہاتھ واضح کانپ رہے تھے۔ اس کا ٹیرس کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ کر رونے کو دل چاہا۔۔۔ بہت زیادہ روتے رہنے کا۔

وہ ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گیا اور اپنے سر کو ہاتھوں میں تھام لیا اور پھر اپنے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑ لیا۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ خواب کے آخری حصے کو دہراتا۔ فون بیڈ سائیڈ سے اٹھا کر واپس ٹیرس پر آکر اس نے سائی کو فون کیا۔

"تم ٹھیک ہو سائی؟"

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔۔۔ کیوں کیا ہوا۔۔۔ اس وقت فون کیا تم نے؟" سائی خود بھی نیند سے جاگا ہوا لگ رہا تھا۔

"نہیں کچھ نہیں ہوا۔۔۔ بس ایسے ہی فون کیا۔"

سائی کچھ دیر خاموش رہا۔ "تمہیں کچھ کہنا ہے مجھ سے؟"

"ہاں۔۔۔"

"کہو۔۔۔"

"میرا بہت رونے کو دل چاہ رہا ہے۔ مجھے روشنی میں بھی اندھیرا نظر آرہا ہے۔"

"تم ماما مارگریٹ کو یاد کر کے سوئے تھے؟"

"نہیں میں نے بہت اچھے تصورات کے ساتھ یاد کیا۔ میں نے ان کے ساتھ بہت اچھی باتیں کیں۔ میں اب کیا اپنی کیفیت ٹھیک سے سمجھ نہیں پا رہا سائی۔"

"تمہیں ایک اچھی نیند لینی چاہیے۔"

"ہاں۔۔۔ شاید۔۔۔ سائی! تمہاری امرحہ سے کب ملاقات ہوئی تھی؟"

سائی اپنے بستر پر پورا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس شخص نے جیسے صدیوں بعد امرحہ کا نام لیا تھا۔

"آج ملاقات ہوئی تھی۔۔۔ تم اسے فون کر سکتے ہو۔" سائی خوشی سے بولا۔

"ٹھیک ہے وہ؟" اس کی کپکپاہٹ کچھ کم ہوئی۔

"ہاں۔۔۔ بالکل ٹھیک ہے۔۔۔ بہت اچھا لگا تم نے اس کے بارے میں پوچھا۔"

"شکریہ سائی۔۔۔ تم سو جاؤ اب۔۔۔" شاید اس نے سائی کو بلاوجہ پریشان کیا۔

"تم بھی۔۔۔"

فون کو وہ ہاتھ میں لے کر سوچتا رہا۔ پھر ہوٹل کے کاؤنٹر تک آیا اور امرحہ کو فون کیا۔

"ہیلو۔۔۔" امرحہ کی آواز آئی۔

وہ خاموش رہا۔ وہ بات کہاں سے شروع کرے گا اور کہاں ختم کرے گا۔ اور کہے گا کیا۔ تو وہ خاموش ہی رہا۔ امرحہ نے فون بند کر دیا۔

"میں نے تمہیں بہت یاد کیا امرحہ!" فون بند ہو چکا تو وہ بڑبڑایا۔

"میں نے تمہیں وہ سزا دی جو خود میں نے بھگتی۔"

وہ کمرے میں واپس آگیا اور ٹیرس پر کھڑا ہو گیا۔ اسے نہیں لگتا تھا کہ اسے نیند آسکے گی اب۔

آنکھیں جاگتے رہنے کا عہد باندھ چکی تھیں۔ وہ سائی اور این کے ساتھ برازیلا آچکی تھی۔ وہ کافی دیر سے ٹیرس پر کھڑی تھی۔ اندر این سو رہی تھی۔ ابھی جو فون آیا تھا اس نے جان لیا تھا کس کا تھا۔

اس شخص کو شبہ تھا کہ وہ اس کی خاموشی کو پہچان نہیں سکتی اور اسے یقین تھا کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔۔۔ کلام کے لیے الفاظ کی ضرورت ہوتی ہوگی' پہچان کے لیے نہیں۔ کیا وہ اسے پھر سے یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس کی وجہ سے اسے کتنی تکلیف کاٹنی پڑی۔ وہ کس تکلیف سے گزرا۔ اس کی اچھی بھلی زندگی کو اس نے اندھا کنواں بنا دیا۔ روشنی اندر جاتی ہے نہ اندھیرا باہر نکلتا ہے۔

وہ سب جو وہ اسے نہیں کہہ سکا۔ وہ اب کہنا چاہتا ہے۔ امرحہ کو خوف محسوس ہوا۔ خوف سے اس کا وہم کسی اژدھے کی طرح دیو ہیکل ہو گیا۔

اب وہ نئے سرے سے سوچ رہا تھا۔۔۔ پہلے دن سے۔۔۔ پہلی ملاقات سے۔۔۔ پہلے جملے سے۔۔۔ ایک لڑکی جس کی آنکھوں کا کاجل ایسے پھیل گیا ہے کہ گالوں کو بھی سیاہ کر گیا ہے۔ وہ اس کے سامنے کھڑی ہے۔۔۔ وہی لڑکی ڈریگن ڈریس میں اس کے ساتھ کھڑی ہے اور پھر وہی لڑکی' ہر جگہ اس کے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ وہ چھپ کر بیٹھتا ہے تو بھی۔۔۔ یہ کیسی لڑکی ہے جو اس کے سائے سے زیادہ اس کے ساتھ ہے۔ روح سے زیادہ اس پر سوار ہے۔

"تم کہتے ہو تم ماما مارگریٹ نہ بن جاؤ اور مجھے یہ خوف ہے کہ تم ولید البشو بن جاؤ گے' اپنا کر چھوڑ دینے والے۔" امائی نے کہا تھا۔

اس نے اپنا سر تھام لیا۔

سر اٹھا کر اس نے چند گہرے گہرے سانس لیے۔

کچھ بھی تھا۔ وہ خوش تھی کہ عالیان نے اسے فون کیا تھا۔ برا بھلا کہنے کے لیے ہی سہی۔ وہ اسے یاد تو رکھتا تھا۔ اس کا نام بھولا نہیں تھا۔ دنیا میں کوئی امرحہ بھی ہے اس میں یہ احساس زندہ تھا۔

زندہ رہنے کے لیے بہت ضرورتیں درپیش ہوں گی' لیکن جینے کے لیے صرف "ایک"

امرحہ کے لیے۔ "ایک عالیان"

عالیان کے لیے۔ "ایک امرحہ"

☆ ☆ ☆

آیئے برازیل اسٹیڈیم کے اندر چلتے ہیں۔

سیریز کا فیصلہ کن میچ ہے۔ انگلینڈ اور برازیل آمنے سامنے آنے والے ہیں۔ لگتا ہے سارا برازیل اٹھ کر اسٹیڈیم میں آگیا ہے۔ میچ شروع ہونے سے پہلے ہی لگ رہا ہے۔ میچ ختم ہونے کے قریب ہے۔ دونوں ٹیمیں ایک ایک گول کر چکی ہیں اور اب دونوں ٹیموں کے شائقین مرے جارہے ہیں کہ بس ان کی ٹیم فیصلہ کن گول کردے۔ برازیلین شائقین کچھ تندی میں تھے۔ وہ انگلینڈ کے شائقین اور کھلاڑیوں کے نام لے لے کر فقرے چست کررہے تھے۔ انہیں بتارہے تھے کہ انگلینڈ ٹیم کس بری طرح سے ہار جانے والی ہے۔

یہ سب ہونا معمول ہے۔ فٹ بال کی دنیا میں جو نہیں ہوتا وہ ہی کم ہوتا ہے۔ شائقین جتنا زیادہ کرتے ہیں۔ کم ہی کرتے ہیں۔ فٹ بال فیور اسٹیڈیم کے اندر اتنے ہائی ٹمپریچر پر ہوتا ہے۔ جیسے وہاں اہتمام سے ایک آتش فشاں پھٹنے والا ہو۔ اس فیور کا تصور اسکرین سے میچ دیکھنے والے کر ہی نہیں سکتے۔

وہ... ویرا... کارل اور چند دوسرے یونی فیلوز آگے پیچھے بیٹھے تھے۔ انہوں نے انگلینڈ ٹیم کی شرٹس پہن رکھی تھیں اور کارل' ویرا نے اچھل اچھل کر سارا اسٹیڈیم ابھی سے سر پر اٹھالیا تھا۔ عالیان خاموش بیٹھا انہیں ناچتے تو دیکھ رہا تھا۔

ایسے ہی ناچتے کودتے کارل نے ایک پیاری سی بچی کی گود میں رکھے سینڈوچز غائب کردیے۔ بچی جس کے ماما' پاپا اس کے پاس ہی کھڑے' اپنی دھن میں اچھل رہے تھے' تاکہ وہ اسکرین پر نظر آسکیں۔ ایک دم سے اپنی گود کو خالی پاکر رونے لگی اور اپنے اچھلتے کودتے باپ کی شرٹ کھینچنے لگی۔

"شرم کرو لٹل اینجل کو رلا دیا۔" عالیان نے تیزی سے چلتے اس کے جبڑے کو دونوں ہاتھوں میں سختی سے دبا کر کہا۔ بچی ان سے ذرا سی دور ہی بیٹھی تھی۔

"اینجل تو کسی نہ کسی طرح زندہ رہ ہی لیتے ہیں ہم شیطانوں کو اپنا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ مجھے بھوک لگی تھی' میں نے محنت کی اور خوراک حاصل کرلی۔ ویسے بھی اس کا باپ اسے اور لے دے گا۔ میرا تو کوئی باپ نہیں ہے نا جو مجھے لے کر دے گا۔"

"میں ابھی بچی کے باپ کو بتاتا ہوں۔" عالیان اس کی طرف جانے لگا۔

"اگر تم نے یہ کہا تو برازیلا میں فٹ بال کی تاریخ کا سب سے بڑا ہنگامہ ہوگا اور وجہ صرف سینڈوچ ہوگا۔ ایک سینڈوچ کے لیے تم نجانے کتنے شائقین کو مروا دوگے اور کتنوں کو زخمی کرو گے عمر بھر کے لیے معذور کردو گے۔"

"یہ میں کروں گا؟" عالیان نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر کہا۔

"ہاں تم۔ صرف تم۔" اس نے بھی عالیان کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ برازیلا اسٹیڈیم میں دو لڑکے ایک دوسرے کے بال مٹھیوں میں جکڑے کھڑے تھے۔

بچی کے ہاتھ میں اب ایک بڑی آئس کینڈی آچکی تھی اور کارل اب آئس کینڈی کو دیکھنے لگا تھا۔ بچی کے باپ نے پھرتی سے بچی کو چپ کرادیا تھا۔

"تمہاری لٹل اینجل کی پسند اچھی ہے۔ مجھے یاد

آیا کہ میں آئس کینڈی کو بہت دنوں سے بہت مس کر رہا تھا۔" کارل نے آنکھیں گھول گھما کر کہا۔

عالیان ہنس دیا۔ "تم ایسے کیوں ہو؟"

"لٹل اینجل سا؟" کارل نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔" Big Devil (بگ ڈیول) سا؟"

"کیا میں بگ ڈیول ہوں۔۔۔ نہیں نا؟ اس نے پیچھے بیٹھی قصہ گو کی طرف رخ موڑ کر کہا اور رشوت کے طور پر جیب سے چاکلیٹ نکال کر آگے کی۔

عالیان پھر مسکرا دیا۔ "بند کرو اپنا ڈراما۔"

"ویسے تم بہت گم صم سے ہو۔۔۔ کچھ ہوا ہے؟"

"میں ٹھیک ہوں۔۔۔ ہونا کیا ہے؟" کارل کی نظروں سے وہ بچ نہیں سکتا تھا۔

"کچھ ہے تو بتاؤ فرش۔۔۔ کیا تم شور سے پریشان ہو۔ یونو می' سارا اسٹیڈیم خالی کروا سکتا ہوں۔ ابھی جا کر کسی برازیلین فین کو دبوچ لیتا ہوں اور اس کی ٹیم کے بارے میں کچھ بھڑکتا ہوا جملہ کہہ دیتا ہوں۔ بس پھر گیم شروع۔۔۔ اور ہاں جو افواہ میں بم کی یہاں پھیلا سکتا ہوں۔ وہ بم بننے سے اب تک کسی نے نہیں پھیلائی ہوگی۔ بس پھر اسٹیڈیم خالی۔"

"اتنے پیسے لگا کر ہم میچ دیکھنے آئے ہیں خالی اسٹیڈیم نہیں۔"

"تم نہیں کیوں' لیکن مجھے میچ دیکھنے سے زیادہ دلچسپی کسی اور چیز کو دیکھنے میں ہے۔ بڑی اگر میں شائقین کو آپس میں لڑوا دوں' کیسا رہے گا۔ میچ تو کئی بار دیکھ چکے ہیں ہم' اب ذرا یہ بھی تو دیکھیں' براہ راست ہنگامہ دیکھنے میں کیسا لگتا ہے۔"

"شیشے کی خالی بوتلیں تمہارے سر پر آکر لگیں گی نا تو مزا آجائے گا۔ براہ راست ہنگامہ دیکھنے کا۔"

"وہ انسان ابھی بنا نہیں جو کارل کے ساتھ یہ کر سکے۔" کارل ادھر ادھر دیکھنے لگا اور کس کے پاس سے کھانے کی چیز اڑائی جا سکتی ہے۔

"وہ بنا بنایا انسان تمہارے ساتھ بیٹھا ہے۔"

"تم بھی کارل ہی ہو۔" کارل نے اس کے دونوں گال پکڑ کر مروڑے۔

میچ شروع ہونے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ بڑی بڑی اسکرینوں پر اسٹیڈیم میں موجود شائقین دکھائے جا رہے تھے۔

"یہ مقامی شائقین تو ابھی سے پاگل ہو رہے ہیں۔" کارل نے ذرا دور موجود ایک لڑکے کی طرف اشارہ کیا جو اپنی ٹیم کے حق میں عجیب و غریب نعرے لگا رہا تھا۔

"تمہارا ابھی نشہ ٹوٹ رہا ہوگا' جا کر تم بھی اس کے ساتھ تھوڑا پاگل ہو جاؤ۔" عالیان نے اسے اسی لڑکے کی سمت دھکا دیا۔

امرحہ نے سائی کو منع کر دیا تھا کہ وہ ویرا کو نہ بتائے کہ وہ وہاں موجود ہے۔ انہیں سائی کی آمد کا پتا تھا۔ اس کی نہیں۔ ویسے بھی کل انہوں نے چلے جانا تھا۔ این اور امرحہ نے بھی انگلینڈ ٹیم کی شرٹس پہن رکھی تھیں۔ این ایسے اچھل رہی تھی جیسے وہ جاپانی نہ ہو' بلکہ برطانوی ہو اور اس کا ایک آدھ بھائی یا دوست ٹیم میں شامل ہو۔ اس نے ٹیم کی نمائندگی کرتی لمبی سی ٹوپی بھی پہن رکھی تھی اور منہ کو پورا رنگا ہوا تھا' ساتھ ہاتھ میں بورڈ پکڑ رکھا تھا۔ "رانی ہماری ہے۔" جس پر پیچھے کہیں سے کسی نے کلر بال پھینک کر اسے بدنما کر دیا تھا۔ یعنی رانی انگلینڈ کی نہیں برازیل کی ہے۔

منظر کچھ ایسا تھا جیسے ورلڈ کپ فائنل ہو۔

امرحہ کچھ بہتر محسوس کر رہی تھی وہاں آکر۔ ویسے بھی رات کو جو عالیان نے کال کی تھی اور کسی بھی وجہ کو لے کر کی تھی۔ اس کے لیے وہ بہت بڑی بات تھی۔ وہ بھی کھڑی ہو کر این کے ساتھ اچھلنے لگی اور رہرسل کے طور پر بنائی جانے والی "ویو" کا حصہ بننے لگی۔ پورے اسٹیڈیم میں لہریں گھوم رہی تھیں اور یہ قابل دید منظر تھا۔

وہ ہنسنے لگی۔۔۔ اسے سب اچھا لگا۔۔۔ جیسے سارے غم بس مٹ گئے۔

امرحہ۔۔۔" عالیان۔۔۔ ویرا' کارل ایک ساتھ چلائے۔

اسکرین پر اچھلتی این کے قریب وہ کھڑی تھی اور اپنی طرف آنے والی "لہر" کی طرف دیکھ رہی تھی اور خوش قسمتی سے ان تینوں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ ویرا نے فون کیا۔

"تم کہاں ہو؟"

امرحہ ہنس دی۔ "اسٹیڈیم"

"پاگل... گندی بچی... بتا نہیں سکتی تھیں؟"

"میں نے سوچا سرپرائز دوں۔"

"سرپرائز اسکرین پر آکر..." ویرا ہنسی... وہ بہت خوش تھی اسے دیکھ کر۔

"این اور امرحہ سائی کے ساتھ ہیں۔" ویرا نے ان سب کو بتایا۔

"تم نے بتایا نہیں کہ تمہارے ساتھ امرحہ بھی ہے۔" عالیان نے سائی کو فون کیا۔

"اس نے منع کیا تھا عالیان۔"

عالیان خاموش ہو گیا اور اسکرین کی طرف ہی دیکھتا رہا کہ وہ پھر سے نظر آجائے، لیکن اب گراؤنڈ میں کھلاڑی آتے نظر آرہے تھے۔

میچ شروع ہو گیا۔

فرسٹ ہاف میں انگلینڈ کی ٹیم نے ایک گول کر دیا۔ لیکن انگلینڈ کے شائقین سے زیادہ برازیلین شائقین دیوانے ہو رہے تھے۔ "غصے سے" انہیں ریفری کا برازیل ٹیم کے ایک اہم کھلاڑی کو ریڈ کارڈ دکھائے جانے سے اختلاف تھا۔ ان کے آس پاس موجود شائقین ریفری کو گالیاں دے رہے تھے کہ اگر وہ یہ فاؤل نہ کرتا تو ٹیم دو گول کر چکی ہوتی اور مخالف ٹیم کو گول کرنے کا موقع ہی نہ ملتا۔

"بچوں بچ کر... برازیلیوں کے نرغے میں گھرے بیٹھے ہو۔" ویرا نے مذاقاً کہا۔

"اگر دوسرا گول بھی انگلینڈ نے کر دیا تو انہوں نے انگلینڈ ٹیم کے کھلاڑیوں کی بجائے ہماری گردنیں دبوچ لینی ہیں۔" عالیان ہنسنے لگا۔

وہ یہ سب مذاق میں کہہ رہے تھے۔ اسٹیڈیم میں ایسا کریز معمول کی باتیں ہوتی ہیں۔ پھر بھی مقامی شائقین کے تیور کافی بگڑ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا سارے ریفری انگلینڈ ٹیم کے سارے کھلاڑی فاؤل کھیل رہے ہیں۔

امرحہ کے پیچھے بھڑکتے ہوئے فاؤل فاؤل کے نعرے لگنے لگے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے سائی؟ پیچھے کوئی لڑائی ہو رہی ہے کیا؟" امرحہ سہم گئی۔

"یہ سب ہوتا رہتا ہے امرحہ... آخری منٹوں میں دیکھنا کیا ہوتا ہے۔"

دوسرا ہاف شروع تھا۔ انگلینڈ کا ڈیفنس اچھا تھا۔ مخالف ٹیم کی سرتوڑ کوششوں کو وہ ناکام بنا رہے تھے۔

دوسرا ہاف ختم ہونے سے پندرہ منٹ پہلے ویرا کو ایک میسج آیا۔ موبائل پر میسج پڑھ کر وہ تھوڑا سا پریشان ہو گئی۔

"کیا ہوا۔" شاہویز نے پوچھا۔

میرے جرنلسٹ دوست کا میسج آیا ہے۔ وہ بھی یہاں موجود ہے۔ اس کا کہنا ہے، کہ اسے کسی متوقع ہنگامے کی خبر ملی ہے۔

"کیسے ہنگامے کی؟"

"زیادہ اسے بھی نہیں معلوم اس کا کہنا ہے کہ کوئی حکومت مخالف گروپ ہے، جو اپنے مفادات کے لیے کوئی ہنگامہ کروانا چاہتا ہے۔ شاید غیر ملکیوں کو نشانہ بنانا ایسا ہی کچھ..."

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ ایسی خبریں پھیل ہی جاتی ہیں، سیکیورٹی بہت اچھی ہے، پولیس جانتی ہے کیسے امن رکھنا ہے اور جو خبر تمہیں ملی ہے وہ حکومت کو بھی تو ملی ہی ہوگی نا۔" کارل نے کہا۔ "ویسے اچھا ہے ہنگامہ ہو ہی جائے میں بھی تو دیکھوں یہ فلم بنا ٹکٹ کے۔"

"اور پھر تمہارا دوست کنفرم بھی نہیں ہے۔" عالیان نے کہا۔

ویرا نے سب دوستوں کو میسج کر دیا کہ میچ ختم ہوتے ہی فوراً اسٹیڈیم سے نکل جائیں۔ خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں۔ کوئی بدمزگی نظر آئے تو پرسکون رہیں۔

آخری پندرہ منٹ میں برازیلین کھلاڑیوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا' لیکن آخری چھٹے منٹ میں گول انگلینڈ نے کر دیا۔

جوش اور افسوس سے دونوں ٹیموں کے شائقین نے اسٹیڈیم سر پر اٹھا لیا۔ سائی' ویرا کا پیغام پڑھ چکا تھا۔ اس نے امرحہ اور این کو چلنے کے لیے کہا۔ عالیان اور ویرا اٹھ چکے تھے۔ جبکہ اچھلتا کودتا کارل پہلے ہی کہیں غائب ہو چکا تھا۔ ویرا نے اب واضح خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔ کہیں کوئی ایک ایسا نعرہ گونجتا کہ اس حصے میں بات بڑھ جاتی۔ میچ کے دوران گالی گلوچ' ہاتھا پائی' تو تڑاخ' خالی بوتلیں پھینکنا عام باتیں تھیں' لیکن ایسی تندی اور طیش نہیں ہوتا تھا جو اب دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے سب جان بوجھ کر کیا جا رہا تھا۔

"سائی نکل چکا ہے؟" عالیان نے پوچھا۔

"ہاں.... اس نے کہا وہ جا رہا ہے۔" ویرا نے فون کان سے ہٹایا۔

وہ دونوں اسٹیڈیم سے باہر آ گئے اور ابھی وہ سڑک تک آئے ہی تھے کہ پولیس کی نفری تیزی سے اندر اسٹیڈیم کی طرف بھاگتی ہوئی نظر آئی۔ ان کا انداز الرٹ تھا۔ ایک دم ہی اسٹیڈیم کے باہر اسٹیڈیم کے اندر کچھ ہو جانے کا منظر نمایاں ہو گیا۔

"چلو عالیان.... جلدی چلو۔" ویرا آگے کو بھاگی وہ بھی سڑک پر اس کے ساتھ بھاگا اور ذرا دور جا کر رک گیا۔

"کیا ہوا؟" ویرا پلٹی۔

"امرحہ!" اس کے چہرے کے سارے رنگ اڑ گئے اور اسے دیکھ کر ویرا کی اپنی شکل پر سائے سے لہرائے۔

ویرا نے فون نکالا۔ امرحہ کو فون کرنے کے لیے.... لیکن عالیان پہلے ہی کال ملا چکا تھا۔

دو بار بیل ہوئی۔ "ہیلو!" امرحہ کی آواز آئی۔

"امرحہ! تم کہاں ہو؟"

الفاظ پورے ادا نہیں ہوئے کہ فون ڈیڈ ہو گیا۔ اس نے دوبارہ کال ملائی' لیکن فون بند جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کا فون بند جا رہا ہے' یہ معلوم ہوتے ہی اپنا فون اس کا فون بند جانا ہی تھا۔ اس کے فون کی بیٹری نکل چکی تھی اور وہ کہیں دور گر گیا تھا اور وہ خود بھی گر گئی تھی۔ وہ بس نکل جانے کو ہی تھے کہ بھڑکا ہوا ایک گروپ اوپر سے گتھم گتھا ہوتا ان کے اوپر آ کر گرا۔ امرحہ کا سر ایک سخت چیز سے ٹکرایا اور اس کے سر سے خون نکلنے لگا۔ سائی نے جلدی سے اسے اٹھایا۔ ایک مقامی فین نے سائی کو دھکا دیا' سائی بھی دور جا گرا۔

میچ کا آخری منٹ ختم ہو چکا تھا۔ انگلش ٹیم جیت چکی تھی اور فوراً" ہی اسٹیڈیم میں مختلف جگہوں پر گروپ کے گروپ آپس میں اٹھ کر گتھم گتھا ہو گئے اور ایک دوسرے پر مختلف ٹھوس چیزیں پھینکنے لگے۔ اس سارے عمل کو تیس سیکنڈ بھی نہیں لگے ہوں گے' جیسے کہ سب کچھ پلان تھا کہ ایسا ہی ہونا ہے۔

اسٹیڈیم کی اندرونی حالت ایک دم سے بدلی اور عام شائقین سہم گئے۔ منظر ہولناک ہو گیا۔ شور بڑھ گیا اور ہنگامے کے آثار نمایاں ہو گئے جو چھپا ہوا تھا وہ نکل آیا۔ اسٹیڈیم نے جنگ کا میدان بدلنے میں ایک منٹ کا وقت بھی نہ لیا۔ این کہیں آگے نکل چکی تھی۔ امرحہ کو سر پر چوٹ کی وجہ سے بری طرح سے چکر آ رہے تھے۔ سائی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اکیلی دھکے کھاتی' جگہ بناتی آگے بڑھنے لگی کہ ایک ہپی لڑکے نے اس کا بازو دبوچ لیا۔ سیکیورٹی فوج تیزی سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ ساٹھ ہزار شائقین کے ہجوم میں ایک دم سے بھگدڑ مچی۔ تیزی سے باہر نکل جانے کا انداز ایسا ہو گیا جیسے قیامت آ گئی ہو۔ خالی بوتلیں اور جسم کے دوسرے حصوں پر آ کر لگنے لگیں۔ دوبارہ امرحہ کی کمر پر کوئی نوکیلی چیز آ کر لگی۔ جس نے اس کا بازو دبوچا تھا۔ پوری قوت لگا کر اس سے بازو چھڑوا کر وہ آگے کو بھاگی تھی۔ لیکن اس کے بازو پر پھر وہی گرفت پڑی اور سرخ آنکھوں والے اس عادی نشئی ہپی لڑکے نے اس کی گردن پر جھک کر کاٹنا چاہا۔ امرحہ نے پوری شدت سے چیخ ماری۔

سڑک پر ہی پھینک کر وہ رش میں مخالف سمت بھاگا‘ ویرا بھی اس کے پیچھے لپکی۔

”تم اس گیٹ کی طرف جاؤ‘ میں دوسرے گیٹ کی طرف جاتی ہوں۔“ بھاگتے ہوئے ویرا چلائی۔

اس کے بھاگنے کے انداز میں اتنی شدت اور تیزی تھی کہ وہ بہت سوں کو پھلانگتا‘ گراتا‘ دھکے دیتا ہوا آگے بڑھا۔ ایک ہجوم تھا جو منتشر باہر نکل رہا تھا اور پولیس کی نفری بڑھتی ہی جارہی تھی‘ جو ہجوم میں نظم لانے کی کوشش کررہے تھے۔ بچوں کے رونے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ بھگدڑ کا ماحول تھا۔

”امرحہ!“ وہ پوری قوت سے رش میں گھس کر چلانے لگا‘ اس کی آواز میں ایسی گرج تھی کہ اتنی افراتفری میں بھی بہت سوں نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”امرحہ!“ وہ پھر چلایا۔ اس کی سانسیں بے قابو ہورہی تھیں۔ اگر امرحہ فوراً اس کے سامنے آجاتی تو وہ زمین پر گرجاتا۔ اس میں کھڑا ہونے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ وہم اسے ہولانے لگے تھے اور خوف نے اس کے دل پر پنجے گاڑ دیے تھے۔

اسے الہام ہوا اور وہ گیٹ سے اندر ہوگیا۔ پولیس کی نفری کھڑی سب کو باہر نکال رہی تھی‘ لیکن وہ سر کو جھکا کر اس پار ہوگیا۔ اسے پورے اسٹیڈیم کے ہزاروں چکر بھی لگانے پڑتے تو اسے کم لگتے اس انسان کے لیے جسے تلاش کیا جارہا تھا۔

امرحہ باہر ہوسکتی تھی۔ اسے یہ خیال آیا تھا‘ لیکن اس کا وجدان اسے بتا رہا تھا کہ وہ اندر ہی ہے اور ٹھیک نہیں ہے۔

اس نے اس کا بازو کسی خونخوار جانور کی طرح پکڑ رکھا تھا اور وہ اسے گھسیٹ کر کسی خاص سمت لے کر جارہا تھا۔ وہ چلا رہی تھی‘ خود کو آزاد کروانے کی کوششیں کررہی تھی‘ لیکن اسی ہپی کے دوسرے ساتھی نے اس کے گرد گھیرا سا بنالیا تھا اور اسے مضبوطی سے کمر سے پکڑ رکھا تھا اور وہ دونوں آپس میں اپنی زبان میں بات کررہے تھے جسے امرحہ نہیں جانتی تھی۔

عالیان تیزی سے ادھر ادھر بھاگ رہا تھا اور اسے مسلسل آوازیں دے رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر گراؤنڈ کے اوپر پرواز کرنے لگا۔ یعنی معاملہ شدت اختیار کرچکا تھا۔

سیکورٹی فورس ہر طرف پھیل رہی تھی۔ کہیں سیکورٹی فورس اور شائقین میں تصادم ہو رہا تھا۔ کہیں شائقین اور شائقین میں۔ معاملہ ایسے بگڑ رہا تھا جیسے جلتی آگ پر اور تیل ڈالا جارہا ہو۔

وہ اسے دوسرے گیٹ سے نکال کر باہر لے جارہے تھے۔ ان کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ اسے کسی گاڑی میں ڈال کر لے جانے والے ہیں۔ وہ معاشرے کے موقع سے فائدہ اٹھانے والے‘ ناسور تھے جو ہر جگہ پائے جاتے ہیں اور اپنی بدخصلتی سے باز نہیں آتے۔

کارل کو سائی مل چکا تھا اور اس نے امرحہ کے لاپتا ہونے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ دوسری طرف اندر سے کارل آیا تھا۔ این‘ سائی‘ شاہ ویز اور چند دوسرے اسٹوڈنٹس اسے باہر رش میں دیکھ رہے تھے۔ سائی نے سب کو فون کرکے بتا دیا تھا‘ کیونکہ امرحہ کا فون بند جارہا تھا تو اسے ڈر تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔

کارل کی نظر دور امرحہ پر پڑی اور وہ تیزی سے بھاگتا ہوا اس کی طرف آیا۔ وہ عام نارمل انداز سے نہیں چل رہی تھی۔ اسے ایک لڑکا گھسیٹ رہا تھا اور دوسرا اس کے منہ پر بار بار ہاتھ رکھ کر اس کا منہ دبا رہا تھا۔ کارل اس کے پاس پہنچتا اس سے پہلے عالیان سیٹیں پھلانگتا ہوا ان کے قریب چلا گیا۔ وہ پیچھے کہیں سے تیزی سے بھاگتا ہوا آیا تھا اور اس نے آتے ہی ان لڑکوں کو لاتیں اور گھونسے مارنے شروع کردیے۔ کارل بھی پہنچ گیا اور جس کی گردن ہاتھ آئی اس نے دبوچ لی۔

امرحہ بری طرح سے خوف زدہ تھی۔ وہ کانپ رہی تھی اور اس کے سر سے خون نکل رہا تھا اور ناک منہ سے بھی۔

دو لڑکے پہلے ہی بھاگ گئے اور ایک کارل سے خود کو چھڑا کر بھاگا۔

امرحہ پر نظر پڑتے ہی عالیان کی آنکھیں نم

ہو گئیں۔ اس نے ڈری سہمی امرحہ کو اپنے ساتھ لگالیا اور ہاتھ سے اس کی ناک منہ کا خون صاف کیا اور اس کے سر کے زخم دیکھنے لگا۔

"تمہیں کافی چوٹ آئی ہے۔" اس نے یہ کہا اور اس نے یہ سنا تو وہ فوراً خود کو رونے سے روک نہیں سکی۔

"نہیں زیادہ نہیں ہے۔ مجھے بالکل تکلیف نہیں ہو رہی اب۔" ٹوٹ ٹوٹ کر الفاظ نکلے جیسے جذبات کی شدت سے الفاظ بکھر سے گئے۔

اس کا سر عالیان کے سینے سے لگا تھا۔ اس سر پر لگی کتنی بھی بڑی چوٹ میں درد کیسے اٹھ سکتا تھا بھلا۔

کارل نے جلدی چلنے کا اشارہ کیا اور آگے بھاگ گیا۔ اسے اپنے ساتھ لگائے عالیان باہر کی طرف آیا۔

اور گیٹ سے باہر ہونے سے پہلے ایک زوردار دھکا لگا کہ امرحہ کا ہاتھ عالیان سے چھوٹ گیا اور وہ گر پڑنے کے انداز سے بہت آگے نکل گئی۔

"سڑک سے دور کسی محفوظ حصے کی طرف بھاگ جانا امرحہ......" عالیان پیچھے سے چلایا اور پورا زور لگا کر اس نے ہجوم میں سے جگہ بنا کر آگے نکل جانا چاہا۔

امرحہ نے دھکے کھاتے آگے بڑھتے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور عالیان کا دل وہیں ٹھہر گیا۔

"احترام واجب ہے۔ سماں عشق ہے۔"

ہجوم نے اسے ایک اور دھکا دیا وہ آگے نکل گئی۔

دھکے نے اسے لڑکھڑا دیا اور وہ اور پیچھے رہ گیا۔

امرحہ نے پھر گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"وقت نے دغا دی وہ وہیں ٹھہر نہ گیا۔"

اگلے دھکے سے وہ باہر نکل گئی۔

سڑک کا منظر کچھ اور ہو چکا تھا۔ منٹوں کی گیم تھی، لمحوں میں بدل گئی۔ سیکورٹی فورس منتشر ہجوم سے نپٹنے میں مشغول تھی۔ رات کا وقت تھا اور آنسو گیس کے دھوئیں نے رات کو خطرناک بنا دیا تھا۔ ربڑ کی گولیاں فائر کی جارہی تھیں۔ مختلف اشکال کے ماسک پہنے ہوئے افراد سیکورٹی فورس پر ٹھوس چیزیں اور آنسو گیس اچھال رہے تھے۔ کہیں کچھ گروپس آپس میں متصادم تھے، کس فورس کے ساتھ......

ایک بڑا ہنگامہ برازیلا اسٹیڈیم کے اندر اور باہر پھوٹ چکا تھا۔

ایک ایسا ہنگامہ جو سانحے میں بدلنے ہی والا تھا۔ ایمبولینس کے سائرن کی آوازیں چار سو گونج رہی تھیں...... دور دور تک سڑک پر ایک جنگ کا عملی منظر دیکھا جا سکتا تھا۔

"تصادم کی تصویر تھی اور بغاوت کی بو۔"

وہ سڑک پر نکل کر ایک سمت بھاگنے لگا۔ کارل اس کے پیچھے ہی تھا۔

"امرحہ کہاں ہے؟" کارل نے چلا کر پوچھا۔

"اسے میں نے سڑک سے دور نکل جانے کے لیے کہا تھا۔" دو فائر فضا میں گونجے اور چیخوں سے کان پھٹنے لگے۔ ان پر شیشے کی بوتلیں اچھالی گئیں۔ ایک نے آگے بڑھ کر کارل پر حملہ کرنا چاہا جسے کارل نے پہلے ہی دبوچ لیا اور سڑک کے ایک طرف نیچے زمین پر پٹخ دیا۔

وقفے وقفے سے، لیکن تیزی اور شدت سے آنسو گیس اچھالی جارہی تھی اور ربڑ کے فائر کیے جارہے تھے۔ کون دفاع کر رہا تھا اور کون حملہ، فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ عالیان تیزی سے سڑک پر بھاگ رہا تھا اور چلا رہا تھا۔ "امرحہ!"

اس کے پیروں تلے کی زمین کھسکتی جارہی تھی اور اس کی آنکھوں کے آگے بار بار اندھیرا چھا رہا تھا۔ اسے اپنا خواب یاد آرہا تھا۔ اندھیرا۔ دھواں...... تصادم اور خطرہ۔

نشانیاں اچھی نہیں تھیں۔ وہ ذرا دیر کو رک کر ہانپنے لگا۔ اس سے اگلا قدم اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کے پیروں کے پاس آکر ایک گیس کا گولا گرا...... وہ تیزی سے دوسری طرف ہوا۔ اس کے بازو پر ربڑ کی گولی آکر لگی، لیکن وہ رکا نہیں، اس کا جسم اسے حرکت کرنے سے جواب دیتا جارہا تھا۔ اس کی کیفیت اس انسان سی ہو گئی، جسے اپنے کسی عزیز کے تابوت کو اٹھانے کے لیے کہا جاتا ہے اور وہ خود کو پہاڑ اٹھا لینے کے قابل تو سمجھ لیتا ہے، لیکن وہ تابوت نہیں۔

برا، یلا اسٹیڈیم دھواں اگلنے لگا۔۔۔ چند ایک جگہ آگ بھڑک اٹھی۔۔۔ دھوئیں کے پھیلاؤ سے سڑک پر حرکت محال ہو گئی۔

پوری قوت لگا کر وہ پھر بھاگا اور چلایا۔ ”امرحہ۔۔“

وہ ساری دنیا کو آگ لگا دے گا۔۔۔ اگر کچھ ہوا تو۔۔۔ وہ سب کچھ جلا ڈالے گا۔ اب وہ طیش سے سڑک پر بھاگنے لگا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ راستے میں آنے والوں کو روند ڈالے، کچل ڈالے، ورنہ حلق پھاڑ کر اتنی شدت سے چلائے کہ سب اپنی اپنی جگہ ساکت ہو جائیں۔

اس نے پھر آواز دی۔ ”امرحہ۔۔۔“

☆ ☆ ☆

اس کا دوپٹا کب کا کہیں گر چکا تھا۔ اسے چلنے میں مسئلہ ہو رہا تھا۔ چند لوگ اس پر آ گرے تھے اور اس کی ٹانگ جیسے ٹوٹ ہی گئی تھی۔ وہ بمشکل لنگڑا کر چل رہی تھی۔ دھوئیں کے بادلوں میں اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سخت چبھن ہو رہی تھی اور ان میں سے مسلسل پانی نکل رہا تھا۔

وہ کبھی ایسے کسی تصادم سے دوچار نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو زندگی میں پہلی بار فٹ بال میچ دیکھنے اسٹیڈیم آئی تھی۔ اسے تو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ ہنگامی صورت حال میں کیا کرنا چاہیے۔ اس وقت اس کی عقل بالکل ماؤف ہو چکی تھی اور وہ بری طرح سے سہم چکی تھی۔ اسے ہر ایک سے ڈر لگ رہا تھا کہ کوئی اسے گھسیٹے گا یا مار دے گا۔ سڑک کا منظر انتہائی ہولناک ہو چکا تھا۔ اس کا دل چاہا واپس اندر بھاگ جائے۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس طرف کو بھاگے اور پھر جس طرف بہت سے لوگ بھاگے جا رہے تھے وہ بھی بھاگنے لگی۔ سڑک پر وہ سب منتشر ہو گئے۔ سیکیورٹی فورس کی نفری بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ پھر بھی تصادم تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ وہ تیزی سے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ لیکن اب وہ ڈیفنس کرنے کی پوزیشن میں آ چکے تھے جو گروپس حملے کر رہے تھے ان کے حملے بہت شدید تھے۔

صرف چند منٹ۔ لگے یہ سب ہونے میں، صرف چند منٹ۔

عالیان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ ٹھیک سمت بھاگ رہا ہے یا نہیں، بس اسے اس کا وجدان کہہ رہا تھا کہ اسے اسی سمت جانا چاہیے۔

ایک اور گولا اس کے پیچھے اور ذرا آگے آ کر گرا۔۔۔ اور دھوئیں کے بادل پھیلنے سے پہلے اس نے امرحہ کو بہت دور دیکھ لیا۔

”امرحہ!“ وہ پوری جان سے چلایا کہ وہ اس کی طرف دیکھ لے، لیکن وہ بہت دور تھی، اس سے ٹھیک سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ وہ ڈر کر کھڑی تھی۔ اس سے ذرا آگے ایک گروپ میں تصادم ہو رہا تھا اور اس کے پیچھے گیس کے گولے پھینکے جا رہے تھے۔

فاصلہ سمٹا، وہ بھاگ کر اس کی طرف لپکا۔

سڑک کے دوسری طرف سے تصادم کے اس پار سے ویرا نے اسے دیکھ لیا اور وہ اس کی طرف بھاگی۔

”امرحہ۔۔۔“ فاصلہ سمٹ چکا تھا۔ وہ اس سے کچھ ہی دور تھا۔ اب امرحہ نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”ارتکاز واجب ہوا۔۔۔ سماں یار غالب آیا۔“

اور اتنی دور سے وہ عالیان کے اس طرح اپنی طرف بھاگتے آنے پر فدا ہو گئی۔

”محبت صبح کا عالم ہے۔ اس میں رات نہیں ہوتی۔“

وہ اس کے لیے کیسے بھاگا پھر رہا تھا۔

”محبت ابد کی گھڑی ہے۔ یہ فنا نہیں ہوتی۔“

جو ہو چکا تھا اب تک۔۔۔ وہ وہیں مٹ چکا۔

”محبت، طرب کا ساز ہے۔ اس میں آہ نہیں ہوتی۔“ جو فاصلہ تھا وہ کم ہونے لگا۔

”کہیں مت جاؤ۔“ دھوئیں کے بادلوں نے دو لوگوں کی ایک سوچ کو جا لیا۔ ”اب کہیں مت جاؤ۔“

وہ عالیان کی طرف گھوم چکی تھی اور اس کی طرف آ رہی تھی۔

اور ایک بھڑکے ہوئے لڑکے نے انگلینڈ ٹیم کی

شرٹ پہنے ایک لڑکی کے سر پر شیشے کی وزنی بوتل سے ضرب لگائی۔

وہ لڑکی جو امرحہ تھی۔ ویرا بجلی کی سی تیزی سے امرحہ کی طرف لپکی۔

کارل اور سائی بھی آگے پیچھے اس کی طرف آرہے تھے۔ اس کے سر پر ضرب لگتے دیکھ کر ساری زمین عالیان کے پیروں تلے سے کھسک گئی اور وہ بھاگتے بھاگتے رک گیا' کیونکہ۔۔۔

دو فائر ہوئے۔

برازیلا اسٹیڈیم کے باہر پھیلا سارا دھواں عالیان کی آنکھوں میں گھس آیا۔ سارا بھاگتا دوڑتا ہجوم اس کے جسم کو روندنے لگا۔

وہ جہاں تھا' وہیں کھڑا رہ گیا۔

ایک فائر ربڑ کی گولی کا تھا۔

ویرا پوری شدت سے چلائی اور کتنے ہی لوگوں کو پھلانگتی ہوئی اس کی طرف آئی۔

"فریز!" دوسرا فائر ربڑ کا نہیں تھا۔

کارل اور سائی نے کتنوں کو ہی دھکے دے کر گرا کر اس تک پہنچ جانا چاہا۔ وہ دونوں اس سے چند قدم کے فاصلے پر پہنچ گئے۔

"فریز!"

"کچھ فیصلے صرف دائمی جدائی کے ہاتھوں ہی طے پاتے ہیں' اس سے پہلے خبر ہوتی ہے' نا احساس۔"

اطراف میں پھیلا دھواں' فورس کی نفری' بھاگتے دوڑتے اجسام۔۔۔ سب ہی۔

"فریز۔۔۔"

سب جامد ہو گیا۔

وہ سڑک پر گھٹنوں کے بل گری اور پھر اس کی پشت سڑک سے جا لگی۔ خون اس کے گرد پھیلنے لگا۔

"امرحہ!" اس نے چلانا چاہا' لیکن چلا نہیں سکا۔ وہ وہیں اس سے کچھ دور کھڑا تھا۔ وہ جو امرحہ کا عالیان تھا۔

اس نے اس کی طرف بھاگنا چاہا' لیکن بھاگ نہیں سکا۔

تو یہ ثابت ہو گیا۔ "جسم سے جان اس وقت نہیں نکلتی جب اپنی جان نکلتی ہے۔ یہ جان اس وقت نکلتی ہے جب جان سے پیارے کی جان نکلتی ہے۔"

"دعا واجب کردی گئی۔ سماں ہجر کی منادی ہوئی۔"

اس کے جسم نے جان چھوڑ دی اور وہ گھٹنوں کے بل سڑک پر گرتا چلا گیا۔ اس کا اپنا جسم ٹکڑوں کی صورت منتشر ہوا۔

دنیا میں کوئی دہائی دینے کے لیے تیار ہوا۔

امرحہ کے سر پر پہنچنے سے پہلے کارل نے عالیان کی طرف دیکھا اور اس نے جانا کہ اگر ایک مر چکا تو دوسرا مرنے جا رہا تھا۔ کیونکہ عالیان نے اس انسان کی بند ہوتی آنکھیں دیکھ لیں' جن میں اس نے خود کو بند کر لیا تھا۔

اس کی آنکھ سے خون ٹپکنے لگا' جس کا رنگ سرخ نہیں تھا۔

امرحہ کے وجود سے عالیان کی اپنی زندگی قطرہ قطرہ بہنے لگی' جس کا رنگ سرخ ہی تھا۔

اے آنکھ تو کیوں روتی ہے
قافلے والے چلے گئے
اے آنکھ پھر تو کیوں روتی ہے
وہ مجھے پیچھے اکیلا چھوڑ گئے
اے آنکھ تو رونا بند کر
اس قافلے میں میرا محبوب تھا
افسوس! ہاں پھر تو رو۔۔۔

سانسیں روک لی ہیں اور دل دھڑکنا بھول گیا ہے۔

(امرحہ اور عالیان کے درمیان اس کشمکش کا فیصلہ وقت کس انداز میں کرے گا۔ عالیان کی زندگی میں امرحہ ایک خوب صورت "یاد" بن کر زندہ رہے گی؟

(آخری قسط آئندہ ماہ)

قیوم صاحب کی بیگم چودھویں بچے کی پیدائش پر فوت ہو جاتی ہیں۔ کثرت عیال کی وجہ سے قیوم صاحب بچوں کی طرف سے لاپروا ہو جاتے ہیں۔ سو حارث قیوم کی تمام تر ذمہ داری زینب آپا پر آجاتی ہے، جو اس سے سولہ سال بڑی ہیں۔ حارث قیوم شروع سے ہی بدتمیز جھگڑالو اور ڈھیٹ واقع ہوا تھا۔ اپنی حرکتوں اور زبان درازی کی وجہ سے سارے بہن بھائی اس سے نالاں اور دور رہا کرتے تھے۔ صرف زینب آپا اس سے محبت کرتی تھیں۔ اس کا خیال رکھتیں، جبکہ وہ زینب آپا سے بھی بدتمیزی سے پیش آتا تھا۔ حارث قیوم کھیل کود میں لڑائی جھگڑے میں اکثر ہی خطرناک چوٹیں لگوالیا کرتا تھا مگر اسے تکلیف کا احساس زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ بچپن سے ہی سخت ہڈی تھا۔ وہ ابا اور بڑے بھائیوں سے مار کھا کھا کر بھی بہت ڈھیٹ ہو گیا تھا جبکہ زینب آپا اس کی چھوٹی چھوٹی تکلیف پر تڑپ جاتی تھیں۔ زینب آپا بیاہ کر چلی گئیں تب بھی اس کی پل پل کی خبر رکھتیں اور ہر موقع پر سب سے پہلے اس کے پاس پہنچ جاتیں۔ حارث قیوم کو اپنے بہن بھائیوں سے نفرت تھی، مگر زینب آپا کے لیے بھی دل سے محبت اور احترام نہ رکھتا تھا۔

زینب آپا کے میاں شفیق بھائی سعودی عرب میں رہتے تھے۔ شادی کے کچھ عرصے بعد انہوں نے زینب آپا کو بلوالیا۔ اس وقت حارث سولہ سال کا تھا۔ زینب آپا کو شدید رنج تھا حارث کو چھوڑ کر جانے کا مگر ان کے رونے دھونے سے وہ شدید

ناولٹ

جز رہا تھا۔ ان کے سعودی عرب جانے کے بعد زینب آپا کو اطلاع ملتی ہے کہ اس نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ ایک لڑکی کو اغوا کر کے عصمت دری کی ہے۔ نابالغ ہونے پر اسے صرف قید کی سزا دی گئی تھی۔ اس کے ابا اور بھائیوں نے اس سے قطع تعلق کر لیا مگر زینب آپا نے سعودی عرب میں رہتے ہوئے بھی اس کا خیال رکھا۔ اگرچہ وہ اس کی اس حرکت پر بے حد شرمندہ اور ملول تھیں مگر اکثر اسے فون کرتیں۔ پاکستان میں مقیم اپنی سہیلی کے ہاتھ اس کی ضرورت کی چیزیں بھجواتی رہتیں۔ وہ فون پر روتے ہوئے کہتا۔ مجھے چھڑا لو، دو چار لاکھ روپے انہیں دے دو اور جیل سے نکلوا دو۔ زینب آپا اس سے کہتی ہیں کہ جیل میں اچھا رویہ اور کردار رکھو۔ تمہاری سزا کم یا معاف کردی جائے گی۔ پھر میں تمہیں سعودیہ بلوالوں گی۔ حارث دل میں زینب آپا کو خوب گالیاں دیتا ہے۔ ساڑھے دس سال جیل میں گزار کر بالآخر زینب آپا اسے سعودیہ بلوالیتی ہیں۔ زینب آپا کی اولاد نہیں ہوتی، شفیق بھائی ان سے بے حد محبت کرتے ہیں اور ان ہی کی خاطر وہ حارث کا بھی خیال رکھتے ہیں، حالانکہ وہ سمجھتے ہیں کہ حارث آپا سے بہت بدتمیزی کرجاتا ہے۔ سعودیہ آکر بھی وہ اکثر زینب آپا کو طعنہ دیتا کہ تم نے پیسے بچائے اور میرے ساڑھے دس سال ضائع کیے۔ زینب آپا اس کی ساری بدتمیزیاں برداشت کرتیں، کیونکہ وہ اسے ماں کی طرح چاہتی ہیں اور شفیق بھائی ان کی خاطر حارث کی بدتمیزیاں نظرانداز کرتے رہتے۔ حارث سعودی عرب دراصل اپنے ساڑھے دس سال ضائع کردینے پر زینب آپا سے بدلہ لینے آیا ہے۔ وہ یہاں آکر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا۔ زینب آپا اور شفیق بھائی عمرہ کرنے جاتے ہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں وہ ایک فلپائنی عورت کو گھر لے کر آتا ہے مگر رقم کے معاملے میں جب بات نہیں بنتی تو وہ اس کے ساتھ زبردستی کرتا ہے اور تہہ خانے میں بند کردیتا ہے۔ اتفاق سے

ٹکٹ بھول جانے پر زینب آپا اور شفیق بھائی کو دوبارہ گھر آنا پڑتا ہے۔ یہ صورت حال دیکھ کر وہ دونوں فق رہ جاتے ہیں اور پھر بے حد مجبور ہو کر زینب آپا شفیق بھائی کو پولیس بلانے کی اجازت دے دیتی ہیں۔

۲

دوسری قسط

"کیا اس عورت کی قسمت میں کوئی سکھ۔ کوئی خوشی نہیں ہے؟" شفیق بھائی نے انہیں بیسمنٹ کا دروازہ کھول کر اندر جاتے دیکھ کر غم سے سوچا تھا اور پھر وہ کال ملانے لگے تھے۔

ضبط، جبر اور پھر صبر۔ یہ کتنا مشکل ہے، یہ کوئی زینب قیوم سے پوچھتا۔

اس عورت کے ہاتھ پاؤں کھولنے کے بعد زینب آپا نے اس کا حلیہ ٹھیک کیا تھا اور اسے ساتھ لے کر وہ اندرونی حصے کا لاک ایک دفعہ پھر کھول کر اندر داخل ہوئی تھیں۔ اسے خاموش رہ کر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ حارث کے کمرے میں گئی تھیں۔

وہ ابھی تک بے سدھ پڑا تھا۔ بیسمنٹ میں ہونے والی کسی بھی قسم کی کارروائی کی آواز گھر کے اندرونی حصے میں نہیں آسکتی تھی اور گھر سے باہر بھی مشکل سے جاتی۔ وہ چند لمحے حارث کو دیکھتی رہیں۔ انہیں بس اس پر ترس آرہا تھا۔ بے انتہا ترس ایسا اور اتنا ترس جیسا آج سے پہلے انہوں نے کبھی بھی اس کے لیے محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھ کر آہستہ آہستہ سے اس کا سر سہلانے لگی تھیں۔ کیوں؟ انہیں نہیں معلوم تھا۔ وہ نہیں جانتی تھیں وہ جاگ سنہ پایا، مگر نہ معلوم اس وقت کیسے اٹھ گیا تھا۔

"آپا!" وہ نیند میں بوجھل آنکھیں بمشکل کھولے حیرانی سے بولا تھا۔

اس وقت اس کے ذہن میں بالکل بھی نہیں تھا کہ وہ کیا کرچکا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ مکمل ہوش میں آتا زینب آپا تیزی سے اٹھیں اور دروازہ باہر سے لاک کردیا تھا۔

جب پولیس اس فلپائنی عورت اور حارث کو پکڑ کر لے جارہی تھی تو وہ اک شاک کے سے عالم میں تھا۔

دس سال پہلے وہ جیل "زینب آپا" کی وجہ سے نہیں گیا تھا مگر وہ "زینب" کی وجہ سے ہی دس سال قید میں رہا تھا اور آج ... آج وہ "زینب" ہی تھیں جن کی وجہ سے وہ دوبارہ قید میں جارہا تھا۔ وہ زینب جو کہ اس کے لیے "خدا" ہو سکتی تھیں ہاں! وہی زینب۔ وہ شدید قسم کے شاک کا شکار ہوا تھا۔

اس رات زینب اور شفیق نے محض ایک گلاس پانی کا پی کر روزہ رکھا تھا۔ اور جب زینب نے آسمان کی طرف منہ کرکے سوال پوچھا تھا تو جواب میں وہ آیت آئی تھی۔

"ہرگز نہیں چھو سکتے تم نیکی کو یہاں تک کہ تم خرچ کردو جس سے تم محبت کرتے ہو۔"

اور زینب کو کرنا پڑا انہیں ثابت کرنا پڑا۔

"کیا انہیں حارث سے بڑھ کر کوئی چیز پیاری ہو سکتی تھی؟" اس کا جواب "نہیں" بھی ہو سکتا تھا مگر اب یہ جواب نفی میں نہیں تھا۔ اب یہ "ہاں" تھا۔ انہیں "اللہ" سب سے بڑھ کر پیارا تھا۔

☆ ☆ ☆

بعض اوقات زندگی اتنی مشکل لگتی ہے کہ مرنا جینے کی نسبت زیادہ آسان لگتا ہے۔

وہ بھی ایسا ہی چاہنے لگی تھیں۔ مگر وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ ان کا تعلق اس مذہب کے پیروکاروں میں سے تھا جہاں مرنا اپنے ہاتھ میں نہیں تھا۔ وہ جس کی

امانت تھیں وہ اپنے وقت پہ واپس لے لی جائے گی مگر تب تک انہیں جینا ہی تھا۔

وہ زبان سے "اللہ" کو یہی بتاتی تھیں کہ وہ اس کی "رضا" میں راضی ہیں اور یہ کہ وہ "مان جانے" والوں میں سے ہیں۔

مگر۔ اندر کہیں۔۔۔ دل کی کسی تہہ میں چھپے کسی خانے میں پوشیدہ ایک ناراضی بھرا شکوہ بھی تھا۔

"کیا زینب قیوم کی عبادت اس لائق نہیں تھی کہ اس کی "دعا" قبول کی جاتی؟"

"کیا زینب قیوم "اس" کے لیے اتنا بھی معنی نہیں رکھتی تھی کہ "وہ" اسے اس غم سے بچالیتا۔"

"کیا ضروری تھا کہ زینب قیوم کا اسی طرح سے امتحان لیا جاتا؟"

زینب کے "شکوے کا کوئی "جواب شکوہ" نہیں تھا۔ اور یہ بھی جانتی تھی کہ تمام تر شکووں کے باوجود اسے "ماننا" ہی تھا۔

"اس کے آگے ماننے کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا؟"

تو کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ "شکوہ" کیا ہی نہ جائے۔

مگر یہ "شکوہ" یہ کیا ہی کب جاتا ہے یہ تو خود بخود بے دھیانی میں دل میں ابل پڑتا ہے اور انسان حیران رہ جاتا ہے کہ کیا اس کی اتنی بساط تھی کہ وہ اس "علم یزل" کے آگے کچھ کہہ سکے انسان صرف "مان جانے" کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ سو اسے مان جانا چاہیے اسی میں بہتری ہے۔ یقین کیجیے اسی میں بہتری ہے۔

سو زینب بھی مان جاتیں۔

تھوڑی سی ناراضگی۔۔۔ ہلکے سے شکوے کے بعد وہ بھی مان جاتی تھیں۔

ہاں! البتہ اب "تسبیح" گردش نہیں کرتی تھی۔ ان کی آنکھیں گردش کیا کرتی تھیں۔ کالے۔۔۔ تاروں بھرے آسمان پہ۔۔۔ تب جب "وہ" ساتویں آسمان پہ براجمان ہوا کرتا تھا۔ وہ نم۔۔۔ فریاد بھری آنکھیں۔۔۔ چاہتی تھیں کہ ان کے "سوال" کو جواب بخشا جائے۔ وہ "دے دیا" جائے۔۔۔ جس کی طلب پہ وہ آسمان کا طواف کیا کرتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

شروع کی تحقیق میں فلپائنی عورت نے یہ ہی ثابت کرنا چاہا تھا کہ اسے اغوا کیا گیا تھا' مگر جب پولیس نے گھر کی تلاشی لی تھی جائے وقوعہ کا معائنہ کیا تھا تو اس دوران حارث اور فلپائنی عورت کا سیل فون بھی قبضے میں لیا گیا تھا۔ اور بس۔۔۔ سب کچھ ثابت ہو گیا۔ طبی معائنے اور میڈیکل رپورٹس اس کے علاوہ تھیں کچھ شک و شبہے والی بات رہ ہی نہیں گئی تھی۔

حارث بری طرح سے ٹینشن کا شکار تھا' وہ اک لمبا عرصہ پھر سے جیل میں گزارنا نہیں چاہتا تھا۔

مگر وہ بھول رہا تھا اب وہ نابالغ نہ تھا اور نہ ہی یہ پاکستان تھا۔ یہ سعودی عرب تھا اور یہ وہ ملک تھا جہاں پہ اس قسم کے جرم کی سزا سرعام۔۔۔ دی جاتی تھی اور ویسے ہی دی جاتی تھی کہ جس طرح دینے کا حکم تھا۔ مگر حارث کے لیے ایک گنجائش ابھی بھی موجود تھی۔ وہ ابھی غیر شادی شدہ تھا۔ اس لیے اسے سو کوڑوں کی سزا سنائی گئی اور وہ فلپائنی عورت۔۔۔ وہ شادی شدہ تھی گو کہ وہ غیر مسلم تھی مگر اس وقت اس نے سعودیہ میں رہتے ہوئے سعودی قانون کی خلاف ورزی کی تھی' سو اس کے جرم کی بھی وہ ہی سزا تھی جو سعودی قانون کے مطابق رائج تھی۔

یہ سزا سن کر حارث نے نجانے کیوں "خوف" کو اس طرح سے محسوس نہیں کیا تھا جس طرح سے کوئی عام انسان کرتا بلکہ اسے اس بات کی طمانیت زیادہ تھی کہ وہ قید سے بچ گیا تھا۔

مار کا کیا تھا۔۔۔ وہ تو بچپن سے کھاتا ہی آیا تھا۔ اب کی بار جوتے' تھپڑ یا پھر پائپ کا' بیلٹ نہ سہی ہنٹر سہی۔۔۔ کوڑے سہی کیا فرق پڑتا تھا!

اسے ایک کھلے میدان میں لے جایا گیا تھا۔ اس کے دونوں بازوؤں کو دو شرطوں (سعودی پولیس کے سپاہی) نے پکڑ رکھا تھا۔ ایک مجمع کے سامنے لے جا کر

اس کو شرٹ اتارنے کے لیے کہا گیا تھا۔ اس نے شرٹ اتار دی تھی۔ ان دونوں نے پھر سے اس کے بازوؤں کو سختی سے پکڑ لیا تھا۔

وہ اب صرف ایک پینٹ پہنے ہوئے تھے۔ ایک سپاہی کے ہاتھ میں موٹا۔۔۔ کالا ہنٹر تھا جس کو اس نے حارث کی کمر پہ برسانا شروع کیا تھا۔ یہ منظر اہل سعودیہ کے لیے نیا نہیں تھا مگر ان کے لیے یہ نیا ضرور تھا کہ "مجرم" آگے سے بچنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا اور اگر اسے کوئی تکلیف محسوس بھی ہو رہی تھی تو وہ اسے اپنے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دے رہا تھا۔ وہ جبڑے بھینچے۔۔۔ سامنے دیکھتے ہوئے ہنٹر کھا رہا تھا جو کہ

پوری قوت سے اس کی کمر پہ برسائے جا رہے تھے۔ ہر دفعہ کوڑا لگنے پہ اس کے جسم کو جھٹکا لگتا تھا۔ مگر وہ ابھی تک اپنے پاؤں پہ کھڑا تھا۔ اردگرد کھڑے سعودی اپنی زبان میں کچھ کہہ رہے تھے۔۔۔ وہ یقیناً "اسے لعن طعن کر رہے تھے وہ ان کی لعن طعن کو سمجھ نہیں سکتا تھا تو اس پہ توجہ بھی دے نہیں رہا تھا۔

وہ تو نہیں "اور" تھا۔ ہر دفعہ "کوڑا" لگنے پہ اسے زینب آپا کا چہرہ یاد آتا۔۔۔ ہر دفعہ وہ انہیں ایک غلیظ گالی منہ ہی منہ میں دیتا۔۔۔ ہر دفعہ جب تکلیف کی شدت سے اس کے جسم کو جھٹکا لگتا تو ہر دفعہ وہ زینب آپا کے چہرے پہ تھوک دیتا۔ ہر ہر کوڑے کے ساتھ اس کی پشت کی جلد پھٹ جاتی تھی اور اذیت اندر سرایت نہیں کرتی تھی۔ وہ نفرت تھی جو سر سے لے کر پیر تک اس کے خون میں شامل ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا خون "سفید" نہیں "کالا" ہو رہا تھا۔

"سیاہ کالا۔۔۔"

جیسے جیسے کوڑوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی اس کا ضبط جواب دیتا جا رہا تھا۔ ایک کے اوپر دوسرا۔۔۔ دوسرے کے بعد تیسرا۔۔۔ اور اسی طرح لگنے والے کوڑوں کی وجہ سے اس کے جسم پہ لہریے دار خون کی قطار سی تھی۔

اور جب اس کا ضبط جواب دے گیا۔ جب اس کی

پشت پہ گوشت کے چیتھڑے ادھڑنے لگے تو۔۔۔ تکلیف کی شدت سے اس نے بلبلا کر زینب آپا کو اونچی آواز میں گالیاں دینا شروع کر دی تھیں۔ وہ انہیں "بددعائیں" دے رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ "اللہ کرے اس کی قبر میں کیڑے پڑیں۔"

کمال ہے۔۔۔! بھرے مجمع میں کوڑے کھاتے اس شخص کو "اللہ" بھی یاد تھا اور کوڑے کھاتے ہوئے وہ زینب کی قبر کو یاد کر رہا تھا۔

"تو کیا اسے اپنی قبر یاد نہیں تھی؟"

"کیا اسے اپنی قبر میں کیڑے پڑنے کا خدشہ نہیں تھا؟"

حالانکہ وہ۔۔۔ وہ وہاں موجود تھا زینب نہیں۔

"انسان کو "اللہ" کی ذات ہمیشہ دوسروں کے لیے یاد آتی ہے۔ اپنی دفعہ وہ بھول جاتا ہے کہ کوئی "اللہ" بھی تھا۔"

"ہاں وہ بھی تو تھا۔"

وہ اب اوندھے منہ گر چکا تھا اور نیم غشی کی سی حالت میں تھا۔ تکلیف سے اس کا دماغ ماؤف ہوتا جا رہا تھا مگر پھر بھی۔۔۔ وہ ہلکی مدھم سی آواز میں۔۔۔ آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

"کیا؟" وہ اب بھی زینب کو "ثواب" پہنچا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کی پشت پہ کچھ زخم اس طرح سے آئے تھے کہ ٹانکے لگانا پڑے تھے اور بعد میں وہ ٹانکے خراب ہو گئے تھے اور ان میں پیپ پڑ گئی تھی۔ وہ کمر کے بل لیٹ نہیں سکتا تھا۔ وہ اوندھے منہ ہی لیٹ سکتا تھا۔ کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ نہیں سکتا۔ ان خراب زخموں نے اسے کسی کام کا نہیں چھوڑا تھا۔ جب زینب آپا اس کے زخموں کو صاف کرتیں ان پہ مرہم لگاتیں تو وہ ان سے ہمیشہ ایک ہی بات کہتا۔

"تم جیسی کوئی بہن نہیں ہو سکتی کوئی "ڈائن" ہی ہو سکتی ہے۔" زینب خاموشی سے اس کا زہر میں ڈوبا ہوا نفرت بھرا لہجہ سنتیں اور اپنا کام کیے جاتیں ان کی

خاموشی حارث کو اور چڑاتی تھی۔ اسے غصہ دلاتی تھی۔

"تم دیکھنا! ایک دن میں بھی ایسا زخم لگاؤں گا تمہیں کہ آپا! تم ساری عمر اسے بیٹھ کر چاٹتی رہو گی۔" وہ مشتعل ہو کر بولتا۔

"شرٹ پہن لو حارث!" وہ اپنا کام ختم کر کے مرہم کی ڈبیا بند کرتے ہوئے یوں کہتیں جیسے کہ وہ سن نہیں سکتیں مگر بول لیتی تھیں اور وہ کھولتے دماغ سے انہیں "ایسا زخم" لگانے کے بارے میں سوچتا رہتا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ "زخم" تو وہ لگا چکا تھا اور وہ بھی ایسا کہ زینب ساری عمر اسے بھول نہیں سکتی تھیں۔

حارث ان دنوں بہت چڑچڑا اور شدت پسند ہو گیا تھا، جب وہ اوندھے منہ لیٹ لیٹ کر تھک جاتا اور سیدھا لیٹ نہیں پاتا تھا تو وہ چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکنا شروع کر دیتا۔ گرم چائے یا دودھ زینب کے ہاتھوں پر گرا دیتا۔ گالیاں دیتا۔ بہن کے بجائے ڈائن کہتا اور کہتا کہ اس نے اچھا نہیں کیا تھا اس کے ساتھ... وہ بدلہ لے کر رہے گا۔ اور زینب... کہا تھا نا کہ وہ عورت... عورت نہیں سراپا "رحم" تھی۔ اک نظر اس پہ ڈال کر نیچے گرے برتن سمیٹنے لگتیں۔ اور جہاں تک بات تھی شفیق بھائی کی تو وہ اپنے نام سے بڑھ کر شفیق تھے۔ یہ دونوں بہن بھائی کا معاملہ تھا وہ ان کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہتے تھے۔

☆ ☆ ☆

"ان نشانوں کو دیکھ کر تمہیں کچھ خیال نہیں آتا حارث! تمہیں تکلیف محسوس نہیں ہوتی؟؟"

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے پشت کیے کھڑا تھا اور ہاتھ میں ایک چھوٹا آئینہ تھا جس میں سے وہ اپنی کمر کو دیکھ رہا تھا اس نے تیز نظروں سے زینب کو دیکھا اور پھر شیشہ پھینک کر ان کے سامنے آیا تھا۔

"آتا ہے، خیال... ضرور آتا ہے اور کیوں نہیں آئے گا خیال، تکلیف بھی محسوس ہوتی ہے یہ مجھے ہمیشہ یاد دلائیں گے کہ میری ماں جیسی بہن نے کیا کیا تھا میرے ساتھ۔"

وہ اب لفظوں کو چبا چبا کر تلخ لہجے میں بول رہا تھا۔ بے اختیار انہوں نے خود کو گہرا سانس بھرنے سے روکا تھا۔ ورنہ وہ کوئی اور تلخ جملہ کہہ دیتا۔ وہ جانتی تھیں کہ ایسا ہی کوئی جواب آتا تھا پھر بھی انسانی جبلت سے مجبور ہو کر سوال کر دیا تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اس کے گھنے بالوں پہ ہاتھ پھیر کر پیار سے، اس کے گال پہ رکھا تھا۔

"کچھ نشان ایسے ہوتے ہیں حارث! کہ وہ زخموں سے بڑھ کر اذیت دیتے ہیں۔

تب ایسے نشانوں کی تکلیف برداشت کرنا ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ میں نے بس تمہیں اس

تکلیف سے بچانا چاہا تھا۔" اپنی تمام تر تندہی و تیزی کے باوجود وہ زینب آپا کے اس طرح کے محبت کے مظاہروں کے بعد سناٹے میں آجایا کرتا تھا۔ اک سکتہ سا ہوجایا کرتا تھا جو اسے کچھ کہنے۔۔۔ کچھ کرنے کے قابل نہیں چھوڑتا تھا۔ جیسے کہ اب۔۔۔ ابھی ابھی اس کے ساتھ ہوا تھا۔ زینب آپا نے ہمیشہ اسے حیران کیا تھا۔ وہ اب بھی اسے حیرت زدہ چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"یہ داغ۔۔۔؟" اس نے ویسے ہی بیٹھے بیٹھے بازو موڑ کر اپنا ہاتھ سمانتھا کے لمس والی جگہ پہ رکھا تھا۔ "یہ ایک سزا ہے۔" اور پھر وہ طنزیہ انداز میں بولا تھا۔

"سزا" وہ شدید حیران ہوتے ہوئے اس کے پیچھے سے آکر کھڑے ہوتے ہوئے بولی تھی۔

"جوانی کی سزا" اس نے مزید سمانتھا کو حیران کیا تھا۔

"کیا؟ اس لبرل اور ماڈرن دور میں اب بھی کوئی ایسا ملک ہے جو ایسی سزائیں دیتا ہے۔" سمانتھا انگلش میں تیز لہجے میں بولی تھی۔

"اوہ خدایا! کیا کسی مذہب میں ایک غلطی کی سزا اتنی بھیانک ہوسکتی ہے۔" اس کے چہرے پہ خوف کے سے تاثرات تھے اور حارث نے سوچا کہ وہ کیا کرنے آئے تھے اور بات کدھر جا پہنچی تھی۔۔۔ مذہب۔۔۔ جو اس کی زندگی میں شاید آخری مقام پہ بھی نہیں تھا مگر اس کو سمانتھا کے تاثرات مزا دے رہے تھے۔

"یہ سزا اس لیے تھی کہ میں سنگل تھا اگر میں میرڈ ہوتا تو وہ مجھے سنگسار کر دیتے۔" اس نے مزا لیتے ہوئے اسے بتایا تھا ادھر سمانتھا۔۔۔! وہ فق چہرے کے ساتھ اس کی شکل دیکھ رہی تھی' وہ ہنس پڑا۔ بے اختیار سمانتھا نے تھوک نگلا تھا اور پھر۔۔۔ اس کے بعد جو اس نے کہا تھا اس بات نے حارث کا چہرہ "فق" کر دیا تھا۔

وہ سفید پڑتے چہرے کے ساتھ یک ٹک سمانتھا کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ یہ کیا کہہ دیا تھا اس نے۔

☆ ☆ ☆

"زینب!" وہ کچن میں کام کررہی تھیں جب ہی انہیں شفیق بھائی نے بلایا تھا۔ وہ مصروف سے انداز میں کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

"کیا بات ہے؟" اور شفیق بھائی نے سامنے کھلی الماری کی طرف اشارہ کردیا۔

الماری کا سب سے محفوظ حصہ کھلا پڑا تھا اور ان کے زیور۔۔۔؟ وہ اک لمحے کے لیے شاکڈ ہوئی تھیں۔

"اور میں سمجھی وہ آج ابھی تک سو رہا ہے۔" پھر ہلکا سا ہنس کر بولی تھیں۔ اتفاق سے آج انہوں نے صبح کے بعد حارث کے کمرے میں نہیں جھانکا تھا۔ وہ صبح کافی دیر تک سونے کا عادی تھا۔

"زخم ٹھیک ہوگئے تھے نا اس کے۔۔۔ اب یہاں رہ کر کیا کرنا تھا اس نے۔" وہ آگے بڑھ کر الماری بند کرتے ہوئے بولی تھیں۔

"زینب! میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔" زندگی میں پہلی بار انہوں نے شفیق کو غصے میں کچھ کہتے سنا تھا۔ انہوں نے حیرت سے شفیق کو دیکھا تھا۔

"کسی خارش زدہ کتے کی طرح سڑک پہ پڑا ہوا تھا۔ اٹھا کر لایا اسے میں۔۔۔ علاج کرایا اور یہ ملا "صلے" میں۔" وہ غصے سے بالکل۔ بے قابو ہوچکے تھے۔ زینب پہلے حیران تھیں اب ششدر۔

"یہ شفیق تھے؟"

"اب بالکل نہیں چھوڑوں گا اسے میں۔۔۔ ابھی میں۔۔۔" اب کی بار شفیق بھائی کو ٹھٹک کر رکنا پڑا تھا۔ زینب نے جو اچانک سامنے آکر دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"مانتی ہوں وہ جو کچھ لے کر گیا ہے۔ وہ سب آپ نے کمایا تھا مگر آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ آپ نے وہ سب مجھے **"تحفتاً"** دیے تھے۔ وہ میری چیزیں تھیں۔ شفیق۔۔۔ میری۔۔۔ اب یہ معاملہ میرا اور اس کا ہے اور میں نے معاف کیا۔۔۔ معاف کیا اسے میں نے۔"

اور بس۔۔۔

شفیق بھائی کو ڈھیر کرنے کے لیے زینب کا "کہا" ہی

کافی تھا کجا کہ نم آنکھیں۔۔۔ جڑے ہاتھ اور التجا کرتا لہجہ۔۔۔

"کیسی عورت ہو تم۔۔۔ کوئی نفرت۔۔۔ کوئی غصہ۔۔۔ کوئی منفی جذبہ ہے کہ نہیں تم میں۔۔۔ انسان نہیں ہو کیا۔۔۔؟" وہ بے چارگی سے زینب کے ہاتھ کھولتے ہوئے بولے تھے۔

"انسان ہی ہوں۔۔۔ فرشتہ کیسے ہو سکتی ہوں۔ مگر نامعلوم کیوں حارث کے نام پہ۔۔۔ میرے۔۔ دل میں "محبت" کے علاوہ کوئی جذبہ ابھرتا ہی نہیں ہے۔" وہ اب شکستہ سے انداز میں بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے بول رہی تھیں۔ شفیق بھائی چند لمحے خاموشی سے ان کے جھکے سر کو دیکھتے رہے۔

"کتنی دعائیں مانگیں تم نے حارث کے لیے مگر۔۔۔"

"میری دعاؤں کو کچھ نہ کہیں شفیق! حارث کے لیے میں نے کچھ ایسی دعائیں مانگی ہیں کہ مجھے یقین نہیں آتا کہ اللہ ان کے بدلے میں مجھے کچھ اور دے گا۔ دہ۔۔۔ وہ ہی مجھے دے گا جو میں نے اس سے مانگا ہے۔۔۔ وہ کیسے ٹال سکتا ہے۔۔۔ کیسے؟" نم۔۔۔ بھرایا لہجہ۔ اور شفیق بھائی۔۔۔ وہ دم بخود انہیں دیکھ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

وہ صرف رقم اور زیور نہیں چرا کر لایا تھا۔ وہ پورا بندوبست کر کے آیا تھا۔ پاسپورٹ، اپنے ڈاکومنٹس سب کچھ۔۔۔ لے کر آیا تھا۔

اس کے بعد اس نے سب سے پہلا کام الخرج سے نکلنے کا کیا تھا۔ وہ سیدھا ریاض آ گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد مختلف کمپنیوں میں اپلائی کیا تھا۔ جیل میں سیکھا جانے والا "ویلڈنگ" کا ہنر اب اس کے کام آیا تھا۔

اس کے پاس رقم معقول تھی مگر رقم کے بجائے اگر پہاڑ بھی ہوتا اور انسان اسے آہستہ آہستہ کھاتا رہتا تو وہ بھی ایک دن ختم ہو جاتا۔ اسی لیے اس نے جاب کے بارے میں سوچا تھا۔ ابھی تک اس کے ذہن میں مستقبل کے حوالے سے کوئی واضح تصویر موجود نہیں تھی مگر اک بات طے تھی۔

اسے زینب آپا سے نفرت ہو چکی تھی اور اپنی پشت پہ موجود نشانوں کے بدلے میں زخم لگا کر بھی اس کے اندر جلتی آگ ٹھنڈی نہیں ہو سکی تھی۔ وہ اور بھڑک اٹھی تھی۔ وہ اس آگ میں ساری عمر جلتے نہیں رہنا چاہتا تھا۔ وہ کچھ ایسا کرنا چاہتا تھا جس سے اسے تسکین مل سکے۔ اسے یہ ہی نقطہ ابھی تک سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے تسکین کس طرح سے مل سکتی ہے کیسے وہ اپنے اندر موجود زہر سے شفا پا سکتا تھا۔

یہ وہ سوال تھا جس کا جواب وہ ہر روز ڈھونڈنے کی کوشش کرتا اور ناکام رہتا۔ ان ہی دنوں اس کی ایک امریکن بیس کمپنی کی طرف سے سلیکشن ہو گئی تھی اور وہ برسر روزگار ہو گیا تھا۔ اس کی تنخواہ بہت زیادہ نہیں تو اتنی ضرور تھی کہ اس جیسے انسان کا کافی اچھی طرح سے گزارا ہو سکتا تھا۔

وہ زیور تو چرا لایا تھا مگر ابھی تک اسے سمجھ نہیں آ سکا تھا کہ وہ ان کا کیا کرے، حالانکہ کچھ رقم خرچ ہو جانے کے باوجود کافی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات تھی کہ اسے اس کمپنی میں کام کرتے ہوئے چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ اس کی ٹرانسفر امریکن برانچ میں ہو گئی۔

وہ یقیناً" اس معاملے میں "خوش قسمت" کہا جا سکتا ہے ورنہ وہاں اس سے کافی زیادہ قابل اور سینئر لوگ موجود تھے۔ مگر صرف وہ ہی "چنا" گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

امریکا آتے ہوئے اس کے ساتھ دو حادثے ہوئے تھے۔ پہلا حادثہ۔۔۔ جہاز میں بیٹھنے کے بعد کا تھا۔ حالانکہ وہ پاکستان سے سعودیہ جاتے ہوئے جہاز کا سفر کر چکا تھا مگر تب تو ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ اچھا خاصا سیٹ پہ بیٹھا تھا۔ کھانے کے بعد وہ کچھ دیر سونا چاہتا تھا وہ دوسرے مسافروں کی طرح فضائی سفر کے خوف کا شکار نہیں ہوتا تھا۔ اپنی سیٹ کو آرام دہ بنانے کے بعد اسے سوئے چند ہی لمحے ہوئے تھے کہ اسے وہی خواب

نظر آیا اور جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ سیدھا آنکھیں کھولے جہاز کی چھت کو دیکھ رہا تھا۔ وہ چند لمحے اسی حالت میں رہا تھا۔ اس کے چہرہ زرد تھا اور وہ یوں ساکت تھا کہ جیسے سانس نہ لے رہا ہو۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" اس کے ساتھ بیٹھے مسافر نے پوچھا۔ ہلکا سا اثبات میں سر ہلا کر وہ سیدھا ہوا تھا مگر یہ پہلی دفعہ تھا آنکھ کھلنے کے بعد بھی اسے یہ اطمینان نہیں ہو سکا تھا کہ وہ "زندہ" ہے۔ وہ مزید خوف کا شکار ہو چکا تھا۔ وہ زمین پہ نہیں تھا۔ بلکہ ہزاروں فٹ کی بلندیوں پہ تھا جہاں چاروں سمتوں کے علاوہ اوپر نیچے بھی موت تھی۔ پہلی دفعہ وہ کھل کر سانس نہیں لے سکا تھا بلکہ اس کا سانس اندر ہی اندر گھٹ رہا تھا۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اسے موت سے اتنا خوف اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ جہاز کریش ہو سکتا تھا۔ لینڈنگ ٹھیک سے نہ ہونے کی وجہ سے بھی حادثے کا شکار ہو جاتا۔ انجن فیل ہو جاتے یا پھر فیول ختم ہو جاتا۔ کچھ بھی ممکن تھا۔ کچھ بھی۔۔۔ وہ سفر اس کی زندگی کا مشکل ترین سفر بنتا جا رہا تھا۔ وہ سارا سفر اس نے اسی خوف کی سی حالت میں کیا تھا۔ جب بھی زیادہ بلندی پہ پھر ہوا کے دباؤ کی وجہ سے جہاز کو جھٹکے لگتے وہ بمشکل اپنے اوپر قابو پاتا۔ اتنی لمبی فلائٹ میں اک لمحے کے لیے نہیں سو سکا تھا۔ سارا سفر جیسے اس نے ننگی تلوار پہ کھڑے ہو کر کیا تھا اور اس نے پہلا اطمینان بھرا سانس تب لیا جب جہاز بحفاظت لینڈ کر گیا تھا۔

مگر یہ شروعات تھی۔ دوسرا حادثہ تب ہوا جب اس کی رقم والا بیگ گم ہوا تھا۔ وہ زیور بیچ چکا تھا اپنے پاس موجود ساری رقم اس نے اپنے ایک ہینڈ کیری میں ڈالی تھی (اتنی رقم بائے ہینڈ لے جانا بین الاقوامی طور پہ ممنوع تھا) اور جب امریکن ایرپورٹ پہ وہ سامان لے کر باہر آیا تو اس کا "ہینڈ کیری" غائب تھا وہ کنویر بیلٹ پہ یقیناً "آگے، پیچھے ہوا تھا۔ وہ پریشان ضرور ہوا تھا مگر اسے اتنا یقین تھا کہ یہ امریکا تھا۔ یہاں پہ چیزیں اتنی آسانی سے کھو نہیں سکتی تھیں۔ وہ شکایت درج کرانے کے بعد کمپنی کے ایک آدمی کے ساتھ جا چکا تھا، مگر اس کا بیگ نہیں مل سکا تھا اور جس شخص کو ملا تھا اس نے اس رقم کو چیریٹی کر دیا تھا۔ یہ سب دراصل ایک غلط فہمی کی بنیاد پہ ہوا تھا۔ حارث اور اس شخص کا بیگ اتفاق سے ایک جیسا تھا۔ وہ غلطی سے لے گیا تھا اس شخص کے بیگ میں اتنی اہم چیز نہیں تھیں کہ وہ اسے فوراً کھولتا یا استعمال کرتا وہ کافی عرصہ یوں ہی بند پڑا رہا تھا۔ اور جب اس نے اسے کھولا تھا تو اس کا حیران ہونا بنتا تھا۔ گو کہ وہ غیر مسلم تھا مگر وہ ایمان دار شخص تھا اس نے ایرپورٹ پہ رابطہ کیا تھا۔ شکایت بھی درج تھی مگر مطلوبہ شخص (حارث) سے رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ تب تک وہ اس شہر سے دوسرے شہر شفٹ ہو چکا تھا اور اس طرح وہ رقم "فلاحی کام کے لیے وقف" کر دی گئی تھی۔

"وہ حلال کی کمائی تھی نا۔۔۔ حرام کاموں میں کیسے استعمال ہو سکتی تھی۔"

☆ ☆ ☆

وہ پیلی رنگت اور نقاہت زدہ چہرے کے ساتھ چھت کو دیکھ رہا تھا۔ ابھی ابھی میل نرس اس کے ہاتھ سے ڈرپ اتار کر گیا تھا اسے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔

"چلو حارث۔۔۔ اٹھو گھر چلتے ہیں۔" شفیق بھائی نے پیار سے کہا تھا۔

اور اس پیار بھرے لہجے نے اسے "حال" سے اٹھا کر "ماضی" میں لا پٹخا تھا۔ ماضی۔۔۔ کہ جس میں وہ جیتا تھا۔ اسے زینب آپا یاد آئی تھیں اور بہت بری طرح سے یاد آئی تھیں۔

"میں گھر نہیں جا سکتا۔" اس نے کافی دیر بعد جواب دیا تھا۔ اور شفیق بھائی نے دیکھا کہ جواب دیتے ہوئے اس کے ہونٹ کسی بچے کی طرح کپکپائے تھے۔

"کہاں جاؤ گے پھر؟" ان کے لہجے کی نرمی حارث کو نشتر چبھونے جیسی تکلیف دے رہی تھی۔

"آپ مجھے پولیس اسٹیشن لے جا سکتے ہیں؟" اور اس بات نے شفیق بھائی کو ششدر کر دیا تھا۔ وہ ہونق

ہو کر اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ اس نے ہمیشہ اسی طرح انہیں "حیران" کیا تھا۔ وہ ابھی نہیں بدلا تھا۔

☆ ☆ ☆

امریکا آنے کے بعد حارث کی زندگی جیسے ایک نئے فیز میں داخل ہوئی تھی اور یہ اس کی زندگی کا تیسرا فیز تھا۔ پہلے دو ابز وہ برے طریقے سے گزار چکا تھا بلکہ برے نہیں۔۔۔ بدترین' وہ اب ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ وہ "انجوائے" کرنا چاہتا تھا مگر خود کو اک عجیب سے "خالی پن" کا شکار پاتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایسا اس "زخم" کو کھو دینے کی وجہ سے تھا۔ مگر ایسا کیوں تھا۔۔۔ یہ اسے ہر بات کی طرح بہت بعد میں سمجھ آیا تھا۔

یہ اس کی زندگی کا عجیب ترین دور تھا۔ اس کے لیے جیسے ہر چیز کی کشش کھوتی جا رہی تھی۔ ہر چیز اس کے لیے اپنے معنی کھو رہی تھی وہ کسی چیز میں دلچسپی محسوس نہیں کرتا تھا اسے کوئی چیز متاثر نہیں کرتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اپنی "نفرت" کو بھی بھول رہا تھا اس کی آگ جیسے "سرد" پڑ رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا وجود بھی۔۔۔

اسے زندگی کا یہ فیز پہلے دونوں فیز (Phases) سے بھی بدترین لگتا تھا۔ اسے لگتا جیل مشکل نہیں تھی۔ زینب آپا کے پاس زخم زخم پشت لیے سیدھا لیٹنے کی خواہش میں تکلیف وہ دور گزارنا بھی برا نہیں تھا۔ جواب ہو رہا تھا وہ سب سے سخت۔۔۔ سب سے برا تھا تب ہی۔۔۔ ہاں تب ہی۔۔۔ اس کی زندگی میں ایک بدلاؤ آیا تھا اور اس بدلاؤ کا نام تھا ہانا مارٹن۔۔۔ وہ اس کی زندگی کی پہلی عورت تھی جس نے اسے احساس بخشا تھا کہ اپنی مردانہ وجاہت کی وجہ سے وہ امریکن عورتوں کے لیے کتنی کشش رکھتا ہے۔

ہانا نے اس کی زندگی کو نئی راہ دی تھی۔

وہ گدھوں کی طرح دن رات کام اس لیے کرتا تھا کہ دولت کما سکے اور دولت اس لیے کماتا کہ عیاشی کر سکے۔ یہ اس کا "انتقام" تھا "بدلہ" تھا "تسکین" تھی مگر کس سے؟ زینب آپا سے؟ وہ خبطی نہیں تھا۔ مگر بن گیا تھا۔ اس کی نفرت نے اسے بنا ڈالا تھا۔

ہر مرتبہ کسی کے ساتھ رات گزارنے کے بعد اسے عجیب سی فتح کا احساس ہوتا۔ وہ سرشاری کی عجیب سی کیفیت سے دوچار ہوتا۔

وہ بتا نہیں سکتا تھا کہ ہر دفعہ زینب آپا کو نیچا دکھانے کے بعد کتنی طمانیت محسوس کرتا تھا۔

وہ تصور میں زینب آپا کو مخاطب کرتا اور کہتا۔

"اب کس طرح سے تم مجھے سزا دلواؤ گی۔ میری پشت کو کیسے زخم زخم کروا سکو گی۔ دیکھو! میں یہاں کس طرح سے آزاد ہوں جو چاہے کروں جس سے چاہے ملوں' اب کہاں گیا تمہارا انصاف۔ تمہارا اسلام اور اس کی سزائیں۔ ہے کوئی۔ جواب مجھے سزا دے سکے۔ مجھے باندھ کر کوڑے مار سکے۔ ہے کوئی؟ ہاتھ لگانا تو دور۔ مجھے کوئی ایک لفظ تک نہیں بول سکتا۔"

اس نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ اگلے دس سال اپنی مرضی سے گزارے گا اور وہ گزار رہا تھا۔

حارث زینب آپا اور ان کی محبت کا عادی ہو چکا تھا۔ جیسے کوئی ماں کی محبت' کرم' التفات اور مہربانیوں کا عادی ہوتا ہے اور وہ توقع نہیں کرتا کہ ماں کبھی اس سے ناراض ہو سکتی ہے یہ ہی حارث کے ساتھ ہوا تھا۔ اس نے زینب آپا کی محبت کو اپنا حق سمجھ لیا تھا۔ وہ کسی بھی قسم کے منفی ردعمل کی توقع کسی سے بھی کرتا مگر زینب سے نہیں۔

اس نے فرض کر لیا تھا کہ زینب آپا صرف اور صرف اس سے "محبت" کے لیے بنی ہیں اور جب ان ہی زینب آپا کی بدولت اس نے کوڑے کھائے۔ یہ زبردست نفسیاتی اور جذباتی دھچکا تھا۔ اور اس دھچکے نے اسے نفرت میں دھکیل دیا تھا۔ اور اب اسی نفرت کی بدولت اس کا زینب آپا سے تعلق پہلے سے زیادہ مضبوط ہو چکا تھا۔ اس کے حواسوں پہ ہر وقت "بہن" سوار رہتی تھی' وہ ہر وقت ان کے الوژن میں گرفتار رہتا تھا۔ گو کہ زینب آپا وہاں' اس کے پاس موجود نہیں تھیں مگر وہ انہیں یوں ہی مخاطب کرتا جیسے وہ ان کے سامنے بیٹھی ہوں اسے لگتا کہ اب کی بار وہ بے بس

تھیں کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔

وہ زینب قیوم کو ہراتا رہا مگر دن بدن۔ روز بروز۔ ایک عبرت ناک شکست اس کا مقدر بنتی جارہی تھی اور وہ حارث قیوم کے انتظار میں تھی۔ اس دن کے انتظار میں۔ کہ جب وہ حارث قیوم کو چاروں شانے چت کر سکے۔ اور اسی طرح سے چت کرے کہ وہ کبھی بھی اٹھنے کے قابل نہ رہے۔ اور اس کا آغاز ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ پانچ سال۔ امریکہ میں گزارے جانے والے وہ پانچ سال۔ اسے لگتا کہ یہ ہی زندگی تھی۔ وہ مگن تھا۔ مسرور تھا۔ زندگی انجوائے کر رہا تھا۔ اپنی پرفارمنس کی بدولت وہ ایک لیبر سے سپروائزر کے عہدے تک جا پہنچا تھا۔

اب کی بار زندگی اسے "عیاشی" کا دوسرا روپ بن کر ملی تھی۔ وہ پانچ دن پیسہ کماتا' دو دن میں اڑاتا اور اگلے ورکنگ ڈے تک کنگلا ہو چکا ہوتا تھا۔ ہفتے کے پانچ دن جاب کے علاوہ بھی وہ مختلف کام کیا کرتا تھا۔ زیادہ پیسہ کمانے کے لیے اور پیسہ پھر اپنی واحد "عیاشی" پہ اڑانے کے لیے۔ وہ دنیا کا عجیب ترین مرد تھا۔

اور وہ حارث قیوم اگلے پانچ سال بھی یوں ہی مگن و مسرور اور عیاشی میں زندگی گزار دیتا۔

اگر سمانتھا کے ساتھ نہ ہوتا یا پھر کم از کم وہ رات اس کی زندگی میں نہ آتی۔ وہ بہت محظوظ ہونے والے انداز میں سمانتھا سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا کہ۔

"اگر میں شادی شدہ ہوتا۔ تو وہ مجھے سنگسار کر کے مار دیتے۔" اس نے متبسم لہجے میں سمانتھا کو بتایا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ آخری دفعہ مسکرا رہا تھا۔ سمانتھا کا چہرہ فق ہوا۔ کتنے ہی لمحے وہ بے یقینی سے حارث کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"تم سچ کہہ رہے ہو؟" اور پھر امریکن لہجے میں نہ یقین کرنے والے انداز میں اس نے پوچھا تھا۔

"ہاں۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔" اس نے بھرپور یقین دلایا تھا۔

"کتنا ظالم اور بے درد ہے تمہارا مذہب' جو مذہب انسان کے ساتھ زندگی میں یہ کر سکتا ہے۔ وہ مرنے کے بعد اس کے ساتھ کیا کرے گا۔" وہ جھرجھری لے کر بولی تھی۔

"کیا۔ کیا کہا تم نے۔" نا سمجھنے والے انداز میں سنجیدگی کے ساتھ اس نے سمانتھا سے دوبارہ پوچھا' تو سمانتھا نے اپنی بات دہرائی۔ حارث کا چہرہ فق ہوا اور پھر وہ خطرناک حد تک پیلا پڑ گیا تھا۔ اس کا دل پورے زور سے دھڑکا تھا۔ وہ توقع نہیں کر سکتا تھا۔ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ آج رات جب وہ کسی کو اپنے اپارٹمنٹ پہ لے کر جائے گا تو وہ کال گرل اسے کیا کہہ دے گی۔ کیا سمجھا دے گی۔ یہ ظالم اور بے درد والی بات نہیں تھی۔ جس نے حارث کا چہرہ فق کیا تھا۔ یہ مرنے کے بعد والی بات بھی نہیں تھی۔ وہ کیا بات تھی؟

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" سمانتھا نے حارث کے رنگ بدلتے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

آج اس کا خوف جاگتے میں اس پہ یک دم حاوی ہو رہا تھا۔ وہ ویسی ہی وحشت محسوس کر رہا تھا جیسی کہ کوئی بھی مرنے والا مرنے سے پہلے محسوس کرتا ہے۔

آج کسی خواب کی صورت نہیں رہی تھی۔ وہ بیٹھے بٹھائے ہنستے مسکراتے' ایک دم سے اسی خوف کے زیر اثر جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ' مگر مسلسل۔ مدھم مدھم۔ رکے بغیر۔

ہمیشہ سیدھی برستی گولیاں۔ اسے احساس دلاتی تھیں کہ وہ مر چکا ہے۔ مگر جاگنے پہ اسے معلوم ہوتا تھا کہ وہ تو زندہ ہے۔ موت اس کے لیے نہیں تھی۔ وہ ان تینوں کے لیے تھی جو اس کے ساتھ تھے۔ باقی سب کو مرنا تھا۔ اسے' حارث قیوم کو نہیں مرنا تھا۔

"وے بلیا اساں مرنا نہیں
گور پیا کوئی ہور"

مگر آج۔ آج کیا ہوا تھا؟ آنکھیں بند کر کے اس نے تھوک نگل کر سمانتھا کو جواب دینا چاہا تھا۔ مگر اس پہ

یہ خوف ناک انکشاف ہوا کہ وہ بول نہیں پا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ محض پھڑپھڑا کر رہ گئے تھے۔ اس کے جسم پہ یکدم لرزش اتری تھی۔

"حارلیس (حارث) تمہیں کیا ہوا ہے؟" سمانتھا اب قدرے فکرمندی سے اس پہ جھک کر اس کے کندھے کو ہلاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ اور وہ.... خود کو سنبھالنے کی کوشش میں اس نے کرسی کے دونوں بازوؤں کو مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

"پانی لاؤں تمہارے لیے۔" اس نے پوچھا۔

حارث نے سر ہلایا تھا۔ سمانتھا کے جاتے ہی اسے محسوس ہوا کہ ابھی کرسی بھی اس کے ساتھ لرزنے لگے گی۔ اس کا جسم اتنا کپکپا رہا تھا' وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ کوئی بھی مرنا نہیں چاہتا۔ وہ آج ابھی اس فوبیا کا شکار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مگر وہ ہو رہا تھا۔ وہ آج کی رات برباد نہیں کرنا چاہتا۔ مگر وہ ہو رہی تھی۔

"مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ بس اک وہم ہے اور کچھ بھی نہیں۔ میں کیسے مر سکتا ہوں؟ میں جوان ہوں... صحت مند ہوں' مجھے کیسے کچھ ہو سکتا ہے؟"

"اور اگر اس اپارٹمنٹ کی چھت ابھی تم پہ آگرے تو..." اچانک اس کے ذہن کو اس خیال نے کرنٹ کی طرح چھوا تھا اور اس نے خود کو سانس کا مریض بنتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ بے ساختہ اس نے اندر گم ہوتے ہوئے سانس کو کھینچ کر باہر نکالا تھا۔

"اوہ خدایا۔" سمانتھا پانی لے کر آرہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹا اور وہ اس کی طرف بھاگی تھی۔ وہ کرسی سمیت اوندھا ہو چکا تھا۔

"حارلیس... حارلیس..." اسے آوازیں دیتے ہوئے سمانتھا نے اسے سیدھا کیا تھا۔ وہ بری طرح سے گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟ کیا تم دمے کے مریض ہو؟ تمہارا ان ہیلر کہاں ہے؟"

وہ مسلسل اس کا سینہ مسلتے سوال پہ سوال کرتے ہوئے بری طرح سے بوکھلائی ہوئی تھی۔ حارث کو واقعی سانس نہیں آرہی تھی۔ اسے ان ہیلر کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

"نہیں... نہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے سمانتھا کا ہاتھ ہٹایا تھا اور گرتے پڑتے اپارٹمنٹ سے باہر جانے لگا تھا۔

سمانتھا کو پہلے تو سمجھ نہیں آیا کیا کرے' لیکن جب اس نے حارث کو اپارٹمنٹ کی سیڑھیاں اترتے دیکھا تو مڑ کر بھاگ کے اس نے حارث کی جیکٹ اور اپنا کوٹ اٹھایا تھا۔

جب وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی تو اس نے دیکھا کہ آخری چند سیڑھیوں پہ حارث اپنا توازن قائم نہیں رکھ پایا تھا اور سیدھا کمر کے بل پھسلتا ہوا نیچے جا گرا تھا۔ مگر وہ تیزی سے اٹھا تھا اور گرتا پڑتا باہر نکل گیا تھا اور جب سمانتھا باہر آئی تو وہ ایک پول کے ساتھ سہارا لے کر کھڑا ہانپ رہا تھا۔ سمانتھا چند لمحے اسے یوں کھڑا دیکھتی رہی تھی۔

باہر شدید سردی تھی اور وہ بنا شرٹ کے تھا۔ مگر اسے جیسے پروا ہی نہیں تھی۔ اب کہ اس نے غصے اور بے زاری سے سر جھٹکا تھا۔ پیچھے سے آکر اس نے حارث کی جیکٹ اس کے کندھوں پر پھیلائی تھی۔ حارث نے چونک کر مڑ کر دیکھا اور پھر سامنے... اندر قبر کا سا اندھیرا اور خاموشی تھی۔ باہر شور تھا' زندگی تھی' روشنی تھی' وہ محسوس کر سکتا تھا' ہاں... وہ محسوس کر سکتا تھا۔ زندگی کو قطرہ قطرہ اپنے اندر اترتے ہوئے وہ گھٹن جیسی فضا جیسے آہستہ آہستہ معدوم ہو رہی تھی۔ وہ کھل کر سانس لینے کے قابل ہو رہا تھا۔ وہ زندہ تھا۔ وہ اپنے عین سامنے زندگی کو چلتا پھرتا دیکھ رہا تھا۔ ہاں... وہ بھی اسی ہجوم کا حصہ تھا جو سانس لیتا تھا۔ جس کا شمار حیات میں ہوتا تھا۔ ہاں... وہ بھی اسی کا حصہ تھا۔ وہاں اس پول کے سہارے کپکپاتا کھڑا وجود وہ دھندلائی آنکھوں سے یوں زندگی کو دیکھتا تھا جیسے کہ کوئی مرجانے والا دیکھتا ہے۔ وہ پول کے ساتھ گھسٹتا ہوا نیچے بیٹھتا چلا گیا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے آنسو بہتے ہوئے محسوس کیے۔ وہ رو رہا تھا۔ حیران کن

بات۔ حارث قیوم رو رہا تھا۔ وہ خوف سے زچ ہو کر رو رہا تھا یا پھر ایک بار پھر زندہ ہو جانے پہ رو رہا تھا۔

"تمہیں کوئی مسئلہ ہے؟ کوئی نفسیاتی مسئلہ؟ یا پھر تم بیمار ہو؟" اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے سمانتھا نے پوچھا تھا۔

وہ ایک بار پھر چونکا تھا۔ مگر خاموش رہا تھا۔ ذرا سا رخ موڑ کر اس نے کندھے پہ رکھے سمانتھا کے ہاتھ کو دیکھا اور پھر۔ آہستگی سے اپنے نم چہرے کو صاف کیا تھا اور اب وہ بے حد تھکے سے انداز میں اپنی جیکٹ پہن رہا تھا۔ اس کے جسم کی کپکپاہٹ ابھی مکمل طور پہ ختم نہیں ہوئی تھی۔

"حاریس! کوئی مسئلہ ہے کیا؟" سمانتھا نے پھر سوال دہرایا تھا اور اب کی بار اس نے ہلکا سا اثبات میں سرہلایا تھا۔

"کیا۔" اب کہ وہ بھی اس کے ساتھ فٹ پاتھ پہ بیٹھ گئی تھی۔

"خوف۔"

"کس چیز کا۔"

"موت کا۔"

اب کی بار وہ حیران نہیں ہوئی تھی۔ وہ لاجواب ہوئی تھی۔ موت ایسی میز تھی جسے ہر کوئی آسانی سے ڈر سکتا تھا۔

"اوہ تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔" اب کی بار وہ ذرا ہلکے سے لہجے میں بولی تھی۔ "میں سمجھی شاید کوئی سیریس مسئلہ ہے۔" اس نے ہاتھ لہرا کر بات کو اڑایا تھا۔

"ویسے تم کو تو واقعی ہی موت سے ڈرنا چاہیے۔ تمہارا مذہب ہی ایسا ہے۔" اس نے یقیناً ہنستے ہوئے مذاق کیا تھا۔

اور حارث۔ اس نے زور سے آنکھیں بند کرکے اس کرنٹ جیسی لہر کو اپنے اندر ہی روکا تھا۔ اسے باہر نہیں آنے دیا تھا۔ سمانتھا نے ایک دفعہ پھر غلط بات کہی تھی۔ جیکٹ کے دونوں سروں کو مخالف سمتوں سے پکڑ کر اس نے کھینچ کر اپنے گرد لپیٹا تھا۔ وہ سر جھکائے خاموش تھا۔

چند لمحوں تک وہ یوں ہی خاموش بیٹھے رہے اور پھر اس نے سمانتھا کا ہاتھ اپنے آگے آتا ہوا دیکھا تھا۔ اس نے حیران نظروں سے سمانتھا کو دیکھا۔

"ایم سوری میں تمہارے ساتھ رک نہیں سکتی۔ تم۔ تم بہت عجیب ہو اور کچھ کچھ خوف ناک بھی۔ ابھی اگر اوپر تمہیں کچھ ہو جاتا یا پھر تم سیڑھیوں سے جس طرح گرے ہو۔ تمہارے سر پہ شدید چوٹ بھی لگ سکتی تھی۔ میں پولیس کو نہیں بھگت سکتی۔ سوری۔ سوری اگین۔"

وہ پیسے اس کی گود میں رکھ کر جا چکی تھی۔ حارث نے اسے روکنا چاہا۔ اسے کہنا چاہا کہ اسے یوں مت اکیلا چھوڑ کر جائے۔ مگر وہ یہ نہیں کرسکا تھا۔ وہ اتنا تھک چکا تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو پھر سے بہہ نکلے تھے۔ وہ کسی بچے کی طرح سسکیاں بھر رہا تھا اور اب وہ اپنی کمر پہ رگڑ لگنے کی وجہ سے تکلیف بھی محسوس کر رہا تھا۔ وہ نارمل ہو رہا تھا' مگر پھر بھی وہ اپارٹمنٹ واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ پھر سے اسی خوف کا شکار نہیں ہونا چاہتا تھا۔

وہاں وہ اکیلا نہیں تھا۔ وہ زندگی کے درمیان رہنا چاہتا تھا۔

وہ لوگوں کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے زندہ ہونے کو محسوس کر رہا تھا۔ یہ مرنے کے بعد کا خوف نہیں تھا' جس نے حارث کی یہ حالت کی تھی۔ یہ موت کا خوف تھا۔ جس کا شکار وہ ہوا بیٹھا تھا۔

☆ ☆ ☆

حارث کے جانے کے بعد زینب آپا کے لیے جیسے دنیا میں کرنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ روتی نہیں تھیں۔ صبر کرتی تھیں۔ مگر تھیں تو انسان نا۔ تو بھی کبھار خوب رو بھی لیا کرتی تھیں' اور پھر ساری رات توبہ کرتے ہوئے گزار دیتیں۔ انہیں لگتا کہ رو کر وہ بے صبری کا مظاہرہ کر رہی تھیں اور شفیق بھائی کہتے تھے کہ جب وہ روتی ہیں تو وہ انسان ہونے کا مظاہرہ کرتی ہیں'

ورنہ تو۔۔۔

وہ پہلے ہی کم بولتی تھیں۔ اس حادثے نے تو جیسے گونگا کر دیا تھا۔ انہیں پہلے چپ لگی، پھر بیماری۔۔۔

"تو حارث کو کیا گیا زینب آپا کو۔" شفیق بھائی نے کہا "پاکستان چلتے ہیں۔ پاکستان کے ڈاکٹرز زیادہ اچھے ہیں۔" وہ نہیں مانیں اور کہنے لگیں۔

"یہاں بھی تو انسان بیمار ہوتے ہیں اور ڈاکٹران کا علاج کرتے ہیں۔ اب ہر کوئی تو اٹھ کر پاکستان نہیں جاتا نا۔۔۔ اور موت نے کون سا یہ دیکھ کر چھوڑ دینا ہے کہ پاکستانی ڈاکٹر کتنے قابل ہیں۔" ان کا ڈائیلسز ہو رہا تھا۔ ان کے گردے ختم ہو چکے تھے۔

شفیق بھائی کے لیے یہ برداشت کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان میں بھی زینب جتنا صبر آجائے۔ مگر زینب اپنے نام کی ایک ہی تھیں اور پھر ان کی حالت ایسی ہو گئی کہ اسپتال کے بستر کی سفید چادر اور ان کے سفید چہرے میں فرق نظر آنا غائب ہو گیا تھا۔

شفیق بھائی ان کو اس حالت میں بھی لیٹے لیٹے اشاروں سے نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر۔۔۔ آنکھوں کے کناروں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ کر حیران نہیں ہوتے تھے۔ پانچ سال بعد وہ وفات پا گئی تھیں۔

وہ بہت روئے تھے۔ اس لیے نہیں کہ زینب مرگئی تھیں۔۔۔ اس لیے کہ زینب غم سے مرگئی تھیں۔ انہیں زینب کے غم نے رلا دیا تھا۔ مرتے وقت تک حارث کے لیے ہاتھ اٹھتے رہے تھے اور اسے وہ یاد کرتی رہی تھیں اور شفیق بھائی کو یہ غم کہ سارے سکھ دینے کے بعد بھی زینب کے نصیب میں حارث نامی سکھ نہیں لا سکے تھے۔ یہ ان کے بس سے باہر تھا۔

اور زینب آپا کی وصیت کے مطابق انہیں سعودیہ کے ہی مقامی قبرستان میں دفن کر دیا گیا تھا اور یہ وہ ہی وقت تھا۔۔۔ یہ عین وہ ہی وقت تھا جب حارث امریکہ کے ایک شہر میں کسی سڑک کے فٹ پاتھ کے کنارے کھمبے سے سر ٹکائے رو رہا تھا۔ ہاں۔۔۔ یہ وہ ہی وقت تھا۔۔۔ عین وہ ہی وقت تھا۔

☆ ☆ ☆

ہوا کے تیز جھونکے کے ساتھ ہی اس نے کسمسا کر گردن سیدھی کرنی چاہی تھی۔ مگر ایک شدید تکلیف کی لہر تھی جو اس کی گردن میں سے ہوتی ہوئی سیدھا سر تک گئی تھی۔

"آہ۔۔۔" بے اختیار اس کے منہ سے کراہ نکلی تھی اور لاشعوری طور پر اس نے ہاتھ اٹھا کر گردن پہ رکھنا چاہا تھا اور اس پر یہ بدترین انکشاف ہوا تھا کہ اس کا ہاتھ حرکت نہیں کر سکا۔ کپکپاتے ہونٹوں کے ساتھ یک دم بھر آنے والی آنکھوں کے ساتھ اس نے ہاتھ کو حرکت دینے کی کوشش کی تھی۔ اس نے انگلیوں کو ہلایا۔۔۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ حرکت میں آگئی تھیں۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ بازو کو دبانے لگا تھا اور ایسا کرتے ہوئے اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کے بازو اور ہاتھ کو کچھ ہوا نہیں تھا۔ یوں ٹیک لگا کر بیٹھنے سے بری طرح سے سن ہو چکے تھے۔ ہاتھ اور بازو کو آہستہ آہستہ دباتے ہوئے وہ سکون کی لہر اپنے اندر اترتے ہوئے محسوس کر سکتا تھا۔

اس کی یہ حالت سردی اور ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے اور سوئے رہنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔

"میں یہاں کیوں سو رہا تھا؟" اپنی کئی کراہوں کو دباتے ہوئے الٹے ہاتھ سے سیدھے بازو کو پکڑے ہوئے وہ لڑکھڑا کر کھڑا ہوا تھا۔ اسے اس طرح کھڑے ہونے میں کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم کا ایک عضو سردی کی وجہ سے جم چکا تھا۔ مگر اب وہ اس تکلیف پر غور نہیں کر رہا تھا۔ وہ یہ سوچنے اور یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آخر وہ یوں کھمبے کے ساتھ سر ٹکا کر کیوں سویا تھا۔ وہ بھی فٹ پاتھ پہ۔۔۔ اس کا سر بھی بھاری ہو چکا تھا۔ اس نے جھٹکے سے سر کو ہلایا۔ آنکھیں پورے زور سے کھول کر سامنے دیکھا تھا۔ تھوڑے فاصلے پہ اپنے اپارٹمنٹ کو جانے والی سیڑھیاں نظر آئی تھیں۔

"میں یہاں کیوں۔۔۔؟" حیران ہو کر سوچتے ہوئے

وہ لڑکھڑا کر اس جھکی ہوئی حالت میں سیدھا ہوا تھا۔

اور پھر۔۔۔

اسے یاد آیا کہ اسے یہاں سمانتھا چھوڑ کر گئی تھی اور اسے یہ بھی یاد آ گیا تھا کہ وہ۔۔۔ وہاں کھمبے سے ٹیک لگائے سامنے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ۔۔۔ رات بیتنے کے ساتھ لوگ کم ہونا شروع ہو گئے تھے۔ دکانوں کی جلتی لائٹس بھی ایک کے بعد ایک بند ہونا شروع ہو گئی تھیں اور وہ پھر سے خوف زدہ ہونا شروع ہو گیا تھا کہ وہ تنہا ہو رہا تھا۔

اسے وہاں بیٹھے دو سے تین گھنٹے ہو چکے تھے اور اس پر نیند کا غلبہ بھی طاری ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں کھلی رکھنے اور حواس کو قائم رکھنے کی مکمل کوشش کر رہا تھا۔ مگر اسے غنودگی آ ہی گئی۔

اور وہ۔۔۔ اب۔۔۔ اس حالت میں جاگا تھا کہ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ کوئی بھی نہیں۔۔۔ ماسوائے۔۔۔ حارث قیوم کے۔۔۔

اب وہاں روشنی تھی۔۔۔ زندگی تھی اور نہ شور تھا وہاں اندھیرا تھا۔۔۔ موت کی سی خموشی تھی۔ وہ خوف زدہ ہو کر آہستہ آہستہ پیچھے کو ہونے لگا تھا۔ اب کی بار وہ بے توازن ہوا اور لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا تھا۔

وہ جس خوف کا شکار ہو کر اپارٹمنٹ سے بھاگا تھا اب اسی خوف کے تحت دوبارہ اپارٹمنٹ کی طرف جا رہا تھا۔ مگر اب وہ بھاگ نہیں سکتا تھا۔ اس کی ٹانگیں سُن تھیں اور جسم اکڑا ہوا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے سیڑھیوں پہ کمر کے بل جھکتے ہوئے وہ ایک سیڑھی پہ اپنا الٹا ہاتھ رکھتا اور جسم کا تمام وزن اس پہ ڈال کر وہ سیڑھی چڑھتا اور پھر اسی طرح اس سے اگلی۔۔۔ وہ تیز چڑھنے کی مکمل کوشش میں تھا اور یہ ہی کوشش اسے ہانپنے پہ مجبور کر رہی تھی۔

اپارٹمنٹ کے سامنے رکتے ہوئے۔۔۔ ہچکیاں بھرتے ہوئے سسکیاں روکتے ہوئے۔۔۔ لرزتے ہوئے جسم کے ساتھ اس نے چابی اپنی جیکٹ کی جیبوں اور پاکٹ میں سے ڈھونڈنا شروع کی تھی۔ اسے چابی کیسے مل سکتی تھی، جبکہ وہ وہاں تھی ہی نہیں۔ اس دفعہ بے بس ہوتے ہوئے وہ سر پہ ہاتھ رکھ کر روتے ہوئے دروازے سے ٹیک لگا کر نیچے بیٹھا اور جیسے ہی اس نے ٹیک لگائی 'وزن' سے دروازہ ہلکی سی چرر کی آواز کے ساتھ کھلتا گیا تھا۔ اس کا رونا یک دم تھما تھا اور وہ حیران ہوا۔ وہ اپارٹمنٹ کھلا ہی چھوڑ گیا تھا۔ مگر اسے یاد نہیں تھا۔ وہ اسی طرح بیٹھے بیٹھے مڑا اور کسی بچے کی طرح گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے تیزی سے اندر داخل ہو گیا تھا اور اب وہ اندرونی طرف دروازے سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ اپارٹمنٹ اسی طرح روشن تھا جس طرح وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ۔۔۔ وہاں بیٹھ کر ہانپتا رہا۔۔۔ کانپتا رہا۔ اب کی بار سردی سے۔۔۔ اس کے کپڑوں پہ لگی برف جسم کی حدت کی وجہ سے پگھل کر پانی بننے لگی تھی، جو کہ سردی میں اضافہ کرنے کا باعث بن رہی تھی۔ لیکن۔۔۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ اٹھتا اور کپڑے تبدیل کرتا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے اس نے گھٹنوں میں سر چھپا لیا تھا اور جب سردی اس کی برداشت سے باہر ہونے لگی تو اسے اٹھنا پڑا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے لیے۔

وہ کسی بیمار آدمی کی طرح نقاہت زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ گیلے کپڑوں کو اٹھا کر اس نے باری باری جھٹکا تھا تو کچھ نوٹ نیچے گرے۔ اس نے کسی وقت ان پیسوں کو جیب میں ڈالا تھا۔ ان نوٹوں کو دیکھ کر اس نے سختی سے آنکھیں بند کی تھیں۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت بھی جیکٹ پہ سخت سے سخت ترین ہو گئی تھی۔

وہ نوٹ جیسے اسے کچھ یاد کروا رہے تھے۔

کیا۔۔۔ اب کی بار اسے رونا نہیں آ رہا تھا۔

اس نے جیکٹ دور پھینکی کر سی نوٹ اٹھائے اور انہیں پھاڑ کر ریزہ ریزہ کر کے اچھال دیے۔ ساتھ ہی ایک آواز اس کے منہ سے نکلی تھی۔ وہ پہلے خوف کے ہاتھوں بے بس ہوا اور اب زچ ہو رہا تھا۔ قریب تھا کہ وہ ایک ایک چیز اٹھا کر دیوار پر دے مارتا کہ کھڑکی کے قریب کچھ کھٹکا ہوا تھا۔

وہ پھر اسی دہشت کا شکار ہونے لگا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس گیا۔ ڈرتے ڈرتے باہر دیکھا۔

وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ دہشت کا شکار ہو کر پلٹا تھا اور تیزی سے بستر میں لیٹ کر کمبل کو خود کے گرد لپیٹ لیا تھا۔

وہ اب اونچی اونچی آواز سے روتے ہوئے زینب آپا کو پکار رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کسے پکار رہا تھا۔ وحشت کی شدت سے وہ کمبل کو دونوں ہاتھوں میں بھینچے ہوئے کبھی دائیں جھکتا... کبھی بائیں اور پھر اس نے چت لیٹے ہوئے کمبل کو منہ پہ ڈال کر اور زور زور سے رونا اور زینب آپا کو پکارنا شروع کر دیا تھا۔ اسی طرح روتے روتے... اچانک اس کی نظر چھت پہ پڑی تھی اور اس کے اعصاب کھنچنے لگے تھے۔ اس کے جسم کی تمام رگیں بھی تن سی گئی تھیں۔ سردی سے نہیں... خواب سے... دہشت سے... وحشت سے... اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی کہ ابھی چھت اس پہ گرنے والی تھی۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا اور وہ پسینے میں شرابور تھا۔ پھر یک دم اس کی سانس کی رفتار ہموار ہوتے ہوتے بالکل آہستہ ہوئی تھی۔ اور اس کا تنا ہوا اکڑا ہوا جسم یک دم ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ حارث قوم بے ہوش ہو چکا تھا۔

بے ہوش ہو جانا اتنا آسان نہیں ہوتا... انسان کا نروس سسٹم اتنی جلدی ہار نہیں مانتا اور پھر ایسا انسان جس کی قوت ارادی بے حد مضبوط رہی ہو۔ وہ جو کہ ایک بہادر، انتہائی قوت برداشت کا مالک شخص رہا ہو۔ جسے جسمانی تکلیف... اذیت بے ہوش نہ کر پائی ہو، بچپن میں چھت سے گرنے سے لے کر کوڑے کھانے تک وہ اپنے ہوش و حواس میں رہا ہو۔ ایسا شخص اگر... کسی ایک رات میں... محض اپنے کسی خوف کی وجہ سے بے ہوش ہو جائے تو اس شخص کی دماغی حالت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

وہ جذباتی انسان نہیں تھا کہ یوں بے ہوش ہو جاتا۔ وہ اک بے حس انسان تھا اور ایسے لوگ عموماً "بڑی سے بڑی بیماریوں میں بھی ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ اپنی قوت ارادی کی بدولت سنبھل جاتے ہیں اور اب... ایسا ہی اک شخص محض خوف زدہ ہو کر بے ہوش ہو گیا

تھا۔ شکست کھا گیا تھا۔ حیرت کی بات تھی۔

زندگی شطرنج کی وہ بساط ہے جس پہ آپ مہرے ہوتے ہیں اور یہ مہرے اپنی مرضی سے نہیں چلتے۔ انہیں کوئی اور چلاتا ہے۔ وہ جو کہ ساری کائنات کا نظام چلا رہا ہے۔ ہاں... ہاں... وہ ہی تو...

☼ ☼ ☼

وہ پہلی دفعہ بے ہوش ہوا تھا۔ مگر یہ آخری بار نہیں تھا۔ وہ پہلی دفعہ بے ہوش ہو کر اسپتال آیا تھا مگر یہ بھی آخری بار نہیں تھا۔ اس نے آنکھیں کھولنا چاہیں' نہیں کھول سکا تھا' اس نے دوبارہ آنکھوں کو بند کیا۔ زور سے میچا اور پھر انہیں کھولا۔ وہ اپنے سانس کے چلنے کی آواز سن سکتا تھا۔ اس کے حواس خمسہ ٹھیک تھے' مگر پھر بھی وہ جان نہیں پا رہا تھا کہ وہ کہاں تھا۔

"کیسا محسوس کر رہے ہو اب تم؟" اچانک اسے اپنے ماتھے پہ کسی ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ وہ آواز اور پنجابی لہجہ...

اس نے چونک کر دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ پہچان نہیں پایا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ جان گیا تھا۔ وہ اس کا سکھ دوست تھا جس کے ساتھ وہ اپارٹمنٹ شیئر کیا کرتا تھا۔

"ٹھیک..." آنکھیں دوبارہ موندتے ہوئے اس نے کہا۔

"تمہیں کیا ہوا تھا؟"

اور جواب میں اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا تھا۔ وہ اس وقت کچھ بولنا' کچھ کہنا' کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ خاموش رہنا چاہتا تھا' سکون محسوس کرنا چاہتا تھا۔ وہ ذہنی طور پر تھک چکا تھا۔

گیان سنگھ نے اک گہرا سانس بھر کے اسے دیکھا تھا۔ وہ رات کی شفٹ کر کے جب آیا تھا حارث بے ہوش پڑا تھا۔ ایک رات میں ہی اس کی آنکھوں کے نیچے ابھرنے والی حلقوں کی لائن کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اس کا پیلا رنگ اور قدرے کمزور چہرہ ڈاکٹر نے اس کو کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھانے کا کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

زندگی میں، بہت سے مراحل... ادوار... اور موڑ آتے رہتے ہیں... وقت کا کام گزرنا ہے سو وہ گزرتا رہتا ہے۔ اچھے دنوں کے بعد سخت دن اور سخت دنوں کے بعد اچھے دن، بہر حال وہ گزر ہی جاتے ہیں۔ مگر...

حارث قیوم کے لیے اب کہ زندگی کوئی نیا مرحلہ، کوئی نیا دور، کوئی نیا ٹرن لے کر نہیں آئی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ زندگی کی سیدھی سڑک پہ چلتے اچانک سڑک کا اختتام ہو گیا تھا وہ سیدھا کسی پاتال، کسی لاوے، کسی کھائی میں جا گرا تھا اور وقت وہیں پہ ٹھہر گیا تھا۔ وہ عذاب سے بھی بدتر دن تھے جو کہ گزر نہیں رہے تھے۔

وہ اب پہلے کی طرح کام نہیں کر سکتا۔ پہلے کی طرح پیسے نہیں کما سکتا تھا۔ پہلے کی طرح عیاشی نہیں کر سکتا تھا۔

وہ اس قابل ہی کہاں رہا تھا۔ رات بڑا عذاب تھی اس کے لیے۔ وہ اس رات کے بعد کبھی سو نہیں پایا تھا۔ وہ جب بھی تنہا یا اکیلا ہوتا اس کا خوف اس پہ حاوی ہونے لگتا اور وہ بے ہوش ہو جاتا۔ پھر اسپتال ہوتا اور وہ ہوتا۔

اس کی جسمانی حالت، دماغی حالت کی وجہ سے متاثر ہو رہی تھی اور ان دونوں کی وجہ سے کمپنی میں اس کی کارکردگی بھی ٹھیک نہیں رہ پا رہی تھی۔ حالانکہ وہ اپنی پوری کوشش میں تھا کہ خود کو سنبھال سکے اور وہ اپنی تمام تر کوشش، صرف اسی کام میں صرف کر رہا تھا۔ مگر اب کی بار وہ ہر کام... ہر چیز میں ناکام ہو رہا تھا۔ اپنے خوف اور تنہائی دور کرنے کے لیے اس نے پھر سے اپنی پرانی سرگرمی شروع کرنا چاہی۔ مگر... اب کہ اس کی یہ چارہ گری بھی کامیاب نہیں ہو سکی تھی کہ اس کے لیے اسے اپارٹمنٹ جانا پڑتا اور اپارٹمنٹ کی چھت کو دیکھتے ہی اس پہ خوف طاری ہو جاتا اور اگر وہ اس خوف پہ قابو پا لیتا تو اسے لگتا کہ اس کے ساتھ آنے والی لڑکی اسے قتل کر کے اس کے اپارٹمنٹ کی قیمتی اشیا اس کا والٹ لے کر بھاگ جائے گی یا پھر اسے لگتا کہ وہ اس کا گلا دبا دے گی یا پھر کسی اور طریقے سے اسے مار دے گی۔ یہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والی لسٹ تھی۔ اس نے یہ کام بھی چھوڑ دیا۔ پھر اس نے دوسرا طریقہ اختیار کیا اور سلیپنگ پلز لینا شروع کر دی۔

امریکہ کے کسی میڈیکل اسٹور پر آپ یوں ہی منہ اٹھا کر کوئی بھی میڈیسن نہیں مانگ سکتے، جب تک کہ آپ کے پاس ڈاکٹر کا نسخہ موجود نہ ہو اور اسے تو پہلے دن سے ہی ڈاکٹر نے سلیپنگ پلز لکھ کر دی تھیں۔ اس کے لیے یہ آسان تھا اور یہ اس کی خوش قسمتی بھی تھی۔ سلیپنگ پلز لینے سے اسے افاقہ ہوا تھا، مگر کچھ عرصہ بعد وہ پلز بس رات کے ایک حصے تک ہی کام کرتی تھیں اور پھر اس کے بعد اسے نیند نہیں آتی تھی۔ وہ اٹھ جاتا، اپارٹمنٹ سے باہر جاتا سڑکوں پر نکل جاتا، کسی پبلک پلیس پہ، کسی ہجوم والی جگہ پہ۔ یا پھر یوں ہی چلتا رہتا۔ سگریٹ پھونکتا رہتا اور پھر سے پلز لے لیتا۔

وہ اکثر اوقات بے بسی سے رو پڑتا۔ سخت سردی میں کسی فٹ پاتھ یا سڑک کے کنارے لگے بینچ پہ بیٹھ کر وہ دھاڑیں مار مار کر روتا... وہاں امریکہ میں پوچھنے یا رک کر کسی کا مسئلہ جاننے یا حل کرنے کا کسی کے پاس وقت تھا، نہ رواج۔ وہ خود کو اتنا بے بس محسوس کرتا کہ اپنے بال نوچ لیتا۔ جھنجلا کر بینچ، پول، فٹ پاتھ کی زمین یا پھر جو کچھ بھی اس کے سامنے ہوتا اسے مار مار کر ہاتھ زخمی کر لیتا اور پھر بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتا۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اب بھی عذاب کی سی حالت میں بھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر پاگلوں کی طرح ہر گزرنے والے کو روک روک کر کہتا۔

"پلیز کیا آپ میری بینڈیج کر دیں گے؟"

اور اگر کوئی اس کی مدد نہ کرتا تو وہ یوں ہی بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر پاگل ہو جاتا اور پھر ٹراما کا شکار ہو کر بے ہوش... یا پھر بھی اس کے ساتھ یہ ہوتا کہ چلتے... چلتے سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتے پلز کا اثر ہوتا اور وہ وہیں کہیں گر کر سو جاتا۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہو چکا تھا

کہ اسے یوں بے سُدھ سوتا دیکھ کر گشت پہ موجود پولیس پکڑ کر لے جاتی۔ وہ ضرور پلز کی زیادتی کی وجہ سے جیل جاتا' اگر اس کے پاس سے ڈاکٹر کا نسخہ نہ نکلتا۔

اس حارث قیوم کو دیکھ کر تو کوئی یقین ہی نہ کرتا کہ یہ چند ماہ پہلے والا حارث قیوم تھا۔ وہ جسمانی اور دماغی دونوں طور پر کمزور ہو چکا تھا۔

ہاں... ایک اور بات... اس حالت میں اسے زینب آپا بہت شدت سے یاد آیا کرتی تھیں اور وہ حیران ہوتا۔ وہ کیوں اسے اس طرح سے یاد آتی تھیں کہ اس کا دل چاہتا کہ وہ ان کی گود میں سر چھپا کر سو جائے۔ ویسا ہی سکون محسوس کر سکے۔ اسے کیوں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر زینب آپا اس کے پاس ہوتو وہ ساری مصیبتوں سے چھٹکارا پا سکتا تھا۔ بے اختیار' لاشعوری طور پہ وہ روتے ہوئے زینب آپا کو پکارتا... شدت سے ان کے پاس جانے کی خواہش کرتا۔

پھر یک دم اسے یاد آتا' اسے تو زینب آپا سے نفرت تھی تو پھر یہ کیا تھا؟ اور وہ وہیں ساکت ہو جاتا۔

"وہ نفرت کہاں تھی جو اسے زینب آپا سے تھی۔ کیا وہ کبھی تھی بھی یا نہیں؟؟"

☆ ☆ ☆

گیان سنگھ ابھی ابھی نائٹ شفٹ کر کے آیا تھا۔ وہ ایک بار میں کام کرتا تھا۔ اس نے چابی سے دروازہ کھولنے سے پہلے ہینڈل گھما کر دیکھا تھا۔ اس کی توقع کے مطابق اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یہ اکثر ہوتا تھا اور ان دونوں کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اب تک کسی حادثے سے محفوظ رہے تھے۔ غصے کی شدید اور اشتعال بھری لہر اس کے اندر اٹھی تھی۔ دروازے کو لاک کرتے ہوئے وہ الٹے پیروں مڑا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ حارث یہیں کہیں آگے پیچھے گرا پڑا سو رہا ہوگا۔ کسی نشے کے عادی کی طرح... نیم ملگجے اندھیرے میں وہ اسے ڈھونڈتا ہوا وہاں آیا تھا اور اس کی توقع کے عین مطابق وہ ایک بینچ پہ دونوں گھٹنے موڑے سویا ہوا تھا۔

اس کے گھٹنے پیٹ کو چھو رہے تھے' جبکہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں جوڑ کر چہرے کے نیچے رکھے وہ بے سدھ سو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر گیان سنگھ کے طیش میں اور اضافہ ہوا اور اس نے ایک بھرپور ٹھوکر اسے دے ماری تھی۔

"اوئے حارثیا (گالی) اوئے اٹھ۔" اس کی مسلسل ٹھوکروں اور آوازوں کی وجہ سے حارث نے بمشکل آنکھیں کھولیں اور پھر دوبارہ لڑھک گیا۔

"اوئے تیری تو (گالی)" گیان سنگھ پھر سے طیش میں آیا تھا اور اب کہ ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پہ دے مارا تھا۔

وہ ہڑبڑایا اور پھر اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔

اس نے تھپڑ والی جگہ پہ ہاتھ رکھا اور گیان سنگھ کو دیکھ کر کسی بچے کی طرح منہ بسورنے لگا تھا۔ اسے یوں ہونٹوں کو بھینچتے ہوئے دیکھ کر گیان سنگھ کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔

اس نے دکھ سے حارث کو دیکھا اور پھر غور کیا۔

اسے یاد تھا کہ جو شرٹ اس وقت حارث نے پہن رکھی تھی اس کا رنگ سفید تھا۔ مگر اب وہ پیلی اور میلی ہو چکی تھی۔ اس کی جینز کا بھی تقریباً" یہ ہی حال تھا۔ اس کا شیو بڑھ چکا تھا۔ بال بھی یقیناً" ترتیب میں نہیں تھے۔ اس کے ہاتھوں کے ناخن بھی بڑھے ہوئے تھے اور وہ اتنے گندے تھے کہ بے اختیار گیان سنگھ کو کراہیت محسوس ہوئی۔ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے گیان سنگھ نے اس کے جسم سے اٹھتی ہوئی بو کو بھی محسوس کیا تھا۔ وہ ابھی تک منہ بسور رہا تھا اور گیان سنگھ کو دیکھے جا رہا تھا۔ ایک گہرا سانس بھرتے ہوئے اس نے حارث کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ "کیا ہو گیا ہے یار تجھے؟" اس نے حارث کا کندھا زور سے ہلایا۔ اس نے گردن موڑ کر گیان سنگھ کو دیکھا اور پھر سیدھا ہوتے ہوئے ہاتھ کی پشت سے رگڑ کر نم چہرے کو صاف کیا تھا۔ پھر وہ اپنی ہپ پاکٹ کھنگالنے لگا تھا۔ اسی طرح اس نے باری باری ساری پاکٹس چیک کی تھیں۔ وہاں پلز کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ گیان سنگھ اسے نوٹ کر رہا تھا۔

"سگریٹ؟" اس نے پوچھا اور گہرا سانس بھرتے ہوئے اسے سگریٹ اور لائٹر نکال کر دیا تھا۔ اس نے ڈبیا میں سے سگریٹ نکالا' منہ میں دبا کر لائٹر کو آن کیا۔ مگر لائٹر کا شعلہ سگریٹ کو سلگا نہیں پا رہا تھا۔ وہ دائیں سے بائیں ہو رہا تھا' مگر سگریٹ کو سلگا نہیں پا رہا تھا۔

گیان سنگھ کو ایک دفعہ پھر سے دکھ ہوا۔ وہ دونوں پچھلے تین سال سے اکٹھے رہ رہے تھے۔ اس نے حارث کے ہاتھ سے لائٹر لے کر سگریٹ سلگایا تھا۔ حارث نے ذرا سا رخ موڑ کر سر کو ہلایا تھا۔ تشکر کے طور پر وہ اب خمیدہ کمر کے ساتھ سگریٹ کے گہرے گہرے کش لگا رہا تھا۔

"حارث! تمہیں دو نوٹس مل چکے ہیں' اب اگر تیسرا بھی مل گیا تو تم کیا کرو گے۔ دوست تمہیں اپنا ذرا خیال نہیں ہے' حالت دیکھی ہے تم نے اپنی؟" گیان سنگھ کی بات سنتے سنتے اس کے چہرے کے تاثرات بدل رہے تھے اور ان میں کھنچاؤ آ رہا تھا۔

پھر ایک دم اس نے اشتعال کے عالم میں سگریٹ کو دور پھینکا تھا اور خود اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ "تمہیں کیا لگتا ہے میں نے اپنی خوشی سے یہ حالت بنائی ہے' بہت سکون ملتا ہے مجھے کبھی بینچ پر اور کبھی فٹ پاتھ پر سوتے۔ میں دو نوٹس ملنے کی خوشی میں بھنگڑے ڈال رہا ہوں۔"

اس نے طیش سے بات شروع کی تھی۔ مگر اب آواز آہستہ ہو گئی تھی۔

"اوئے تو سکھ کا سکھ رہا نا' بہت تکلیف ہے مجھے بہت زیادہ ہے۔" اس نے جھک کر گیان سنگھ کے دونوں کندھوں پہ ہاتھ رکھے تھے اور انہیں زور' زور سے ہلاتے ہوئے رو کر کہہ رہا تھا۔

"تو پھر تم کچھ کرتے کیوں نہیں ہو' سائیکاٹرسٹ کے پاس کیوں نہیں جاتے۔" وہ اس کے دونوں ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹا کر اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا تھا۔ حارث نے تھک کر اس کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ نکالے تھے اور بینچ پہ بیٹھ کر سر اس کی پشت سے لگا لیا تھا۔ وہ اب آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں ہلکی ہلکی سپیدی نمودار ہو رہی تھی۔

"چل... میں تجھے لے چلتا ہوں۔" وہ اب پیار سے کہہ رہا تھا۔

"جانا ہے کسی کے پاس؟"

"ہاں..."

"کون ہے؟"

"مسلا ہے تیری طرح..."

گیان سنگھ اب کہ ہنس کر بولا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ پہلے سے بہتر نظر آ رہا تھا۔ تراشیدہ سلیقے سے جمے ہوئے بال... شیو بھی کی گئی تھی۔ لباس بھی صاف ستھرا تھا اور وہ خود بھی فریش دکھائی دے رہا تھا۔ یہ یقیناً "گیان سنگھ کی وجہ سے تھا اور اس نے ہی اسے ڈاکٹر حسنات سے اپائنٹمنٹ لے کر دی تھی۔ وہ اس وقت ان کے سامنے موجود تھا۔

"ایک مسلمان ہونے کے ناتے سے ہمیں موت سے ڈرنا چاہیے' مگر جس طرح سے آپ کی..."

"آپ غلط سمجھے ہیں... میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے موت سے نہیں ڈرتا' یہ کیفیت کچھ اور ہے۔" اس نے تیزی سے ڈاکٹر حسنات کی بات کاٹی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس کے خوف کو کسی اور سمت میں لے جائیں۔ یعنی اسلام اور مسلمان کی طرف... ڈاکٹر حسنات حیران ہوئے۔ مگر انہوں نے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ کس حد تک مسلم تھا' یہ انہیں اس کی ہسٹری سے معلوم ہو چکا تھا۔ وہ ان کو سب کچھ بتا چکا تھا۔ بنا کچھ چھپائے۔

"اچھا تو یہ کون سی کیفیت ہے۔" وہ اپنی آرام دہ کرسی سے ٹیک لگائے' بند ہاتھوں کی مٹھی ہونٹوں پہ رکھے بغور اسے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے یک دم حارث کے چہرے پہ الجھن کے تاثرات ابھرتے دیکھے تھے' یوں جیسے وہ خود کو ظاہر نہ کر پا رہا ہو۔

"میرا مطلب ہے کہ تمہیں کیا محسوس ہوتا ہے جب بھی تم موت کے بارے میں سوچتے ہو؟ موت

کے کس خیال سے تمہیں خوف آتا ہے۔" ان کے اس سوال سے حارث کے جسم میں ایک کرنٹ سا دوڑی تھا۔ ڈاکٹر حسنات نے اسے خوف زدہ ہوتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھے اور اس کی پشت پہ کھڑے ہو کر اس کے کندھوں پہ دونوں ہاتھ کا نرم سا دباؤ ڈالا تھا۔

"بی ریلیکس حارث۔ بی ریلیکس۔ یہ۔ یہ صرف تمہارا خوف ہے۔ اور کچھ بھی نہیں۔ بتاؤ مجھے۔ کیسا خوف محسوس کرتے ہو تم؟" وہ بڑے ہلکے ہاتھوں سے نرمی سے اب اس کے کندھے سہلا رہے تھے۔

"میں مرنے سے ڈرتا ہوں۔ خ۔ خ۔ خو۔ خوف آ۔ آتا ہے مجھے۔ قب قبر کا سوچ کے۔ میرا سانس بند ہوتا ہے جب میں سو۔ سوچتا ہوں کہ میرے۔ میرے اوپر اتنی مٹی ہو گی۔ یہ دنیا۔ میں اسے نہیں دیکھ پاؤں گا۔ میرا جسم۔" وہ اب اپنے دونوں ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔

"میرا جسم۔ یہ کیڑوں کی خوراک بنے گا۔ وہ کیڑے جنہیں میں اپنے جسم پہ محسوس کرتے ہی گرا کر مار دیتا ہوں۔ میری زندگی۔ یہ۔ یہ ختم ہو جائے گی۔ پھر سب ختم۔ سب ختم۔ صرف اک تنگ سی قبر۔ اندھیرا۔ سانس لینے کو کوئی روزن۔ سوراخ تک نہیں۔ اندھیرا۔ اندھیرا۔"

اب وہ کمرے میں موجود چیزوں کو دیکھ رہا تھا اور یوں دیکھ رہا تھا جیسے آخری بار دیکھ رہا ہو۔ کمرے میں ہیٹنگ سسٹم ہونے کے باوجود وہ لرز رہا تھا۔ کپکپا رہا تھا۔ ہلکے مگر تیز سانس لے رہا تھا۔

"اندھیرا۔ اندھیرا۔" وہ سسکتے ہوئے مسلسل ان ہی دو الفاظ کو دہرائے جا رہا تھا۔

"ریلیکس پانی پیو۔ شاباش۔" اسی دوران ڈاکٹر حسنات اس کے لیے پانی لے آئے تھے۔

"شاباش پیو۔" وہ اسے کسی بچے کی طرح پچکار رہے تھے۔

حارث نے کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ گلاس پکڑا تھا اور ایک سانس میں ختم کیا تھا۔ ڈاکٹر حسنات دوبارہ اپنی کرسی پہ بیٹھ چکے تھے اور اپنی پیشانی کو مسلتے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔

"تھینکس۔" اس نے گلاس سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ وہ ان کی زندگی کا عجیب کیس تھا اور سمجھ سے باہر بھی تھا۔

ایک شخص جو کہ ایک فائرنگ کے واقعے میں معجزانہ طور پر بچتا ہے۔ جیل کاٹتا ہے۔ گناہ کرتا ہے۔ پھر کوڑے کھاتا ہے اور پھر گناہ کرتا ہے۔ پھر گناہ۔ وہ موت سے ڈرتا ہے۔ مگر موت کے بعد اپنے انجام سے نہیں۔ وہ جان نکلنے سے خوف کھاتا ہے۔ مگر جان دینے اور لینے والے سے نہیں۔ یہ عجیب تھا۔ یہ بہت ہی عجیب تھا۔ اگر کوئی عام مسلم شخص ان کے پاس اس طرح کا مسئلہ لے کر آتا تو وہ یقیناً" اسے دلائل۔ آیات۔ احادیث کے حوالے دے کر مطمئن کرتے کیونکہ وہ صرف سائیکاٹرسٹ نہیں تھے۔ وہ قرآن بھی جانتے تھے، مگر وہ عالم نہیں تھے۔ وہ اس شخص کا کیا کرتے۔ جو ان کے سامنے بیٹھا تھا اور موت کے علاوہ

کسی سے خوف زدہ نہیں تھا۔

"تو کیا اس کا دل مہر شدہ تھا؟" اس لرزتے شخص کو دیکھ کر ڈاکٹر حسنات نے سوچا۔

"مہر شدہ دل کسی بھی چیز سے خوف نہیں کھاتے' وہ خوش... مطمئن اور مسرور ہوتے ہیں' اپنے ہی گناہوں میں... وہ ڈھیل دیے گئے لوگ ہوتے ہیں۔"

"اور اسے... یقیناً ڈھیل نہیں دی گئی تھی؟"

ایک گہرا سانس بھر کے... کچھ بے بس ہوتے ہوئے ڈاکٹر حسنات نے اپنا قلم لے کر رائٹنگ پیڈ پہ لکھنا شروع کیا تھا۔

"یہ کچھ آیات کے نمبرز اور سورتوں کے نام ہیں۔ ان کو مستقل پڑھو' ان شاء اللہ تم فرق محسوس کرو گے۔" وہ مصروف سے انداز میں لکھتے ہوئے بولے تھے۔

"میں قرآن نہیں پڑھ سکتا۔ نہیں پڑھا ہوا میں..." وہ کسی بھی قسم کی شرمندگی کے بغیر بولا تھا۔ وہ

اب ٹشو سے ماتھے پہ آیا پسینہ صاف کر رہا تھا۔ یوں جیسے اسے معلوم ہی نہ ہو کہ اس نے کیا کہہ دیا تھا۔

اور ڈاکٹر حسنات... ان کا قلم وہیں ایک جگہ پہ ساکت تھا۔ وہ پلکیں جھپکائے بنا... اسے دیکھ رہے تھے۔ اچانک ایک فلیش ہوا تھا اور کوئی کرنٹ سا... سر سے لے کر پیر تک ڈاکٹر حسنات کے جسم میں دوڑا تھا۔

اس کی بیماری اور اس کا علاج دونوں ہی بے حد اچانک انہیں سمجھ میں آیا تھا۔ کچھ لمحوں کے توقف کے بعد انہوں نے پین والا ہاتھ ہلایا۔ قلم ہاتھ سے چھوٹ کر شیشے کی ٹیبل پر آواز پیدا کرتے ہوئے گرا تھا۔

"تم جانتے ہو تمہارا علاج میرے پاس نہیں ہے۔ بلکہ یہ کسی کے پاس نہیں ہے۔" وہ اب براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے تھے۔

"تو کس... کس کے پاس ہے... میں چلا جاؤں گا... میں کہیں بھی چلا جاؤں گا۔ کچھ بھی کروں گا۔ کسی بھی طرح سے... آپ مجھے بتادیں پلیز... کوئی تو طریقہ ہو گا' کچھ تو ضرور ہو گا۔" وہ بے اختیار بہت بے چین ہوا تھا۔

"موت ایک حقیقت ہے، حارث قیوم! تمام جان داروں کا یہ ہی فانی انجام ہے۔ تمہیں موت سے کوئی چیز نجات نہیں دے سکتی۔ کچھ بھی تمہیں اس سے نہیں بچا سکتا۔ تم کچھ بھی کرلو' سرنگ کھود کر زمین کی تہوں میں جا چھپو یا پھر کسی کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرلو۔ تمہیں مرنا ہی ہے۔ یہ ہی تمہاری حقیقت ہے۔ تمہیں نہیں مل سکتی ثبات۔ مگر..." وہ اچانک خاموش ہوئے تھے۔

"مگر... مگر کیا...؟" حارث یک دم ٹیبل پہ دونوں ہاتھ رکھ کر آگے کو جھکا تھا۔

"بولیے ڈاکٹر... مگر کیا..." وہ سخت مضطرب تھا

"مگر شفا... مل سکتی ہے۔" ڈاکٹر حسنات نے بھی اسی طرح سے آگے جھک کر سرگوشی میں کہا تھا اور اس کے چہرے پہ مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ وہ... حارث قیوم... وہ نجات ڈھونڈنے آیا تھا۔ اس نے تھک کر

ڈاکٹر حسنات کو دیکھا اور پھر کرسی سے ٹیک لگائی تھی۔ وہ اب ذرا سا رخ موڑے ہونٹوں کو بھینچ کر اپنی حالت پہ قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈاکٹر حسنات نے بھی کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے' اب کے... اسے مسکرا کر دیکھا تھا۔

"حارث قیوم۔" اس نے بے زاری سے انہیں دیکھا۔

"بیماری سے نجات نہیں ملتی' شفا ملتی ہے۔" متبسم لہجے میں کہا گیا جملہ تھا۔

"کیسے؟" وہ پھر سے اسی پرجوش انداز میں ٹیبل پر جھکا تھا۔

ڈاکٹر حسنات اپنی دائیں سائیڈ پہ ذرا سا جھکے اور ایک دراز کھول کر کچھ نکالا تھا۔ پھر انہوں نے اسے حارث کے سامنے رکھ دیا تھا۔ حارث نے شدید حیران ہو کر کچھ کہنا چاہا۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

(تیسری اور آخری قسط آئندہ ماہ)

فروری 2015ء
کے شمارے کی ایک جھلک

- عمیرہ احمد کا ناول "آبِ حیات"،
- نمرہ احمد کا مکمل ناول "نمل"،
- تنزیلہ ریاض کا مکمل ناول "عہد الست"
- نعیمہ ناز، راؤ سمیرا ایاز اور حیا بخاری کے ناولٹ،
- مہک فاطمہ، حوازنہ، زینت زونی اور ریحانہ اسلم کے افسانے،
- معروف ٹی وی فنکار "شہریار منور" سے ملاقات،
- ٹی وی فنکارہ "حنا الطاف" سے باتیں،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ "دستک"،
- کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا فروری 2015 کا شمارہ آج ہی خریدلیں۔

نبیلہ عزیز

وصل سراب
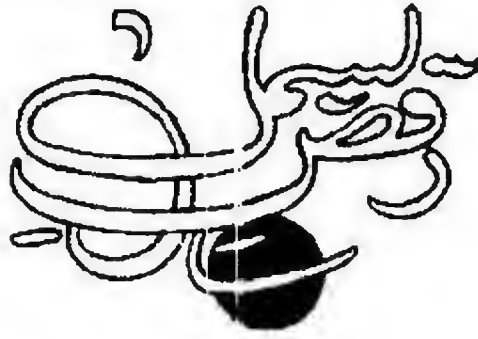
ماورا مرتضیٰ' عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ ماورا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

فارہ اپنی ثمینہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لاتعلق ہے۔

منزہ' ثمینہ اور نیرہ کے بھائی رضا حیدر کے دو بچے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر بزنس مین ہے اور بے حد شان دار پرسنالٹی کا مالک ہے۔ ولید رحمٰن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیٹس حائل نہیں ہے۔ نیرہ کے بیٹے سے فارہ کی بہن حمنہ بیاہی ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں بم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے حواس کھو دیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اسے سنبھال کر تیمور کو فون کرتا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید اور عزت کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ دیتی ہے۔ تاہم عزت کھل کر اس کا اظہار کر دیتی ہے۔ ولید ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔

آفاق فون کر کے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فارہ روتی ہے۔ اشتیاق یزدانی' آفاق سے حد درجے خفا ہو کر اس سے بات چیت بند کر دیتے ہیں۔ آفاق مجبور ہو کر شادی پر راضی ہو جاتا ہے۔ فارہ دل سے خوش نہیں ہو پاتی۔ رضا حیدر' تیمور و فارہ کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد بھیجتے ہیں۔ فارہ اپنی تاریخ میں ماورا کو بصد اصرار مدعو کرتی ہے۔ ماورا' عافیہ بیگم کی ناراضی کے باوجود چلی جاتی ہے۔ وہاں تیمور اور ماورا کی ملاقات ہو جاتی ہے۔

شادی میں تیمور حیدر' ماورا کے قریب آنے کی کافی کوشش کرتا ہے مگر ماورا کا سخت اور کھرا رویہ ہر بار اسے ناکام

کردیتا۔ تیمور' ماورا سے رضا حیدر کو ملواتا ہے۔ رضا حیدر اسے دیکھ کر چونک جاتے ہیں مگر باوجود کوشش کہ وہ سمجھ نہیں پاتے۔ فارہ کی ہی شادی میں عزت کی ملاقات خیام مرزا کے بیٹے مونس مرزا سے ہوتی ہے۔ وہ سخت بیزار ہوتی ہے جبکہ مونس خوب دلچسپی لیتا ہے۔

شادی کے اول روز سے آفاق کے انداز کچھ مشکوک سے ہیں۔ فارہ سمجھ نہیں پاتی اور غیر مطمئن رہتی ہے۔ تیمور' فارہ کے ذریعے' ماورا کو اپنے آفس میں ایک شاندار پیکج پر جاب کی پیشکش کرتا ہے۔ جسے ماورا کافی حیل حجت کے بعد قبول کرلیتی ہے۔ یہ گل یہ جان کر دم بخود رہ جاتی ہیں جب انہیں پتا چلتا ہے کہ تیمور' رضا حیدر کا بیٹا ہے۔ ماورا' عافیہ بیگم کی سخت مخالفت کے باوجود ان دونوں کو لے کر کراچی کے فلیٹ میں شفٹ ہو جاتی ہے جو اسے آفس کی طرف سے ملا ہے۔ آہستہ آہستہ اسے دیگر مراعات بھی تیمور مہیا کردیتا ہے۔ تیمور کئی مرحلوں پر ماورا کی گھریلو سطح پر بھی مدد کرتا ہے۔ اتفاق سے ماورا کی زبانی تیمور سن لیتا ہے کہ ماورا ایک مقصد کے تحت اس کے آفس میں کام کرنے پر راضی ہوئی ہے۔

آفاق کا رویہ بدستور مشکوک ہے۔ فارہ اسے چھوڑ کر اپنے شہر آجاتی ہے۔ ثمینہ آفاق سے خفا ہو جاتی ہیں۔ آفاق دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے لینے جانے کا ارادہ کرلیتا ہے۔ ولید اور عزت کے درمیان محبت کا باقاعدہ اقرار ہو جاتا ہے۔ خیام مرزا عزت کا رشتہ مانگتے ہیں۔ رضا حیدر خوش ہوتے ہیں مگر تیمور انکار کردیتا ہے۔ ماورا کے جاب چھوڑنے پر تیمور اسے باقاعدہ پروپوز کرتا ہے اور اس کی خواہش کے مطابق اپنی تمام تر جائیداد اس کے نام لکھنے کا وعدہ کرلیتا ہے۔ عزت سے فون پر بات کرنے کے دوران نامعلوم افراد ولید کو گولیاں مار دیتے ہیں۔ عزت گھبرا کر تیمور کو بتاتی ہے۔ وہ اسپتال بھاگتا ہے۔ ولید کو اسی اسپتال میں لایا جاتا ہے' جہاں عافیہ بیگم داخل ہیں۔

۱۸
اٹھارہویں قسط

اور وہ لرزتی ٹانگوں سے پلٹ کر دوبارہ بینچ پر بیٹھ گئی۔

"یا اللہ رحم فرما... یا اللہ رحم فرما... یا اللہ... ولید رحمان کی ماں پہ رحم فرما... اس کے لخت جگر کو سلامت رکھ... اس کو زندگی نواز دے۔" ماورا نے آنکھیں بند کر کے مٹھیاں بھینچتے ہوئے صدق دل سے دعا کی تھی۔

"ضمیر... ضمیر... ولید کہاں ہے؟" تیمور حیدر کی آواز پہ ماورا نے یک دم آنکھیں کھول دی تھیں۔ تیمور حیدر بہت بوکھلائے اور گھبرائے ہوئے انداز سے ضمیر انصاری کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس کے پیچھے اس کی بہن عزت حیدر بھی تھی' جسے دیکھ کر ماورا بری طرح چونکی تھی۔

"وہ... وہ... آپریشن تھیٹر میں ہے۔" ضمیر انصاری نے آپریشن تھیٹر کی طرف اشارہ کیا تھا' جہاں ڈاکٹرز جمع ہو رہے تھے۔

"وہ بچ جائے گا نا؟" تیمور نے اپنے اندر کے خدشوں سے ڈر کر پوچھا تھا۔

"یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے... ورنہ اس کی حالت تو بہت ہی..." ضمیر انصاری نے بات ادھوری چھوڑتے ہوئے لب بھینچ لیے تھے۔

اور عزت نے اپنے اندر اٹھتی چیخوں کو دبانے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ منہ پہ رکھ لیے تھے۔

"یا اللہ..." تیمور زیر لب کہتا بے ساختہ آپریشن تھیٹر کی طرف لپکا تھا اور عزت مرے مرے قدموں سے چلتی بے دھیانی میں آکر ماورا کے برابر بینچ پر بیٹھ گئی تھی اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپاتے ہوئے رو پڑی تھی۔

ماورا بڑے تعجب آمیز انداز سے اسے دیکھ رہی تھی کیونکہ تیمور حیدر کی اس قدر پریشانی اور بے قراری تو سمجھ آرہی تھی لیکن تیمور حیدر کی بہن کی ایسی کیفیت اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ولید رحمان سے اس کی

بھی کوئی دوستی ہو۔ ماورا نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے سوال کو خود ہی جواب سے نوازا۔

"دوستی... مگر نہیں... عورت اور مرد میں کبھی دوستی نہیں ہو سکتی۔" اس نے اپنے جواب کو خود ہی جھٹلا بھی دیا تھا۔

"تو پھر..." ذہن نے مزید الجھانے کی کوشش کی تھی۔

اور اس "تو پھر..." سے آگے کا جواب سمجھ میں آتے ہی ماورا چونک گئی تھی اور عزت حیدر کو گردن موڑ کر دوبارہ دیکھا تھا۔

"اس طرح رونے سے بہتر ہے کہ آپ اس کی زندگی کی دعا کریں... اللہ کے حضور جھک کر اس کا رحم مانگیں۔" ماورا نے بے حد آہستگی سے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تھا اور عزت نے یک دم چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"آپ...؟" عزت اسے پہچان نہیں پائی تھی۔

"میں بھی ولید رحمان کے لیے ہمدردی رکھنے والوں میں سے ہوں... وہ واقعی بہت بری حالت میں ہے۔ اسے دعا کی ضرورت ہے۔" وہ بڑے مضبوط لہجے میں بول رہی تھی۔

"آ... آپ... نے... دیکھا ہے... اسے؟" عزت کو اس کی بری حالت کا سن کر یہی سوال سوجھا تھا۔

"ہاں دیکھا ہے... اور اس کی ماں کا کلیجہ کٹا ہوا نظر آیا ہے... خون میں لت پت۔" ماورا تھوڑی دیر پہلے کا منظر یاد کرتے ہوئے جھرجھری لے کر رہ گئی تھی۔

"وہ... وہ... بچ جائے گا نا؟" عزت کا بھی وہی تیمور والا سوال تھا۔

"وہ بچ جائے گا... یہ کہنے والے ہم کون ہوتے ہیں بھلا؟ یہ ساری ڈور تو اللہ کے ہاتھ میں ہے... ہاں البتہ یہ دعا ضرور کر سکتے ہیں کہ وہ بچ جائے... اللہ اسے لمبی عمر عطا کرے... آمین۔" ماورا کی بات پہ عزت نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

"میں آپ کو پہچان نہیں پائی؟" عزت آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"ماورا! ڈرپ ختم ہو گئی ہے بیٹا!" بی گل روم سے نکل کر باہر آ گئی تھیں۔

"جی میں ابھی نرس کو انفارم کرتی ہوں۔" ماورا کہتی ہوئی تیزی سے اٹھ گئی تھی اور بی گل پلٹ کر چلی گئیں جبکہ عزت جوں کی توں دیکھتی رہ گئی۔

"ماورا... ماورا مرتضیٰ... تت... تیمور بھائی کی... او، مائی گاڈ... میں اسے پہچان ہی نہیں پائی... مگر وہ... وہ... رات کے اس پہر یہاں کیوں ہے۔ اس کا کون بیمار ہے اور... اور اسے میرے... اور ولید کے بارے میں کیسے پتا چلا؟"

جس طرح تھوڑی دیر پہلے ماورا کے ذہن میں عجیب عجیب سوال اٹھ رہے تھے، اسی طرح اب عزت کے ذہن میں بھی ایسے ہی عجیب عجیب سوال ہلچل مچا رہے تھے۔

"آپ کا اور ولید رحمان کا تعلق آپ کے چہرے پہ لکھا ہے۔" ماورا دوبارہ آ کر اس کے برابر بیٹھ گئی تھی۔ عزت ایک بار پھر ٹھٹکی تھی۔

"آنسوؤں کی تحریر بڑی بامعنی ہوتی ہے... صاف نظر آ جاتی ہے... کیونکہ میری بی گل کہتی ہیں کہ آپ کو کسی کے لیے ہنسی آ جائے... یہ بڑی بات نہیں ہے... البتہ... آپ کو کسی کے لیے رونا آ جائے... یہ بہت بڑی بات ہے۔ کیونکہ ہنسی صرف چہرے سے پھوٹتی ہے، جبکہ آنسو دل سے پھوٹتے ہیں اور دل سے آنسو اسی وقت پھوٹتے ہیں

جب بے چارے دل پہ چوٹ پڑتی ہے..... بلبلاتا ہے۔ بے چارہ۔"
ماورا نے عزت کا دھیان کافی حد تک بٹا دیا تھا۔ عزت بھی اسے دیکھے جا رہی تھی۔
"حیران ست ہوں..... یہ بہت عام سی باتیں ہیں۔ آپ خاص بات کی طرف دھیان دیں۔" ماورا نے اس کی توجہ دوسری طرف دلانی چاہی۔
"خاص بات..... "عزت نے زیر لب دہرایا۔
"دعا..... ولید رحمان کے لیے دعا کرنے کی بات..... "اس نے دعا کی طرف توجہ دلائی۔
"عزت..... ولید کا آپریشن..... "تیمور کافی عجلت بھرے انداز میں عزت کو دیکھ کر اس طرف آیا تھا مگر اس کے برابر میں بیٹھی ماورا کو دیکھ کر بے ساختہ رک گیا تھا اور بات بھی ادھوری رہ گئی تھی۔
"آپ یہاں..... "تیمور کو اک نئی تشویش ہوئی تھی۔
"ہاں..... میری مدر کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔" ماورا کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی تھی۔
"نروس بریک ڈاؤن.....؟" تیمور خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔
"آپ لوگ بات کریں..... میں چلتی ہوں۔" ماورا کہہ کر وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"مرتضیٰ..... مرتضیٰ..... بی گل..... مرتضیٰ..... "عافیہ بیگم گہری غنودگی کے باوجود بے حد اذیت سے اور آہستگی سے پکار رہی تھیں اور ان کی اس پکار پہ ماورا کا دل مٹھی میں آگیا تھا۔
وہ اٹھ کر ان کے بیڈ کے قریب آگئی تھی۔
"امی..... پلیز ریلیکس..... "اس نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے تھپکا تھا۔
"دیکھیں..... ہم آپ کے پاس ہیں۔" اس نے انہیں تسلی دینے والے انداز سے کہا تھا۔
"بی گل..... مرتضیٰ..... "عافیہ بیگم کے منہ سے جیسے سسکی ابھری تھی۔
"عافیہ..... عافیہ..... آنکھیں کھولو بیٹا..... سب ٹھیک ہے..... دیکھو تو سہی۔" بی گل نے بیڈ کے قریب آکر ان کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے انہیں اپنی موجودگی کا یقین دلانے کی کوشش کی تھی۔
"ڈونٹ وری ماں جی..... وہ بے ہوشی میں ایسی باتیں کر رہی ہیں۔" نرس نے اندر آتے ہوئے انہیں پریشانی سے منع کیا تھا۔
"بے ہوشی میں بھی تو صحیح باتیں کر رہی ہے۔" بی گل نے تلخی سے کہہ کر سر جھٹکا۔
"بے ہوشی میں اکثر لوگ صحیح باتیں ہی کرتے ہیں۔" نرس ہلکے سے مسکرائی تھی۔
"اسی لیے، تو پریشانی ہو رہی ہے۔" بی گل تاسف سے بولی تھیں۔
"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تھوڑی دیر بعد یہ مکمل ہوش میں آجائیں گی۔ ریلیکس..... "نرس عافیہ بیگم کا چیک اپ کرنے کے بعد ان سے کہتے ہوئے ماورا کا کندھا تھپک کر باہر نکل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ولید کو خون کی ضرورت تھی۔
اور اتفاق سے تیمور کا خون میچ کر گیا تھا۔
ماورا عافیہ بیگم کے چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کو بلانے کے لیے نکلی تھی لیکن سامنے والے روم میں بیڈ پہ لیٹے

تیمور حیدر کو دیکھ کر قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے۔۔۔ جس کی نبضوں سے ولید رحمان کے۔ لیے خون نکالا جا رہا تھا۔۔۔ ماورا کے دل پہ اک سایہ سا گزرا تھا اور اسے پتا بھی نہیں چلا تھا۔

وہ ٹھٹکی تھی۔۔۔ رکی تھی۔۔۔ دیکھا تھا۔۔۔ کچھ ہوا تھا۔۔ اور آگے بڑھ گئی تھی۔

لیکن زیادہ آگے بھی نہیں بڑھ سکی تھی۔۔۔ کیونکہ راستے میں ہی عزت حیدر بھی بیٹھی ہوئی تھی۔۔۔ پریشان حال۔۔۔ اور آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی۔۔ ماورا اسے نظر انداز نہیں کر سکی۔

"عزت۔۔۔" اس کے قدم ٹھہر چکے تھے۔

عزت۔۔نے آہستگی سے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔

"میرے۔ ساتھ آجاؤ۔" ماورا نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا اور عزت تو انکار کرنے کی حالت میں ہی نہیں تھی۔ اس کا ہاتھ تھام کر راہ داری کے بینچ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور ماورا اسے ساتھ لیے اپنے کمرے میں واپس آگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم۔۔۔" صبح ہو چکی تھی' جب تیمور نے اندر داخل ہوتے ہوئے سلام کیا تھا اور عزت کو چائے کا کپ تھماتی ماورا۔ کے ہاتھ رک گئے تھے۔

بی گل اور عافیہ بیگم نے بھی چونک کر دروازے کی سمت دیکھا تھا۔ عافیہ بیگم ہوش میں آچکی تھیں اور کافی دیر سے عزت کو دیکھ رہی تھیں کہ وہ کون ہے مگر دل میں ناراضی ہونے کی وجہ سے پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔۔۔ لیکن اب دروازے میں کھڑے تیمور حیدر کو دیکھ کر وہ عزت کو بھی پہچان گئی تھیں۔

"وعلیکم السلام بیٹا۔ آؤ۔۔ اندر آؤ۔" بی گل دانا دشمن والے محاورے پہ پورا اترنے والوں میں سے تھیں۔۔۔ عافیہ بیگم کی طرح دوسری طرف رخ نہیں پھیر سکتی تھیں۔

"تھینک۔ یو۔۔ آنٹی کیسی ہیں؟" اس نے ذرا ٹھہر کر اندر داخل ہوتے ہوئے بی گل سے استفسار کیا تھا۔

"ہاں۔۔ اللہ کا کرم ہے اب۔۔۔ پہلے سے کافی بہتر ہے۔۔۔ تم اپنے دوست کا سناؤ بیٹا۔۔ خیریت سے تو ہے نا۔" بی گل نے ولید کا پوچھا تھا۔

"جی ہاں۔۔۔ اللہ کا احسان ہے۔۔۔ اس کا آپریشن کامیاب ہوا ہے۔"

"ریلی' بھائی!" عزت یک دم بے قراری سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس پل پہلی دفعہ تیمور نے ذرا چونک کر عزت کے چہرے کی سمت دیکھا تھا اور اسے عزت۔ کے چہرے پہ ولید کے نام کی اتنی خوشی نظر آئی تھی کہ عزت کا اپنا چہرہ اسے۔ دکھائی ہی نہیں دیا تھا اور تیمور عزت کے۔ چہرے پہ ولید کا چہرہ دیکھ کر چند لمحے کے لیے اپنی جگہ پہ گم صم سا ہو کر رہ گیا تھا۔

اور اس کا یہ گم صم ہونا عزت نے بھی محسوس کر لیا تھا اور ماورا نے بھی۔۔۔

عزت۔ بے ساختہ تھم گئی تھی۔

"چائے لیں گے؟" ماورا نے مداخلت کی۔ وہ ٹھٹک 'گیا تھا۔

"نو تھینکس۔۔۔ میں ابھی گھر جا رہا ہوں۔۔۔ سوچا اسے بھی ساتھ لے لوں۔۔۔ چلیں۔۔۔؟" وہ ماورا کو وضاحت دیتے ہوئے عزت کی طرف متوجہ ہوا۔

"جی۔۔۔" عزت فوراً" سر جھکا کر اس سے پہلے ہی باہر نکل آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

صبح صبح سڑکوں پہ بہت زیادہ رش تھا۔

ڈاکٹرز نے تیمور کو آج کے دن ڈرائیو کرنے سے منع کیا تھا کہ خون دینے کی وجہ سے اسے کہیں کوئی چکر وغیرہ نہ آجائے۔ مگر وہ ایسا پریشان تھا کہ اسپتال سے خود ہی گاڑی لے کر نکل آیا تھا۔

عزت فرنٹ سیٹ پہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور تیمور خاموشی سے ونڈ اسکرین پہ نظریں جمائے ڈرائیو کر رہا تھا۔

"بھائی۔" بالآخر عزت نے خود ہی اس خاموشی کا تسلسل توڑنے کی کوشش کی تھی۔

"پلیز۔ میں ابھی اس ٹاپک پہ بات نہیں کرنا چاہتا۔" تیمور نے اسے کچھ بھی کہنے سے منع کر دیا تھا۔

"لیکن بھائی! میں کرنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ آپ کسی غلط فہمی کا شکار ہوں۔" عزت بڑی تیزی سے بولی تھی۔

"میرے دل میں کوئی غلط خیال نہیں آئے گا۔ کیونکہ مجھے تم سے بھی زیادہ اس پہ بھروسا ہے۔ اعتماد ہے۔ یقین ہے۔" تیمور نے سنجیدگی و یقین سے کہا۔

"تو پھر ایسا رویہ کیوں؟" عزت نے بے ساختہ کہا۔

"افسوس ہے کہ اس نے یا تم نے مجھ پہ بھروسا نہیں کیا۔" تیمور نے تلخی سے سر جھٹکا۔

"نہیں بھائی۔ ایسا مت کہیں۔ میں تو۔"

"تو پھر۔ پھر کیوں ایسا ہوا کہ۔ مجھے بے خبر رکھا گیا؟" تیمور چیخا۔

"کیونکہ وہ اس بات کے حق میں ہی نہیں تھا۔ وہ انکاری تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں اس کے دوست کی بہن ہوں اور وہ اپنے دوست کی بہن کو اس نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ اور نہ ہی... شادی کر سکتا ہے۔ کیونکہ ہمارے بیچ کلاس کا فرق ہے۔ اسی فرق کو لے کر اس نے مجھے بہت نظر انداز کیا۔ میں جانتی تھی کہ وہ مجھ میں انٹرسٹڈ ہے مگر اسٹیٹس کی وجہ سے اور آپ کی وجہ سے اظہار نہیں کر رہا۔" وہ رکی۔

"اور بیچ میں پھر کچھ ایسا وقت آیا کہ میں نے غصے میں اسے اس کے حال پہ چھوڑ دیا۔ لیکن جب اسے مونس مرزا کا پتا چلا تو پھر وہ چپ نہیں رہ سکا۔ اور یہ ابھی کل کی بات ہے۔ اور آج یہ سب ہو گیا۔ پھر کیسے اور کب کچھ بتاتی آپ کو۔"

عزت نے تیمور کے سامنے ساری بات سچ سچ کہہ دی تھی اور تیمور نے ڈرائیو کرتے ہوئے اک گہری سانس خارج کی تھی اور پھر قدرے توقف سے گردن موڑ کر عزت کی طرف دیکھا تھا۔

"اینی وے۔ یو ڈونٹ وری۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ مجھے خوشی ہے اس بات کی کہ تم نے ایک اچھے انسان کا انتخاب کیا۔ جو ہر معاملے میں سچا اور کھرا ہے۔" تیمور نے کہتے ہوئے عزت کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا تھا اور عزت اس کے اس قدر بھرپور ساتھ پہ بے ساختہ خدا کا شکر بجا لائی تھی۔

"تھینک یو بھائی۔ تھینک یو سو مچ۔" عزت اس کے بازو سے لگ گئی تھی۔

"جانتی ہو بابا کا کیا ری ایکشن ہو گا؟" تیمور کا اشارہ مونس مرزا کے پرپوزل کی طرف تھا کہ اس کے بعد ولید کے پرپوزل کی کیا حیثیت ہو گی۔

"ہاں جانتی ہوں۔ مگر آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کوئی ڈر نہیں ہے۔ اب میں ریلیکس ہوں۔" وہ بیٹھے بیٹھے چہکنے لگی تھی اور تیمور نے مسکراتے ہوئے گیٹ پر ہارن دیا تھا۔

✡ ✡ ✡

"بیگم صاحب۔۔۔ باہر آفاق صاحب آئے ہیں۔" منزہ رحیم ملازمہ سے ڈائننگ روم سیٹ کروا رہی تھیں جب ملازم نے آکر اطلاع دی اور منزہ رحیم اپنی جگہ پہ جوں کی توں رہ گئیں۔

"آفاق۔۔؟" انہوں نے بمشکل ہونٹوں کو جنبش دی تھی۔

"جی ہاں۔۔۔ آفاق صاحب!" ملازم نے تصدیق کی۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ اندر بھیجو۔" منزہ رحیم نے اپنے تاثرات سنبھال کر لیے تھے۔

"جی ٹھیک ہے۔" ملازم کہہ کر چلا گیا تھا اور چند ثانیے بعد آفاق کی صورت نمودار ہوئی تھی۔

"السلام علیکم آنٹی!" اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔" منزہ رحیم کا لہجہ آج پھر اجنبیت لیے ہوئے تھا۔

"کیسی ہیں؟" وہ قریب آچکا تھا۔

"ٹھیک ہوں' اللہ کی مہربانی سے۔۔۔ آؤ بیٹھو۔" انہوں نے اپنے آپ کو رفتہ رفتہ نارمل کرنے کی کوشش کی تھی۔

"تھینک یو۔۔۔" آفاق نے شکریہ ادا کیا اور پھر اسے کھڑے دیکھ کر منزہ رحیم خود بھی بیٹھ گئی تھیں۔

"خیریت۔۔۔ آج فیصل آباد کا چکر کیسے لگالیا؟" وہ بڑے ٹھہرے ہوئے انداز سے بولی تھیں۔ آفاق بے ساختہ ہلکے سے مسکرا دیا تھا۔

"آپ لوگوں سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔" اس کے لہجے اور انداز میں نرمی تھی۔

"اتنی محبت تو نہیں ہے تمہیں ہم سے کہ ہم سے ملنے کے لیے فیصل آباد آجاؤ۔" ان کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی طنز اتر آیا تھا۔

"آپ کو پتا ہی تو نہیں ہے کہ ہم فیصل آباد والوں سے کتنی محبت کرتے ہیں۔۔۔ بس کبھی کبھی اظہار میں تاخیر ہوجاتی ہے۔ اور فیصل آباد والے ناراض ہوکر کراچی چھوڑ دیتے ہیں۔" آفاق جیسے بڑے موڈ سے اور بڑے مزے سے بول رہا تھا۔

"ہر بار تاخیر اچھی نہیں ہوتی نا۔۔۔ اس لیے۔۔۔" منزہ رحیم نے اپنی بات پہ زور دیا تھا۔

"تاخیر کی کوئی وجہ۔۔۔ کوئی مجبوری بھی تو ہوسکتی ہے' نا؟" آفاق نے سوالیہ دیکھا۔

"ہر بار کوئی وجہ۔۔۔ کوئی مجبوری نہیں ہوتی۔۔۔ انسان کی اپنی مرضی ہوتی ہے۔"

"دیکھیں آنٹی جان۔۔۔ کبھی کبھی انسان کی مجبوری نظر نہیں آتی۔۔۔ مرضی نظر آنے لگتی ہے۔ مگر مجبوری اور مرضی میں فرق جاننے کے لیے گہرائی میں اترنا پڑتا ہے اور گہرائی میں اترنے کا کام کوئی بھی نہیں کرنا چاہتا۔۔۔ اتنا ٹائم نہیں ہے کسی کے پاس۔۔۔ کہ کوئی کسی کو جاننے کی کوشش کرے۔" آفاق کی بات پہ منزہ رحیم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا کیونکہ اس کے لہجے میں ایسا کچھ ضرور تھا کہ ان کے دل کو بھی احساس ہوا تھا۔

"ناشتا کرو گے؟" انہیں بالآخر خیال آہی گیا تھا۔

"مہربانی ہوگی آپ کی۔۔۔ ناشتا تو واقعی کرنا ہے ابھی۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ میں ناشتا لگواتی ہوں۔" وہ فوراً اٹھتے ہوئے بولیں۔

"لیکن فارہ کے کمرے میں۔۔۔" وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"کمرے میں۔۔۔ لیکن فارہ تو سو رہی ہے۔" وہ پلٹتے ہوئے رک گئی تھیں۔

"میں اسے جگاؤں گا نہیں۔ صرف ناشتا کروں گا اس کے پاس بیٹھ کر۔" آفاق انہیں تسلی دے کر ڈرائنگ روم سے نکل گیا تھا اور منزہ رحیم اس کی عجیب سی باتوں پہ حیران ہوتی کچن کی طرف چل دی۔ اور ملازمہ کو اس کے ناشتے کے لیے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ بے حد آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔

فارہ اپنے بیڈ پہ گہری اور بے خبر نیند سو رہی تھی۔ آفاق بے آواز قدموں سے چلتا آہستگی سے دروازہ بند کر کے اس کے بیڈ کے قریب آگیا تھا۔

فارہ دائیں کروٹ سو رہی تھی اور اپنا دایاں ہاتھ چہرے کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ کھڑکی سے اندر آتی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ آفاق اسے دیکھ کر پرسکون ہو گیا تھا اور پھر آہستگی سے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کے چہرے سے بال پیچھے ہٹائے تھے۔

وہ اس وقت گلابی رنگ کے سلکی نائٹ ڈریس میں ملبوس تھی اور اس کے سراپے کی اس قدر نرمی اور لاپروائی دیکھ کر آفاق کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا مگر وہ اس وقت کسی بے خودی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لیے دل کو کچھ لگام ڈالنے کے لیے بے اختیار آہستگی سے وہ اس پہ جھکا اور اس کے چہرے پہ اپنی بے قراری کی مہر ثبت کر دی تھی۔

فارہ بے ساختہ اس لمس پہ کسمسائی تھی اور آفاق نے جیسے اپنی سانس تک روک لی تھی۔ کیونکہ وہ اس کے اوپر جھکا ہوا تھا۔ یوں اس کے کسمسانے پہ یک دم پیچھے ہٹتا تو وہ بیدار ہو جاتی۔ پھر کافی احتیاط سے اسے بغور دیکھ کر مسکراتے ہوئے ایک اور جسارت کرتا اس کے قریب سے اٹھ گیا تھا۔

"صاحب جی ناشتا۔" ملازمہ نے بے حد ہلکی سی دستک دی تھی۔

آفاق نے آگے بڑھ کر فوراً" دروازہ کھول دیا تھا۔

"بس یہ رکھ دو۔ مگر آرام سے۔" اس نے ملازمہ کو آہستگی سے رکھنے کا اشارہ کیا تھا۔

"جی۔" ملازمہ نے سرہلاتے ہوئے آگے بڑھ کے ناشتے کی ٹرے بے حد آہستگی سے ٹیبل پہ رکھ دی تھی اور باہر نکل گئی تھی۔ آفاق دروازہ بند کر کے صوفے پہ آبیٹھا تھا۔

اور بغیر آواز کے برتن ادھر سے ادھر رکھتے ہوئے ناشتا کرنے لگا۔

اور ابھی وہ ناشتا کر ہی رہا تھا کہ اس کا موبائل گنگنا اٹھا تھا۔ آفاق نے گھبرا کر موبائل کو سائلنٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر تب تک دیر ہو چکی تھی۔ فارہ کی نیند اور خواب کا تسلسل ٹوٹ چکا تھا۔ اس نے جیسے ہی آنکھیں کھولیں۔ پہلی نظر صوفے پہ بیٹھے آفاق پہ ہی پڑی تھی۔ جو بڑے اطمینان سے براجمان۔ انتہائی سکون سے ناشتا کرنے میں مصروف تھا۔ فارہ کو ایسا لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ اسی لیے اس نے دوبارہ پلکیں موندنے کی کوشش کی تھی۔

"گڈ مارننگ۔" آفاق کی آواز پہ وہ یک دم چونک گئی تھی اور اس نے بے ساختہ آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھا تھا کہ وہ واقعی اس کے بیڈ روم میں اور اس کی نظروں کے سامنے موجود ہے لیکن وہ اس کی حیرت سے بے نیاز لاپروائی سے ناشتا کرنے میں مشغول تھا۔

"آپ۔" وہ یک دم اٹھ بیٹھی تھی۔

"اٹس او کے... سوئی رہو۔ ڈسٹرب نہیں کروں گا۔ صرف ناشتا کروں گا۔" اس نے فارہ کو اس طرح بوکھلانے اور گھبرانے سے منع کیا تھا۔

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟" فارہ کے اندر بیویوں والا غصہ عود کر آیا تھا۔

"ناشتا کرنے۔" آفاق کی لاپروائی ہنوز تھی۔

"آفاق... آپ جانتے ہیں میں مذاق نہیں کر رہی۔" فارہ لفظوں پہ زور دے کر بولی۔

"لیکن تم جانتی ہو کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔" وہ چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بولا۔

"آپ ہمیشہ مذاق ہی کرتے ہیں... بلکہ یوں کہنا چاہیے، کہ مذاق ہی اڑاتے ہیں... وہ بھی صرف میرا۔" وہ اپنی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

"محبت بھی تو صرف تم سے کرتا ہوں نا؟" وہ چائے کا کپ یوں ہی ہاتھ میں لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"پلیز... میرے قریب مت آئیں۔" وہ اسے بیڈ پہ بیٹھے دیکھ کر یک دم پیچھے ہٹی تھی۔

"مجھے یقین تھا کہ تم ایسا ہی کہوگی' اسی لیے اس وقت تمہارے قریب آیا جب تم سو رہی تھیں۔" آفاق نے اس کے رخسار کو چھوا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ مزید ٹھٹکی۔

"اپنے تھپڑ کا مداوا بھی تو کرنا تھا؟" آفاق کا جملہ معنی خیز تھا۔

"مداوا..." فارہ کھٹک گئی تھی۔

"چلو مداوا نہ سہی مرہم کہہ لو... اپنی دی ہوئی چوٹ پہ مرہم بھی تو مجھے ہی لگانا تھا نا؟" آفاق کی ٹون ہی بدلی ہوئی تھی۔ فارہ کو لگا وہ نشے میں ہے... اس نے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"تمہارے سارے شکوے اور شکایتیں ختم کرنے آیا ہوں... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے..." آفاق کہتے ہوئے اس

کے بالوں کو چھونا چاہ رہا تھا مگر وہ یک دم بیڈ سے ہی کھڑی ہوگئی تھی۔

"میرے سارے شکوے اور ساری شکایتیں آل ریڈی ختم ہو چکے ہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ اس لیے آپ یہاں سے جا سکتے ہیں۔ میں اپنے گھر میں سکون سے ہوں۔" فارہ رکھائی سے کہہ رہی تھی۔ وہ آفاق سے برگشتہ تھی اس کی ایسی نرمی اور نوازش پہ بھر گئی تھی۔

"تم اپنے گھر میں سکون سے ہوتیں تو شاید میں بھی اپنے گھر میں سکون سے ہوتا۔ لیکن افسوس کہ سکون ہی تو نہیں ہے نا۔" وہ کپ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھ کے اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔

"آپ سے کس نے کہا کہ میں سکون سے نہیں ہوں؟" وہ تلخی سے بولی۔

"تمہاری آنکھیں کہہ رہی ہیں۔ تمہارا چہرہ کہہ رہا ہے۔ تمہارا اک اک انداز کہہ رہا ہے۔ تم بے سکون ہو۔ بے چین ہو۔ اداس ہو۔" آفاق نے گمبھیر لہجے میں کہتے ہوئے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا اور فارہ پیچھے ہٹنے کی محض کوشش کرتی رہ گئی تھی۔

"بتاؤ۔ اداس نہیں ہو کیا؟" اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

فارہ کے دل میں چھپے تمام جذبات اس کی آنکھوں میں امڈ آئے تھے اور وہ بے ساختہ رو پڑی تھی۔

"فارہ پلیز۔ یہ کام مت کیا کرو۔ میرے دل پہ اثر ہوتا ہے۔" آفاق نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا تھا اور فارہ اس کے سینے سے لگ کے مزید پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔

"پلیز۔ فارہ۔ پلیز۔ چپ ہو جاؤ۔ پلیز میرے لیے۔" آفاق اس کے بالوں کو ایک ہاتھ سے سہلاتے ہوئے اسے چپ کروا رہا تھا۔

"آپ کے لیے سب کر کے دیکھا ہے۔ بہت برداشت کر کے دیکھا ہے۔ مگر نہیں۔ اب نہیں ہوتا۔" اس نے روتے ہوئے انکار کیا تھا۔

"صرف ایک چانس اور دے دو۔ اب دوبارہ ایسا ہو تو بے شک جو چاہے سزا دینا۔" آفاق نے التجا کی تھی۔

"ہرگز نہیں۔" فارہ نے اس سے الگ ہوتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"پلیز۔" اس نے پھر کہا۔

"کبھی نہیں۔" وہ مان ہی نہیں رہی تھی۔

"واپس اپنے گھر چلو۔" آفاق اسے دلچسپ اور ذومعنی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"نہیں جانا۔!" وہ ایک ہی ضد پہ اڑ چکی تھی۔

"سوچ لو۔" آفاق کی دلچسپی ہنوز تھی۔

"سوچ لیا ہے۔" وہ بھی قائم تھی۔

"ٹھیک ہے پھر جب تک تم یہاں ہو میں بھی یہاں ہی رہوں گا' بیڈ روم تو ویسے بھی خاصا خوب صورت ہے' انجوائے کریں گے۔" آفاق نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"واٹ۔ آپ یہاں رہیں گے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ بدک گئی۔

"کیوں نہیں ہو سکتا؟ یہ میری سگی خالہ کا گھر ہے اور کمرا سگی کزن کا۔ مزے میں رہوں گا۔" وہ کہتے ہوئے بیڈ پہ قدرے نیم دراز سا ہو گیا تھا۔

"آفاق۔!" فارہ تو جیسے بری پھنسی تھی۔

اور آفاق اس کی کیفیت پہ بے اختیار مسکرا دیا تھا اور اسے قریب آنے کا اشارہ کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

دروازے پہ دستک ہوئی تھی اور زبیدہ بیگم کے کام کرتے ہاتھ یک دم رک گئے تھے۔
یہ دستک ولید کے ہاتھ کی نہیں تھی اور وہ تھا کہ دو دن سے گھر ہی نہیں آیا تھا۔ اسی لیے وہ ذرا پریشان سی کام چھوڑ کر دروازے تک آئی تھیں۔
"کون ہے...؟"
"آنٹی... میں ہوں تیمور... ولید سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔" آواز سنتے ہی انہوں نے دروازہ کھول دیا تھا۔
"ولید سے ملنے کے لیے؟ مگر بیٹا! وہ تو دو دن سے ایسا کام میں بزی ہے کہ گھر ہی نہیں آیا۔" زبیدہ بیگم اپنی پریشانی دباتے ہوئے بولیں۔
"اچھا... کیا میں اندر آسکتا ہوں؟" تیمور نے اندر آنے کے لیے اجازت چاہی۔
"ہاں ہاں... کیوں نہیں بیٹا... آؤ... اندر آجاؤ..." وہ دروازے کے سامنے سے ہٹ گئی تھیں اور وہ اندر آگیا تھا۔
"وحید اور ککو کہاں ہیں؟" اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے تمہید باندھنے کی کوشش کی۔
"اسکول گئے ہیں۔ کیوں خیریت بیٹا؟" ان کا دل وہم اور وسوسوں کا شکار ہو چکا تھا۔
"آپ بیٹھیے پلیز..." اس نے صحن میں بچھی چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔
"تم بھی بیٹھو نا...!" ولید کی غیر موجودگی میں وہ کبھی ان کے گھر نہیں آیا تھا اور کبھی بلانے آیا بھی تھا تو دروازے سے ہی لوٹ جاتا تھا جبکہ آج تو وہ باقاعدہ اندر چلا آیا تھا اور بیٹھنے کا اشارہ دے رہا تھا۔
"جی بیٹھتا ہوں۔" تیمور سر ہلاتے ہوئے بیٹھ گیا اور پھر زبیدہ خاتون بھی بیٹھ گئی تھیں۔
"دیکھیے آنٹی! میں آپ کو لینے کے لیے آیا ہوں۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔ ولید اسپتال میں ہے، لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے وہ ٹھیک ہے اب..." اس نے یک دم بتانے سے پرہیز کیا تھا۔
اور زبیدہ بیگم کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔ ان کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔
"کک... کیا ہوا ہے اسے...؟" وہ ہکلا گئی تھیں۔
"وہی ہوا ہے جس کا مجھے ڈر تھا اور میں نے اسے سمجھایا بھی تھا، لیکن وہ نہیں سمجھا۔"
"مگر اسے ہوا کیا ہے؟" وہ بمشکل بول پا رہی تھیں۔
"اس پہ فائرنگ ہوئی ہے... اسے تین گولیاں لگی ہیں۔ رات کو آپریشن ہوا ہے، دو گولیاں نکال دی گئی ہیں، لیکن ایک گولی ابھی باقی ہے۔ اس کا دوبارہ آپریشن ہوگا۔"
تیمور نے بڑے تحمل اور بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں بتایا تھا تاکہ انہیں زیادہ دھچکا نہ لگے، مگر پھر بھی وہ آخر ماں تھیں ان کا کلیجہ مٹھی میں آگیا تھا۔ اور وہ ضبط کرتے کرتے بھی رو پڑی تھیں۔
"پلیز... پلیز آنٹی... روئیں مت... وہ ٹھیک ہے۔ اگر ٹھیک نہ ہوتا تو میں کبھی بھی آپ کے پاس نہ آتا... میں آپ کو دکھ میں نہیں دیکھ سکتا۔ وہ ٹھیک ہے اب۔ خطرے سے باہر ہے۔ اسی لیے پورے اطمینان کے بعد میں آپ کو لینے کے لیے آیا ہوں... آپ اللہ کا شکر ادا کریں کہ وہ ٹھیک ہے اور اس کی جان بچ گئی ہے۔" تیمور نے انہیں اچھی طرح تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔
"ہائے میرے اللہ... تیرے سوا اور کون ہے ہمارا... ولید کو اپنے کرم کے سائے میں رکھ... میرے بچے کو زندگی دے... شفا دے..."

زبیدہ خاتون اللہ سے التجا کر رہی تھیں، تیمور نے سر جھکا لیا تھا۔
پھر جب وہ اچھی طرح دل کا غبار نکال چکیں تو وہ انہیں ساتھ لے آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

عافیہ بیگم کو ایک مکمل ٹریٹ منٹ کے بعد اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔
اس لیے اسپتال سے جانے سے پہلے ماورا ولید کی خیریت معلوم کرنے کے لیے اس کے روم میں آئی تھی۔

"السلام علیکم...!" اس نے دروازہ پر دستک دی۔ سب نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا تھا اور ان سب میں تیمور حیدر بھی تھا۔
"کیا میں اندر آسکتی ہوں؟" اس نے اجازت طلب کی۔
"آیئے..." زبیدہ خاتون نے کہا۔
بیڈ پہ پڑا ولید اسے دیکھ کر قدرے حیران ہوا تھا کہ تیمور کی ماورا مرتضیٰ یہاں...؟
"کیسے ہیں آپ...؟" وہ سیدھی ولید کے پاس آکر رکی تھی۔
"آپ کے سامنے ہوں۔" ولید حسب عادت اتنی تکلیف کے باوجود باز نہیں آیا تھا۔ شرارت اس کے چہرے پہ دوڑ گئی تھی۔
"میرے سامنے آپ اچھے حال میں نہیں ہیں نا اس لیے۔" ماورا جانتی تھی وہ بہت شگفتہ مزاج ہے۔
"آپ سے کس نے کہا کہ میں اچھے حال میں نہیں ہوں؟ دیکھ لیں آج بڑی بڑی ہستیاں میرے انتظار میں بیٹھی ہیں۔ اس سے اچھا حال اور کیا ہوگا؟" اس نے تیمور، زبیدہ بیگم اور ماورا کی طرف اشارہ کیا تھا۔
"لیکن یہ بڑی بڑی ہستیاں آپ کو اس طرح نہیں دیکھنا چاہتیں۔ اس لیے جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔" ماورا بڑی نرمی سے بات کر رہی تھی۔
"آپ عیادت کے لیے آگئی ہیں، سمجھ لیں میں ابھی سے ٹھیک ہو گیا ہوں۔" تیمور پہلو بدل کر ادھر ادھر دیکھنے لگا تھا کیونکہ اسے ولید کی خباثت کا اندازہ تھا... وہ اپنی کمینگی سے باز آنے والا نہیں تھا۔
"چلیں، یہ تو اچھی بات ہے۔ فی الحال میں چلتی ہوں۔ امی میرا انتظار کر رہی ہیں۔" ماورا نے اجازت چاہی۔
"رکے، فی الحال جائیں لیکن دوبارہ آئیں گی؟" اس نے لگے ہاتھوں آئندہ کا بھی پوچھ لینا چاہا تھا، ماورا ٹھٹکی تھی، پھر ولید کے چہرے پہ شرارت کا عنصر دیکھتے ہوئے بے ساختہ مسکرا دی تھی۔
"ضرور آؤں گی... اللہ حافظ۔" وہ ان سب کو خدا حافظ کہہ کر چلی گئی تھی اور ولید، تیمور کو دیکھ کر آنکھ دباتے ہوئے ہنس پڑا تھا۔
"واؤ... میری تو انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی ان سے۔" وہ تکلیف کے باوجود فریش نظر آ رہا تھا۔
"کمینگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے ولید!" تیمور تلملا کر کھڑا ہو گیا تھا۔
"اپنی ہونے والی بھابھی سے بات کرنا کہاں کی کمینگی ہے بھلا... کیا چاہتے ہو کہ میں بات نہ کروں صرف تم کرو...؟" ولید الٹا خفا ہونے لگا تھا۔
"شرم کرو... تمہیں تین گولیاں لگی ہیں، میڈیا پہ تمہاری باتیں ہو رہی ہیں۔ لوگ تمہارے لیے پریشان ہیں اور تم ہو کہ پرواہ ہی نہیں ہے، ایسے بات کر رہے ہو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے یہ گولیاں تمہیں نہیں کسی اور کو لگی ہیں۔" تیمور نے اسے بری طرح لتاڑا تھا۔

"اچھا۔ تو تم چاہتے ہو کہ میں گولیاں کھا کر بے ہوش پڑا رہوں؟" ولید نے اسے بری طرح ستایا تھا۔
"بے ہوش نہیں کم از کم خاموش پڑے رہو تاکہ پتا چلے کہ تم زخمی ہو۔" وہ خفگی سے جھنجلا کر بولا تھا۔
"زخمی تو تم بھی ہو۔۔۔؟" ولید کا لہجہ اب کی بار معنی خیز ہوا تھا' تیمور نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔

"آنٹی! میں ذرا دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں بعد میں آؤں گا۔" تیمور پلٹ کر زبیدہ خاتون سے کہتا دروازے کی طرف بڑھا۔

"اب کیا فائدہ۔۔۔؟ اب تو وہ جا چکی ہیں۔" ولید نے پیچھے سے آواز دی تھی اور زبیدہ خاتون ساری بات سمجھتے ہوئے مسکرا دی تھیں۔

☆ ☆ ☆

ماورا کچن میں کھڑی عافیہ بیگم کے لیے جوس بنا رہی تھی جب اچانک اس کا موبائل بجنے لگا تھا۔ اس نے جلدی سے باہر نکلتے ہوئے کال ریسیو کی۔
"ہیلو! کیسی ہو۔۔۔؟" قارہ نے چھوٹتے ہی استفسار کیا۔
"فٹ ہوں۔۔۔" ماورا اس سے بات کرتے ہوئے دوبارہ کچن میں آگئی۔
"کیا ہو رہا ہے؟"
"امی کے لیے جوس بنا رہی ہوں۔۔۔ ان کی طبیعت خراب تھی۔"
"خیریت کیا ہوا ان کو۔۔۔؟" قارہ کو تشویش ہوئی تھی۔
"تیمور حیدر نے پرپوز کیا ہے مجھے اور آگے کا مسئلہ تم خود سمجھ سکتی ہو۔" ماورا جوس مکس کرتے ہوئے بولی۔
"اوہ اچھا! کیا کہتی ہیں آنٹی۔۔۔؟"
"کہا کچھ نہیں، بس نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔"
"مائی گاڈ! اتنا برا اثر لیا انہوں نے؟" قارہ کو پریشانی ہونے لگی۔
"اب اچھا بھی ہو گا۔۔۔" ماورا کی سنجیدگی اور مضبوطی اس کے لہجے سے ہی ظاہر ہوتی تھی۔
"اوکے! بٹ پلیز فل میں کل کراچی آجاؤں گی۔ آج ڈیڈی اور حماد بھائی نے ہم کو روک لیا ہے۔"
"واٹ۔۔۔؟ تم فیصل آباد میں ہو۔۔۔؟ مجھے بتایا بھی نہیں؟" ماورا کو اچنبھا ہوا۔
"سب آکر بتاؤں گی۔۔۔ ویٹ کرو۔"
"ٹھیک ہے اللہ حافظ۔" ماورا فون بند کر کے جوس لے کر عافیہ بیگم کے پاس آگئی۔
"مجھے نہیں پینا۔۔۔" انہوں نے رخ موڑ لیا تھا۔
"امی۔۔۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتی پلیز۔" ماورا نے کہتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں سے ان کے پاؤں پکڑ لیے تھے، اور عافیہ بیگم دہل گئی تھیں۔
"ماورا۔۔۔!" انہوں نے بے اختیار اسے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آج بڑے دنوں بعد سکون ملا ہے۔۔۔" ماورا نے آنکھیں موندے بڑے مزے سے کہا تھا جبکہ اس کے بالوں

میں تیل سے مساج کر رہی تھیں اور وہ نیچے قالین پہ بیٹھی انجوائے کر رہی تھی۔
"کسی کو بے سکون کرنے کا عہد کرنے کے بعد۔" بی گل بھی کہے بغیر نہیں رہتی تھیں۔
"طرف داری کر رہی ہیں۔۔۔ یا ہمدردی ہو رہی ہے۔۔۔؟" ماورا نے کریدا۔
"محبت تم سے کرتا ہے۔۔۔ سب کچھ تم پہ وار رہا ہے۔۔۔؟ ہمدردی ہمیں کیوں ہوگی۔۔۔؟" بی گل نے لاپروائی دکھائی اور ماورا جوابا" بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنسی تھی۔
"جیلس ہو رہی ہیں۔۔۔؟" اس نے انہیں چھیڑا تھا۔
"ہاں۔۔۔ بندہ ہو بھی جاتا ہے۔" وہ جیسے افسردگی سے بولی تھیں۔
"ارے، ڈونٹ وری میں وہ سب کچھ آپ پہ وار دوں گی۔" ماورا نے بڑے پیار سے، اور بڑے شاہانہ انداز سے کہا تھا۔
"بس بس رہنے دو۔" وہ خفگی سے بولیں۔
اس سے پہلے کہ ماورا کچھ کہتی باہر دروازے پہ بیل بجنے لگی تھی اور دروازے کے قریب گملے رکھتی عافیہ بیگم چونک گئی تھیں۔
"امی! پلیز باہر دیکھیں شاید ڈرائیور ہو گا مارکیٹ بھیجا تھا میں نے۔" ماورا نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے آواز دی تھی اور پلکیں دوبارہ موندلی تھیں۔
"کتنا خیال کرتا ہے۔۔۔ کتنی محبت کرتا ہے تم سے' جاب دی' گھر دیا۔ گاڑی دی۔ ڈرائیور دیا۔ اپنی محبت دی۔۔۔ اپنا دل دیا اور اب اپنا سب کچھ دے رہا ہے۔ ایسا ہمسفر تو اللہ بڑی نصیب والیوں کو دیتا ہے۔" بی گل نے ایک بار پھر اپنے لفظوں کی لو تیز کی تھی۔
"تو کیا میں نصیب والی نہیں ہوں؟" ماورا ہلکے سے مسکرائی تھی اور ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے سے اندر داخل ہوتے تیمور حیدر کے قدم اس کی اتنی خوب صورت مسکراہٹ پہ جیسے جہاں کے تہاں تھم گئے تھے۔ مگر وہ عافیہ بیگم کے خیال کی وجہ سے مزید اس طرح نہیں رک سکتا تھا ورنہ بالوں میں مساج کرواتی نیچے قالین پہ بیٹھی ماورا اس کے دل کو چھو گئی تھی۔ اس کا یہ انداز تیمور حیدر کے دل میں اتر گیا تھا۔ اسے اس لمحے اپنی نظر کا تسلسل توڑنا بہت دشوار لگا تھا۔
مگر پھر بھی اس نے گلا کھنکارتے ہوئے اپنی آمد کا سگنل دیا تھا اور وہ دونوں اپنی باتوں میں مگن چونک گئی تھیں ماورا نے یکدم کرنٹ کھا کے دروازے کی طرف دیکھا تھا۔
اور پھر بجلی کی سی تیزی سے کھڑی ہو گئی تھی۔
"آپ۔۔۔؟" اس نے بڑے بوکھلائے ہوئے انداز سے صوفے پہ پڑا اپنا دوپٹا کھینچ کر اردگرد پھیلا لیا تھا۔۔۔
"وہ میں دراصل آپ کی مدر کی عیادت کے لیے آیا ہوں۔ ولید کی وجہ سے اور کچھ ضروری کام کی وجہ سے کافی بزی تھا اس لیے نہیں آسکا۔" اس نے اپنے آنے کی وضاحت دی۔
"آیئے۔۔۔ بیٹھیے۔" عافیہ بیگم بھی اندر آگئی تھیں اور تیمور کو دیکھتے ہوئے صوفے پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔۔۔ جس پہ ماورا نے ٹھٹک کر پہلے عافیہ بیگم پھر بی گل اور تیمور کی طرف دیکھا تھا۔
اور تیمور ان کے اشارے کی تقلید کرتے ہوئے صوفے کی طرف بڑھ گیا تھا۔
"السلام علیکم!" وہ بی گل کی سمت جھکا اور بی گل نے شفقت سے اس کے کندھے پہ ہاتھ پھیرا تھا۔ تیمور حیدر کا اس قدر اپنائیت بھرا انداز دیکھ کر ماورا جزبز سی ہو گئی تھی۔

کیونکہ تیمور حیدر کی اس کے گھر آمد اس کی پلاننگ یا اس کے وہم و گمان میں بھی کہیں نہیں تھی۔
"جیتے رہو۔۔۔ خوش رہو۔۔۔ بیٹھو" بی گل نے بھی بیٹھنے کا کہا۔
"تھینک یو۔۔۔ آپ بھی بیٹھیے ناں!" اس نے عافیہ بیگم کی طرف دیکھا۔
"ہوں ضرور۔" وہ کہتی آگے بڑھ کے صوفے پہ بیٹھ گئی تھیں۔ اور ان کے ساتھ ہی تیمور بھی بیٹھ گیا تھا۔
"ایم سوری۔۔۔ میں ماورا سے ملنے کے لیے یا کسی اور کام کے لیے آتا تو یقیناً پہلے بتا کر یا اجازت لے کر آتا لیکن۔۔۔ میں دراصل آپ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے آیا ہوں۔۔۔ اس لیے بغیر بتائے ہی آگیا۔۔۔ زیادہ ٹائم نہیں لوں گا آپ کا۔" اس نے پہلے اچانک آمد کا جواز پیش کیا تھا۔ کیونکہ وہ ماورا کے چہرے کا تعجب اور غیر یقینی نوٹ کر چکا تھا۔
"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔۔۔ آپ آرام سے بیٹھیں۔۔۔ ماورا چائے بنا کر لا۔" عافیہ بیگم نے بڑے اچھے طریقے سے بات کرتے ہوئے گردن موڑ کر ماورا کو دیکھا تھا جو تیل سے چپڑے بالوں کے ساتھ بڑے ہونق سے انداز میں عافیہ بیگم کو دیکھ رہی تھی کہ کیا واقعی وہ عافیہ بیگم ہیں۔۔۔؟
"ماورا۔۔۔!" بی گل نے آہستگی سے ٹھوکا دیا اور ماورا چونک گئی تھی۔ تیمور نے کن اکھیوں سے اسے ایک بار پھر دیکھا تھا وہ کتنے عام سے حلیے میں بھی کتنی خاص لگ رہی تھی۔
"جی ابھی لے کر آتی ہوں۔" وہ جانے کے لیے پلٹی۔
"نہیں پلیز۔ اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں بس چند منٹ بیٹھوں گا۔" تیمور نے منع کیا تھا تاکہ ماورا کو یہاں سے جانا نہ پڑے۔
"چند منٹ میں چائے بھی بن جائے گی۔۔۔ جاؤ شاباش!" انہوں نے پھر اشارہ کیا اور ماورا فوراً وہاں سے چلی گئی تھی۔
"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی۔۔۔؟" وہ اب پوری طرح سے ان کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔
"اللہ کا کرم ہے اب جو زندگی باقی ہے وہ جینا تو پڑے گی۔۔۔ چاہے جیسے بھی سہی۔" انہوں نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا تھا جو تیمور کو بھی فیل ہوا تھا۔
"ایسا نہ کہیں آنٹی۔۔۔ اللہ آپ کو ہمیشہ صحت یاب رکھے، اولاد کے لیے ماں باپ بہت بڑا سہارا ہوتے ہیں۔۔۔ ماورا کے فادر کے بعد آپ ہی تو ہیں جو۔"
"آپ کے فادر کیا کرتے ہیں۔۔۔؟" عافیہ بیگم نے تیمور کی بات کاٹتے ہوئے وہ سوال کر ڈالا تھا جو بی گل کبھی مر کے بھی تصور نہیں کر سکتی تھیں کہ عافیہ زندگی میں یہ سوال بھی کر سکتی ہے۔
"میرے فادر بزنس مین ہیں بہت سال انہوں نے بزنس سنبھالا ہے اور اس معاملے میں ہمیشہ ایک کامیاب بزنس مین رہے ہیں۔۔۔ مگر میری ایجوکیشن ختم ہوتے ہی سب کچھ مجھے سونپ کر خود بزنس سے الگ ہو گئے ہیں۔۔۔ اس لیے آج کل فراغت کے مزے لے رہے ہیں۔"
تیمور نے ایک نارمل سا جواب دیا تھا لیکن عافیہ بیگم کے سینے سے جیسے ٹرین گزر گئی تھی۔
"آپ کی مدر۔۔۔؟" انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اگلا سوال کیا۔
"میری مدر بہت ہی سادہ طبیعت اور گھریلو سی خاتون ہیں۔۔۔ بابا سے بالکل برعکس۔" تیمور ماں کے ذکر پہ بے اختیار مسکرا دیا تھا۔
"جانتی ہوں یہ بھی جانتی ہوں۔" انہوں نے دل ہی دل میں جیسے خود کو جواب دیا تھا۔۔۔

"سر... ! چائے۔" ماورا نے قریب آکر کپ اس کے سامنے رکھتے ہوئے اسے متوجہ کیا۔
"تھینک یو...!" تیمور نے آہستگی سے کپ اٹھا لیا تھا۔
"آپ لوگ کبھی ہمارے گھر آئیں ناں... اس طرح میرے پیرنٹس سے بھی ملاقات ہو جائے گی آپ کی... اور مجھے یقین ہے میری مدر آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔" تیمور نے چائے پیتے ہوئے انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔
"جب اپنے گھر گئے تو تمہارے گھر بھی ضرور آئیں گے بیٹا۔" عافیہ بیگم پہ کیا بیت رہی ہے ماورا بھی خوب جانتی تھی۔
"اپنا گھر...؟" تیمور کو پتا تھا کہ کراچی میں ان کا بھی کوئی گھر نہیں ہے۔
"ہاں اپنا گھر... یہ تو کمپنی کی طرف سے دیا ہوا فلیٹ ہے ناں... مگر میں اپنے گھر کی بات کر رہی ہوں... جو ہمارا ذاتی گھر ہو گا... اپنا ذاتی گھر۔"
عافیہ نے جیسے اپنے لفظوں پہ زور دیتے ہوئے کہا تھا۔
"انشاء اللہ ایسا بھی ضرور ہو گا' اینی وے میں اب چلتا ہوں' تھینک یو سو مچ' آج آپ سے مل کر اور آپ سے بات کر کے بہت خوشی ہوئی ہے مجھے..." تیمور کپ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے کھڑا ہو گیا تھا۔
"آیئے میں آپ کو دروازے تک چھوڑ دوں۔" ماورا کہتی ہوئی اس کے ساتھ چلتی دروازے تک آگئی تھی۔
"آپ کو برا لگا میرا آنا...؟" تیمور نے دروازے کے قریب رکتے ہوئے سوال کیا۔
"نہیں۔" ماورا نے نفی میں سر ہلایا تھا۔
"آپ کا چہرہ تو یہی کہہ رہا ہے..." تیمور کی نظریں اس کے چہرے کو چھو رہی تھیں ماورا نے پلکیں جھکا لی تھیں۔
"چہرے ہمیشہ دھوکا دیتے ہیں... اس دھوکے میں نہ رہیں۔" ماورا نے تلخی سے کہا۔
"آپ کا چہرہ بھی دھوکا دیتا ہے؟" وہ دلچسپی سے بولا۔
"میرا چہرہ بھی تو آخر چہرہ ہی ہے ناں! دھوکا دے بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔" ماورا نے صاف گوئی سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔
"آپ کے جواب کا منتظر ہوں...؟" تیمور نے جاتے جاتے پھر پوچھا۔
"آج سوچنے کے بعد کل فیصلہ سنا دوں گی۔" اس کا لہجہ حتمی تھا۔
"او کے' انتظار میں ہوں... اللہ حافظ۔" وہ کہہ کر دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکل گیا تھا اور ماورا اس کے پیچھے دروازہ بند کر کے واپس آگئی تھی۔
"شادی کی بات کی اس نے...؟" بی گل نے استفسار کیا۔
"ہاں کی ہے..." اس نے سر ہلایا۔
"پھر...؟" انہیں تجسس تھا کہ اب ماورا کا کیا فیصلہ ہو گا؟
"میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ آج سوچنے کے بعد کل فیصلہ سنا دوں گی۔" ماورا کہہ کر پلٹی اس نے شاور لینے جانا تھا... مگر اسے پھر رکنا پڑا تھا۔
"کیا فیصلہ...؟" بی گل کا دوٹوک سوال عافیہ بیگم چپ چاپ سن رہی تھیں۔
"یہی کہ ماورا مرتضیٰ تیمور حیدر سے شادی کے لیے تیار ہے' وہ لینے کے لیے آجائے..."
ماورا انتہائی سنجیدگی سے کہہ کر چلی گئی تھی اور پیچھے اپنی بے رحمی اور سفاکی چھوڑ گئی تھی!

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

تیری جستجو کا کرم دیکھتے ہیں
ستاروں کو زیرِ قدم دیکھتے ہیں

ہمارا شعورِ محبت تو دیکھو
تمہیں بھی محبت سے کم دیکھتے ہیں

یہ ظالم زمانہ دکھائے گا کیا کیا
تری آنکھ بھی آج نم دیکھتے ہیں

ذرا بزمِ عشرت سے باہر تو آؤ
تمہیں بھی دکھائیں جو ہم دیکھتے ہیں

قابل اجمیری

ہم خواب سہارے زندہ ہیں،

بے شمار اندیشے ہیں
ان گنت ہیں وسوسے
بے تحاشا دکھ ہیں
بے سبب اُداسیاں
طویل شبوں کے رت جگے
کوئی سبب نہیں ہے جینے کا
پھر بھی بیچارے زندہ ہیں
خواب سہارے، زندہ ہیں

علی راسخ

دوست کیا معتبر نہیں ہوتے
آپ سے ہاں! مگر نہیں ہوتے

ہم ہی خطرات مول لیتے ہیں
راستے پُر خطر نہیں ہوتے

محوِ پرواز ہے خلاؤں میں
عقل کے بال و پر نہیں ہوتے

منزلیں میرے ساتھ چلتی ہیں
راستے مختصر نہیں ہوتے

رہنماؤں کے ساتھ رہنے سے
حوصلے معتبر نہیں ہوتے

زندگانی سے کھیلنے والے
موت سے بے خبر نہیں ہوتے

چار دن کی شکیب قربت سے
فاصلے مختصر نہیں ہوتے

شکیب جلالی

میں نے توقیر کا سوال کیا
اس نے تحقیر میں کمال کیا

ہم سفر ہاتھ تھام کر نہ چلا
ٹھوکروں نے بہت نڈھال کیا

میرا ہتھیار میری خاموشی
صبر کو میں نے اپنی ڈھال کیا

غم کسی مسئلے کا حل کب تھا
ہم نے بے فائدہ ملال کیا

اس کی احسان مند ہوں جس نے
شامِ غم میں مرا خیال کیا

حمیدہ شاہین

کوالٹی

ریڈیو چینل سے کلاسیکی موسیقی کا پروگرام نشر ہو رہا تھا۔ ریڈیو کا ڈائریکٹر اپنے گھر پر پروگرام سن رہا تھا۔ پروگرام کی کوالٹی کے بارے میں اس نے اپنے ماتحت ڈیوٹی افسر کو فون کیا اور کہا۔

"کیا آپ پروگرام سن رہے ہیں؟"

"جی سر! میں سن رہا ہوں۔"

"پھر آپ کو بھی اندازہ ہو رہا ہو گا کہ طبلہ کی آواز کس زور سے آرہی ہے؟"

"سوری سر! میں ابھی جا کر دیکھتا ہوں۔ آپ ہولڈ کیجیے۔"

تھوڑی دیر بعد ڈیوٹی افسر دوبارہ فون پر آئے اور ڈائریکٹر سے کہا۔

"سر! دراصل دو طبلچی طبلہ بجا رہے تھے۔ میں نے ایک رکوا دیا ہے۔"

فرح بابر۔۔۔ کراچی

جنگلی لڑکی

مصوری کے شوقین صاحب نے جنگل میں ایک لڑکی کو دیکھا اور فوراً اس کی تصویر بنانے کا ارادہ کر لیا۔ جنگلی لڑکی کو گڑ اور چنے دے کر ماڈل بننے پر راضی کیا اور درخت کی ایک اونچی شاخ پر بٹھا کر اس کی تصویر بنانے لگے۔ ایک گھنٹے بعد لڑکی نے بے چینی سے پہلو بدلا تو صاحب نے ذرا منہ بنا کر کہا۔

"میں نے تو سنا تھا کہ جنگلی لڑکیاں بڑے صبر اور برداشت والی ہوتی ہیں۔ تم تو ایک گھنٹے میں ہی گھبرا گئیں۔"

لڑکی نے مصور کی بات سن کر شاخ سے چھلانگ لگا دی۔ "تم اس شہد کے چھتے پر پانچ منٹ بھی بیٹھ کر دکھا دوں تو مانوں۔"

حنا غلام محمد۔۔۔ کراچی

بچے

ایک آدمی نے ایک آٹومیٹک روبوٹ کار خریدی۔

ایک دن اس نے کار کو آرڈر دیا کہ اسکول سے اس کے بچے لے آئے۔ کار چلی گئی اور بہت دیر تک واپس نہ آئی۔ آدمی پریشان ہو گیا اور پولیس کو رپورٹ کرنے گھر سے نکل ہی رہا تھا کہ کار بہت سارے بچوں کو لے کر آ گئی۔ جس میں اس کی ملازمہ کے دو' پڑوسن کے دو' سالی کا ایک اور سیکریٹری کے دو بچے بھی تھے۔ آدمی ان بچوں کو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اس کی بیوی غصے میں بولی۔

"اس کا مطلب ہے یہ سارے بچے تمہارے ہیں؟"

"یہ تو میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔" آدمی نے جواباً چلا کر کہا۔ "پہلے یہ بتاؤ۔ کار ہمارے دو بچوں کو لے کر کیوں نہیں آئی۔"

ثناء عمر۔۔۔ شارجہ

اسپیشلسٹ

ایک تقریب میں ایک خاتون کی ملاقات ایک ڈاکٹر سے ہوئی۔ خاتون فوراً خوش اخلاقی سے ان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"ڈاکٹر آف فلاسفی؟"

"نہیں۔ ڈاکٹر آف میڈیسن۔"

"جنرل؟"

"نہیں۔ اسپیشلسٹ۔"

"آنکھ' ناک اور گلا؟"

"نہیں۔ صرف ناک۔"
"دونوں نتھنوں کے؟"
"نہیں۔ صرف دائیں نتھنے کا۔"
"ناک، مرد کی یا عورت؟"

افشاں فرقان۔۔۔ کراچی

خرچہ

پانچ سالہ بچی سے اس کی نئی کنجوس پڑوسن نے پوچھا۔ "بیٹا! آپ کے گھر میں کتنے بچے ہیں؟"
"پندرہ۔" بچی نے انگلیوں پر حساب لگا کر جواب دیا۔

"او! پندرہ بچے۔" پڑوسن کو بڑی حیرانی ہوئی۔ "بڑا خرچہ آتا ہوگا۔"
"ہم بچوں کو خریدتے تھوڑی ہیں' جو خرچہ آتا ہو۔" بچی نے کھلکھلا کر بے ساختہ کہا۔ "ہم تو پیدا کرتے ہیں۔"

صائمہ عمران۔۔۔ وہاڑی

موسیقی

ایک نوجوان نئے پاپ سنگر کے گانے پر جھوم رہا تھا۔ اچانک اس کا باپ آگیا۔ باپ کے چہرے پر ناگوار تاثرات دیکھ کر اس نے باپ کی توجہ ہٹانے کی غرض سے کہا۔
"ڈیڈی! آپ نے اس سے پہلے ایسی موسیقی کبھی سنی ہے؟"
"ہاں، بالکل!" باپ نے خوش مزاجی سے جواب دیا۔ "ایک دفعہ شہر جاتے ہوئے دو ٹرکوں کو ٹکراتے ہوئے دیکھا تھا میں نے۔ ایک میں دودھ کے خالی ڈرم تھے اور دوسرے میں مویشی۔"

رشیدہ بتول۔۔۔ کراچی

خواہش

نہایت ست الوجود ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔ "آج صبح جب میں سو کر اٹھا تو بے اختیار میرے دل میں خواہش ہوئی کہ میں باہر نکلوں اور کوئی ملازمت تلاش کروں۔"
"تو پھر اس خواہش پر تم نے عمل کیا؟" دوست نے ذرا خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں۔" ست الوجود نے ایک بڑی سی جماہی لے کر جواب دیا۔ "میں اس وقت تک بستر پر لیٹا رہا۔ جب تک یہ خواہش میرے دل سے نکل نہیں گئی۔"

شازیہ شکیل۔۔۔ اسلام آباد

اعتراض

برادری کی روایت کے مطابق شادی کے موقع پر نکاح سے قبل لڑکی کے باپ نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر مہمانوں سے بلند آواز میں کہا۔
"میں اپنی بیٹی کی شادی شہزادہ دلدار ولد راجہ دلدار سے کر رہا ہوں۔ کسی صاحب کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"
"مجھے ہے۔" غصے سے بھری ایک آواز آئی۔
"تم چپ رہو اور آرام سے بیٹھ جاؤ۔ تم دولہا ہو۔" لڑکی کے باپ نے ڈپٹ کر کہا۔

خنساء عاصم۔۔۔ ضلع کیمبل پور اٹک

بے غیرتی

"سڑک کے اس پار جو تین منزلہ بلڈنگ ہے نا، اس کے کونے والے فلیٹ میں جس کی بالکونی دوسری سڑک پر ہے۔ اس میں جو میاں بیوی رہتے ہیں، توبہ! انتہائی بے غیرت ہیں۔ انہیں دیکھ کر تو میری نظریں شرم سے جھک جاتی ہیں۔ جب دیکھو' بالکونی کے ساتھ والے کمرے میں۔۔۔" خاتون خانہ نے اپنے شوہر کو بتایا۔
شوہر نے اپنی بالکونی سے اس فلیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مگر یہاں سے ان کا فلیٹ واضح نظر نہیں آتا۔"
"ایسے تھوڑی نظر آتا۔" خاتون خانہ نے جھنجلا کر کہا۔ "سیڑھی لگا کر دیکھنا پڑتا ہے۔"

الماس تنویر۔۔۔ ہزارہ

شگفتہ جاہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ہر نشہ آور چیز حرام ہے اور جس چیز کی زیادہ مقدار سے نشہ آئے، اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔

غصے میں انصاف،

ایک دن حضرت عمر ؓ 644ء نے ایک شرابی کو زمین پر گرا ہوا دیکھا۔ اسے سزا دینے کے لیے درہ اٹھایا ہی تھا کہ اس نے گالیاں دینا شروع کر دیں۔ آپ نے اسے چھوڑ دیا اور واپس چل پڑے۔ کسی نے وجہ پوچھی تو فرمایا۔

"اس نے گالیاں دے کر مجھے غصہ دلایا اور غصے میں انصاف نہیں ہو سکتا۔"

نقش گر،

کہتے ہیں کہ لقمان کا رنگ کالا، چہرے پہ چیچک کے داغ اور خد وخال حبشیوں جیسے تھے۔ ایک دن کسی نے ان سے کہا۔

"مجھے تمہاری صورت ناپسند ہے۔"

جواب دیا۔ "تمہیں یہ نقش ناپسند ہے یا نقش بنانے والا؟"

نورینہ حنیف۔ کامدان سرگودھا

عدل کی برکت،

نوشیرواں 579ء جنگل میں گھوم رہا تھا۔ ہر طرف پھل دار درخت اور سرسبز کھیت دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"کیا ہر سال فصلیں ایسی ہی ہوتی ہیں؟"

بزرجمہر نے کہا۔ "نہیں صاحب عالم! پھل اور غلے کی یہ فراوانی اب کے سال آپ کی تخت نشینی سے شروع ہوئی ہے۔ جب بادشاہ عادل ہو اور رعایا شکر گزار ہو تو شہر اور جنگل سب آباد ہو جاتے ہیں ورنہ سراسر برباد۔"

نمرہ۔ کراچی

نصیحت،

ایک شخص حضرت علی 661ء کے پاس گیا اور کہا۔

"مجھے کوئی نصیحت فرمائیے۔"

کہا۔ "کوئی چیز مل جائے تو خوش نہ ہو، چلی جائے تو غم نہ کر۔ انسانوں کا سب سے بڑا خیر خواہ وہ ہے جو انہیں اللہ کی رحمت سے مایوس اور گناہ پر جری نہ ہونے دے۔"

دوسرے کی تعریف،

دوسرے کی تعریف دراصل اس حقیقت کا اعلان ہے کہ وہ آپ سے بعض باتوں میں ملتا جلتا ہے۔

(فارابی)

معلم کے لیے مشورہ،

محقق طوسی 1274ء نے اساتذہ کے متعلق ہلاکو خان 1265ء کو مشورہ دیا۔

"ایک معلم پچیس سال کی عمر تک پڑھے۔ چالیس سال کی عمر تک تحقیق کرے۔ ساٹھ سال کی عمر تک لکھے اور پھر پوری تنخواہ پر اس کو سبکدوش کر دیا جائے۔"

علم کے آداب،

امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم 798ء سے کسی نے پوچھا۔

"علم کے آداب کیا ہیں؟"
انہوں نے کہا۔
اول علم
دوم توجہ سے سننا
سوم یاد رکھنا
چہارم اس پر عمل کرنا
پنجم اس کی تبلیغ کرنا

موازنہ

عرب کے ایک فیاض معن بن زائدہ 786ء نے اپنے ایک یتیم بھتیجے یزید بن مزید کو بھی پال رکھا تھا۔ ایک دن اس کی بیوی نے شکایت کی اور کہا۔
"تم یزید پر زیادہ مہربان ہو اور اپنے بچوں کی پروا نہیں کرتے۔"
انہوں نے کہا" اس کی وجہ ہے۔"
پوچھا" وہ کیا؟"
کہا" اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔"
معن نے اسی وقت اپنے دو بیٹوں کو بلایا۔ وہ اس حال میں آئے کہ بہترین ریشمی لباس تن پر تھا اور ساتھ خدمت گاروں کی ایک فوج تھی۔
پھر اس نے اپنے بھتیجے کو طلب کیا۔ وہ زرہ پہن کر اور شمشیر و سنان سے مسلح ہو کر فوراً پہنچا۔
جب معن نے مسلح ہونے کی وجہ پوچھی تو کہنے لگا۔
"چچا جان! قاصد نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ آپ نے کیوں یاد فرمایا ہے۔ میں نے سوچا مسلح ہو کر جاؤں۔ اگر میری تلوار کی ضرورت پڑے تو تعمیل میں دیر نہ لگے ورنہ زرہ اتارنے میں کیا دیر لگتی ہے۔"
یہ منظر دیکھ کر معن کی بیوی نے کہا۔
"بے شک میرے بچوں کا اس سے کوئی مقابلہ نہیں۔"

صبیحہ شوکت۔ لاہور

مرغن غذائیں

ایک طبیب کا دستور تھا کہ جب کسی مریض کو دیکھنے جاتا تو سب سے پہلے گھر کے باورچی کو بلا کر گلے لگاتا۔ کسی نے اس کی وجہ پوچھی تو کہا۔
"میرا تمام کاروبار ان ہی باورچیوں کی وجہ سے چل رہا ہے۔ اگر یہ لوگ مرغن اور ناقابل ہضم غذائیں گھر والوں کو نہ کھلاتے تو کوئی بیمار ہوتا۔"

ثناء عبدالقیوم۔ بنکہ

مصیبت پر شکر

ابن عربی 240ء سے کسی نے پوچھا۔
"مصیبت میں کیا کرنا چاہیے؟"
فرمایا" جب مجھ پر کوئی مصیبت آتی ہے تو چار مرتبہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔
1۔ اس بات پر کہ مصیبت اس سے بڑی بھی ہو سکتی تھی۔
2۔ برداشت کرنے کی ہمت دی۔
3۔ دعا و عبادت بڑھ گئی۔
4۔ مصیبت جسمانی تھی، دینی نہ تھی۔

عائشہ جمیل۔ لاہور

اقوال ابوالکلام آزاد

- انسان کی سب سے بڑی عقل مندی عبرت پذیری ہے مگر سب سے بڑی غلطی غفلت اور اغماض ہے۔
- اگر سچائی کو اس کی اصل ضرورت کے وقت پیش نہ کیا جائے تو اس کے وجود کا اعتراف بے کار ہے اور چراغ جلانے کا وقت غروب آفتاب کے بعد آتا ہے نہ کہ پچھلے پہر۔
- غلامی کے چاہے کیسے حسین نام کیوں نہ رکھے جائیں غلامی بہرحال غلامی ہے۔
- درخت سب بوتے ہیں لیکن ہر شخص کے نصیب میں یہ نہیں ہوتا کہ پھل بھی کھائے۔ نہایت مبارک ہے وہ ہاتھ جو بیج بونے کے بعد ہی اپنے دامن میں اس کے پھلوں کو بھی دیکھے۔
- دلوں کی اقلیم میں منٹوں اور لمحوں کے اندر انقلاب آجاتا ہے اور اس کے انقلاب سے اس دنیا کے انقلاب وابستہ ہیں۔
- حسن، خوشبو، نغمہ اور زیب و آسائش الگ الگ نام ہیں لیکن حقیقت صرف ایک ہے۔ یعنی

عدل و اعتدال۔

نجمہ اکرم۔ گاؤں گولیکی

دین،

اپنے دین کی سچائی کو لاٹھی نہ بناؤ۔ اپنے دین کی سچائی کو میزبان بناکر دوسرے ادیان کی سچائی کو مہمان بناؤ۔ دوسروں کا ذوقِ یقین بھی ان کے اندر وہی یا اس جیسی کیفیت پیدا کر رہا ہے۔ جیسے آپ کے ساتھ آپ کا ذوقِ یقین۔ بڑا دین یا سچا دین بڑے دریا کی طرح ہوتا ہے۔ جو سب ندی، نالوں کو اپنے ساتھ ملا کر سمندر سے واصل کرتا ہے کیونکہ دریا ملاپ کرتے ہیں "لڑائیاں نہیں۔"

(اشفاق احمد)

ثمینہ عطاری، صبا نوشاہی۔ گجرات

حضرت بایزید بسطامیؒ کا قصہ،

حضرت بایزید بسطامیؒ کا قصہ ہے کہ ان کو کسی نے بعد وفات خواب میں دیکھا۔ پوچھا آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا۔ فرمایا۔

"مجھ سے سوال ہوا تھا کہ ہمارے واسطے کیا لائے؟"

میں نے سوچا کہ اور اعمال تو میرے ناقص ہیں ان کا تو کیا نام لوں البتہ میں مسلمان ہوں اور بحمد اللہ توحید میری کامل ہے اس کو پیش کردوں چنانچہ میں نے عرض کیا کہ توحید لایا ہوں۔ ارشاد ہوا۔

"وہ دودھ والی رات یاد نہیں۔"

یہ ایک واقعہ کی طرف اشارہ تھا کہ ایک بار حضرت بایزید بسطامیؒ نے دودھ پیا تھا اس کے بعد پیٹ میں درد ہو گیا تھا۔ تو آپ کے منہ سے نکل گیا۔

"دودھ پینے سے پیٹ میں درد ہو گیا۔ اس پر مواخذہ (پکڑ) ہوا کہ تم نے درد کو دودھ کی طرف منسوب کیا۔ کیا یہی توحید ہے۔ جس کو تم ہمارے واسطے لائے ہو کہ دودھ کی طرف درد کی نسبت کرتے ہو۔"

حضرت بایزیدؒ یہ سن کر گھبرا گئے اور عرض کیا۔

"الٰہی! میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔"

ارشاد ہوا "راہ پر آگئے تو جاؤ۔ اب ہم تم کو ایسے عمل سے بخشتے ہیں جس پر تمہارا گمان بھی نہ تھا کہ اس سے بخشش ہو جائے گی۔ وہ یہ کہ تم نے ایک رات ایک بلی کے بچے کو سردی میں اکڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ تم کو اس پر رحم آیا اور اپنے لحاف میں لاکر سلا لیا۔ اس بچے نے دعا کی اے اللہ اس کو ایسے ہی راحت دیجیے جیسے اس نے مجھے راحت دی۔ جاؤ ہم تم کو اس بلی کے بچے کی دعا سے بخشتے ہیں۔ سارا تصوف گاؤ خورد ہو گیا۔ سارے مراقبے اور مجاہدے رکھے رہ گئے۔ اور ایک بلی کے بچے کی سفارش سے بخشے گئے۔

نمرہ، اقرا۔ کراچی

زمانہ،

بنو امیہ کے آخری خلیفہ مروان بن محمد کے یہ اشعار بوقت مرگ کہے گئے۔

- زمانے کے انقلاب پر لعنہ دینے والے سے کہہ دو کہ زمانہ اس کے خلاف ہو جاتا ہے جو کوئی درجہ رکھتا ہے۔
- تم دیکھتے نہیں دریا کی سطح پر مردے تیرتے ہیں لیکن موتی اس کی تہہ میں بیٹھتے ہیں۔
- اگر زمانے نے ہمیں ستایا اور اس کی سختیاں

ہم پر پڑی ہیں تو کوئی تعجب نہیں۔ آسمان میں بے شمار ستارے موجود ہیں مگر گہن صرف چاند اور سورج ہی کو لگتا ہے۔

(الکوثر جلد 2 نمبر 7)

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ

فوزیہ ثمر بٹ ———— گجرات

کس تذبذب میں ہے نئے سال کی دہلیز پہ
جو کھویا ہے اس کا غم نہ کر جو پایا ہے اس کا عہد کر
نہیں حاصل محرومیوں کے کچھ شمار سے
گزرے غموں کو بھول کر نئی خوشیاں تلاش کر

یاسمین حنفی ———— کراچی

میرے لیے حرف دعا ہو گیا وہ شخص
سارے دکھوں کے دور ہو گیا اک شخص
پڑھتا تھا میں نماز سمجھ کے اسے قتیل
پھر یوں ہوا کہ مجھ سے قضا ہو گیا وہ شخص

طیبہ نواز ———— لاہور

نہ ہاتھ تھام سکے، نہ پکڑ سکے دامن
بہت قریب سے اٹھ کے چلا گیا کوئی

عائشہ رانجھا ———— ڈسکہ

کیا خبر تم نے کہاں، کس روپ میں دیکھا ہے مجھے
میں کہیں پتھر، کہیں مٹی، کہیں آئینہ ہوا پھرتا ہوں

عائشہ فاطمہ ———— لودھراں

منحصر اہل ستم پر ہی نہیں ہے محسن
لوگ اپنوں کی عنایت سے بھی مر جاتے ہیں

ام امثل ———— گجرات

اپنا کام ہے صرف محبت، باقی اس کا کام
جب چاہے وہ روٹھے، جب چاہے من جائے

ثمینہ یاسمین ———— میانوالی موڑ

بجھا سکو تو دیا بجھا دو، دبا سکو تو صدا دبا دو
دیا جلے گا تو صبح ہو گی صدا دے گی تو حشر ہو گا

مدیحہ نورین مہک ———— برنالی

کمال کرتے ہو اے دل تم بھی
اسے فرصت نہیں، تمہیں چین نہیں

نوشابہ منظور ———— پھریارو ڈ

وقت نے وہ خاک اڑائی کہ دل کے دشت سے
قافلے گزرے ہیں پھر بھی نقش پا کوئی نہیں

شازیہ علی ———— ٹنڈوالہ یار

آہٹ پہ کان، در پہ نظر بار بار کیوں
تو جا چکا ہے پھر بھی تیرا انتظار کیوں

کوثر خالد ———— جڑانوالہ

اس زندگی کے حسن کی تابندگی نہ پوچھ
جو حادثوں کی دھوپ میں تپ کر نکھر گئی

خدیجہ مومن ———— پشاور

مجھے خود اپنی نہیں اس کی فکر لاحق ہے
بچھڑنے والا بھی مجھ سا ہی بے سہارا تھا

عائشہ جمیل ———— لاہور

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

سیدہ لوبا سجاد ———— کہروڑپکا

اس کی جدائی کھا گئی گھن کی طرح ہمیں
ہم سخت جان پہلے تو یوں کھوکھلے نہ تھے
جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا وہ بجا نہ تھا
اتنے برے بھی کب تھے اگر ہم بھلے نہ تھے

ناہید شبیر رانا ———— رحمٰن گڑھ

دسمبر کی آخری شب نہ پوچھو کس طرح گزری
مجھے لگتا تھا یہ ہر دم کہ وہ کچھ پھول بھیجے گا

عمرانہ جمیل ———— میاں چنوں

اس کی یادوں کی یہ بھی تو اک کرامت ہے
ہزار میل پہ ہو کر بھی ساتھ ہو جیسے
ہمارے دل کو کوئی مانگنے نہ آیا محسن
کسی غریب کی بیٹی کا ہاتھ ہو جیسے

انجیل ــــــــ ڈہرکی

نہ جانے کتنی مدت سے دل میں ہے یہ عمل جاری
ذرا سی ٹھیس لگتی ہے بہت سا ٹوٹ جاتی ہوں

سیدہ نسبت زہرا ــــــــ کہروڑپکا

ان سے پوچھو کبھی چہرے بھی پڑھے ہیں تم نے
جو کیا کرتے ہیں کتابوں کی باتیں اکثر

حرا قریشی ــــــــ ملتان

سکوت شام سے وحشت ہے، کیا کیا جائے
تمہارا ہجر قیامت ہے، کیا کیا جائے
بہت سی باتیں فراموش کرنی پڑتی ہیں
یہ عمر بھر کی رفاقت ہے، کیا کیا جائے

حمیرا نوشین ــــــــ منڈی بہاؤالدین

وہ مستقبل میں کیا تہذیب عالم کی امیں ہوں گی
جو نسلیں سانس لے رہی ہوں ان زہریلی فضاؤں میں

سونیا مبین ــــــــ موہڑہ دھمیال

یہ کیا ہوا کہ بھرے آسماں کے آنگن میں
بچھڑ گیا وہ ستارہ جو ہمارے نام کا تھا

ساجی عاصم ــــــــ ٹنڈو آدم

اک نقش بھی ادھر سے ادھر نہ ہونے پائے
میں جیسا تمہیں ملا تھا مجھے ویسا جدا کرو

عائشہ جمیل ــــــــ بلدیہ ٹاؤن

صحن تربت میں تقاضا دیے مت آیا کر
خرچ تدفین کا لگ جاتا ہے بیماری پر

تانیہ نصیر ــــــــ فیصل آباد

چپکے، چپکے دیے جلتے ہیں
گہرے رنگ سنہرے لوگ

کوثر ناز ــــــــ حیدرآباد

محبت میں ان کی شدت ہی اس قدر تھی ساقی
گر اقرار سونپ آتے تو وہ جان سے گزر جاتے

کوثر خالد ــــــــ جڑانوالہ

اس زندگی کے حسن کی تابندگی نہ پوچھ
جو حادثوں کی دھوپ میں تپ کر نکھر گئی

عالیہ نور ــــــــ ٹنڈو الہ یار

مرے دل کی راکھ کرید مت، اسے مسکرا کے ہوا نہ دے
یہ چراغ پھر، چراغ ہے کہیں تیرا ہاتھ جلا نہ دے

فوزیہ ثمر بٹ ــــــــ گجرات

خوش مزاجی بھی مشہور تھی اب سادگی بھی کمال ہے
ہم شریر بھی انتہا کے تھے اب سنجیدگی بھی کمال ہے

نوال افضل ــــــــ لاہور

کوئی تو ایسی بات کرو
جس سے لگے تم میرے ہو

مدیحہ جاوید ــــــــ سرگودھا

اے مصور! تجھے استاد مانوں میں
میرا درد بھی کھینچ لے تصویر کے ساتھ

آمنہ اُجالا ــــــــ ڈہرکی

ٹھہرنے کی کہاں ملتی ہے مہلت راہ ہجرت میں
نہ جانے کتنے چہروں کو یہیں دیوار چھوڑ آئے

اُفق آتش ــــــــ چیچہ وطنی

کیوں کر بڑھائیں ربط کسی اجنبی کے ساتھ
ساتھی تھے عمر بھر کے جو غیروں سے جا ملے

زرغونہ خان ــــــــ پشاور

وقت کی قید، خواہشوں کے جال
زیست کچھ بھی سہی، غلامی ہے

مسرت احمد ــــــــ فیصل آباد

میں کیوں نہ ترک تعلق کی ابتدا کرتا
وہ دور دیس کا باسی تھا کیا وفا کرتا
وہ میرے ضبط کا اندازہ کرنے آیا تھا
میں ہنس کے زخم نہ کھاتا تو اور کیا کرتا

ثمرہ بوگن ــــــــ رتیال سانگلہ ہل

ورق ورق پر تیری عبارت، تیرا افسانہ تیری حکایت
کتاب ہستی جہاں سے کھولی تیری ہی یاد کا باب نکلا

فوزیہ ثمر بٹ ــــــــ گجرات

ہر شام چراغوں کی طرح جلتی ہیں آنکھیں
کیا کوئی چلا جائے تو یوں ہوتا ہے محسن

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں۔
آپ سب کی عافیت، سلامتی اور دائمی خوشیوں کے لیے دعائیں۔
اللہ تعالیٰ آپ کو، ہم کو، ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین
اب آتے ہیں آپ کے خطوط کی طرف۔

پہلا خط درگاہی پور سے تہمینہ ارشد کا ہے، لکھتی ہیں،

سمیرا حمید کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں۔ امرحہ پر تو مجھے بہت غصہ آتا ہے، ہر الٹا کام امرحہ ہی کیوں کرتی ہے۔ اب آتے ہیں "رقص بسمل" کی طرف۔ جو بلاشبہ ایک زبردست ناول ہے۔ رخسانہ نگار عدنان کا "ایک تھی مثال" بھی اچھا ناول ہے۔ حقیقت سے قریب مکمل ناول دونوں ہی اچھے تھے۔ افسانوں میں "بیماری دل" نمبرون تھا۔ کنیز نور علی کا "انتخاب" بھی اچھا افسانہ تھا۔ سحر ساجد کا ناولٹ "غریق رحمت" پورا پڑھ کر بتائیں گے۔ کیسا لگا؟ جنوری کے شمارے میں ڈاکٹر یونس بٹ سے ملاقات کرکے بڑا مزا آیا۔ بہت خواہش تھی ان کا انٹرویو پڑھنے کی۔ شاہین رشید سے گزارش ہے کہ وہ سمیع خان اور ارم اختر کا انٹرویو شائع کریں۔

بہت شکریہ تہمینہ! شاہین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ تہمینہ اچھا ہوتا کہ آپ "غریق رحمت" کی قسط پڑھ کر اس کے بارے میں بھی لکھتیں۔

صائمہ مشتاق نے حافظ آباد سے لکھا ہے

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی مکمل رسالہ میرے ہاتھ میں تھا۔ سرورق کچھ خاص نہ تھا۔ فہرست پر نظر دوڑائی تو مریم عزیز کو دیکھ کر مسکراہٹ دوڑ گئی لبوں پہ۔ اس لیے اس بار سب سے پہلے "یارم" کے بجائے "میرے ساتھ رہنا" کو ترجیح دی۔ وجہ صرف اتنی سی ہے کہ یارم کے بعد کچھ اور پڑھنے کے قابل نہیں رہتی۔ ہمیشہ ایسے ہی ہوتا ہے ایک دن "یارم" پڑھتی ہوں اور اگلے دن پورا شعاع۔

خیر... مریم عزیز کا ناول تھا تو ہمیشہ کی طرح۔ مگر ہمیشہ کی طرح اس بار زیادہ مزا نہ آسکا۔ (لو جی! بجلی گل۔ ٹھہریں ایمرجنسی لائٹ جلا لینے دیں... جی تو) وہی سادہ سی کہانی تھی مگر مزہ نہیں آیا۔ بھئی اب "زندگی دھوپ، تم گھنا سایہ" جیسا مصطفیٰ روز روز جنم تو نہیں لیتا نا۔ مریم پلیز! ایسی کہانیاں لکھیں کریں جیسی مصطفیٰ والی ہے۔

افسانوں میں "مما" سب سے بہترین تھا۔ جملے بہت زبردست تھے اور واقعات بالکل حقیقی اس لیے بہت اچھا لگا پڑھ کے۔

مصباح نوشین کا ناول بھی زبردست تھا۔ لگا ہم بھی اسی زمانے میں پہنچ گئے۔ منظر نگاری لاجواب تھی۔ رائٹرز کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو بہت عمدگی سے قلم بند کیا ہے مصباح نے۔ حشمت زیدی کے احساس کمتری نے جو خلا اس کی شخصیت میں بھر دیے تھے۔ بہت نقصان کیا اس نے حشمت کا۔ اپنی انا اور احساس کمتری کے ہاتھوں اس نے اپنی جنت خود جہنم بنا دی۔ جس محبت میں عزت نہ ہو اس کی طرف تو دیکھنا ہی نہیں چاہیے۔ آفاق اور ارسہ کی کہانی مجھے بہت اچھی لگی۔ ویل ڈن مصباح۔ بہت زبردست ناول تھا۔ ایک اور زبردست کہانی "غریق رحمت"

نے دل چھولیا۔ سحر ساجد ہمیشہ کچھ نیا اور زبردست لکھتی ہیں۔ اتنی بے قراری سے میں کہانی پڑھتی گئی اور جب آخری صفحے پر پہنچی تو "آخری حصہ آئندہ ماہ" دیکھ کر بے ساختہ منہ سے "اوہ نو" نکلا۔ زینب آپا کا کردار بہت کمال کا تھا۔ ان میں مجھے اپنی شازی بجو کی جھلک نظر آئی۔

ڈاکٹر یونس بٹ سے مل کر اچھا لگا۔ "ہم سب امید سے ہیں" تو میں بھی بہت شوق سے دیکھتی ہوں۔ بینش چوہان میری پسندیدہ اداکارہ ہیں اس لیے ان سے مل کر اچھا لگا۔ منہاج عسکری ... قطعی پسند نہیں۔ مستقل سلسلوں میں میرے پسندیدہ "باتوں سے خوشبو آئے" "خط آپ کے" سارے پڑھتی ہوں۔ فائزہ افتخار اور سعدیہ عزیز آفریدی کو ڈھونڈ لائیے خدارا...

پیاری صائمہ! آپ کا طویل خط پڑھا۔ بہت جامع اور اچھا تبصرہ کیا ہے آپ نے۔ سعدیہ عزیز آفریدی اور فائزہ افتخار کی کمی ہم بھی محسوس کرتے ہیں، ان تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔

آپ کی رائے مصنفین تک ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

ثوبیہ رحمٰن قریشی کے پی کے خوب صورت شہر بنوں کے احوال کے ساتھ شریک محفل ہیں، لکھا ہے

سابق وزیر اعلیٰ اکرام درانی کا گاؤں "سورانی" میرا بھی گاؤں ہے جو کہ بہت سر سبز و شاداب ہے۔ بنوں میں ہر طرح کی سہولیات موجود ہیں اور حال ہی میں یہاں گیس بھی آچکی ہے جو کہ بہت خوشی کی بات ہے۔ یہاں ایک بہت مشہور مل ہے جو بنوں وولن مل کہلاتی ہے ایک شوگر مل بھی ہے اور کچھ سال پہلے بنوں یونیورسٹی کا قیام بھی عمل میں آیا ہے۔ اسی طرح لاتعداد اسکولز اور کالجز ہیں جن میں لاکھوں لوگ علم کی دولت حاصل کر رہے ہیں۔ بنوں اور خاص کر سورانی کے لوگ بہت مہمان نواز ہیں (اگر یقین نہ آئے تو کبھی آکر آزمالیں) اگرچہ ہر میدان میں ترقی ہو چکی ہے مگر پھر بھی یہاں روایات اور رسم و رواج کو مقدم سمجھا جاتا ہے خوشی اور غمی میں سب ایک دوسرے کا ساتھ نبھاتے ہیں۔ ہمارے ہاں شادیاں گھروں میں ہوتی ہیں (اگرچہ ایک دو شادی ہال بن چکے ہیں) ہزاروں لوگوں کو مدعو کیا جاتا ہے لیکن شادیوں میں بھی پردے کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ہماری طرف سخت پردہ ہوتا ہے ہم ٹوپی والا برقعہ پہن کر اسکول اور کالج جاتے ہیں مگر ہمیں اس پر کبھی بھی کسی سے بھی شرمندگی محسوس نہیں ہوئی بلکہ ہمیں فخر ہے۔ اپنے پردے پر۔

بنوں کی عید کا بھی اپنا مزہ ہے۔ عید کی روایتی ڈش سفید چاولوں کے ساتھ اصلی گھی اور پلاؤ یا زردہ ہر گھر میں بنتا ہے۔ عید والے دن ہماری امی فجر سے ایک دو گھنٹے پہلے اٹھ کر یہ سب تیار کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ نماز عید کے بعد گاؤں کے سب مرد ایک گروپ کی شکل میں ہر گھر میں حاضری دیتے ہیں اور روایتی ڈش چکھتے ہیں، صرف چکھتے اس لیے ہیں کہ ہر گھر میں حاضری دینا لازمی ہوتا ہے اس لیے گنجائش رکھی جاتی ہے (پیٹ میں)

اسی طرح عورتیں بھی گروپ ہی کی شکل میں اپنے اپنے بچوں کے ساتھ برقعوں میں ملبوس عید ملنے جاتی ہیں ہماری عید بہت پیاری ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں مذہب کو خاص اہمیت حاصل ہے اور نماز چھوڑنے کا تصور بھی گناہ سمجھا جاتا ہے یہاں کے تمام لوگ نماز اور روزے کے پابند ہیں اور سچ کہوں، مجھے ان لوگوں پر ترس آتا ہے جو نماز اور روزے کی پابندی نہیں کرتے اور شکر ہے خدا کا ہماری طرف ایسے لوگ نہ ہونے کے برابر ہیں۔

بنوں میں بہت سی مشہور چیزیں ہیں جس میں سکندر خیل بالا کی جلیبی طور کہ بازار کے پکوڑے، دلبر کا حلوہ اور سورانی کے امرود شامل ہیں، سورانی میں ایک مشہور جگہ کورمہ ہے جسے لوگ دیکھنے آتے ہیں یہ بہت خوب صورت جگہ ہے آبادی سے دور سرسبز شاداب زمینیں چند ایک باغات اور تاحد نگاہ پانی کی نہر جو نجانے کہاں تک جاتی ہے۔ یہاں شعاع اور خواتین وقت پر مل جاتے ہیں۔ مگر ایک کمی ہے اور وہ یہ کہ سورانی میں پی ٹی وی کی نشریات نہیں آتیں۔ رات کو تو کبھی ٹی وی دیکھ لیتے ہیں مگر دن کے وقت تو ٹی وی ایک خواب ہو گیا ہے۔

پیاری ثوبیہ! اللہ تعالیٰ آپ کے بنوں کو ہمیشہ سلامت رکھے اور یہاں ہمیشہ امن و امان رہے، آپ کے شہر اور آپ لوگوں کی روایات کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوئی۔ پختون بہت غیور ——— مہمان نواز محنت کش ہوتے ہیں اور تاریخ گواہ ہے کہ ان پر کبھی کوئی باہر سے آکر حکومت نہیں کر سکا ہے۔ انگریزوں نے پورے برصغیر پر

قبضہ کرلیا لیکن اس خطے پر قابو نہ پاسکے۔

ہماری دعا ہے کہ ہمارے ملک کے تمام شہر گاؤں ہمیشہ آباد و خوش حال رہیں۔ آمین۔

بیلہ ساحل نے میرپور آزاد کشمیر سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

ایک بار پہلے بھی میں نے یہ شکایت کرنے کا سوچا تو اللہ بھلا کرے ایک بہن نے مجھے زحمت سے بچالیا۔ اسے بھی آپ نے وہی جواب دیا جو جنوری کے شمارے میں دیا قریشی کو دیا اور مجھے مجبور کیا کہ اب کی بار میں خود اپنا غصہ نکالوں۔ ہندی لہجے اور الفاظ کی بابت آپ کا موقف میری نظر میں انتہائی غیر مدلل ہے (معذرت کے ساتھ) میں مانتی ہوں کہ اردو کا مطلب لشکر ہے تقریباً" سات زبانوں نے مل کر اردو کو جنم دیا ہے جن میں ہندی بھی شامل ہے۔ ہم لوگ اردو میں انگریزی کا ضرورت سے زیادہ استعمال بھی کرنے لگے ہیں۔ حتی کہ بہت سی زبانوں کے بہت سے الفاظ اردو میں شامل نہ ہونے کے باوجود ہماری زبان میں شامل ہیں جن کو "مستعمل" کہا جاتا ہے۔ آپ نے کہا کہ "اردو کو محدود نہ کریں اس کا دامن بہت وسیع ہے" اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہم ہر اچھی بری چیز اس کے دامن میں اچھال دیں۔ ایک کہاوت ہے کہ جہاز میں گندم کے دانے کے برابر بھی سوراخ ہو تو آخر کار جہاز کے ڈوبنے کا باعث بن جاتا ہے۔ آج ہم اردو کی جگہ ہندی لہجہ اختیار کریں گے، کل کو ہندوؤں کی طرح جذبات کے بجائے "جذباتوں" کا استعمال کررہے ہوں گے۔ ہر زبان اپنے اندر دوسری زبان کو سمونے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود اپنا ایک خاص ماحول اور مزاج رکھتی ہے اور اسے اس کے ماحول اور مزاج کے مطابق بولا جائے تب ہی اس کا حسن برقرار رہتا ہے اور کشش محسوس ہوتی ہے۔ میرے بچے خواب کی جگہ "سپنا" بولیں تو میں انہیں فوراً" ٹوکتی ہوں کہ جب اردو میں لفظ موجود ہے تو آپ کارٹون سے سن کر یہ کیوں بولیں جب یہ کہا جاسکتا ہے کہ "میں اس کی وجہ سے پریشان ہوں" تو پھر "اس کو لے کر پریشان ہوں" کہنے کا مقصد؟ اور یقین کیجئے اچھی خاصی تحریر پڑھتے ہوئے انسان بے تحاشا برگشتہ ہو جاتا ہے آج "لے کر" بول رہے ہیں، کل "لے کرکے" بھی بولیں گے۔ اور اب یہ ساری لکھاری بہنیں دیکھا دیکھی ایک ہی ڈگر پہ چل رہی ہیں۔ ہندو اردو بولتے ہیں اپنے انداز میں۔ جہاں ہندی لہجہ محسوس ہوتا ہے۔ ہم اردو کی اصل روح کے ساتھ اردو نہ بول کر اپنی علیحدہ شناخت کیوں کھو رہے ہیں۔ خدارا تحریروں کا مزا کرکرا ہونے سے بچائیے۔ ہم بہت سی زبانوں خصوصاً" اپنی علاقائی زبانوں کا تڑکہ ضرور لگاتے ہیں۔ اردو میں تڑکہ مزا بڑھاتا ہے اور چھوٹے چھوٹے پتھر مزا کرکرا کرتے ہیں۔

تبصروں میں خبروں کے ساتھ طنز و مزاح سے پر تبصرے میں بہت مزا آتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں کسی فنکار کی عزت نفس پہ بھی خاصا حملہ محسوس ہوتا ہے۔ سو "ہتھ ہولا" رکھا کریں۔

ایک درخواست ہے کہ کسی خاتون یا حکیم صاحب سے مشوروں کا اگر سلسلہ شروع کرسکیں تو۔ یہ لوگ ٹی وی پہ جو بتاتے ہیں وہ چیزیں بولتے ہوئے لکھنا یا سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔

پیاری بیلہ! آپ کی شکایت سر آنکھوں پر ہم نے غلط اردو لکھنے کی حمایت نہیں کی تھی۔ نہ ہی انڈین ڈراموں میں جو اردو بولی جاتی ہے اس کو صحیح قرار دیا تھا۔

ہم نے صرف اردو میں ہندی الفاظ کی آمیزش کے بارے میں لکھا تھا۔ اردو میں ہندی کے بہت سے الفاظ شامل ہیں۔ انشاجی کی نظم کا ایک حصہ لکھ رہے ہیں۔ اس میں ہندی الفاظ کا شمار کیجیے۔

جب سورج ڈوبے ' سانجھ بھیے
اور پھیل رہا اجیارا ہو

کسی ساز کی نے پر جھنن جھنن
کسی گیت کا مکھڑا جاگا ہو
اس تال پہ ناچتے پیڑوں میں
ایک چپ چپ بہتی ندیا ہو
ہو چاروں کوٹ سگندھ بسی
جیوں جنگل پہنا گجرا ہو
اس سندر شیتل شانت سے
ہاں بولو بولو پھر کیا ہو؟
وہ جس کا ملنا نا ممکن
وہ مل جائے تو کیسا ہو؟

یہ انشاجی کی ایک طویل نظم "انشاجی بہت دن بیت

چکے" کا ایک حصہ ہے۔

اس میں اجیارا، نکھرا، سگندھ، جیون، شیتل، شانت سمیت یہ تمام الفاظ ہندی کے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی اگر ہم اردو کے اساتذہ شعرا اور مستند نثر نگاروں کو دیکھتے ہیں تو ان کی تحریروں میں ہندی الفاظ شامل ہوتے ہیں۔

آپ نے بہت اچھا خط لکھا ہم آپ کے جذبات کی قدر کرتے ہیں بلا ضرورت ہندی الفاظ کا استعمال ہمیں بھی پسند نہیں ہم کوشش کریں گے کہ ہندی الفاظ کا استعمال نہ کیا جائے۔

اروما عزیز نے سیالکوٹ سے لکھا ہے

ایک شکایت، ہر دفعہ وہ ہی پرانے ناولوں کے ناموں کی اشاعت ہزار دفعہ کہا... مگر کوئی فرق نہ پڑا، کسی مصنفہ سے کوئی ملاقات نہیں... ؟ ہم سے ضرور آپ کی دشمنی ہے۔ ورنہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ آپ ہماری مرضی نہ سنیں! سرورق بس سو سو تھا۔ سمیرا حمید کی تصویر دکھایئے۔ کیوں ہمیں تڑپا رہی ہیں اور ہاں تمام مصنفات کے ناولز جو کہ شعاع کی ابتدا سے لکھ رہی ہیں۔ لسٹ میں دے دیں۔ پلیز... کہنے کو بہت کچھ ہے مگر وقت کی کمی ہے۔ انسان جو ٹھہرے، ابھی ہم فارغ ہو ہی نہیں سکتے۔

اروما! دشمنی کا سوال ہی نہیں ہمیں اپنی تمام قارئین بے حد عزیز ہیں اور ہم ان کی آرا کا نہ صرف احترام کرتے ہیں بلکہ ان کے مشورے کو مد نظر رکھ کر پرچا ترتیب دیتے ہیں پرانی مصنفین کی تحریروں کی دوبارہ فرمائش میں صرف ایک مسئلہ ہے، وہ یہ کہ ہماری قارئین پرانی سے پرانی تحریروں کے نہ صرف کردار بلکہ ان کے عنوان اور مصنفین کے نام بھی یاد رکھتی ہیں۔ ہم نے یہ تحریریں دوبارہ شائع کیں تو انہیں کوفت ہوگی۔

جہاں تک مصنفین کی تصاویر کی بات ہے ہم مصنفین سے سروے میں ان کی تصاویر دیتے رہے ہیں، یارم کے مکمل ہونے کے بعد سمیرا حمید کا انٹرویو دیں گے اور اگر انہوں نے اجازت دی تو ان کی تصویر بھی شائع کریں گے۔

اس بار تو آپ کا خط شکایت نامہ تھا۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

روبی ذیشان اٹک سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

آپی 2013ء کو شادی کے مقدس بندھن میں بندھ کر ایک نئی زندگی سے روشناس ہوئی۔ نئی زندگی، اجنبی لوگ، پر اللہ تعالیٰ کا بہت احسان ہے کہ شوہر کے روپ میں بہت مخلص اور محبت کرنے والا ساتھی دیا۔ بہت طویل عرصے بعد خواتین میں عمیرہ احمد کو "آب حیات" کے ساتھ دوبارہ ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑتے دیکھ کر خط لکھنے سے خود کو روک نہ سکی۔

فائزہ افتخار کہاں غائب ہو گئی ہیں جی؟ بشریٰ سعید کے بھی منتظر ہیں۔ "ایک تھی مثال" کی ابھی ایک ہی قسط پڑھی ہے پر اچھا لگا۔

آپی پچھلے سال میرے ابو جی مختصر علالت کے بعد وفات پا گئے۔ ابو جی کی علالت کے دوران پہلی بار لوگوں کے بناوٹی رویوں کو دیکھا۔ لہجوں کو بدلتے دیکھا کہ ہر رشتے سے اعتبار اٹھ گیا۔

پیاری روبی! اللہ تعالیٰ آپ کے والد کی مغفرت کرے۔ کسی کے رویوں سے اسے پرکھنا درست نہیں۔ آج کے دور میں ہر انسان بہت سے حصوں میں بٹا ہوا ہے اور زندگی پہلے کی طرح آسان نہیں رہی ہے۔ رشتے نبھاتے ہوئے کہیں نہ کہیں کوئی کمی یا کوتاہی ہو جاتی ہے۔ اس کو دل سے لگانا، یا دل میں رکھنا صحیح طرز عمل نہیں۔ افسوس ضرور

سانحہ ارتحال

ہماری مصنفہ نور عین کے چچا شوکت علی صاحب قضائے الٰہی سے وفات پا گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

ہوتا ہے لیکن ایسی باتوں کو بھلا دینا چاہیے۔

فائزہ افتخار چینلز کو پیاری ہو گئی ہیں' ہمیں وہ اب بھولے سے بھی یاد نہیں کرتیں۔ لیکن ہمیں بہت یاد آتی ہیں شاید کبھی لوٹ آئیں۔

بشریٰ سعید ضرور لکھیں گی ان شاء اللہ وہ آج کل ایک ناول پر کام کر رہی ہیں۔

آپ نے لکھا ہے رخسانہ نگار کے ناول کی ایک ہی قسط پڑھی ہے۔ اس بات کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ رخسانہ کے ناول کی 23 اقساط شائع ہو چکی ہیں کیا آپ شروع سے ناول نہیں پڑھ رہی ہیں۔

عائشہ جمیل نے لاہور سے لکھا ہے

جس دن باجی شعاع لے کر آئیں تو میں نے سب سے پہلے سروے کھول کر دیکھا پھر میں رسالہ باجی اسماء کو دے کر کچن میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد باجی اسماء کی آواز آئی۔ میں نے جا کر پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

کہنے لگیں "یہ تم نے لکھا ہے؟" میں نے پڑھا اور آنکھیں پھیل گئیں۔

"نہیں' یہ تو میں نے نہیں لکھا۔" پھر پڑھ کر دیکھا۔ اپنے لکھے کی نشان دہی کی۔ وہ تو کسی اور کا سروے شروع ہو رہا تھا۔ میرے سروے کے نیچے سے۔ مگر اس کا نام نہیں لکھا تھا۔ باجی اسماء نے پنسل سے لائن لگا کر اینڈ لکھ دیا۔

پرسوں مریم علی کا میسج آیا "عائشہ تمہاری شادی ہو رہی ہے؟" اف! میرے تو سر پر لگی۔ غصے میں اسے بھی سنا ڈالیں کہ دھیان سے دیکھو۔ نئی نمبرنگ شروع ہو رہی ہے۔ میں کیا پاگل ہوں جو ایک سوال کا دو دو بار جواب لکھوں گی۔" اب آپ سے گزارش ہے کہ پلیز اس غلطی کی وضاحت کر دیں۔ گھر والوں کو تو میں نے بتا دیا۔ بلکہ انہیں پتا ہے۔ اتنی دور بیٹھی دوستوں کو کیسے سمجھاؤں؟ سارا مزہ کرکرا ہو کر رہ گیا سچ میں۔

سائرہ رضا اور عائشہ فیاض جو خطوط لکھتی ہیں۔ شان دار ہوتے ہیں۔ پہلے تو نمرہ احمد بھی لکھا کرتی تھیں۔ اب کیوں نہیں لکھتیں؟ کبھی کبھار لکھا کریں نا نمرہ جی! تاریخ کے جھروکے" مجھے بہت پسند ہے۔

پیاری عائشہ! ہمیں احساس ہے کہ آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی اور ہماری چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے آپ کو وضاحتیں دینا پڑیں۔ اس سہو کے لیے معذرت خواہ ہیں۔

کائنات خان نے میلسی سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

جنوری کا ٹائٹل بہت پسند آیا۔

"سمیرا حمید" کا ناول یارم میری فیورٹ کہانی ہے۔ نبیلہ عزیز کا ناول "رقص بسمل" بہت اچھا ہے۔ پلیز نبیلہ جی اس کہانی میں تھوڑی سی تیزی لائیں۔ رخسانہ نگار عدنان کا ناول "ایک تھی مثال" اپنی مثال آپ ہے۔

پیاری کائنات! شعاع کی محفل میں خوش آمدید' آپ نے ان دونوں ناولوں میں کرداروں کو ملانے کی بات لکھی ہے ایک بات ہمیں بہت عجیب لگتی ہے۔ حقیقی زندگی میں دو افراد اپنی زندگی کا خود فیصلہ کر کے ملنا چاہیں تو کوئی بھی ان کا ساتھ نہیں دیتا جبکہ ناول اور افسانوں میں ہر قاری بہن کی فرمائش یہی ہوتی ہے کہ مرکزی کرداروں کا ملاپ کروا دیں۔ آپ اطمینان رکھیں۔ ہم سے آپ کی ساری فرمائشیں پوری کریں گے اور جن کرداروں کے بارے میں آپ نے لکھا ہے ان کا ملن ضرور ہوگا۔

فرح یعقوب اور سائرہ داؤد' ڈیرہ غازی خان سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

سب سے پہلے تو سرورق پر خوب صورت سی ماڈل دل کو بھا گئی۔ ماڈل کے بال تو سب سے پیارے لگے۔ اس کے بعد ڈریس کا کلر...... پہلے اپنے موسٹ فیورٹ ناول یارم کی طرف دوڑ لگا دی۔ مجھے امرحہ کی بد دعائیں بڑی اچھی لگتی ہیں اور ہنسی بھی خوب آتی ہے۔ کبھی کہتی ہے' ویرا روس کے برفانی طوفان میں دب کر مر گئی ہو گی تو کبھی کارل مر گیا ہو گا (خیر ہنس ہنس کے برا حال ہو جاتا ہے) چلو شکر ہے کہ کارل کا غرور توڑنے والا ابھی کوئی پیدا ہوا (چچ چچ بیچارا کارل.... ہماری پاکستانی امرحہ زندہ باد) باقی رسالہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔

فرح اور سائرہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ سمیرا حمید تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ باقی رسالہ آپ نے پڑھا نہیں' اس لیے تبصرہ بھی ادھورا ہے۔ دادا جی نے اپنا رویہ اس لیے تبدیل کیا کہ وہ نہیں چاہتے ان کی مسلمان' پاکستانی پوتی اپنی مرضی سے

شادی کرے اور وہ بھی ایسے لڑکے کے ساتھ جس کے باپ کا ہی پتا نہیں ہے۔

کائنات اصغر ڈہرکی سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

ٹائٹل اچھا لگا۔ ویسے ٹائٹل گرل کے ہونٹ تو نارمل تھے پھر بھلا لپ اسٹک اتنا آؤٹ کیوں تھی۔ پھر نئے سال کی دہلیز پر آ کھڑے ہوئے۔ ہمیں نا ہی ماہ و سال کے گزرنے سے کوئی فرق پڑتا ہے اور نا ہی بدلتے موسموں سے، کسی نے کیا خوب، کہا کہ "سال ختم ہونے سے کچھ نہیں ہوتا صرف ہندسے بدلتے ہیں مقدروں کے لکھے تھوڑی نا بدلتے ہیں۔ ہماری زندگیاں تو ویسے بھی ٹھہرے پانیوں کی طرح ہیں۔ سروے میں ایک قاری بہن کے جوابات تو تھے مگر ان کا نام نہیں تھا۔ وہ اپنے رشتے کے حوالے سے اتنا پریشان کیوں ہیں۔ ہمارے یہاں بھی لڑکیوں سے پوچھے بغیر ان کے والدین رشتہ طے کر دیتے ہیں۔ بہت سی باتیں ہیں جن کی وجہ سے میں مشرقی عورت اسپیشلی اپنی برادری کی عورتوں کو سیلوٹ پیش کرتی ہوں۔

"رقص بسمل" پڑھا لگتا ہے۔ نبیلہ عزیز بے دلی سے لکھ رہی ہیں۔ "ایک تھی مثال" کیا اولاد باپ کی نہیں ہوتی؟ حقیقت میں، میں نے دیکھا ہے کہ جب ماں ہوتی ہے تو باپ بھی ہے۔ ورنہ نہیں یارم میں یقین ہے کہ لاسٹ میں سب ٹھیک ہو گا۔ اینڈ میں سب اچھا کیوں ہو جاتا ہے کیونکہ حقیقت تو یہ نہیں ہے۔ مریم عزیز نے خونی رشتوں کی وفا کو واضح الفاظ میں بیان کیا سحر ساجد نے۔ ناول کا نام "زینب آپا" ہونا چاہیے تھا۔ "میرے بے خبر میرے بے نشاں" چہ چہ حشمت زیدی، رشتوں کو دولت کے ترازو میں تولتا ہوا۔

حمیرا نوشین، پہلے مفت مشورہ لیں کہانی کو اس طرح ہونا چاہیے تھا کہ مما جتنا بچوں سے چڑتی تھیں نا تو بچوں کے دل میں ان کے لیے پیار ہونا چاہیے تھا۔ وہ اپنے بچوں کا اچھا رویہ دیکھ کر پچھتاتیں۔

کائنات! مشرقی عورت قابل تعریف ہے لیکن مشرقی روایات نہیں۔ شادی کے لیے لڑکی کی مرضی پوچھنا ضروری ہے۔

رافیہ کنول دائرہ دین پناہ سے لکھتی ہیں

خط لکھنے کی وجہ سمیرا حمید کی کہانی "یارم" ہے عالیان کے ساتھ اتنا ظلم، محبتیں بانٹنے والا لڑکا خود کتنا ادھورا ہے، کیا محبت واقعی میں اتنے دکھ دیتی ہے۔

محبت بھی کتنی عجیب شے ہے، ہنستے مسکراتے زندگی سے بھرپور انسانوں کا کیا حال کر دیتی ہے اور آخر میں یہ کارل کے جملے۔ "تمہیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ میری کچھ سانسیں تم سے راستہ بنا کر مجھ تک آتی ہیں اور یہ بھی نہیں بھولنا کہ کارل کا شمار بھی بدنصیبوں میں ہوتا اگر اس کے پاس عالیان نہ ہوتا" مکمل ناول میں تم ساتھ رہنا' مریم عزیز بازی لے گئیں۔ حمیرا نوشین کا افسانہ "مما" اچھا تھا کیا انہوں نے پہلی مرتبہ لکھا ہے۔

جی رافیہ! ہمارے ہاں یہ ان کا پہلا افسانہ تھا۔

سمعیہ سحر قریشی نے ضلع بھاول نگر سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

رقص بسمل پڑھا۔ ولید بے چارے کے ساتھ کچھ ٹھیک نہیں ہوا۔ ایک تھی مثال۔ مثال اپنے فیصلے پر قائم رہی۔ میرے بے خبر میرے بے نشاں بھی پسند آیا۔ اس میں مجھے کلی کا کردار بہت اچھا لگا۔ تم ساتھ رہنا۔ تو بہت ہی اچھا ناول تھا۔ شعاع کی جان "غریق رحمت" پڑھا پر یہ کیا باقی آیندہ؟

افسانے بھی بہت پسند آئے۔ اور جو سب سے زیادہ پسند آیا وہ ہے۔ انتخاب اور یہ کہ آپی جی بالوں کو دھونے کے لیے جو آملہ۔ ریٹھا اور سیکاکائی کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ کس طرح کریں۔ ضرور بتائیے گا۔ انٹرویوز اچھے اچھے لیا کریں۔ مثلاً "فہد مصطفی، عینی جعفری، صبا قمر۔

معذرت

رخسانہ نگار عدنان کے ناول "ایک تھی مثال" کی قسط تاخیر سے موصول ہونے کے باعث شامل اشاعت نہ ہو سکی۔ اس کے لیے ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔

سمیعہ جی! آپ ان تینوں چیزوں کو بھگو دیں ' پھر ریٹھے کی گٹھلی نکال کر پیسٹ بنالیں۔ بالوں میں لگائیں۔ آدھے گھنٹے بعد سر دھولیں۔ انٹرویو کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچائی جارہی ہے۔

صبا خان اور فوزیہ شکیل سسٹرز۔ سیٹلائٹ ٹاؤن میرپورخاص ' سندھ سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

شعاع اور خواتین ہمارے پسندیدہ ترین ڈائجسٹ ہیں۔ کیونکہ نمرہ احمد ' شعاع چھوڑ کر خواتین میں شفٹ ہوگئی ہیں اور اب تو عمیرہ احمد نے بھی خواتین کی شان بڑھادی ہے۔ "آب حیات" پڑھ کر یقین نہیں آیا کہ "پیر کامل" کا دوسرا حصہ اتنی جلدی شائع ہوگا۔ پلیز نمرہ احمد سے کہیں کہ "جنت کے پتے" کا دوسرا حصہ لکھیں۔ لیکن اتنے سال نہ لگائیں کہ ہم بوڑھے ہو جائیں۔ سمیرا حمید کو کیا کہوں میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ اتنا زیادہ ظلم عالیان اور امرحہ کے ساتھ۔ رلادیا قسم سے۔ پلیز مشال کے ساتھ اب اتنا ظلم نہ کریں اور "رقص بسمل" میں تیمور پہ بہت غصہ آتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو اتنا بھی ڈی گریڈ نہ کرے اور آپ سے نمرہ احمد کے انٹرویو کی فرمائش کی تھی ' کب پورا کریں گی۔

پیاری صبا اور فوزیہ! یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے شعاع کے ساتھ ساتھ خواتین بھی پڑھنا شروع کردیا ہے۔

نمل مکمل ہو جانے دیں۔ ان شاءاللہ نمرہ احمد کا انٹرویو ضرور شائع کریں گے۔

ملتان سے سدرہ بتول شریک محفل ہیں ' لکھا ہے

"یارم" کے بارے میں پہلی قسط سے لکھنا چاہ رہی تھی ' لیکن وقت کی کمی اور پوسٹ کا مسئلہ۔ کارل کا کردار سب سے مزے کا ہے۔ امرحہ کی حرکتیں اور اس کی عجیب و غریب سی بد دعائیں جہاں ہمیں ہنسنے پر مجبور کرتی تھیں ' آج وہی امرحہ ہمیں رلا رہی ہے۔ سروے بھی اچھا تھا۔ اور مشال کے ساتھ کچھ زیادہ ہی برا ہو رہا ہے رخسانہ نگار اپنی ہر ہیروئن کے ساتھ ایسا ہی کرتی ہیں (سوری رخسانہ جی) نئے سال پر کوئی نیا سلسلہ شروع کریں (جس میں ' میں بھی شامل ہوسکوں۔)

پیاری سدرہ! ہمیں یاد نہیں کہ ہم نے آپ سے کوئی جھوٹا وعدہ کیا تھا ' اچھا ہوتا کہ آپ ہمیں یاد دلا دیتیں۔ ہم اتنے خط پڑھتے اور شائع کرتے ہیں کہ ساری باتیں یاد رکھنا ہمارے لیے بہت مشکل ہے۔ یارم آئندہ ماہ ختم ہو جائے گا۔ اس کی صرف ایک قسط باقی ہے۔ امرحہ آپ کو رلا رہی ہے۔ اس کا ہمیں بھی دکھ تو ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو کردار رلاتے ہیں ' وہ قارئین کو ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔

قارئین متوجہ ہوں!

1- ماہنامہ شعاع کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کرسکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس و فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، نا قابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- ماہنامہ شعاع کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع
37- اردو بازار کراچی

واصفہ سہیل

آئینے جہاں میں

پیادیس

لیجیے جناب ایک اور اداکارہ پیادیس سدھار گئیں جی ہم بات کر رہے ہیں صنم سعید کی' ان کی شادی فرحان حسن کے ساتھ گزشتہ دنوں لاہور میں انجام پائی۔ ان کے شوہر ان کے بچپن کے دوست ہیں۔ یہ شادی دونوں خاندانوں کی باہمی رضا مندی سے ہوئی ہے۔ فرحان حسن ورلڈ بینک میں ملازمت کرتے ہیں اور امریکا سے شادی کرنے کے لیے خصوصی طور پر لاہور آئے تھے۔

صنم سعید جنہوں نے اپنے کیریر کا آغاز ماڈلنگ سے کیا' پھر ٹی وی پر اداکاری کی اور اب صنم فلم انڈسٹری میں اپنے فلمی کیریر کا بھی آغاز کر رہی ہیں۔ انجم شہزاد کی فلم میں صنم کے ساتھ ایمان علی اور فہد مصطفیٰ مرکزی کردار ادا کر رہے ہیں۔

واپسی
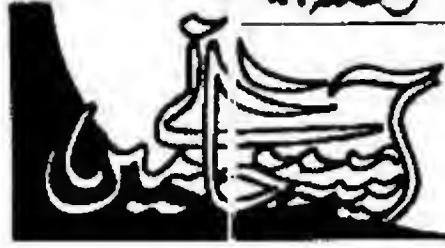
راتوں رات پی ٹی وی کوئٹہ کی سیریل "دھواں" کے ذریعے شہرت حاصل کرنے والے عاشر عظیم اپنی بھرپور اداکارانہ صلاحیتوں کے باوجود سیریل دھواں کے بعد منظر سے غائب ہوگئے اب ایک طویل عرصے کے بعد وہ اپنی ٹیلی فلم محافظ کے ذریعے دوبارہ شوبز میں آچکے ہیں' لیکن اب وہ فلم کے پردے پر جلوہ گر ہوں گے۔ حسن وقاص رانا کی یلغار کے علاوہ عاشر عظیم نے خود بھی فلم بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ "مالک" جی یہ نام ہے عاشر کی اس فلم کا جس کی کہانی بھی عاشر عظیم نے خود لکھی ہے اور اس کی ہدایات بھی وہ خود دیں گے۔ (یعنی یہ فلم انڈسٹری کے لیے دھواں جیسی کوئی زبردست چیز ہوگی۔) عاشر عظیم نے اس کے لیے فنکار بھی ٹی وی سے ہی لیے ہیں' فرحان علی آغا' ساجد حسن' حسن نیازی اور سبین بلوچ کے نام فائنل کیے جاچکے ہیں (ہیں! ہم تو سمجھے تھے کہ نبیل اور نازلی نصر کے نام بھی ہوں گے اس میں لیکن۔۔۔؟) یہ تمام فنکار پہلی مرتبہ فلم میں کام کریں گے۔

جواب

آج کل ہر طرف عامر خان کی "پی کے" کا چرچا

ہے۔ عامر خان نے "پی کے" کا کردار بہت اچھے انداز میں کیا ہے، وہ ایک دوسرے سیارے کی مخلوق بنے ہیں جو اپنا ریموٹ کھو بیٹھتا ہے۔ جس کے ذریعے وہ واپس اپنے سیارے پر جاسکتا ہے۔ اب اس ریموٹ کی تلاش کی جدوجہد اسے مختلف مذاہب کے بارے میں جاننے کی راہ پر ڈال دیتی ہے۔ اس تلاش و جستجو میں وہ مختلف ڈھونگیوں اور مذہبی گروہوں سے ملتا ہے جو مذہب کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس فلم کے ایک سین میں وہ کردار پی کے ٹی وی پر آ کر ایک مذہب کے ماننے والے سے کہتا ہے کہ "میں کہتا ہوں کہ ہمیں اس بھگوان کی پوجا کرنی چاہیے جس نے ہمیں بنایا ہے اور تم کہتے ہو کہ ہمیں اس بھگوان کی پوجا کرنی چاہیے جسے تم نے خود بنایا ہے۔" یہ فلم کا سب سے متاثر کن اور مضبوط سین ہے۔ (اسی وجہ سے اس فلم پر مقدمہ بھی چلایا گیا۔) اس سین میں پی کے آگے کہتا ہے کہ "تم کہتے ہو کہ مسلمان دھوکا دیتا ہے، میں کہتا ہوں کہ مسلمان دھوکا نہیں دے سکتا۔" یہ مسلمانوں اور خاص کر بھارتی مسلمانوں کے حق میں بہت اچھی آواز ہے کہ جب مسلمانوں کے خلاف آواز اٹھائی جا رہی تھیں تو اس پروپیگنڈے کا اس سے بہتر جواب نہیں ہو سکتا۔ خاص طور پر اس وقت جب کہ بھارت میں نریندر مودی جیسے انتہا پسند کو منتخب کیا گیا ہو۔

ڈھٹائی

پچھلے دنوں حمائمہ ملک اپنی قومی ایر لائن میں سوار ہوئیں کافی دیر گزر گئی، لیکن جہاز نے اڑنے کا نام نہیں لیا۔ سب پریشان ہو رہے تھے۔ سوا گھنٹے کے بعد یہ خبر آئی کہ جہاز کے عملے کے تاخیر سے پہنچنے کی وجہ سے فلائٹ لیٹ ہوئی ہے۔ حمائمہ ملک فوراً" اگلے حصے میں پہنچیں، جہاں سے پائلٹ اور فلائٹ انجینئر خراماں خراماں چلے آ رہے تھے۔ (بھئی اپنی قومی ایر لائن جو ہے۔!) جب حمائمہ نے ان سے یہ پوچھا کہ وہ تاخیر سے کیوں آئے ہیں؟ سارے مسافر پریشان تھے ان کی وجہ سے تو انہوں نے شرمندہ ہونے کے بجائے حمائمہ سے بدتمیزی کی۔ (ان کی نوکری کو کوئی خطرہ تھوڑی تھا جو وہ شرمندہ ہوتے۔۔۔!) اس صورت حال میں دیگر مسافروں نے بھی حمائمہ کا ساتھ دیا۔ حد تو یہ ہوئی کہ ایک مسافر نے موبائل پر اس سارے منظر کو قید کر لیا۔ لیکن قومی ایر لائن کے پائلٹ اور انجینئر پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔

ڈیمانڈ

میکال ذوالفقار کا کہنا ہے کہ "بھارتی ڈراما ان کی اپنی فلموں سے متاثر ہے۔ جس میں ایک خیالی دنیا ہوتی ہے جو حقیقت سے بہت دور ہے۔" میکال نے مزید کہا کہ "میں بھارتی فلموں اور ڈراموں میں ضرور کام کرنا چاہتا ہوں (ہائے ہمارے فنکاروں کے ارمان) مگر میں بولڈ مناظر عکس بند نہیں کراؤں گا (ابھی کام ملا نہیں اور شرطیں۔۔۔ واہ جی واہ۔!) میکال کا کہنا ہے کہ اچھے ڈرامے کے لیے، یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کا موضوع صرف قتل و غارت گری یا محبوب کی بے وفائی ہی ہو۔ (تو۔۔۔؟ آپ اب ڈراما لکھیں نا بھئی ان موضوعات سے ہٹ کر۔۔۔)

تبدیلی

عتیقہ اوڈھو کہتی ہیں کہ اب انہیں سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں رہی (بھئی کاسمیٹکس کا بزنس جو کر رہی ہیں۔) انہوں نے کہا کہ سیاست کچھ دو اور کچھ لو کا نام ہے (یہ چلن تو ہر جگہ ہے) جب کہ میں سیدھی سادی فطرت کی مالک ہوں (آہم۔۔۔ آہم۔۔۔) چنانچہ اب میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ میں اچھی سیاست دان نہیں بن سکتی۔ عتیقہ نے مزید کہا کہ ہمارے معاشرے میں زیادہ تر مرد نہیں چاہتے کہ عورت سیاست کے میدان میں کامیاب ہو (آپ کے منہ سے یہ باتیں کچھ عجیب لگ رہی ہیں کہ مرد۔۔۔؟) اسی لیے عورتوں کے راستے میں کئی رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتی ہیں (کیا کنٹینر لگا کر۔۔۔؟) عتیقہ نے کہا کہ جب تک

اٹھتی اور پھر وہیں ڈھیر ہو جاتی ہے۔

(حفیظ اللہ نیازی۔ جنگ)

تجزیہ کیا جائے تو پاکستان میں ٹیلی ویژن صحافت کا ایک ایسا بھیانک چہرہ ہے جسے اگر اس صحافت کے ذمے دار خود بھی غور سے دیکھ لیں تو ڈر جائیں۔

(شاہنواز فاروقی۔ فرائی ڈے اسپیشل)

شیخ رشید صاحب کی پیش گوئیاں فال نکالنے والے طوطے کی طرح ہوتی ہیں یا اس جعلی پیر کی طرح جس نے اولاد کے لیے کسی کو تعویذ لکھ دیا تھا لڑکا نہ لڑکی۔

لڑکا ہو گیا یہ تاویل کہ ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا "نہ لڑکی" لڑکی ہوئی تو یہ کہ ہم نے کہا نہ تھا "لڑکا نہ" یعنی لڑکا نہیں بلکہ لڑکی ہوگی اگر کچھ نہ ہوا تو یہ دلیل "تعویذ میں صاف لکھا ہے "لڑکا نہ لڑکی" یعنی کچھ نہیں ہونے کا۔ پرویز مشرف کے وزیر اطلاعات بن کر موصوف نے بہت ڈھنگ سیکھ لیے ہیں۔

(بین السطور۔ جسارت)

☆

فنکار کی زندگی میں تبدیلی نہ آئے وہ کچھ نہیں سیکھتا اور تبدیلی پیدا کیے بغیر وہ لوگوں کے دلوں میں گھر بھی نہیں کر سکتا۔ (عتیقہ کہیں آپ عمران خان کی "تبدیلی" بھئی ریحام جیسی تبدیلی کی بات تو نہیں کر رہی ہیں لیکن ایسی تبدیلیاں تو آپ بھی کر چکی ہیں تو کچھ سیکھا آپ نے؟)

کچھ ادھر ادھر سے

☆ بگرام جیل کے ایک قیدی سہراب خان کا چشم دید بیان "جنوری" کی ایک یخ بستہ صبح عافیہ کو جیل کے باریک لباس میں گھسیٹ کر دالان میں لا کر پٹخ دیا۔ عافیہ بلک رہی تھی اس کی چیخ و پکار سے سارے قیدی جاگ گئے۔ ہم لوگ سلاخوں کے ساتھ لگ کر ذات باری سے رحم رحم کی بھیک مانگ رہے تھے۔ عافیہ کا پورا جسم آہنی زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑا نظر آیا۔ گرم کپڑوں موٹی جیکٹوں، لمبے جوتوں، اونی ٹوپیوں سے مزین درجنوں سی آئی اے اہلکار اور شقی القلب امریکی فوجیوں نے برفانی پانی کی بالٹیاں عافیہ پر انڈیل دیں۔ ایک گارڈ رائفل کے نچلے حصے سے مسلسل مار رہا تھا، حکم نامہ کہ جیل کے دالان کے چکر لگاؤ۔ عافیہ بمشکل

روم اور نیرو

روم کا جابر و سنگدل بادشاہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ درباری سوچ رہے تھے کہ نہ جانے اب کون سی مصیبت آنے والی ہے۔ کیوں کہ جب کبھی بادشاہ ایسی سوچ میں گم ہوتا کوئی نہ کوئی ظلم کا کھیل تفریح کے لیے ضرور سوچتا تھا۔

اچانک محل میں بادشاہ کی آواز گونجی۔ "میں روم کو دوبارہ تعمیر کراؤں گا۔"

"کیا؟" درباری حیران ہو گئے۔ ایک درباری نے عرض کیا۔ "جناب عالی! روم تو پہلے ہی فن تعمیر کا شاہکار ہے اس کی مزید تعمیر کیا معنی؟"

"مزید تعمیر نہیں۔" بادشاہ نے کہا۔ "اس کو تباہ کر کے دوبارہ تعمیر کراؤں گا۔" بادشاہ نے زور سے جواب دیا۔

ایک درباری نے آہستہ سے کہا کہ لوگ کہاں جائیں گے۔ غرض کہ درباریوں نے ہزاروں خدشات کا اظہار کر کے بادشاہ کو اس عمل سے روکنے کی کوشش کی، لیکن بادشاہ اپنی بات پر قائم رہا اور درباریوں کو دھمکی دی کہ جو اس بات کی مخالفت کرے گا اس کا یہ فعل بغاوت سمجھا جائے گا۔ اس کے بعد بادشاہ نے اپنی خاص فوج کو حکم دیا کہ رات کے اندھیرے میں شہر کے مختلف حصوں میں آگ لگا دی جائے تاکہ شہر مکمل طور پر تباہ ہو جائے۔ اس طرح نئے سرے سے شہر کی تعمیر ہو گی اور مجھے ایک دلفریب تفریح دیکھنے کو بھی ملے گی۔

حکم کی تعمیل ہوئی۔ لوگ آگ لگتے ہی بدحواسی میں جان بچانے کے لیے گھروں سے نکل کر بھاگے۔ لیکن کوئی امرا اپنے کنبے کے مکمل افراد کے ساتھ محفوظ مقامات پر نہ پہنچ سکا۔ کسی کا باپ، کسی کی ماں، کسی کی بہن، کسی کا بھائی ایک دوسرے سے بچھڑ گئے اور کئی لوگ آگ میں جھلس گئے۔ ادھر یہ قیامت خیز افراتفری کا منظر تھا۔ دوسری طرف بادشاہ روم نے اپنے محل میں تاریکی کا راج کر رکھا تھا اور محل کے سارے دروازے کھول دیے گئے تاکہ شہر کا منظر فلم کی روشن اسکرین کی طرح نظر آئے اور بادشاہ اس خوفناک سین کو بغیر کسی دقت کے دیکھ سکے۔ اس لطف کو مزید بڑھانے کے لیے اس نے محفل موسیقی کا بھی انتظام کیا تھا۔ بادشاہ خود بھی بانسری بجا رہا تھا۔

آگ محل تک پہنچ گئی تو بادشاہ خفیہ راستے سے نکل گیا۔ پورا شہر جل کر خاکستر ہو گیا۔ ہزاروں انسان جیتے جی موت کے منہ میں چلے گئے۔

اس ظالم حکمران کا نام نیرو تھا۔ انگریزی کا ایک مشہور مقولہ ہے "روم جل رہا تھا اور نیرو بانسری بجا رہا تھا۔" یہ مقولہ اسی واقعے کی یاد دلاتا ہے۔

روم کے جل جانے کے بعد شہر کی دوبارہ تعمیر کے لیے نیرو نے دولت کو پانی کی طرح بہانا شروع کیا۔ لیکن بچی کھچی رعایا اب اس ظالم بادشاہ کو ختم کر دینا چاہتی تھی۔ نیرو کے خلاف بغاوت شروع ہوئی تو بغاوت کی خبر سن کر نیرو رعایا کو سمجھانے یونان سے روم واپس آیا۔ لیکن غصے سے بھرے عوام نے اس کے محل کا محاصرہ کر لیا۔ نیرو بڑی مشکل سے جان بچا کر اپنے ملازم کے ساتھ اس کے گاؤں چلا آیا۔ لیکن یہاں بھی باغیوں نے اس کا گھیراؤ کر لیا۔ آخر کار وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ لیکن دوسروں کے جسموں کو اذیت دینے والے کھیلوں کے بادشاہ کے لیے خود کو موت کے گھاٹ اتارنا مشکل ہو گیا۔ جب کہ اس نے اپنی اذیت پسند فطرت کو تسکین دینے کے لیے "میکسم تھیٹر" کی بنیاد رکھی تھی۔ جہاں صرف اذیت کے مناظر سے

تسکین حاصل کرنے والے جذبے کی تکمیل کے لیے روزانہ کئی لوگوں کو زندہ درگور کیا جاتا تھا۔

جب نیو خود پر خنجر اٹھانے لگا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ آخر اس کے بے حد وفادار ملازم نے آگے بڑھ کر خود ہی خنجر اس کی گردن میں گھونپ دیا۔

(بشریٰ سجاد)

سیب کی خواہش

"ایک سیب چاہیے! ایک سیب کھانے کو مل جاتا تو مجھے تسکین ہو جاتی۔ کہیں سے مجھے ایک سیب لا دو!" ایک بیوی نے اپنے شوہر کو سیب کا مطالبہ کرکے

پریشان کر دیا۔ جہانگیر بادشاہ کے زمانے کی بات ہے کہ ایک کسان کی بیوی کے بچہ ہونے والا تھا۔ وہ غریب جھنگ کے علاقے میں رہتا تھا۔ بیوی نے جو سیب کی خواہش کی تو بڑا پریشان ہوا۔ بستی میں کہیں سیب نہ ملا تو کسی نے کہا کہ بستی کے باہر ایک سوداگر آیا ہوا ہے۔ اس سے پوچھ لو شاید سیب مل جائے۔ وہ سوداگر کے پڑاؤ پر پہنچا۔ اس کے کارندوں نے کہا۔ ہمارے پاس تو نہیں شاید ہمارے مالک کے پاس ہو۔ ہوتے ہوتے وہ کسان سوداگر تک جا پہنچا۔ سوداگر گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے تھا۔ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتا تھا۔ ایسا کائیاں تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ کسان کی بیوی کے بچہ ہونے والا ہے۔ اسے سیب کھانے کی خواہش ہو رہی ہے۔ اس نے کسان سے کہا۔ "یہ لو سیب موجود ہے۔ مگر ایک شرط پر سیب تمہیں دیتا ہوں۔" کسان نے کہا۔ "وہ کیا؟"

سوداگر بولا۔ "میرے تجارتی مال پر جو ٹیکس لگتا ہے وہ پوری مملکت میں معاف کیا جائے۔" کسان نے جواب دیا۔ "میری کیا مجال کہ تمہاری بات مانوں۔" سوداگر بولا۔ "تو بس ایک سفارش مجھے لکھ دے۔ میں یہ معافی آج نہیں چاہتا۔ تیرا بیٹا جب بڑا ہو کر وہ کچھ بن جائے گا جو میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں تب میں یا میری اولاد تیری لکھی ہوئی سفارش اسے بتا کر اپنا مطلب

حاصل کر لیں گے۔" کسان نے بڑی خوشی سے تحریر پر انگوٹھا لگایا اور سیب لے کر چلتا بنا۔

مغلیہ سلطنت میں دو شخص وزیر اعظم ہوئے۔ ایک ابو الفضل اور دوسرا سعد اللہ۔ دونوں اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر یہاں تک پہنچے۔ دونوں ذہین و فطین تھے۔

نواب سعد اللہ خان لکھتے ہیں کہ۔۔۔ میں جب ذرا کھیلنے کودنے کے قابل ہوا تو کسان باپ نے کہا کہ گائے بھینس چرایا کرو! اس زمانے میں مجھے مکتب جانے والے ہم عمروں پر بڑا رشک آتا تھا۔ رہ رہ کے دل میں ہوک اٹھتی کہ کاش میں بھی پڑھ سکتا! ایک دن گائے بھینسوں کو چراتے چراتے میں ایک جگہ گھاس پر

لیٹا تو آنکھ لگ گئی۔ خواب میں کسی نے کہا کہ۔۔۔ دلی جا اور پڑھائی شروع کر! یہ بات میں نے اپنے باپ سے کہہ سنائی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ شاید اسے سوداگر کی بات یاد آگئی جو مجھے اس وقت معلوم نہ تھی۔ کچھ سوچ کر وہ بولا۔ "جانا ہے تو دلی چلا جا۔ خواہش میری بھی یہی ہے کہ تو پڑھ لکھ کر کچھ بن جائے۔ مگر یہ بات پلے باندھ لے کہ میں غریب ہوں۔ پیسہ ٹکا تجھے بھیج نہیں سکتا۔ نہ سفر خرچ دے سکتا ہوں۔"

دیوانے کو تو ہو چاہیے۔ سعد اللہ خان کو اتنی بات کافی تھی۔ تین مہینے پیدل چل کر اور دنیا بھر کے دھکے کھا کر لڑکھڑاتا ہوں میں وہ دلی پہنچ گیا۔ اور ایک مسجد کے مکتب میں پڑھنے لگا۔ دن محنت مزدوری میں گزرتا اور راتوں کو پڑھائی ہوتی۔ کئی سال اسی طرح گزرے تو جہانگیر کا بیٹا شہاب الدین محمد شاہجہاں کا لقب اختیار کر کے تخت پر بیٹھا۔ انہی دنوں شاہ ایران نے ایک خط بھیجا کہ۔۔۔ تم تو ہند کے بادشاہ ہو پھر سارے جہان کے بادشاہ۔ شاہجہاں کہلانے کے تم کیسے مستحق ہوئے ہم کوئی تم سے کم ہیں؟ بہتر یہ ہے کہ تم فوراً" یہ لقب بدل دو۔ وہ خط دربار میں پڑھا گیا تو شاہجہاں نے کہا کہ۔۔۔ تم لوگ اس کا جواب لکھو۔ درباریوں نے بہت دماغ لڑایا مگر کوئی جواب نہ بن پڑا۔ آخر بادشاہ نے حکم دیا کہ دلی

کے مکتبوں میں اس کی اطلاع کرادی جائے تاکہ استاد اور ان کے شاگرد اس کا جواب لکھیں۔ سعد اللہ خان کی جماعت میں جب یہ فرمان سنایا گیا تو سب جواب لکھنے میں لگ گئے۔ سعد اللہ خان نے کاغذ پر اپنا نام پتا لکھ کر جواب لکھا کہ ہند اور جہان کے اعداد برابر ہیں۔ اس لیے، شاہ ہند کو زیبا ہے کہ شاہجہاں کہلائے۔ یہ ہند میں ہ کے پانچ۔ ن کے پچاس اور د کے چار عدد ہوتے ہیں۔ جملہ انسٹھ بنتے ہیں۔ جہاں میں ج کے تین، ہ کے پانچ۔ الف کا ایک اور ن کے پچاس، جملہ انسٹھ ہوتے ہیں۔

استاد نے یہ جواب پسند نہ کیا اور سب سے نیچے یہ جواب رکھ کر شاہی محل بھیج دیا۔ اتفاق سے بادشاہ کے ہاتھوں میں جب یہ پلندہ آیا تو آخری کاغذ اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ اس نے اٹھا کر سب سے پہلے اس کو پڑھا تو یہ سعد اللہ خان کا جواب تھا۔ بادشاہ کو یہی جواب پسند آیا۔ اس نے حکم بھیجا کہ سعد اللہ آج سے ہمارے ذاتی عملے میں شامل کرلیا جائے! یہ تقرر کیا ہوا سعد اللہ خان کے لیے اللہ تعالیٰ نے ترقی کے دروازے کھول دیے۔ پھر بہت جلد سعد اللہ خان مغلیہ سلطنت کا وزیر اعظم بن گیا۔

ایک دن ایک بوڑھا سوداگر اس سے ملنے آیا اور ایک تحریر اسے پیش کی۔ سعد اللہ خان نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور تمام سلطنت مغلیہ میں اس کے سامان تجارت پر محصول معاف کردیا۔

احتیاط

ایک دن امیرالمومنین منصور نے یزید بن مسلم سے ابو مسلم کے بارے میں مشورہ کیا۔ یزید نے کہا۔

"امیرالمومنین کی عمر دراز ہو۔ مناسب یہ ہے کہ اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کردیا جائے تاکہ اس کے خرخشوں سے نجات مل جائے۔"

یہ سن کر منصور خفا ہو کر بولا۔

"تیری زبان جل جائے' یہ کیا کہہ رہا ہے' اگر تیرے دیرینہ حقوق ہم پر نہ ہوتے تو جو سزا تو اس کے لیے تجویز کررہا ہے ہم تیرے لیے تجویز کرتے۔"

یہ کہہ کر اسے حکم دیا گیا کہ وہ نظروں سے دور ہوجائے۔

ان باتوں کو ایک مدت گزرنے کے بعد جب منصور نے ابو مسلم کو قتل کرادیا تو یزید بن مسلم کو بلوایا اور پوچھا۔

"تمہیں یاد ہے کہ ایک بار ہم نے ابو مسلم کے بارے میں تم سے مشورہ لیا تھا اور تم نے اسے ٹھکانے لگانے کا مشورہ دیا تھا؟"

یزید نے جواب دیا۔

"میں کیوں کر بھول سکتا ہوں۔"

منصور بولا۔ "شاید تمہیں معلوم نہ ہو کہ تم نے جو مشورہ دیا تھا' وہی معقول تھا' لیکن میں نے بناوٹی غصے کا اظہار کیا۔ اس خیال سے۔ کہ یہ بات کسی کے سامنے تمہاری زبان سے نہ نکل جائے۔ پھیلتے پھیلتے ابو مسلم تک پہنچ جائے۔ اور وہ میرے ہاتھ نہ آئے۔ اس لیے باوجود اس کے کہ تم نے بہترین رائے دی تھی۔ احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ اسے ظاہر نہ ہونے دیا جائے۔"

شعاع کے ساتھ ساتھ

ادارہ

ڈاکٹر ایس عامر۔ لاہور

1۔ پیشے کے لحاظ سے میں ایک ڈاکٹر ہوں اور لاہور کے مضافاتی علاقے فرید نگر میں رہائش پذیر ہوں۔ اس کے واحد بازار میں میرا کلینک واقع ہے۔ یہ علاقہ دریائے راوی سے متصل ہے اور قدرے پسماندہ۔ اردگرد لوہے کے کارخانے ہیں۔ یہاں طبی سہولتوں کا فقدان ہے۔ اس مٹی کا قرض چکانے کے لیے میں نے اپنی پریکٹس کا آغاز اسی علاقے سے کیا اور تیس سال کا عرصہ ہوگیا' میں مصروف خدمت ہوں۔ اگرچہ میری مالی حالت اوسط درجے کی ہے۔ لیکن محبت و شفقت کی دولت بے بہا ہے' جس سے طمانیت قلب حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں میں سے ایک رحمت میری چھوٹی بیٹی شمائلہ رضا (اب شمائلہ امجد) ہے جس نے میری زندگی کے انتہائی نازک دور میں میرا بڑا ساتھ دیا۔ مجھے اور میرے گھر کو بکھرنے سے بچایا۔ اس کی والدہ کو 2004ء میں فالج نے مکمل طور پر زیر کرلیا۔ وہ سن اور دیکھ سکتی تھیں۔ لیکن گویائی متاثر ہوگئی تھی۔ یہ بچی سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی۔ اس نے کالج جانا چھوڑ دیا اور رات رات بھر جاگ کر ماں کی خدمت کی۔ ان کے پلنگ کے پاس کرسی ڈال کر بیٹھی رہتی۔ اس نے نہ صرف ماں کا خیال رکھا۔ آنے والے مہمانوں کو بھی سنبھالا۔ میرے معمولات میں میرا بے حد ساتھ دیا۔ تعلیم کا سلسلہ بھی منقطع نہ ہونے دیا۔ پرائیویٹ تیاری شروع کردی۔ نہ جانے کب اس کی دوستی شعاع اور خواتین ڈائجسٹ اور دوسرے رسائل سے ہوگئی۔ وہ خود بھی مطالعہ کرتی اور ماں کو بھی منتخب چیزیں پڑھ کر سناتی۔ بیگم کے مزاج میں خوشگوار تبدیلی جھلکنے لگی۔ چڑچڑے پن کی جگہ مسکراہٹ سے ہمارا واسطہ پڑنے لگا۔ صحت یابی کی رفتار میں بھی تیزی آگئی۔ پہلے ہاتھوں میں جان پڑی۔ پھر پاؤں حرکت کرنا شروع ہوئے' پھر واکر کے سہارے صحن میں چہل قدمی ہونے لگی۔ اس تین سال کے عرصے کے دوران شمائلہ نے بی اے میں کامیابی حاصل کی اور بی ایڈ کے کورس کے لیے علامہ اقبال یونیورسٹی سے منسلک ہوگئی۔ شعاع سے وابستگی برقرار رہی۔ اس کی والدہ اپنے چھوٹے موٹے کام خود کرنے لگیں۔ جون 2008ء میں اس کے لیے جدہ میں مقیم ایک آرکیٹکٹ کا رشتہ آگیا جو ہر لحاظ سے بہتر لگا۔ پھر لڑکے نے پاکستان میں سیٹل ہونے کا ارادہ ظاہر کیا۔ سب نے مشورہ دیا کہ فرض کی ادائیگی میں دیر نہ کی جائے۔ یوں میری غم گسار' ہم راز اور لخت جگر مجھ سے بچھڑ گئی۔ اب وہ آمنہ اور علیزہ کی ماما ہے۔ اس کی ہر بات ان ہی سے شروع ہوتی ہے اور ان ہی پر ختم۔ آج آمنہ نے یہ کیا تو علیزہ نے وہ۔ ڈائجسٹ پڑھنے کے لیے اسے وقت ہی نہیں ملتا۔ وہ ان معصوم کلیوں میں مگن ہو کر اکثر ہمیں بھی بھول جاتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد بھی میں نے ان رسائل کو بند نہیں کیا۔ ہر مہینے ہاکر باقاعدگی سے ہمیں دے جاتا ہے۔ میں پانچ سال سے ان کا قاری ہوں۔ انہیں پڑھے بغیر مجھے رات کو نیند نہیں آتی۔ شعاع کے اس سلسلے میں حصہ لینے کا یہ پہلا موقع ہے۔ شامل اشاعت ہو یا ردی کی زینت۔

2۔ ہماری صبح حسب معمول نماز سے ہوتی ہے۔ بیگم تسبیح پکڑ وظیفے میں مشغول ہوجاتی ہیں اور میں چھوٹے سے لان میں چہل قدمی کرلیتا ہوں۔ اس اثنا میں رضیہ سلطانہ (ملازمہ) آجاتی ہے اور وہ بیگم کی زیر نگرانی گھر کا نظام سنبھال لیتی ہے۔ میں دو گھنٹوں کے لیے سوجاتا ہوں۔ اتنی دیر میں ناشتا تیار ہوجاتا ہے۔ ناشتے کے بعد میں کلینک کا رخ کرتا ہوں۔

رات کو جب واپس آتا ہوں تو رضیہ اپنے شوہر کے ساتھ جاچکی ہوتی ہے۔ میں عشاء کی

نماز ادا کرتا ہوں۔ اتنے میں بیگم کھانا گرم کرلیتی ہیں۔ کھانے کے بعد وہ لیٹ جاتی ہیں اور میں اسٹڈی میں پہنچ جاتا ہوں۔ ہلکی آواز میں میوزک سنتے ہوئے شعاع، خواتین ڈائجسٹ کا مطالعہ کرتا ہوں۔ پھر کچھ دیر بعد نیند آجاتی ہے۔ صبح فجر کی اذان کے وقت جاگ جاتا ہوں۔

3 ۔ ذاتی زندگی میں بہت حساس، سنجیدہ اور ہمدرد ٹائپ شخص ہوں۔ اسی لیے بچے بڑے مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ بیگم جب زندہ لاش کی صورت اختیار کرگئی تھیں۔ بہت سی مہربان خواتین و مرد حضرات دوسری شادی کے لیے بے شمار جواز پیش کرتے تھے۔ وہ افادیت بیان کرتے تھکتے نہیں تھے۔ میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ جو میری زندگی میں اکیس سال سے شامل ہے۔ اس سے منہ موڑ کر نئی ہم سفر تلاش کروں۔ اللہ کے فضل سے میں یہ سلامت اس دور سے گزر گیا۔ دماغ اور دل میں بڑی جنگ ہوئی۔ آخر کار وفاشناس دل جیت گیا۔

کسی بھی جریدے کی مقبولیت اور کامیابی میں جہاں ادارے اور مصنفین کی کاوشیں شامل ہوتی ہیں وہیں قارئین کی پذیرائی اور آرا بھی چار چاند لگانے کی وجہ بنتی ہیں۔ قارئین کی توجہ بھی عملے میں نئی روح اور لگن کا باعث بنتی ہے۔ شعاع کے قارئین کے خطوط بہت لطف دیتے ہیں۔ میری پسندیدہ مصنفین کی لسٹ کافی لمبی ہے۔ محترمہ نسیم سحر قریشی، رفعت ناہید سجاد، نگہت عبداللہ، ناہید سلطانہ اختر، نمرہ احمد، فرحت اشتیاق، عنیزہ سید، انیسہ سلیم اور آسیہ رازقی شامل ہیں۔ باقی بھی بہت اچھا لکھتی ہیں۔ آج کل صائمہ اکرم چوہدری اور سائرہ رضا کے چرچے ہیں۔ کنیز نبوی، فائزہ افتخار اور رخسانہ نگار بھی اچھا لکھتی ہیں۔ قارئین میں انیقہ انا، نوال افضل گھمن، نمرا، اقرا، آمنہ اجالا، کرن شبیر، قرۃ العین رائے اور نوشین اقبال نوشی اور دوسری خواتین کا انتخاب اور رائے عمدہ ہوتے ہیں۔ ایک محترمہ تھیں سیدہ نسبت زہرہ گیلانی ان کے تبصرے کمال کے ہوتے تھے۔ وہ آج کل کدھر غائب۔

ہیں۔

4 ۔ خوبیاں اور خامیاں تو دوسرے ہی بتاسکتے ہیں۔ اپنے لیے تجزیاتی رائے دینا بہت مشکل ہے۔ میری بیٹی کہتی ہے کہ آپ کی عادات و اطوار "شہرذات" ڈرامے کی ہیروئن سے ملتی جلتی ہیں۔ وہ بھی آپ کی طرح ہمدرد اور حساس ہے۔

5 ۔ زندگی اس قدر مصروف ہے کہ ساون کے پکوانوں کا لطف لینا بہت مشکل ہے۔ صبح اٹھ کر پتا چلتا ہے کہ رات بارش ہوئی تھی۔

6 ۔ جہاں تک لطیفوں کا تعلق ہے تو طنز و مزاح سے بھرپور بہت کتابیں میرے ذخیرہ کتب میں موجود ہیں۔ ویسے مجھے عطاء الحق قاسمی کی تحریریں بہت پسند ہیں۔

مسرت الطاف احمد... کراچی میٹروول

1 یادوں کی شمع روشن کی تو نئے موسموں کی اوٹ سے پرانے مناظر دکھنے لگے۔ ہر یاد ایک ایک کرکے ذہن پر دستک دینے لگی۔ شعاع سے میرا تعارف میری فرینڈ نے کرایا۔ جب میں بی اے میں تھی۔ تین سال تک سیکنڈ ہینڈ لے کر پڑھتی رہی۔ پھر جب خط لکھنے کا شوق پیدا ہوا تو فروری 2010ء سے باقاعدگی سے پڑھنا شروع کیا۔

شعاع کے حوالے سے ایک اہم واقعہ میرے ذہن میں آرہا ہے۔ ہوا کچھ یوں کہ میں اپنے کزن اسامہ سے رسالہ منگواتی ہوں، ایک دفعہ میں نے اسامہ کو 2 تاریخ کو پیسے دیے کہ کل اپنے ساتھ رسالہ لے آئے، کیونکہ مجھے عموماً" 3 تاریخ تک رسالہ مل جاتا ہے۔ مگر تین تاریخ کو جب اسامہ آیا تو خالی ہاتھ دیکھ کر پوچھا۔ "رسالہ کہاں ہے؟" اسامہ نے کہا۔ "نہیں ملا، پانچ تاریخ تک آئے گا" پانچ تاریخ کو میں نے اسامہ کو ایس ایم ایس کیا۔ "رسالہ ملا یا نہیں" تو جواب ملا "ہاں مل گیا ہے، لیکن میں نے کسی دوست کی دکان میں رکھا تھا اور وہیں بھول گیا اور شاید وہ شاپ تین، چار دن بند رہے گی۔" یہ سن کر میں پریشان ہوگئی، تو اسامہ نے کہا۔ "اتنی جلدی کیا ہے، مل جائے گا تو آرام سے پڑھ لینا۔" میں نے کہا۔ "مجھے پڑھ کر خط

لکھنا ہوتا ہے پندرہ تاریخ تک۔ میری پریشانی دیکھ کر اسامہ دوسرا رسالہ لینے گیا۔ لیکن اب وہ شاپ پر بھی ختم ہوگیا تھا۔ ان دو سالوں میں پہلی بار ایسا ہوا کہ شعاع کی کسی بھی تحریر پر تبصرہ نہیں کرسکی‘ کیونکہ رسالہ چودہ تاریخ کو مجھے ملا تھا۔“

2 میری زندگی میں صبح کا آغاز ابو کی آواز پر ہوتا ہے جو نماز کے لیے جگا رہے ہوتے ہیں۔ نماز کے بعد ایک گھنٹے کے لیے سو جاتی ہوں‘ پھر اٹھ کر امی کی ہیلپ کرتی ہوں۔ ابو کے آفس جانے کے بعد صبح صبح چھت پہ جاکر پودوں کو پانی دیتی ہوں‘ ان کے ساتھ باتیں کرتی ہوں‘ سبزہ دیکھ کر موڈ خوشگوار ہوجاتا ہے۔ امی نے ہم بہنوں کی باری مقرر کی ہے۔ میں چھت اور سیڑھیوں کی صفائی کرتی ہوں اور ہفتے میں دو یا تین بار گراؤنڈ فلور کی تفصیلی صفائی کرتی ہوں۔ ندا امی کے ساتھ کچن کی صفائی اور رات کے کھانے کی تیاری کرتی ہے‘ جبکہ رباب ان کی ہیلپ کرتی ہے اور صائمہ سیکنڈ فلور کی صفائی کرتی ہے۔ دوپہر کے کھانے کا کچھ خاص انتظام نہیں ہوتا ہے‘ لیکن اگر کچھ بنانا ہو تو صائمہ ہی بنالیتی ہے۔ میں اس دوران فریش ہوکر شعاع کے لیے تھوڑا وقت نکال لیتی ہوں۔ ظہر کی نماز پڑھ کر سب اکٹھے کھانا کھاکر باتیں کرتے ہیں یا ریسٹ کرتے ہیں۔ جبکہ میرا یہ وقت صرف شعاع کے لیے ہی ہوتا ہے۔

پھر دو گھنٹے تک ٹیوشن پڑھاتی ہوں۔ بچوں کے جانے کے بعد عصر اور مغرب کی نماز پڑھتی ہوں۔ تھوڑا وقت اپنے بھانجے محمد راحیل کو دیتی ہوں۔ میں رات کا کھانا کبھی کبھار ہی بناتی ہوں۔ کیونکہ ابو کو تو صرف امی کے ہاتھ کے کھانے ہی پسند ہیں۔ البتہ اگر ابو کا چائنیز کھانے کا موڈ ہو تو میں شوق اور دل لگا کر بناتی ہوں۔ رات کے کھانے کے بعد جس کی باری ہو‘ وہ برتن دھوتی ہے۔

عشاء کی نماز کے بعد رات ساڑھے بارہ بجے تک پھر شعاع پڑھتی ہوں۔ شعاع تنہائی میں ہی پڑھنا پسند کرتی ہوں۔ تاکہ مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔ ریڈیو سننا اچھا لگتا ہے۔ ٹی وی دیکھنے کا خاص شوق نہیں ہے اگر کوئی ڈرامہ فیورٹ رائٹر کا ہو تو وہ ڈرامہ مس نہیں کرتی۔

3 شعاع کے ہر شمارے میں کوئی نہ کوئی تحریر ایسی ضرور ہوتی ہے جو دل چھو لینے والی اور متاثر کن ضرور ہوتی ہے۔ جیسے رخسانہ نگار عدنان کے ناول ”زندگی اک روشنی“ نے مجھے بہت انسپائر کیا۔ فرحت اشتیاق کے ناولز ”بن روئے آنسو اور جو بچے ہے سنگ سمیٹ لو“ میرے موسٹ فیورٹ ناول رہے اور نمرہ احمد کے ناولز میں ”قراقرم کا تاج محل“ اور ”جنت کے پتے“ ایک خوب صورت یاد بن کر دل پر نقش ہیں۔ صوفیہ بشیر کا ناول ”اداس چاند“ دل میں اترتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے علاوہ نبیلہ ابر راجہ کا ناول ”زندگی کے رنگ“ اور نبیلہ عزیز کے ناولز میں کردار مہیان‘ مائے نی اور نہ برت بے نیازی“ اپنی مثال آپ ہیں۔ یہ تحریریں ہمارے ذہنوں پر برسوں حاوی رہیں گی۔ نبیلہ عزیز کے ناول مائے نی پڑھ کر دل بہت دیر تک الجھا‘ جب موموکی ڈیتھ ہوئی ابھی تک یہ بات ذہن میں گردش کرتی رہتی ہے کہ کاش! موموکی ڈیتھ نہ ہوتی۔

4 جہاں تک میری خوبیوں اور خامیوں کا تعلق ہے تو میں کلیوں کی طرح نرم و نازک ہوں‘ تو کبھی چٹان کی طرح مضبوط‘ کبھی بہار کی طرح رنگین‘ تو کبھی خزاں کے زرد پتوں کی طرح اداس۔۔۔ میں ضدی طبیعت کی مالک ہوں‘ کافی حد تک انا پرست ہوں‘ موڈی ہوں اور اگر ایک بار ناراض ہوجاؤں تو جب تک کوئی پہل نہ کرے بات نہیں کرتی۔ خوبیوں میں ۔۔۔ بہت ہی حساس طبیعت کی مالک ہوں‘ بہت نفاست پسند ہوں۔ صائمہ نے کہا کہ میرا دل بہت بڑا ہے۔ کھل کر خرچ کرتی ہوں۔ ندا نے کہا اپنے آپ میں رہتی ہوں۔ بہت فرینڈلی ہوں‘ تعریفی جملہ۔ اسمعہ نے کہا۔ ”گھر میں جب کسی کی طبیعت خراب ہو تو سب گھبراتے ہیں‘ لیکن تم نہیں گھبراتیں۔ بلکہ اس سچویشن کو بہت اچھی طرح ہینڈل کرتی ہوں۔“

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

پالک کے پراٹھے

ضروری اجزا :

پالک	آدھا کلو
دودھ' تازہ بالائی	ایک ایک کپ
چکن کیوبز	دو عدد
میدہ' آٹا	چار' چار کپ
نمک' گھی	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

پالک دھو کر باریک کاٹ لیں اور دودھ ڈال کر پکنے دیں۔ دودھ خشک ہو جائے تو اتار کر ٹھنڈا کر لیں اور پیس لیں۔ اس کے بعد چکن کیوبز کو اچھی طرح پالک میں ملا لیں۔ میدے اور آٹا میں نمک اور ایک کپ گھی ملائیں۔ اس کو پانی یا دودھ سے قدرے سخت گوندھ لیں اور تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں۔ اب مناسب سائز کے پیڑے بنالیں۔ روٹی بیل کر درمیان سے آدھا کاٹ لیں۔ روٹی پر بالائی کی تہہ لگائیں۔ پھر پالک کی تہہ لگا کر رول کرنا شروع کریں۔ اور تکون شیپ میں مکمل کر کے اوپر سے دبا کر دوبارہ پیڑے کی شیپ بنالیں۔ سارے پیڑے اسی طرح بنالیں۔ پھر بیل کر گرم توے پر گولڈن تل کر اتار لیں۔ گرما گرم پیش کریں۔

کھڑے مسالے کا پلاؤ

ضروری اجزا :

مٹن	ایک کلو
چاول	ایک کلو
دہی	ایک پاؤ
پیاز	تین عدد
چھوٹی' بڑی الائچی	پانچ' پانچ عدد
تیزپات' لونگ	چار چار عدد
سونف' ثابت دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
تیل' نمک	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

ململ کے کپڑے میں ثابت دھنیا' سونف آدھی مقدار میں لونگ' دار چینی' تیزپات' سیاہ مرچ بڑی اور چھوٹی

الائچی باندھ کر پوٹلی بنالیں۔ ایک دیگچی میں گوشت' پوٹلی اور پانی شامل کرکے اتنا پکائیں کہ گوشت گل جائے' پھر پوٹلی کو نچوڑ لیں اور چھلنی کی مدد سے گوشت اور یخنی علیحدہ کرلیں۔ الگ پتیلی میں تیل گرم کرکے پیاز براؤن کریں' پھر ادرک' لہسن اور آدھی مقدار میں بچا ہوا گرم مسالا ہری مرچیں اور گوشت شامل کرکے اچھی طرح بھونیں۔ پھر بھیگے ہوئے چاول کے ساتھ نمک اور یخنی شامل کریں۔ جب پانی خشک ہوجائے تو اس کے اوپر زردے کا رنگ ڈال کر چاول کو دم پر رکھ دیں۔ رائتے کے ساتھ پیش کریں۔

اسپیگٹھی سوپ

ضروری اجزا :

اسپیگٹھی	آدھا پیکٹ
ٹماٹر کا پیسٹ	ایک کپ
پیاز	ایک عدد
یخنی	چار کپ
نمک	حسب ذائقہ
مکھن	دو کھانے کے چمچے

ترکیب :

اسپیگٹھی ابال کر رکھ لیں۔ الگ برتن میں مکھن گرم کرکے پیاز فرائی کریں پھر ٹماٹر کا پیسٹ اور یخنی ڈال کر پکائیں۔ سوپ گاڑھا ہوجائے تو نمک اور سیاہ مرچ ڈال کر مکس کردیں۔ پیالے میں اسپیگٹھی ڈال کر سوپ ڈالیں اور پودینے سے سجاکر گرم گرم پیش کریں۔

قیمہ کباب مسالا

ضروری اجزا :

قیمہ	آدھا کلو
ٹماٹر	دو عدد
ادرک' لہسن پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
لال مرچ' گرم مسالا	آدھا' آدھا چائے کا چمچہ
پیاز	پانچ عدد
بیسن	دو کھانے کے چمچے
نمک' تیل	حسب ذائقہ' ضرورت

ترکیب :

قیمہ میں ٹماٹر' دو پیاز' ادرک' لہسن' لال مرچ' گرم مسالا' بیسن ڈال کر پیس لیں اور کباب بنالیں۔ دیگچی میں تیل گرم کریں۔ باقی پیاز لچھے دار کاٹ کر گول کٹے ٹماٹروں کے ساتھ تہہ لگائیں' پھر کباب رکھیں' پھر پیاز' ٹماٹر کی تہہ لگائیں' پھر کباب رکھیں۔ اور بیس منٹ دم پر رکھ دیں۔

چپاتی اور رائتے کے ساتھ پیش کریں۔

کیلے کا میٹھا

ضروری اجزا :

کیلے	چھ عدد
دودھ	آدھا لیٹر
چینی	ایک کپ
کافی	دو کھانے کے چمچے
فریش کریم	ایک پیکٹ
کارن فلور	دو کھانے کے چمچے
اخروٹ	حسب ضرورت

ترکیب :

پتیلی میں دودھ اور چینی ملا کر پکائیں' تھوڑے سے ٹھنڈے دودھ میں کارن فلور حل کریں اور اسے پورے دودھ میں ملا کر پکائیں۔ مسلسل چمچہ چلاتی رہیں۔ فریش کریم میں کافی ملا کر پھینٹیں اور دودھ والے آمیزے میں شامل کردیں۔ ٹھنڈا کرنے کے لیے فریج میں رکھیں۔ پھر اس میں کٹے ہوئے کیلے' کریم اور اخروٹ شامل کریں اور مزید ٹھنڈا کرکے پیش کریں۔

☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- رابعہ جمیل

میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافر ---------- موسیٰ رضا

بھی ملالیں۔ اس آمیزے کو چہرے پر لگالیں۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد چہرہ نیم گرم پانی سے دھولیں۔

متناسب جسم

جسم خواہ کتنا ہی متناسب ہو مگر بڑھا ہوا پیٹ ساری خوبصورتی اور دلکشی کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے' پیٹ کم کرنے کے لیے نہار منہ سادہ چائے (بغیر دودھ اور شکر کے) میں چوتھائی لیموں کا رس شامل کرکے روزانہ ایک ماہ پابندی سے پئیں تو بڑھا ہوا پیٹ کم ہوجائے گا۔ اس کے علاوہ بڑھے ہوئے پیٹ کے لیے ایک انتہائی آسان ورزش ذیل میں درج ہے۔ اس ورزش کا دہرا فائدہ حاصل ہوگا۔ ایک تو بڑھا پیٹ کم ہوجائے گا۔ دوسرے اگر ٹانگیں وزنی ہیں تو ان کے وزن میں بھی کمی واقع ہوگی۔

زمین پر سیدھی لیٹ جائیں۔ ٹانگوں کو ہوا میں بلند کرکے سائیکل کی طرح چلائیں۔ یہ عمل سو سے ڈیڑھ سو مرتبہ کریں۔ ابتدا میں جتنی بار یہ عمل کرسکتی ہیں کریں پھر آہستہ آہستہ بڑھا کر سو مرتبہ کردیں۔ دو مہینوں میں خاطر خواہ اثر پڑے گا۔ اس کے ساتھ غذا کو متوازن رکھیں تاکہ ورزش بہتر اثر کرسکے۔

(ایسی خواتین جنہیں سانس یا قلب کا مرض لاحق ہو ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر یہ ورزش نہ کریں)

صحت مند اور روشن آنکھیں

آنکھیں چہرے کو خوب صورت بنانے میں کافی اہمیت کی حامل ہیں اسی لیے ان کا صحت منداور روشن رہنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں رات کو سوتے وقت اصلی شہد (اگر شہد نیم کے درخت کا حاصل کردہ ہو تو اثر بہتر ہوگا) ایک ایک سلائی دونوں آنکھوں میں پھیرلیں۔ اس سے نہ صرف آنکھیں روشن اور صحت مند ہوں گی بلکہ بینائی بھی بہتر ہوجائے گی۔

روزانہ صبح ٹھنڈا پانی تین دفعہ آنکھوں میں ڈالنے سے بھی بینائی اور آنکھوں کی صحت پر مجموعی اثر پڑے گا۔

چہرے کی دلکشی کے لیے

چہرے پر جھریاں عموماً عمر میں اضافے یا پھر زیادہ دھوپ میں رہنے سے پڑجاتی ہیں۔ عمر میں اضافے والی کا تو کوئی علاج ممکن نہیں' لیکن جھریاں اگر دھوپ کی وجہ سے ہیں تو کوشش کریں کہ دھوپ میں کم نکلا کریں۔ اس کے علاوہ دھوپ میں نکلنے سے پہلے چہرے پر اچھے سن بلاک کا استعمال کریں

تاکہ چہرے کی قدرتی نمی برقرار رہے۔

جھریوں سے بچنے کے لیے بہت ہی سستا اور آسان ماسک گھر پر بھی تیار ہوسکتا ہے۔

چنے کی دال لے کر پیس لیں یعنی موٹا چورا بنالیں۔ پھر اس میں ایک انڈے کی سفیدی جو کہ پہلے ہی سے جھاگ کی شکل میں پھینٹ لی گئی ہو اور تھوڑا سا شہد